سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منفرد، آسان اور جدید اسلوبِ بیاں

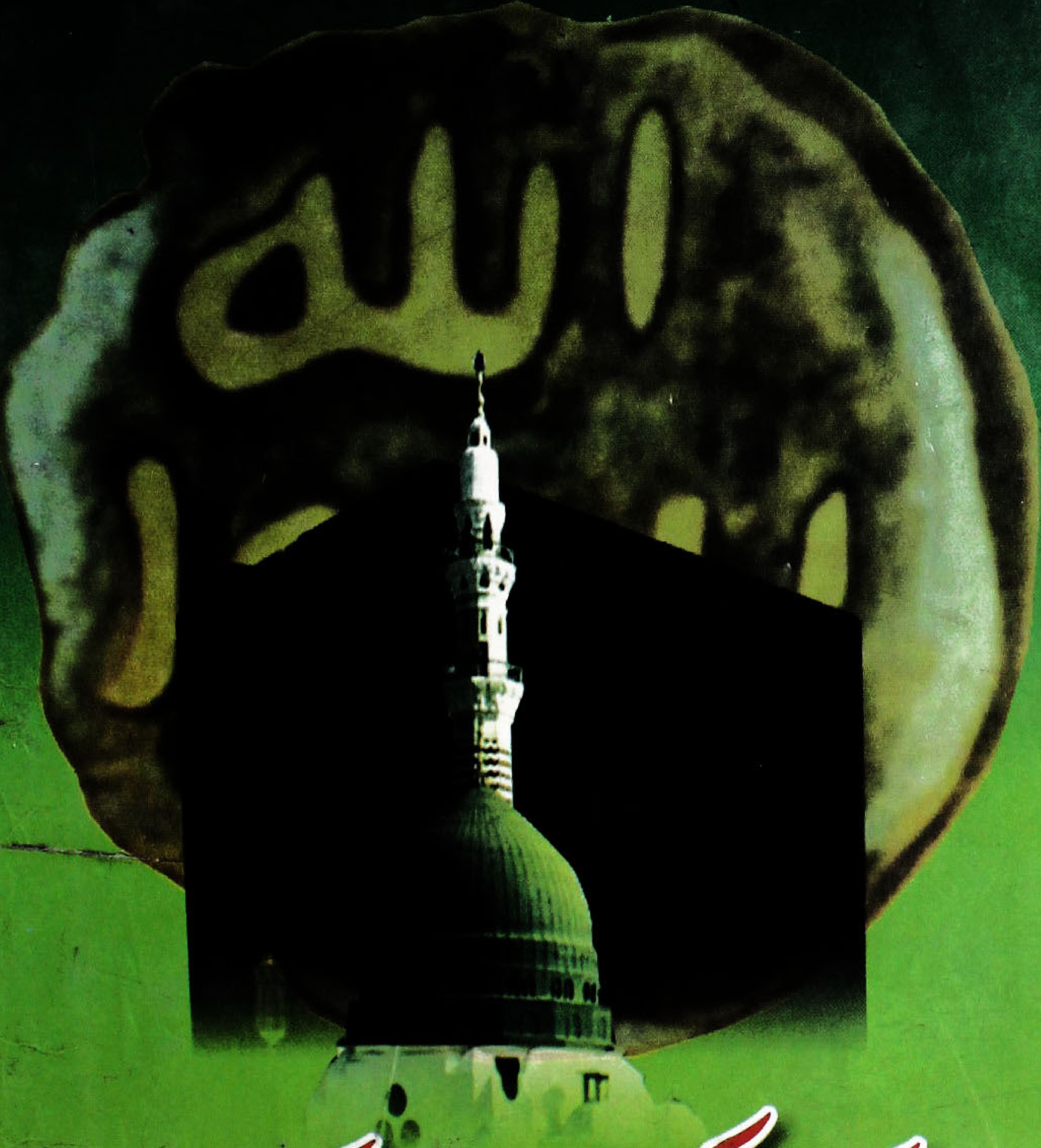

مکہ کی سرد جنگ

رسول اللہ ﷺ کے خلاف کفار مکہ کی مذموم سازشوں کی تاریخ

میجر میاں محمد رفیع مراد

BOOK HOM

Marfat.com

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمْ ط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ط

Marfat.com

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا
ایک منفرد، آسان اور جدید اسلوب بیان

مکہ کی سرد جنگ

یہ تحریک "قُمْ فَاَنذِرْ" سے شروع ہوتی ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ پر
مکمل ہوتی ہے اور قیامت تک تسلسل رکھتی ہے۔

میجر میاں محمد رفیع مراد

مکہ کی سرد جنگ

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کفار مکہ کی مذموم سازشوں کی تاریخ)

میجر میاں محمد رفیع مراد

BOOK HOME

Marfat.com

مکہ کی سرد جنگ

میجر میاں محمد رفیع مراد

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

اہتمام	رانا عبدالرحمٰن
پروڈکشن	ایم سرور
سرورق	ریاظ
کمپوزنگ	محمد انور
پرنٹرز	نوید حفیظ پرنٹرز، لاہور
اشاعت	2008ء
ناشر	بک ہوم لاہور

بک ہوم

بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور- فون:042-7231518-7245072
E-mail:bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعالَمِین
وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلامُ علیٰ سَیِّدِنا
مُحَمّدٍوَّ آلِہٖ وَ اَصْحابِہٖ
وَاَہلِ بَیتِہٖ اَجْمَعِین ط

Marfat.com

انتساب

والدِ بزرگوار مکرم و محترم جناب حضرت میاں برکت علی (مرحوم) اور والدہ محترمہ جناب زینب بی بی کے نام..........

والدِ محترم جناب حضرت میاں برکت علی (مرحوم)......جن کی صحبت میری متاعِ بے بہا ہے۔ جن کی سادگی، درویشی، نرم مزاجی، جفاکشی، مناسب گفتاری حلیمی و بردباری اور صلح پسندی میرے لیے راہنما اور زریں اصولِ زندگی ہیں۔ جن کی قربتیں اور محبتیں، مشاورتیں اور نصیحتیں، شفقتیں اور وصیتیں میرے رگ و پے میں حلاوت آ گیں اور معطر یادیں بن کر سلگ رہی ہیں۔ یہ میری خام سی زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ اور انتہائی انمول خزانہ ہیں......

اور والدہ محترمہ کی گود کا تقدس جس نے زندگی کے آوارہ اور اوباش دنوں میں بھی میری مصنوعی شخصیت و کردار کے گرد حقیقی حصار کیے رکھا......

اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی کمال رحمتوں کا نزول فرمائے "آمین"

Marfat.com

فہرست

سرِ ورق 11
حرفِ نیاز 13
سخنے چند 17
پیش لفظ 22

حصہ اول

باب 1: قدیم عرب 33
قدیم عرب پر ایک نظر 33
مذہب اور اخلاق پر ایک نظر 43
عرب کی جغرافیائی اہمیت 51
قبل اسلام، سیاسی پس منظر 56
ابرہہ کا مذہبی واقتصادی پیکج (عام الفیل) 61
باب 2: ولادت و پرورش 77
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور پرورش 77
عملی زندگی کا آغاز 83
انسانی حقوق کی پہلی عالمی تنظیم (حلف الفضول) 88
تاریخ حرم کا بہترین پنچایتی فیصلہ 94
آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تجارتی منیجر 99
ازدواجی زندگی کا آغاز 104
آپ کی آمد کی صدیوں پہلے اخبار 111
باب 3: بعثت 118
طلوعِ آفتاب نبوت صلی اللہ علیہ وسلم 118

Marfat.com

پہلی زیر زمین تحریک کا آغاز 128
او جب خفیہ پن ختم ہوا 133
باب4: سرد جنگ 143
سرد جنگ کا آغاز 143
باب5: سیاسی محاذ 148
سرد جنگ کا محاذ سیاست 148
قوم عاد (حضرت وہود علیہ السلام کی قوم) 154
قوم ثمود (حضرت صالح علیہ السلام کی قوم) 162
باب6: خاندانی محاذ 174
سرد جنگ کا خاندانی محاذ 174
حضرت حمزہؓ کا اسلام میں داخلہ کیسے ہوا 181
دختران رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو طلاق دلوانے کی کوششیں 192

حصہ دوم

باب7: ثقافتی محاذ 203
عرب کلمہ طیبہ کے حصار میں 203
بے پر کے جھوٹ (Disinformation) 210
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے مذمم (نعوذ باللہ) 216
جب افواہوں کو پر لگے 220
جب حج پر چلا جھوٹ 225
مخالفین نے ابتر کہا تو (نعوذ باللہ) 240
اور جب وحی رکی تو (فترۃ وحی) 248
ایک اور اشقلا ہاتھ آ گیا 257
مسلمانوں کی تنظیم نو 262
مشرکین پر قرآن کے ثقافتی اثرات 267
باب8: اخلاقی محاذ 273
نبوت کے اخلاقی مظاہرے 273

Marfat.com

ابو جہل پر کیا بیتی 277
جب مشرکین عذاب کے طلبگار ہوئے تو 287
اور جب قحط پڑا تو 293
سیدنا موسیٰ اور فرعونِ مصر 297
اور جب چاند دو ٹکڑے ہوا 308
باب 9: سفارتی محاذ 315
یہودی علماء سے سفارت و مشاورت اور ان کے سوال؟ 315
حضرت یعقوب علیہ السلام 317
یوسف علیہ السلام کون تھے اور مصر کیسے پہنچے؟ 320
یوسفؑ بازار مصر سے تختِ مصر تک 334
اولادِ یعقوب مصر میں 349
یہود سے ایک اور مشورہ چند اور سوال 365
اصحاب کہف کون تھے؟ 368
ذوالقرنین کون تھے؟ 374
موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی ملاقات 377

باب:10
سرد جنگ کا محاذِ دہشت گردی 385
محاذِ دہشت گردی 385
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش (نعوذ باللہ) 393
رسول اللہؐ کے ساتھیوں پر بربریت 397
غلاموں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے 399
اسلام کی پہلی شہیدہ 402
مسلمانوں کے ہاتھ غلام فروخت کرنے پر قدغن 404
اسلام کے لیے پہلے مرد کی شہادت 407
ظلم کے اثرات ونتائج 409

باب:11
سرد جنگ کا معاشی ومعاشرتی محاذ 413

معاشی ومعاشرتی محاذ 413
ہجرت کرنے والی پہلی اسلامی جماعت (ہجرت حبشہ) 416
مسلمان دربارِ نجاشی میں 419
سخت معاشی ومعاشرتی ناکہ بندی 424
شرار بولہبی 433

باب:12

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم 438
معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تاریخی پس منظر 438
کائناتِ انسانی کا پہلا آسمانی سفر 441
مکہ سے اقصیٰ تک 444
اقصیٰ سے پہلے آسمان تک 448
پہلے آسمان سے سدرۃ المنتہی تک 454
سفرِ معراج سے واپسی 462
واقعہ معراج کا ذکر اور لوگوں کا ردِعمل 464
اسلام کا پہلا بنیادی دستور یا قراردادِ مقاصد 468
جائزہ بنیادی دستور 472
معراج النبی کا عقلی ومنطقی جائزہ 483
معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سائنسی جائزہ 491
سفرِ طائف اور جنوں کا قبولِ اسلام 499
اسلام کا پہلا حربی حلف (بیعتِ عقبہ اول اور دوم) 506

باب:13

ہجرت 512
جداگانہ معاشرتی وعالمی تشخص 512
ہجرت ایک عظیم قربانی 516
آؤ مدینے چلیں 520
دنیا کا پہلا تحریری آئین 532
کتابیات 540

Marfat.com

سرِ ورق

"مکہ کی سرد جنگ" ایک عام فہم اور نہایت سلیس زبان میں لکھی گئی کتاب ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے عبارت کی سادگی طرز ادا کی سہولت اور واقعات کے سلجھاؤ کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس کتاب کے دو حصوں کی ترتیب نہایت ہی منطقی انداز میں دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین پر احکام الٰہی جاری کر کے دنیا کو ظلم و ستم، شر و فساد اور سازش سے پاک و صاف رکھنے کے لیے ہر بستی، ہر خطے اور ہر قوم میں ہادی و نبی بھیجے اور کتابیں اتاریں۔ جب کبھی اولاد آدم نے بندہ ہونے کی بجائے مالک و خالق بننے اور فرمان الٰہی سے روگردانی کی کوشش کی تو قوموں کی قومیں صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں۔ عاد و ثمود، قوم صالح و قوم لوط اپنے زمانے کی ترقی یافتہ اقوام تھیں جو اس حقیقت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ فرعون، ہامان جن کا گلوبل آرڈر (Global Order) چلتا تھا اپنے فطری انجام کو پہنچے اور دنیا میں عبرت بن کر رہ گئے۔ ان تمام اقوام کا ذکر جس منفرد انداز میں مصنف نے پیش کیا ہے شاید اس سے پہلے کسی ایک مجموعہ کتاب میں ایسا نہیں تھا۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر مقالات اور کتابوں کی کوئی کمی نہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ آج تک کسی علمی، تاریخی یا ادبی موضوع پر اتنی تحریریں وجود میں نہیں آئیں جتنی سیرت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے متعلقات پر آ چکی ہیں۔ لیکن اس کثرت کے باوجود ایسی کتابیں گنتی کی ہیں جن میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی جامعیت اور اکملیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہو جس کی وہ مستحق ہے۔ جیسا کہ مصنف نے اس کتاب میں کیا ہے۔

یقیناً یہ کتاب نہایت مفید و بصیرت افروز ہے اور مرشدین کے لیے اصلاح کے میدان میں شمع فروزاں ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف کو اس خدمت کی اپنی شان کے مطابق جزا دے (آمین)

Marfat.com

میجر محمد رفیع مراد میرے ماتحت مجاہد بٹالین میں کام کر چکے ہیں اور وہ پختہ ذہن اور علمی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فرض شناس سپاہی بھی ہیں۔ میں اُن کی جملہ صفات کا ہمیشہ معترف رہا ہوں اور دعا گو ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر اُن کو ہمیشہ کی طرح علمی لحاظ سے فعال اور باعمل و باصحت رکھے۔ آمین

لیفٹیننٹ جنرل
محمد اشرف سلیم

Marfat.com

حرفِ نیاز

اس پر آشوب دور میں جب اسلام شناسی کی بجائے اسلام فراموشی اور اسلام فروشی کی طرف پوری امت مسلمہ کا یہ عالم ہو کہ اس گرداب وگڑھے میں گرنے کے لیے اتنی عجلت اور سرعت کا مظاہرہ کر رہی ہو جتنی کہ فراز اور بلندی سے لڑھکتے ہوئے پتھر کو نشیب میں آنے کے لیے، بلاشبہ ملتِ اسلامیہ کا چراغ جسے ہر دور میں بجھانے کے لیے استعمار کی نسبت اسلام کے جامے میں ملبوس مسلمانوں نے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا لیکن یہ بھی تو بہت بڑا اعجاز اور کرامتِ خداوندی ہے کہ اس کی لو اور لاٹ میں کمی کا وقت ہی دنیا میں ضیا پاشیوں اور دلوں کے تاریک گوشوں میں سلگتی چنگاری کے شرر بار ہونے کا سبب بن جاتا ہے اور اس شرر سے اسلام دشمنی کے پکے ہوئے خوشے وگوشے اور یہود و ہنود کے خرمن جل جل کر خاکستر ہونا شروع ہو جاتے ہیں یعنی کربلائیں ہی اسلام کی حیاتِ ازلی وابدی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستانوں، ان کی شگفتگی اور شیفتگی، ان کی بلندی اور پستی جلوؤں اور جذبوں پر پڑی ہوئی اوس اور زنگ آلود قلوب و اذہان پر جمی ہوئی وقت اور حالات کی گرد کو صاف کرنے کے لیے اسلام کے سرفروشوں اور آشفتہ نواؤں نے مورخین، محدثین، مفسرین و مصنفین کی صورت میں ہر دور میں اپنا تابندہ ورخشندہ کردار ادا کیا۔ چنانچہ آج کے دور میں جب کہ کفر کی تند وتیز اور تیرہ وتار آندھیاں پوری یورش اور یلغار کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے ٹمٹماتے چراغ کو بجھانے کے درپے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کے حقیقی خدوخال اور اس کی نقش گری کے سچے اور کھرے نقاش اسے نکھارنے اور اسلام کا جذبہ ابھارنے کے لیے اپنے دل کے خون کا آخری قطرہ تک اس چراغ کی نذر کر رہے ہیں۔

بلاشبہ اس دور میں میرے لیے اعزاز اور شرف کے قابل دوست میجر محمد رفیع مراد نے نہ صرف عسکری محاذ پر بلکہ علمی وادبی تاریخی واسلامی محاذ پر اسلام دشمنی کی جنگ میں اپنا تن من اور دھن سب کچھ جھونک دیا ہے۔ یقیناً ان کو آج کا دور ہی نہیں مستقبل بھی خراجِ تحسین کے پھول نچھاور کرے گا کیونکہ مادیت پرستی، ہوس زر، طمع اور لالچ کی چمگادڑوں نے اسلام، روحانیت، تیقن،

اعتقاد اور عقیدہ کے معبد پر اپنی مذموم اور مطعون پالیسیوں کے ذریعے انتہائی شیریں اور سرد انداز سے یلغار کر رکھی ہے۔

ایسے میں اسلام اور مسلمانوں کی بکھرنے کے قریب سطوت اور شان وشوکت کو قدرت کاملہ کے وہ ابابیل بچائے ہوئے ہیں۔ جو کبھی اصحابِ فیل کی طاقت ونخوت زمین برد کر دیتے ہیں اور کبھی چڑیا کی شکل میں آتشِ نمرود کو بجھانے کے لیے اپنی چونچ سے ایک قطرہ پانی ٹپکا کر یقین ایمان جذبوں اور جلوؤں کی تاریخ رقم کر دیتے ہیں۔ ایسے ابابیلوں کے غول میں میجر محمد رفیع مراد نے بھی اپنے حصے کا وہ کردار ادا کر دیا ہے جو آتشِ نمرود کے دہکتے ہوئے آلاؤ کو بجھانے کے لیے ایک چڑیا نے چونچ بھر پانی سے بجھانے کے جذبے اور جلوے کی تاریخ رقم کی تھی۔

سیرۃ النبی ﷺ اور قرآن کریم کی تفسیر وتفصیل پر روز ازل سے لے کر اب تک سب سے زیادہ لکھا گیا اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک جان لیوا المیہ ہے کہ سب سے زیادہ فراموشی بھی اسی مشعلِ راہ سے اغماض کی صورت میں کی گئی۔ کیونکہ استعمار کو سب سے زیادہ فکر، تشویش اور خدشہ اسلام سے ہے مسلمانوں سے نہیں کیونکہ وہ اسلام کی نقش گری کو تبدیل نہیں کر سکے البتہ مسلمانوں کی "بت گری" کرنے میں وہ کامیاب وکامران ٹھہرے حالات کے ہر آذر نے سمجھا کہ اس نے اپنی مرضی کے مسلمان اور ان کی حکومتیں تو تراش لی ہیں لیکن اُسے یہ معلوم نہیں کہ ان کی آنکھوں کے ابرو کے اشارے پر کٹھ پتلیوں کی طرح رقصاں حکمران ہی سب کچھ نہیں اور ان کے اس صورت میں جلوہ گر نمائندے اپنی نمو کے لیے تو سب کچھ کر گزرتے ہیں لیکن اسلام کی پرداخت اور پرورش میں ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ اسلام کی بھولی ہوئی شناخت کے لیے ہمیشہ اولیا کرام، علماء کرام، صوفیا اور مورخین ومفسرین نے بھٹکی ہوئی عوام اور رعایا کو بھیڑ بکریوں کے اس ریوڑ کی طرح موڑ دیا جنھیں یہ علم نہیں ہوتا کہ پہاڑ کی جس اگلی کھائی میں وہ گرنے والے ہیں وہاں پر روپوش بھیڑیوں کا غول انھیں اپنی شکم سیری کے لیے بے تاب وبے قرار ہے۔ بدقسمتی سے مسلم اُمہ کے اکابرین واشرافیہ ہوسِ اقتدار وزر میں فکری لحاظ سے اندھی، گونگی اور بہری ہو کر اپنے ہی وجود میں کیل ٹھونک رہی ہے۔ مگر قدرتِ کاملہ نے ایک ایسی تیغ بے نیام کارگاہِ ہستی میں کارآمد بنا رکھی ہے جس کا استعمار اور اس کے حلیف مسلم اکابرین کے پاس نہ تو انتظام ہے اور نہ ہی اس کی ننگی تلوار کے لیے نیام۔ یہ تیغ بے نیام قرونِ اولیٰ کے مورخین سے لے کر زمانۂ حال کے مصنفین نے قلم کی صورت میں سونت رکھی ہے۔

اس نوجوان نسل کی تابندہ اور قابل فخر روایات، تعلیمات، اخلاقیات اور تاریخ تک کو

Marfat.com

بھلانے کے لیے ہر حربہ آزمایا گیا اور اس میدان میں استعمار کے بازی گروں کو کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی کہ ان کی شخصیت سازی کی عمارت کی بنیاد میں ہی برادہ بھر دیا گیا تاکہ وہ یہود و ہنود کی طرف سے بھیجے گئے سازش کے معمولی جھونکے کی نذر ہو کر ان کی یہ عمارت خود بخود منہدم ہو جائے اور اس کام کے لیے انھوں نے نصاب پر سب سے پہلے ہلہ بولا تاکہ ان کے نصاب سے ہر قسم کے جہاد سے انھیں تنفر کر دو چنانچہ اس کاری ضرب کے بعد نوجوان نسل اپنے حقیقی ہیروز کی پیروی و تقلید کرنے کی بجائے مغربی اور فلمی ہیروز کی مقلد ہو جائے گی مگر الحمد اللہ اس تباہی سے بروقت انتباہ کرنے کا کام اس دور میں اللہ تعالیٰ نے میجر محمد رفیع مراد سے لیا ہے اس کے قلم نے تاریخ و تہذیب کا وہ بھولا ہوا سبق ہمیں یاد کروا دیا ہے ورنہ ہم تو اپنا اصل راستہ بھی بھول گئے تھے۔اور بھٹکی ہوئی بکھری ہوئی شکست خوردگی کا شکار نئی نسل کی انگلی تھام کر جو مشکل منزل پار کرانے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا ادراک آئندہ نسلوں کو خود بخود ہو جائے گا یقیناً اس کارِ عظیم کی ابتداء کا اجر اور ثمر اور صلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے انسانوں کے بس کی بات نہیں۔

میجر محمد رفیع مراد نے اپنے دل کے آبگینوں سے اسلام کے دھندلے نگینوں کو دھویا چمکایا اور پھر اسے ہماری زندگی کے شیش محل میں سجایا ہے اب اس پہ عمل کر کے اپنی زندگیوں کو منور کرنا ہمارا کام ہے ان کی سالوں پر مشتمل یہ تحقیق اور تاریخ نوجوانوں کے لیے ایک تازیانہ بھی ہے اور رسول کریم ﷺ کی بارگاہ رسالت میں نذرانہ بھی ہے یہ تاریخ ایک ہاری ہوئی قوم کا آنسو بھی ہے گلے میں رُندھی گلوگیر آواز کی چیخ بھی ہے اور اس قوم کے لاعلاج مرض کی تشخیص بھی ہے آنے والی نسلوں کے لیے تشویش بھی ہے۔ یہ ایک آئینہ بھی ہے کہ جس میں ہم اپنی بگڑی ہوئی اشکال اور افعال کو سنوار کر عالمِ اسلام کی زیبائی کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔

یہ ہماری عالمی، ملی، دینی اور اسلام کی رسوائی کی وہ ایف آئی آر ہے جسے ازل کے مورّخ نے ہمیں اوائل آفرینش سے ہی انتباہ کیا ہے اور پھر اسے تاریخ کے روزنامچے پر درج کیا ہے۔ چنانچہ میجر صاحب امت مسلمہ کے وہ وکیل صفائی ہیں جو پوری دیانتداری اور ایمانداری سے ان سے اعتراف جرم کروانے کے بعد مسلمانوں کے تباہ شدہ خوشہ وخرمن کی راکھ پہ نوحہ گری کرنے کے بعد ایسی قوم کے ایسے نقاش بنے ہیں کہ جس نے چودہ سو سال پہلے کے بھولے ہوئے فطرت کے نقوش ابھارنے اور انھیں سنوارنے میں دور جدید کی نسل کی آبیاری کے لیے ایک معمار اور سنگ تراش بلکہ کہیں زیادہ اس معالج کا کردار ادا کیا ہے جو کہ قوم کو لگے ہوئے سرطان کے آپریشن کے ذریعے ان کے فاسد مادوں کا نہ صرف اخراج کرتا ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے متنبہ کر دیتا ہے کہ

قومی اور ملی بدن کو لاحق مرض کے پھوڑے کا سبب یہ تھا آئندہ سے اس سے اجتناب برتنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو ان کے نیک جذبوں سے کہیں بڑھ کر ثمر و اجر سے نوازے کیونکہ انھوں نے ''مکہ کی سرد جنگ'' میں وہ طرز نگارش اپنایا ہے جسے پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے پھول پر پڑی شبنم دل میں اتر جانے والی طراوت تحریر کا انداز آج بھی سلیمان ندوی کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ ان کے اندر اردو کا خوبصورت اور خوب سیرت ادیب، مورخ، محقق اور مفسر کسی درویش کی طرح اپنے من کی دنیا کی کٹیا کے اندر بیٹھا وہ چراغ لیے ہوئے ہے جس کی روشنی سے ہمارے قلب و قالب روشن ہوں گے۔ میجر محمد رفیع مراد نے ''مکہ کی سرد جنگ'' لکھ کر وہ کام کیا ہے جو مسدس حالی لکھ کر مولانا الطاف حسین حالیؒ نے کیا تھا۔ ہم بھی اس کے دوست ہونے کے ناطے اللہ کی بخشش کے طلبگار ہیں۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنیا حَسَنتاً وَّ فِی الآخِرِ حَسَنتاً وَقِنَا عَذَابَ النَّار.

محمد اسلم کھوکھر
لیکچرار شعبہ اردو
پی اے ایف کالج لوئر ٹوپہ (مری)

Marfat.com

سخنے چند

قرآن مجید کلام اللہ بھی ہے، کتاب اللہ بھی۔ اس کا حرف حرف معنی کا سمندر لیے ہوئے ہے۔ اس کے نازل ہونے سے آج تک جب بھی کوئی مفسر علم کی پونجی لیے اس کے سمندروں میں غوطہ زن ہوا، وہ تعبیر و تفہیم کے گوہر ہائے آبدار لیے برآمد ہوا۔ مفسر کے لیے خلوصِ نیت بھی درکار ہے اور علم کی پونجی بھی کہ اس کے بغیر کچھ کہا تو اپنا ٹھکانا وہاں بنالیا جو نہ ماننے والوں کا ٹھکانا ہے۔ گویا قرآن کے در پر آنے کے لیے آداب بھی درکار ہیں اور عشق بھی۔

صاحبِ قرآن کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ سرکار ختمی مرتبتؐ کی سیرت بھی سمندروں کی وسعت لیے ہوئے ہے۔ آپؐ جامع الصفات بھی ہیں، جامع الحیثیات بھی۔ خاتم النبین بھی ہیں، خاتم العلم بھی ہیں رحیم بھی ___ بات کہاں تک کریں۔ ان کی صفات کی نہ حد ہے، نہ شمار ہے۔ ان کے بارے میں جاننے کے لیے علم بھی درکار ہے، عشق بھی۔ اس کے باوجود آپؐ کی ذات کو کاملاً بیان کر دینا اور سیرت کی ہر تفصیل پیش کر دینا ممکن ہی نہیں۔ آخر سورج کو کرن کرن ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ کب کسی نے سورج کی ساری روشنی، ساری کرنیں ایک مٹھی میں بند کی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو بھی کاملاً پیش کرنا کب کسے نصیب ہو سکتا ہے۔ غالب جیسے قادر الکلام شاعر نے کہا تھا:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کہ آں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید نے یوں ارشاد فرمایا:

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ (سورۃ الکھف۔ آیت 110)

دراصل ہم لوگ اس ساری بات پر ایمان تو لاتے ہیں، مگر یُوْحٰىٓ اِلَيَّ کی کیفیت پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے عالم کے Parameter اس کی تفصیل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ہماری زبان کے الفاظ اس حالت کو بیان کرنے سے عاجز آ جاتے ہیں۔

Marfat.com

ہم نہ یہ کیفیت محسوس کر سکتے ہیں، نہ بیان کر سکتے ہیں۔ مان سکتے ہیں۔ مان لیتے ہیں۔ یہ بھی اس کی توفیق ہے کہ مان لینے کی سعادت بخشی۔ کیوں کر کہیں کہ یُوحیٰ اِلَیَّ کی کیفیت بھی دکھائی جائے۔ چند اشارے بیان کر دیے گئے۔ بس ماننے والوں کے لیے یہی کافی ہے۔ اگر کوئی جاننے والا آگے کی کیفیت جاننا ہے تو یہ اس کی سعادت ہے۔ ہم کون ہوئے، وہ کچھ مانگنے والے جو ہمارے ظرف اور ضمیر سے ماوراء ہو۔

پرانے وقتوں میں لوگوں کی توجہ انا بشر' پہ بھی رہی اور یُوحیٰ اِلَیَّ پر بھی۔ ان لوگوں نے معراج نامے لکھے۔ یہ ان کا حوصلہ تھا۔ مولود نامے لکھے تو سوچا کہ مبالغہ کے بغیر یوحیٰ الیٰ کی کیفیت کیونکر بیان ہو سکے گی۔ اس لیے ہر محیر العقول روایت اٹھا کر بیان کر دی۔ کسی نے سوچا اور سوچ سمجھ کر روایات بیان کیں۔ کسی نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ دیکھ لیتا کہ یہ روایت آئی کہاں سے ہے۔ اس کا راوی کون ہے؟ کس کتاب میں درج ہے۔ پھر تحقیق کا دور آیا۔ شبلی اور سلیمان منصور پوری آئے۔ انھوں نے تحقیق کا در کھولا۔ ضعیف اور موضوع روایات کو ٹکسال باہر کیا۔ چھان پھٹک کی اور صرف وہ روایات بیان کیں جو تحقیق کی کسوٹی پر پورا اترتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور معاملہ بھی ہوا۔

ہوا یوں کہ سیاسی تحریکات نے زور باندھا۔ روس کا انقلاب برپا ہوا۔ نئے انقلابوں نے نئے افکار کی ہوا باندھی۔ سیاست سکہ رائج الوقت ٹھہری تو اسلام کو ایک سیاسی نظام کے طور پر دیکھنے کا رواج ہوا۔ اس کے بعد ہی شریعت کی جگہ اسلامی نظام کی اصطلاح نے لے لی۔ کہیں سے نظریہ بھی آ گیا اور زبانوں پر طاری ہو گیا۔ اسلام بطور سیاسی تحریک کے دیکھا گیا تو معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہ دور ابھی جاری ہے۔ اس دور میں سیرت نگاری کا نیا منہاج متعارف ہوا۔

سیرت نگاری کے جدید منہاج میں چند باتیں بہت پاپولر ہوئیں۔

1- جدید سیرت نگار آپ کو خیر البشر کے طور پر دیکھ رہا ہے۔ اسے معراج ناموں اور مولود ناموں سے دلچسپی نہیں۔ وہ شبلی کی سیرت النبیؐ کے ظہور قدسی والے باب کو میلاد ناموں کا تتمہ خیال کرتا ہے۔ رہا معراج نامے لکھنا تو یہ اس عہد کا چلن نہیں رہا۔

2- سیرت نگار دعوت دین کو سیاسی تحریکات کی اصطلاحوں میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور نئے مضامین باندھتا ہے۔

3- سیرت نگار جدید عہد کی زندگی کے مختلف گوشے دریافت کرتا ہے اور ان گوشوں میں آپ

Marfat.com

سے راہنمائی چاہتا ہے۔اب کوئی معلم ہے تو وہ آپ کا نظام تعلیم اور طریق تعلیم پیش کرتا ہے۔کوئی بطور تاجر، کوئی بطور منتظم، کوئی بطور حاکم، کوئی بطور مبلغ، کوئی بطور خاوند، کوئی بطور مقنن اور کوئی بطور سپہ سالار۔اس طرح اتباع کے مختلف حوالے سامنے آتے اور زندگی کی تاریک راہوں کے لیے سیرت کی روشنی دستیاب ہوتی ہے۔

سیرت کے جدید منہاج آج کے انسان کے لیے ضروری تھے۔انھی کی بدولت وہ جان پایا کہ زندگی چاہے کتنی جھل دار بن جائے۔جتنی جی چاہے جدید ہو جائے۔زندگی کے ہر گام اور ہر موڑ پر، ہر راہ میں اور ہر مقام پر، ہر منزل پر اور ہر حال میں ہماری راہنمائی بھی کرتی ہے، رہبری بھی۔ہم جو روزانہ بار ہا دعا مانگتے ہیں:

اھدنا الصراط المستقیم

تو ہم جانتے ہیں کہ صراط مستقیم انھی کا راستہ ہے جو انعام والے ہوئے۔ہمیشہ انعام والے رہے۔نہ یہود کی طرح مغضوب ہوئے، نہ نصاریٰ کی طرح ضالین۔یہ انعام پانے والے انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین ہیں۔پھر امام الانبیا کی سیرت بدرجہ اولیٰ اس دعا کا جواب ہے:

اھدانا الصراط المستقیم

صراط مستقیم قرآن کی آیات کا نام بھی ہے اور سیرت کی تفصیلات بھی۔اسی لیے سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے ارشاد فرمایا:

کان خلقہ القرآن۔

آپؐ کے اخلاق تو سراپا قران ہیں۔قرآن کے مفاہیم کی عملی تشکیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔قرآن بیان ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمل ہیں۔سرتا پا عمل بالقرآن۔ان دونوں کو الگ کرنا ممکن نہیں۔قران کا بیان ہوگا تو مثال ذات رسالت سے آئے گی۔ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ہوگا تو قرآن کا حوالہ مرکزی اور بنیادی ہوگا۔

قرآن سے صراط مستقیم کی تلاش یا سیرت سے صراط مستقیم کی تفہیم کی خواہش آرزو اور دعا ہر صالح انسان کا فرض ہے۔ہر سلیم روح جب بھی اپنے رب کو پکارتی ہے تو اس سے صراط مستقیم کی استدعا کرتی ہے، لیکن اس صراط مستقیم کا بیان ہر ایک کا نصیب کہاں۔یہ تو خوش نصیب کو نصیب ہو سکتا ہے۔دعا تو ہر کوئی مانگتا ہے، مگر دعا کا مستجاب ہو جانا یہ خوش بختی اور خوش نصیبی ہے۔ایسی ہی خوش نصیبی ہمارے محترم میجر محمد رفیع مراد کا مقدر بنی ہے۔

میجر محمد رفیع مراد افواج پاکستان کے نیک نیت اور نیک دل افسر ہیں۔ان کی نیکی اور نیک نیتی انھیں سیرت کے دروازے پر لے گئی۔جہاں انھیں نعمتوں کا خزانہ میسر آیا ہے۔وہ سیرت

Marfat.com

نگاروں کی صف میں کھڑے ہیں۔ وہ چاہیں تو اس مقام پر شکر کریں، چاہے فخر، بہرحال یہ خوش نصیبی کسی کسی کو مقدر ہو سکتی ہے۔

میجر محمد رفیع پیشے کے لحاظ سے فوجی ہیں۔ ہمارے عہد میں فوجی ہونا صرف پیشہ نہیں، علم بھی ہے۔ میجر صاحب نے اپنے پیشے کو علم بنا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے علم کے حوالے سے سیرت کا مطالعہ کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سیرت کے جدید منہاج یہ ہیں کہ جدید علوم کے حوالے سے اوراق سیرت کو پڑھا، سمجھا جائے۔ میجر محمد رفیع نے سیرت کا یہی منہاج اختیار کیا ہے۔ انھوں نے سرد جنگ کی سٹریٹجی کے حوالے سے یقیناً وسیع مطالعہ کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس سٹریٹجی کے حوالے سے سیرت کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے زیر نظر کتاب میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کی تصویر پیش کی ہے۔ مکی زندگی ان کے نزدیک سرد جنگ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس دور میں براہ راست قتال یا جنگ کی صورت پیش نہیں آئی۔ اس دور میں پروپیگنڈا ہی واحد ذریعۂ جنگ تھا۔ قریش مکہ نے آپؐ کے خلاف سرد جنگ کی سٹریٹجی کے وہ تمام حربے آزمائے جو ہمارے عہد کی بڑی طاقتوں نے آج متعارف کرائے۔ گویا بولہبی حربے سدا سے وہی رہے ہیں۔ میجر محمد رفیع مراد نے وسعت علمی کا مظاہرہ بھی کیا ہے اور وسعت نظری کا بھی۔ ان کی نظر میں کتاب سیرت کے اوراق کھلے پڑے ہیں اور وہ ان سے وہ واقعات منتخب کرتے اور ان کا تجزیہ پیش کرتے چلے جاتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ سرد جنگ کی سٹریٹجی کیسے آگے بڑھی اور کیسے قریشِ مکہ نے چراغ مصطفوی کو بجھانے کے لیے آندھی کا کردار ادا کیا، مگر ناکام رہے۔

چراغ مصطفیٰ سدا جلتا رہے گا۔ سیرت کے اوراق بتا رہے ہیں کہ کس کس طرح مکہ کی سرد جنگ کے زمانے میں قریش کے اصانید نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سٹریٹجی اپنائی اور کس طرح دین حق کو Defame کرنے کی سعی کی۔ آج بھی ہمارے عہد کے بڑے لوگ اور بڑے ممالک نے اسلام کے خلاف سرد جنگ شروع کر رکھی ہے۔ وہ بھی سرد جنگ کے تمام حربے آزما رہے ہیں۔ ایک زمانے میں مغربی یورپ کے ممالک میں Toilets میں کمیونسٹ انسان کے کارٹون نظر آتے تھے۔ سوویت یونین ٹوٹا تو ان Toilets میں مسلمان کے کارٹون نظر آنے لگے۔ یہ لوگ سمجھ بیٹھے ہیں کہ شرار بولہبی چراغ مصطفوی کو شکست دے سکے گا۔ Defame کرنے کے تمام حربے آزمائے جا رہے ہیں۔ اسی صورتِ حال میں ہمیں سیرت سے جامع راہنمائی مل سکتی ہے۔ میجر محمد رفیع مراد کی کتاب کا یہی حاصل ہے کہ اس دور میں جب اسلام کے خلاف سرد جنگ پھر سے شروع ہے، ہمیں سیرۃ طیبہ سے راہِ عمل کی ہدایت میسر آ سکتی ہے۔ یہی راہ

عمل دیکھنا اور دکھانا اس کتاب کا مقصد ہے۔ یہ مقصد حاصل کر کے ہم اسلام کی جنگ لڑ سکتے ہیں۔ وہ سرد جنگ جس میں کفر نام کا تمام شرار بولہبی مخالفت کے تمام بولہبی حربے آزما رہا ہے۔ ایسے میں اقبال کا یہ اشعار امر واقع نظر آتے ہیں:

تہذیب کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
ابلیس نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

میجر محمد رفیع مراد نے سیرۃِ طیبہ کے لیے ایک نیا موضوع منتخب کیا ہے۔ یہ نیا موضوع ہمارے عہد کی ضرورت ہے۔ ہم اس موضوع سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ میجر صاحب نے اس کتاب میں آج کی سیاسی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ بعض جگہ ان اصطلاحات کے استعمال پر اعتراض بھی وارد کیا جا سکتا ہے، مگر شاید یہ اس موضوع کی ضرورت تھی۔ ویسے بھی ایک مدت سے تحریک اسلامی کی اصطلاح متعارف و مستعمل ہے۔ اس لیے اس سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال جدید اصطلاحات موضوع کی ضرورت ہیں اور اس کتاب میں استعمال ہوئی ہیں۔

میجر محمد رفیع مراد اس کتاب میں جہاں فکر و نظر کی گہرائیوں میں اترے ہیں، وہیں جذبہ ہائے دل بھی کاغذ پر سجا دیئے ہیں۔ وہ قدم قدم پر عقیدت کے پھول بکھیرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کا جذبۂ دل اور سوزِ دروں اُن کے لفظوں میں نور بن کر جگمگا رہا ہے۔ اسی بات نے کتاب کو قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے، بلکہ بعض جگہ ایسے ایسے فقرے بھی آ گئے ہیں جنھیں Qoutable فقرے کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ کتاب سیرۃ پر ایسی کتاب ہے جو اختصار میں جامعیت لیے ہوئے ہے اور جامعیت میں جذبۂ دل لیے ہوئے۔ جذبۂ دل عبودیت بن گیا ہے اور یہی ایک مسلمان کی زندگی کا حاصل ہے۔

میجر محمد رفیع مراد صاحب نے راقم سے فرمائش کی کہ میں اس پر چند سطریں قلمبند کر دوں۔ میں نے اس تجویز کا حریصانہ خیر مقدم کیا ہے تا کہ سیرۃ سے میری وابستگی اور دلبستگی قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ میجر صاحب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور میری یہ سطور قبول فرمائے۔

وما توفیقی الا باللہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ٥

والسلام
امجد علی شاکر
پرنسپل اسلامیہ ڈگری کالج، قصور

Marfat.com

پیش لفظ

قرآن وسیرتؐ علوم وعوامل کے ابتدائی ماخذات ہیں۔اس کائنات بسیط پر قرآن مجید قدیم و جدید حرکی وجمالیاتی حیاتیاتی دستاویز ہے۔سیرتؐ کا ایک ایک حرف قرآن کا عملی عکس ونمونہ ہے۔

قرآن ساکت اس لیے کہ لفظی ومعنوی لحاظ سے جس حالت میں نازل ہوا قیامت تک اسی حالت میں پڑھا اور لکھا جائے گا۔اس کے کسی ایک حرف میں تغیر وتبدل ممکن نہیں۔قدیم اس لیے کہ جس مقصدِ حیات کے تابع انسانی کائنات تخلیق ہوئی اور انسان کو اس کا وارث ومختار بنا کر بھیجا گیا۔وہ ابتدائی نظریہ وتاریخ انتہائی ارتقائی حالت میں قرآن کے اندر موجود ہے۔جدید اس لیے کہ انسانی فطرت یا انسانی کائنات کے اندر جتنی جدّتیں موجود ہیں،قرآن اور سیرتؐ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

جس کائناتِ ارضی کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی،اس کا جدید ارتقائی عُروج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا۔اس انسانی ارتقاء کی جزوی اور حیاتیاتی انتہا قیامت کو ہوگی۔قیامت کے بعد پھر ایک زندگی کی ابتداء ہے جس کی انتہا نہیں۔جس زندگی کی انتہا نہیں،اس کی اس فانی زندگی سے زیادہ فکر کی ضرورت ہے۔اس فکر کا محور صرف حیاتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

یہ کہنا درست ہے کہ نزولِ قرآن کا زمانہ بے شک بعثتِ نبویؐ سے عبارت ہے،لیکن اس کا بنیادی انسانی معبودی اور عبدی منشور آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کی قدامت لیے ہوئے ہے۔ قرآن جس معبودی وعبدی منشور کے لیے جس رسالت اور نبوت کا سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع کرتا ہے،اسے حضور خاتم النبیینؐ کا ورودِ مسعود ختم کر دیتا ہے۔سیرتِ رسولؐ اسی عبدی و معبودی نظام کو جو آدمؑ سے شروع ہوا قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی تک بڑھا دیتی ہے۔ قرآنی تحریک تنظیمی اور دستاویزی لحاظ سے ازلی بھی ہے اور ابدی بھی۔یوں آپ بھی آدمؑ سے شروع ہونے والے سلسلۂ انبیاء اکرام کی آخری کڑی ہیں۔آپؐ کے بعد قیامت تک سلسلہ نبوت ختم ہے۔آپؐ نے تمام انبیاء اکرام اور تمام آسمانی کتب کی تصدیق بالیقین اور بالایمان

٢٦٩٩٩

Marfat.com

فرمائی۔آپؐ کا کردار بقول قرآن تمام آئندہ نسلِ انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔آپ کی سیرت بھی قرآن کی طرح ازلی وابدی طوالت و جامعیت لیے ہوئے ہے، لہٰذا سیرت رسولؐ موجود و آئندہ نسلِ انسانی کے لیے قابلِ تقلید ہی نہیں، بلکہ ہر دو جہاں میں کامیابی و کامرانی کی کنجی بھی ہے، علاوہ ازیں سیرت رسولؐ اس لیے بھی قابلِ عمل اور حسین نمونہ ہے کہ آپؐ ''محمدؐ'' ہیں، ''احمدؐ'' ہیں، ''شفیع'' ہیں، ''انیس'' ہیں ''امام المتقین ہیں، محبوب خدا ہیں۔امام الانبیاء ہیں، اللہ کے ہاں تمام مخلوقات سے افضل واعلیٰ ہیں، انسانوں میں عظیم تر ہیں اور صاحب ''مقامِ محمود''[1] ہیں، سیرت طیبہ کے ازلی وابدی اور قابل اتباع ہونے کی یہ معمولی علامات ہیں، وگرنہ آپؐ کا مقام بیان سے باہر ہے۔

بلاشبہ قیامت تک زبان وقلم نت نئے آہنگ اور نئے نئے اسلوب و انداز سے آپؐ کی تعریف و مداح سرائی کرتے رہیں گے اور عنادلِ گلشنِ سیرتؐ وسنت اس چمن سے خوشہ چینی کرتے رہیں گے۔ حسین و دلپذیر و دلنواز فکر و نظر و وجود اس معمورۂ عالم کو سیرتؐ کی رحمتوں اور برکتوں سے معمور کرتے رہیں گے۔

ہر نظر ہر فکر ہر انداز ہر نُطق حسین
دلپذیر و دل گداز و دلنواز و دل نشین
ہر تبسم سرمایۂ لوح و قلم
ہر تکلم حاملِ منشائے رب العالمین

انسان فطرتاً عبد ہے۔اس کا فطری مقام عبودیت ہے یعنی اپنے رب یا اللہ کی عبادت اور پہچان اس کی عین فطرت ہے، لہٰذا سیرت رسولؐ کی تعلیم ومطالعہ اور سنتِ رسولؐ کی پیروی اللہ یا رب تک پہنچنے کا آسان اور بہترین ذریعہ ہے۔آج کا انسان شرورِ نفس و وجود سے تنگ ہے۔سیرت محمدؐ کی پیروی اس کے قلبی، نفسی اور ذہنی ہیجان کا بہترین علاج ہے۔سنتِ نبوی اس کے لیے اطمینانِ قلب ونفس اور قربِ الٰہی کو آسان بنا سکتی ہے۔وہ اپنی معرفت و پہچان سے بھی بہرہ ور ہو سکتا ہے۔محبِ اللہ اور محبِ رسولؐ بن کر اس دور کی تاریکیوں سے نکل سکتا ہے۔نہ صرف اپنے آپ کو روشن خیال بنا سکتا ہے، بلکہ پوری دنیا کو بقعۂ نور بنا سکتا ہے۔اسی لیے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

محمدؐ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

1- سورہ الاسراء ۷۹:۱۷۔عنقریب تمہارا رب تمہیں ''مقام محمود پر فائز کردے۔

Marfat.com

محمدؐ کی محبت خون کے رشتوں سے بالا ہے
یہ رشتہ دنیوی قانون کے رشتوں سے بالا ہے
(مولانا ظفر علی خان)

آپؐ کی سیرت فلسفۂ حیاتِ دو جہان ہے۔ ''مکہ کی سرد جنگ'' حکمرانوں، سیاسی لیڈروں، ثقافتی اداروں اور ملکی پالیسی سازوں کے لیے چراغِ راہ ہے۔ یہ گلشنِ سیرت کا ایک معطر خوشہ بھی ہے اور دیکھنے والوں کے لیے نئی خوشبو اور رنگ بھی۔

سیرت طیبہ محبت، عفو، درگزر، صبر، رحمت، اخوت، شکر، اطاعت، راضی بہ رضا اور عشق خداوندی کا ایسا وجدانی آئینہ ہے جس میں انسان بمقام عبد و معبود کو دیکھ سکتا ہے۔ کردارِ رسالت مآبؐ سے شناسائی اور اپنے رب سے تعارف و تعلق اللہ کی مخلوقات سے محبت اور اُنس کا ذریعہ بنتی ہے۔ دوسری طرف ابلیس کے خوبصورت علمی و منطقی فریب سے بچنے کا بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اطاعتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے حقائق پر یقین و نظر پیدا کرتی ہے پھر کثرت میں بھی وحدت نظر آنے لگتی ہے۔ بقول اقبالؒ:

جب تک نہ ہو زندگی کے حقائق پر نظر
تیرا زجاج نہ ہو سکے گا حریفِ سنگ
(اقبالؒ)

زندگی کے حقائق یہ ہیں کہ انفرادی فکر و عمل کی بجائے اجتماعی سوچ کو فروغ دیکر ہر فرد کو ملّت کے لیے مفید و کارآمد بنایا جائے یعنی:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارہ
(اقبالؒ)

زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ بندہ بندہ ہے اور اللہ اللہ۔ نبی کی سیرتؐ اس حقیقت کو عملی انداز سے متعین کرتی ہے کہ اس کا ادراک علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کی حد تک آراستہ ہو جائے۔

اہلِ ذوق و نظر کے لیے تو سیرت رسولؐ مقامِ کمال کی حامل ہے۔ ان کے لیے تو اخوت، محبت، حریت، مساوات، احسان، تقویٰ، عجز، درگزر، عدل اور انصاف کے دروازے کھول دیتی ہے اور طاغوت، جالوت، فرعون، ہامان، قارون، شدّاد جیسی استحصالی قوتیں فکر و عمل کی منحوس

Marfat.com

علامتیں بن جاتی ہیں۔تمام معاشرتی مفاسد وامراض کے لیے شافی وحاذق نسخہ قرار پاتی ہے اور اللہ کے خاص بندے شفائے عاجلہ وآجرا سے بہرہ ور ہو کر بتانِ رنگ وخون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جاتے ہیں۔ان کے روئیں روئیں سے ایسے نغمے پھوٹ نکلتے ہیں۔

نہ افغانیم و نے ترک و تاتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو برما حرام است
کہ ما پروردہ نوبہاریم
(اقبالؒ)

آج کے انسان سے اس کے زُعمہائے علم، دولت، منصب، غرور، بے جا تفاخر، نمود ونمائش، تصورِ اونچ نیچ یعنی طبقاتی ناہمواری اور عدمِ اخوت ومساوات نے اس کی مثبت صلاحیتیں چھین لی ہیں اور وہ تکبر، جھوٹ، رشوت، غیبت، شرک، ظلم، جبر، بے حیائی، ہوس، حرام خوری اور بے شمار نہ پوری ہونے والی نفسیاتی خواہشات کے قفس میں اسیر ہے۔شیطان نے اسے اپنی ترغیباتی تعلیم سے کامیابی کے زُعم میں مبتلا کر دیا ہے، حالانکہ یہ سب چیزیں عارضی اور موجب ناکامی ہیں۔دل و نگاہ کے لیے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔اسی لیے معاشرتی حوالے سے اس کی زندگی روز بروز تاریک اور بے ربط ہوتی جا رہی ہے یہی انسان کے سب سے بڑے مسائل حیات ہیں۔زندگی کا یہ مقصود نہیں جو آج کا انسان لیے بیٹھا ہے۔زندگی کی اقدار صاحبانِ فکر ونظر کے نزدیک بہت ہی اعلیٰ وارفع ہیں۔زندگی سود وزیاں کے اندیشوں سے پاک ہے:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
(اقبالؒ)

بہرکیف زندگی کا ایک اپنا فلسفہ ہے جو سمجھنے کی صلاحیت زندہ کیے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔اسے پانے کے لیے اپنے من میں ڈوبنا پڑتا ہے گرمیٔ نفس کو سرد خانے میں رکھنا پڑتا ہے۔قناعت اور صبر کے تپتے ریگزاروں سے گزرنا پڑتا ہے۔حقیقت ہے:

قناعت ہے جنھیں نانِ جویں پر بزمِ ہستی میں
وہی کرتے ہیں شمشیرِ خودی سے رزم آرائی
(اقبالؒ)

زندگی کے تمام مسائل کا حل اُسوۂ حسنہ میں موجود ہے۔ فلسفۂ حیات کی ایک خوبصورت حسین وجمیل روایت پیش خدمت ہے۔ اگر کسی کے دل میں اُتر جائے یا کسی کے لاشعور کو بیدار کر دے تو اللہ اللہ سبحان اللہ بڑی سعد اور سعادت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، روایت کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی سنتِ حسنہ کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

''معرفت میرا سرمایۂ زندگی ہے۔ عقل میری اصل[2] ہے۔ محبت میری بنیاد ہے۔ شوق میری سواری ہے۔ اللہ کا ذکر میرا انیس ہے۔ اعتماد میرا خزانہ ہے۔ غم میرا رفیق ہے۔ علم میرا ہتھیار ہے۔ صبر میرا لباس ہے۔ رضا میرا مالِ غنیمت ہے۔ عجز میرا فخر ہے۔ زہد میرا پیشہ ہے۔ یقین میری قوت ہے۔ صدق میرا حامی ہے۔ اطاعت میری کفایت کرنے والی ہے۔ جہاد میرا خلق ہے اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔''

قارئین!! یہ چند جملے دریا کو کوزے میں بند کر دینے کے مترادف ہیں۔ بظاہر عام سے الفاظ، لیکن لغوی معنوی اور اصطلاحی اعتبار سے اتنے فصیح و بلیغ کہ فلسفۂ حیات پر محیط ہیں۔ واہ واہ سبحان اللہ پہلا لفظ ہی کتنا خوبصورت اور جامع ہے: معرفت یعنی پہچان ہے۔ اس پہچان سے مراد انسان کو اپنے آپ سے، اپنے نفس میں موجود خیر وشر سے اور گوشت پوست کے اس چلتے پھرتے مجسمے میں موجود خفیہ و پراسرار صلاحیتوں کی پہچان سے ہے۔ اس معرفت سے مراد روح اور جسم کے حسین وجمیل امتزاج کی معرفت ہے۔ چونکہ انسان کا مقام اور حیثیت عبد ہے اور معبود کا حصول اس کی اصل ہے۔ اپنی صلاحیتوں کا احاطہ کئے بغیر عظیم و کبیر خدا تک پہنچنا ممکن نہیں، اس لیے نصابِ زندگی کی شروعات ہی معرفت سے فرمائی۔ صوفیہ کرامؒ اس مضمون کی گرہ ان الفاظ میں باندھتے ہیں۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

یعنی جس نے اپنے آپ کو پالیا اس نے اپنے رب کو پالیا۔

دوسری گرہ عقل یعنی تدبر وتفکر اور سوچ بچار ہے۔ عقل کے بغیر قرآن کا سمجھنا اور سیرتؐ پر عمل پیرا ہونا ممکن نہیں۔

تیسری گرہ محبت ہے اس سے مراد دوہری محبت ہے۔ ایک عشق الٰہی اور دوسری قیامت تک آنے والی نسل انسانی کی محبت یعنی مخلوقات کے لیے جذبۂ رحمت اور پھر شوق اعتماد، غم، اللہ کا ذکر،

Marfat.com

صبر، رضا، عجز، زہد، یقین، صدق، اِطاعت، جہاد اور نماز جیسی بھلائیوں کو سُنتِ حسنہ قرار دے کر زندگی کا پورا فلسفہِ فکر و عمل سترہ جملوں میں سمو دیا۔

(قارئین انشاء اللہ کسی اور نشست میں اس ''فلسفہِ حیات'' پر بحث ہوگی کیونکہ ایک ایک جملہ مضمون کا تقاضا کر رہا ہے جو اس جگہ پڑھنے والوں کے لیے بھاری ہوگا)

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی وسیع و فصیح موضوع ہے۔ حیات مبارکہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک لحہ فکر و عمل کی فصاحت و بلاغت لیے ہوئے ہے۔ یقیناً یہ اُنہیں عاشق صادق بزرگوں کا کام ہے جن کے فکر و عمل کا وجدان کچھ یوں ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

ہمیں اپنی کوتاہ علمی اور نقصِ عقل و بصیرت کا پورا پورا احساس ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مجھ جیسے کم فہم اور بے ڈھنگے آدمی کو حیات طیبہ کا یہ رخ یعنی ''مکہ کی سرد جنگ'' دکھا کر اپنی کمال رحمت سے اسے پیش کرنے کی توفیق بخشی، وگرنہ یہ کام ناقصوں کا نہیں کاملوں کا ہے اور ہم ہیں ناقص ہی ناقص۔

یہ سب تمہارا کرم ہے آقا
کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے

اس لیے فنِ تاریخ و سیرتؐ کے لحاظ سے غیر ارادی غلطی یا کوتاہی ممکن ہے۔ ہم اللہ سے معافی کے طلبگار ہیں اور نقص اور کوتاہی بتانے والا ہمیں بہت عزیز ہوگا۔ یوں تو ہم مسائل میں پڑے ہی نہیں۔ یہ علماء اکرام کا کام ہے۔ ہم نے فضائلِ سیرتؐ میں رہنے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی کسی کوتاہی بتانے پر شکر گزار ہوں گے۔

یوں تو الحمدللہ 1986ء سے آج تک ''مکہ کی سرد جنگ'' ''قرآن تاریخ اور انسان''...... ''قرآن اور سیرت'' کئی اور تاریخی اور ادبی موضوعات پر کام جاری تھا کہ غمِ روزگار اور کئی ایک معاشرتی ناہمواریوں پر کڑھتے کڑھتے دل اپنا توازن کھو بیٹھا۔ 1998ء سے 2001ء تک ہم نے ڈاکٹروں سے مل کر اسے باتنظیم رکھنے کی اپنی سی کوششیں کیں، لیکن 2001ء میں ملکی سرحدوں پر کشیدگی پیدا ہوئی۔ اسے ہم نے اپنی ایمانی، جذباتی خواہشات کے پورا کرنے کے لیے غنیمت سمجھا اور اگلی صفوں کے انتخاب کے لیے رضا کارانہ خدمات پیش کر دیں۔ بریگیڈئر اشرف سلیم اب لیفٹیننٹ جنرل اشرف سلیم نے میرے عارضہِ دل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ ان حالات میں جب دشمن پوری طاقت کے ساتھ سرحدوں پر براجمان تھا اور وطن عزیز کو (خاکم

Marfat.com

بدہن) پاش پاش کرنے کی منصوبہ بندی کیے بیٹھا تھا۔ ہمارے تصور میں پیچھے بیٹھنا قومی جرم کے مترادف تھا۔ ہم اپنے جوانوں کے ساتھ ہر روز دشمن سے نبرد آزمائی کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ ایک دن عصر اور ظہر کے درمیان بریگیڈیئر اشرف سلیم اپنے ڈی کیو میجر مصطفیٰ کے ہمراہ تشریف لائے سلام ودعا کے بعد کہنے لگے رفیع اپنی کمپنی کے ساتھ دو دن بعد سجرہ تا نگر پوزیشن لو۔ آپ کا کرنیل ساجد عمر خان دو دن بعد پہنچ جائے گا۔ یوں پورا سیکٹر آپ کی یونٹ کمانڈ میں آجائے گا۔ اچھا خدا حافظ ہمیں جلدی ہے۔ آئندہ ملاقات ''مبوکے'' میں ہوگی۔

دو دن بعد 10 فروری کو ہم کارگاہِ الفت میں قدم رکھ چکے تھے۔ یہ علاقہ دفاع سے خالی (Defencless) تھا۔ رات ہم نے پلان کیا کہ یہ دفاع اگر گورنمنٹ کے پاس وسائل نہ بھی ہوں تو ذاتی معاونت (Own Arrangment) سے تیار کریں گے۔ اللہ سے دعا مانگی۔ بریگیڈ اور ڈویژن سے اجازت طلب کی اور پھر کیا تھا نصرتِ الٰہی تو جیسے پہلے ہی دامن پھیلائے کھڑی تھی۔ ہمارے بھائیوں عزیزوں دوستوں نے ہماری توقعات سے زیادہ کچھ ہمیں پیش کر دیا اور ہم نے اپنی تنخواہوں کا کچھ حصہ اپنے اوپر حرام کر لیا۔

دن رات کی محنتِ شاقہ رنگ لائی۔ میرے جوانوں نے کمال نظم وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف دفاع پر مضبوط گرفت کی، بلکہ کبھی ایک لمحہ بھی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا احساس نہیں ہونے دیا۔ نتیجتاً چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں ہم نہ صرف اپنا دفاع، بلکہ پوری بٹالین کا دفاع تعمیر کر چکے تھے۔ تکمیل پر میرے جوانوں کو جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل شفاعت اللہ شاہ (اب لیفٹیننٹ جنرل) نے خصوصی نقد انعامات سے نوازا اور میری بٹالین کو کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ضرار عظیم نے ایک لاکھ روپے نقد انعام کیے جو کہ پاکستان آرمی کی تاریخ میں سب سے پہلا بڑا انعام تھا۔ یہ یونٹ کے افسروں، صوبیداروں، حوالداروں اور جوانوں کے لیے ایسا اعزاز تھا جسے پانے کی اکثر پلٹنیں خواہش کرتی ہیں۔

ایک سال تک دشمن کا زعم باطل ہو چکا تھا۔ اس نے واپسی اختیار کر لی تو ہمیں بھی طوعاً و کرہاً دل پر پتھر رکھ کر واپس آنا پڑا۔ عرض کرنے کا مطلب تھا یہ تو ہم جیسے عاصی وگناہ گار بندوں کے عزائم اور ارادوں پر اللہ رب العزت کی نصرت اور مدد کا عالم ہے۔ اس طرح کے غیبی امداد ہم زندگی میں کئی بار دیکھ چکے ہیں انبیاء اکرام کا صدق وسچائی تو بیان وتحریر سے باہر ہے۔

جب ہم نے ذاتی طور پر حصولِ شہادت کے لیے اپنے آپ کو عارضۂ دل کے باوجود وقف کیا۔ گرمی، سردی، نیند اور آرام کا خیال کیے بغیر ملکی دفاع میں اپنے آپ کو گھلا دیا۔ شہادت اور جنگ ہمارے بس سے باہر تھی۔ ہمارے بس میں مال، جان اور وقت تھا جسے ہم نے اللہ کی راہ میں

Marfat.com

لگانے سے دریغ نہیں کیا تو اللہ کی مدد ہمارے دامن گیر ہوگئی (اللہ قبول فرمائے)

بہر حال اکتوبر 2003ء تک ہمارا دل باوجود کوششوں کے اپنی ترتیب کھو بیٹھا۔ مجبوراً آرمی کارڈیالوجی (AFIC) پنڈی والوں کو نشتر زنی (By Pass) کے ذریعے دل کی تنظیم نو کرنا پڑی۔ اللہ ان سب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور انسانی خدمات پر مستحکم رکھے۔

بلاشبہ دینوی لحاظ سے زندگی کی بے ترتیبیوں اور ناہمواریوں سے ہی واسطہ رہا۔ معاشی و معاشرتی لحاظ سے ہمیشہ تنزل پذیر ہی رہے۔ حالات کے ستم وسزا ہی اٹھاتے رہے یعنی......

ستم کش تھے سزاوار بھی ٹھہرے۔

کی صورت نمایاں رہی، مگر اللہ اور رسول ﷺ کی محبت و شفقت کے علاوہ زندگی کی الجھنوں کے تانے بانے بننے میں بڑے برادران حاجی محمد اشرف اور حاجی محمد معراج کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید میں اس قابل ہی نہ ہوتا کہ بے رُخیِ زمانہ کا مقابلہ کرسکوں۔ اپنی خاموش معاونت پر وہ خصوصی دعاؤں اور شکریے کے حقدار ہیں۔ اللہ انھیں اور ان کی اولاد کو دنیا و آخرت کی بھلائیاں عطا فرمائے۔

علاوہ ازیں برادرم محمد سلیم صاحب (لائبریرین ماڈل ٹاؤن لائبریری لاہور) کی گاہے بگاہے علمی و ادبی مزاج پرسی بھی مجھے "مکہ کی سرد جنگ" مکمل کرنے پر متحرک کرتی رہی۔ اللہ ان کا بول بالا کرے۔

اس کاوش کو منظرِ عام پر لانے کے اصل محرک محمد اسلم کھوکھر صاحب اور رانا عبدالرحمٰن (بک ہوم) ہیں۔ اسلم کھوکھر صاحب تو کچھ یوں کمال انداز سے اُکساتے رہے کہ:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
(اقبالؒ)

اکثر مصنفین جب کاتبوں کے ہتھے چڑھتے ہیں تو پروف ریڈنگ سے تنگ آ کر لکھنے سے توبہ کر لیتے ہیں۔ باقی زندگی اس گناہ سے استغفار کرتے گزار دیتے ہیں، لیکن ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوا جبھی تو آپ یہ نسخہ آسانی سے پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں اللہ کی مہربانی سے۔

"جو بھی ملا غم گسار ہی ملا"

ہمارے کمپوزر جناب محمد انور صاحب نے بھی کمپوزنگ میں خوب صاف ستھرا ہاتھ استعمال کیا ہے۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔

دوست احباب کے علاوہ ہماری اکلوتی اور نیم جان بیگم صاحبہ جو بیگم کم بیوی زیادہ ہیں یعنی

Marfat.com

گھر بار سنبھالنے والی یقیناً شکریے کی حقدار ہیں۔ اگر وہ راتوں کے مطالعے پر قدغن لگا دیتی تو مجھے کافی مشکلات پیش آتیں۔ اللہ اسے دنیا و آخرت کی سعادتیں عطا فرمائے۔

''مکہ کی سرد جنگ'' سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نیا عنوان اور نیا پہلو ہے۔ سرِ دست اس کا پہلا اور دوسرا حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اگلے دو حصے جہاد کے زمرے میں آتے ہیں اس لیے وہ جہاد کے عنوان سے پیش کیے جائیں گے۔ آخری معروضات سے پہلے فکرِ اقبال سے ایک اقتباس عرض ہے جو معرفتِ ذات کے لیے ایک فکری جھونکا ہے۔

زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں
جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں
بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ
رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دین محکم یہی فتح باب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

سیرت رسولِ اُمی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور احکامات خداوندی کا ایک حسین اور خوبصورت مرقع ہے یقیناً اس کا مطالعہ سعادت مند لوگوں کا شیوہ ہے۔ حق اور باطل سچ اور جھوٹ کی پہچان کا آسان اور فطری طریقہ ہے۔ آدابِ زندگی اور آدابِ نشست و برخاست سیکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ سب کام چھوڑ کر ''مکہ کی سرد جنگ'' پڑھ کے چھوڑیں۔ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ فرصت کے لمحات میں ''مکہ کی سرد جنگ'' کا مطالعہ ہر طبقۂ فکر کے لیے مفید و کار آمد اور باعثِ سعادت ہوگا۔ چونکہ سیرتؐ کے کسی عنوان یا کسی بھی پہلو کا مطالعہ سعادت مند لوگوں کا شیوہ ہے۔ یہ حق و باطل، سچ اور جھوٹ اور معرفتِ ذات کا ذریعہ ہے۔ اس لیے عمومی مطالعہ نیکی اور علم میں اضافے کا سبب ہے اور خصوصی مطالعہ جسے ہم وجدانی مطالعہ کہتے ہیں، اللہ اور رسولؐ کی محبت و عشق کے وجدان سے منسلک کرتا ہے۔ جس سے زندگی کے اسرار و رموز اور بصارتیں ملتی ہیں اور انسان کا دل واقعی پکار اُٹھتا ہے کہ:

کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
کہ نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی
(اقبالؒ)

قارئین دینِ اسلام ہمارا ہے اور ہم اس کے۔ اللہ کا قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ محفوظ و مامون ہیں۔ اس لیے اللہ کی توحید اور رسول کی رسالت کا پرچار ہمارے ذمے ہے۔ یہ کام ہمارے کرنے کا ہے۔ اگر ہم نہیں کریں گے تو پکڑے جائیں گے۔

قرآن اور سیرت کا نصاب ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں اپنی معرفت یعنی اپنے اندر موجود صلاحیتوں کو پہچانتے ہوئے رسول اللہ کا یہ مشن اس انداز سے آگے بڑھانا ہے کہ اللہ اور رسولؐ خوش ہو جائیں۔ یقین کرو اس میں ہماری اپنی پہچان اور بھلائی ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
(اقبالؒ)

اگر ہم نے کوتاہی برتی تو وقت ہم سے ہاتھ کر جائے گا اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے یاد رکھیے۔ اگر ہم نے اس کام سے کوتاہی کی تو پھر اللہ تو اللہ ہے۔ اس نے اپنے دین کو زندہ رکھنا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ صنم خانوں سے حرم کے پاسبان اٹھانے پر قادر ہے۔ کسی اور قوم کو دنیا کی امامت کے لیے اٹھا سکتا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے نہیں اللہ تعالیٰ قرآن میں خود اس بات پر استدلال فرما رہا ہے۔

اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ

مفہوم:۔ ”ہم تمھاری جگہ کوئی دوسری قوم امامت کے لیے کھڑی کر دیں گے۔“

اپنی کوتاہ عملی، کم علمی، کوتاہ فکری، کوتاہ عقلی، بے یقینی اور کم نظری پر تاسف کے ساتھ......

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن ہزار بے ادبی است

اللہ اُمتِ مرحومہ میں ارتعاشِ حیات پیدا فرمائے۔ اس اُمت کو تاریکیوں سے نکال کر روشنیوں میں بسنے کا ہنر عطا کرے اور پوری کی پوری اُمتِ مغلوبہ و مغضوبہ کا حامی و ناصر ہو۔ ”امین“

خادمِ ملک و ملّت
محمد رفیع مراد
شیخ عماد کہنہ قصور

Marfat.com

حصہ اوّل

باب: 1

قدیم عرب

قدیم عرب پر ایک نظر

بات قرآن کی ہے جس کی تفصیل روایات میں [1] یوں بیان کی گئی ہے کہ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال توحید الٰہیہ کا پرچار کیا، مگر چند درجن اصحاب کے سوا کسی پر اثر نہ ہوا۔ قوم نے نوح علیہ السلام کی ناک میں دم کر دیا۔ جینا دو بھر کر دیا۔ آخر خالق حقیقی نے اس قوم پر تاریخ کا عبرت ناک طوفان مسلط کیا۔ یہ طوفان تاریخ میں ''طوفان نوح'' [2] کے نام سے مشہور ہوا۔

اس وقت دنیا کی کل آبادی [3] دریائے دجلہ وفرات کے درمیان آباد تھی۔ دنیا کے کسی بھی علاقہ میں چلے جائیں طوفان نوح علیہ السلام کی ایک ہی داستان بکھری پڑی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام کے بعد انسانی آبادی جیسے جیسے بڑھی دجلہ وفرات کے دوآبے سے نکل کر مختلف براعظموں میں پھیلتی گئی۔

نوح علیہ السلام کے ہاں پانچ سو [4] برس کی عمر میں تین بیٹے سام، حام اور یافث پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے 600 سال بعد طوفان نوح آیا۔ چالیس دن تک پانی زمین سے ابلتا اور آسمان سے برستا رہا۔ 150 دنوں بعد زمین پانی سے خالی ہوئی۔ ساڑھے سات ماہ کے بعد کشتی جبل جودی کے کوہ ارارات پر ٹھہری۔ ایک سال گیارہ دن کشتی میں گزرے۔ طوفان کے بعد نوحؑ 350 سال زندہ رہے۔ یہ واقعہ حضور ﷺ کی پیدائش سے 5375 سال پہلے کا ہے۔ بعض روایتوں [5] میں ہے کہ طوفان نوحؑ کے بعد آپ کے ہاں چوتھا بیٹا عجم پیدا ہوا جو عجم کا مورث اعلیٰ بنا۔

طوفان میں دنیا کی تمام آبادی ختم ہو گئی۔ بس وہی لوگ بچے جو نوح علیہ السلام کے بیڑے میں سوار تھے۔ بعد ازاں نوحؑ کے بیٹوں حام، سام اور یافث کے ہاں سینکڑوں اور اولادیں ہوئیں (نوح علیہ السلام کے چوتھے بیٹے کا نام عجم تھا۔ جو عجم کے رہنے [6] والوں کا مورث اعلیٰ ہے)

Marfat.com

قومِ نوحؑ کا علاقہ اور جبلِ جودی

یافث والد بزرگوار کے حکم پر شمالی مشرق کی طرف جا کر آباد ہوا۔ ترکستان کی تمام قومیں مثلاً ترک، مغل، ازبک، چینی، تاجک، غوری، ایرانی وروسی وغیرہ اسی کی اولاد میں سے ہیں نوحؑ علیہ السلام کا دوسرا بیٹا حام جنوب کی طرف جا کر آباد ہوا جس کی اولاد کے ناموں سے ہند۔ سندھ، حبش، افرنج، بوبہ، پورب۔ بنگ، نہروال، دکن وغیرہم ممالک کی بنیاد پڑی۔

Marfat.com

نوحؑ کا تیسرا بیٹا سام والد گرامی کی جگہ جانشین ہوا جس سے عربوں کی نسل چلی اسی کی اولاد سے ہزاروں نبی پیدا ہوئے۔

سام بن نوحؑ کی اولاد میں سے قحطان یمن کے علاقہ میں چلا گیا۔ جس کی نسل کو عرب کے تاریخ وادب میں بنو قحطان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قحطان کا بیٹا جرہم اور سام کا پوتا عملیق بن لوذ یثرب وحجاز میں جا بیٹھے۔ بعدازاں بنو طسم بن لوذ اور بنو جدیس یمامہ اور بحرین تک پھیل گئے۔

نوح علیہ السلام کی کچھ اولاد، جو بنو سام ہی تھے، اقوام عاد وثمود سے موسوم ہوئی، قوم عادؔ شحر، عمان اور حضر موت کے علاقوں تک پھیل گئی جس کی ہدایت کے لیے حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے۔

قوم ثمود شام، حجاز اور حجر تک پھیلتی گئی۔ زمانے کے تغیر نے ان سے انبیاء کا دیا ہوا پیغام توحید چھین کر گمراہی اور بت پرستی کے گڑھوں میں دھکیل دیا۔ صدہا سال اسی گمراہی میں گزر گئے تو قدرت خداوندی نے ان کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا۔

عادؔ[7] وثمود[8] دونوں قومیں نبیوں کی تعلیمات چھوڑ گئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے نام ونشان تک مٹا دیے۔ آج قرآن اور تاریخ میں عبرت کے لیے ان کے صرف نام موجود ہیں۔

اقوام عادؔ وثمودؔ جدیس، عمالیق کو فنا ہوئے صدیاں گزر گئیں تو لوگوں نے ان کو عرب بائدہ کہنا شروع کر دیا۔ ان سے بچے کھچے لوگ حضرت اسماعیل کی اولاد میں مدغم ہو گئے۔ حضرت اسماعیلؑ کی شادی قبیلہ جرہم میں ہوئی تھی۔ بنو جرہم پرانے حجازی تھے یہ لوگ عاد وثمود کی تباہی کے باعث بنو اسماعیل میں آئے تھے۔ اب ان کے بنو اسماعیلؑ سے ملنے پر لوگوں نے بنو اسماعیل کو عرب مستعربہ کہنا شروع کر دیا۔

بنو قحطان کی اولاد میں سے جو لوگ بچ گئے، انھوں نے اپنے قحطانی قبائل سے باہر میل ملاپ بڑھانا پسند نہ کیا تو لوگوں نے انھیں عرب عاربہ کہنا شروع کر دیا۔ عربوں کی یہ قدیم شہری (Citizenship) پہچان تھی۔

———(((اللہ اکبر)))———

زمانے نے اپنی ڈگر پر چلتے رہنا ہے سو وہ چلتا رہا۔ وقت کے مدوجزر آتے رہے وقت کے سمندر اپنی طغیانیاں دکھاتے رہے۔ قومیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ بشر اپنے اندر موجود خیر وشر کے نغمے آلاپتا رہا۔ یہ کبھی ابلیس اور کبھی نبی کی شکل میں دنیا کو اپنی تحریک سے متاثر کرتا رہا۔

قارئین! انسان کا اصل نام بشر ہے۔ جو "ب" "ش" "ر" تین الفاظ کا مجموعہ ہے۔ جس

کے لغوی معنی ”بشارت دینے والا“ کے ہیں۔ اس میں سے اگر صرف ”ب“ کو ہٹا دیا جائے تو پیچھے دو حروف کا مجموعہ ”شر“ رہ جاتا ہے۔ اگر حرف ”ب“ کو خیر کے ہم معنی تصور کیا جائے تو ایک حصہ خیر اور دو حصے ”شر“ رہ جاتا ہے۔ اگر انسان کی رغبت خیر کی طرف ہو تو معاشرہ امن و آشتی کا مظہر نظر آتا ہے اور اگر ابلیسیت کی ترغیبات انسان پر حاوی ہو جائیں تو پورے معاشرتی نظام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ افراد کی سفلی خواہشات کی وجہ سے معاشرے کا شر کی لپیٹ میں آ جانا گویا کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ یا کسی بہت بڑے عذاب کا سائرن ہوتا ہے۔

بہر حال انسانی خباثتیں قدرت کی قوت برداشت سے باہر ہو گئیں تو عرب عاربہ اور عرب مستعربہ کو قدرت نے زمینی صفحہ سے لپیٹ کر تاریخ کے سیاہ صفحات میں رکھ دیا۔ زمین پر بنو عدنان اور بنو قحطان کے چند لوگ رہ گئے۔ بنو عدنان اصل میں بنو اسماعیل ہیں۔ اسی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے چن لیا تھا۔ حضور ﷺ کی ولادت تک یہ نسل اتنی پھلی پھولی کہ پورے عرب میں اسی نسل کے مختلف قبائل آباد تھے۔ خاص کر مکہ میں کوئی ایک قبیلہ بھی ایسا نہ تھا جو بنو عدنان اور بنو اسماعیل سے باہر ہو۔

عہد عتیق سے عرب تجارت کی غرض سے مصر و شام آیا جایا کرتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے کنویں میں پھینک دیا تو یہ اسماعیلیوں (بنو عدنان یا بنو اسماعیل) کا ہی قافلہ تھا۔ جس نے یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکالا۔ یہ قافلہ گلعاد[9] سے مصر جا رہا تھا جن کے پاس ادویہ، بلسان اور مُرلدے ہوئے تھے۔ مصری یہ چیزیں لاشوں کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کے صدیوں بعد تک بھی بنو اسماعیل[10] مویشی، ادویہ، قیمتی پتھروں اور سونے کی تجارت کرتے ہوئے مصر و شام کی تجارتی شاہراہوں پر دیکھے جاتے رہے۔

عرب کے منفرد قبائلی نظام نے عربوں کو ہمیشہ خود دار اور آزادی پسند بنائے رکھا۔ آج کے افغانستان کی طرح عربوں پر کئی حملے ہوئے، لیکن انھوں نے کسی کے زیر اقتدار رہنے پر مرنے کو ترجیح دی۔ یہ قانون فطرت ہے کہ جو قوم مرنے کا عزم کر لیتی ہے، زندگی اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے اور موت اس کے سامنے بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

مصری فاتح شیشک نے عربوں پر کئی حملے کیے، ہر بار ناکام و نامراد لوٹا۔ 529 ق۔م میں قیروش فارسی نے شمالی عرب پر حملہ کر کے کچھ حصوں پر تسلط جما لیا، مگر تھوڑے عرصہ بعد اسے یہ علاقے چھوڑنا پڑے۔

مشہور مورخ ہیرودوتس[11] 424 قبل مسیح کے لگ بھگ ملک فارس کے نامور جرنیل دارا کے

Marfat.com

متعلق رقمطراز ہے: "اگرچہ اس نے فارس کو چارسو پھیلا دیا تھا مگر عرب اس کے عہد میں خراج سے بری تھے۔"

بخت نصر جیسے ماہر جرنیل نے عرب کے بہت سے علاقے فتح کیے، مگر عافیت اسی میں سمجھی کہ غنیمت کا مال لے کر واپس چلا جائے۔

301 قبل مسیح کو عظیم جرنیل سکندر اعظم کے جانشیں انطیغونس نے بھی عرب علاقوں پر قسمت آزمائی کی، مگر عرب قبائل کی متحدہ مدافعت کے سامنے اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

106 قبل مسیح کے لگ بھگ رومی فاتح پومپے (Pompay) نے عرب کے ایک حصہ پر دھاوا بول دیا۔ جب قبائل کی متحدہ قبائلی فورسز دفاع میں اتریں تو فتوحات کے جھنڈے گاڑنے والی رومی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ عرب قبائلی فورسز عرصہ دراز تک روم کے اندر جا کر لوٹ مار کرتی رہیں۔ یہ وہی فورسز تھیں جو رومیوں کے تعاقب میں نکلیں تھیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً 23 سال پہلے کا زمانہ تھا جب رومی جرنیل الیوس گالس نے بحیرہ قلزم تک فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ وہ چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر عرب کو بھی فتح کرے، مگر پہلی کوشش میں ناکام رہا۔ عرب طاقت[2] کا اندازہ ہوتے ہی اس نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔

اس کے بعد 120ء عیسوی کے قریب طراجان رومی نے آگے بڑھ کر عرب کے مشہور ملک حجر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے دنوں میں اسے قدرتی عذاب نے گھیر لیا۔ ایک مہیب آندھی اور طوفان ژالہ باری نے ان کے خیمے اکھاڑ دیے۔ بارش تھمی تو شہد کی مکھیوں کے غولوں نے اس کی افواج پر حملہ کر دیا۔ یوں وہ ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔ اس کے بعد بھی طراجان نے عرب پر کئی حملے کیے، ہمیشہ اس قسم کی قدرتی آفات سے پالا پڑا۔

200ء کے قریب روم کے ایک جرنیل سیوا روس نے حجر پر حملہ کیا اور محاصرہ کر لیا۔ بدقسمتی سے اس کی فوج میں کوئی جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ یہ تنازعہ انتہائی گھمبیر شکل اختیار کر گیا۔ مجبوراً اسے محاصرہ[12] اٹھا کر واپس جانا پڑا۔

پھر 360 کے قریب فارس کے بادشاہ شاپور ذوالاکتاف نے عرب پر چڑھائی کی۔ یہ پہلا حملہ آور تھا جو بحرین، حجر اور یمامہ فتح کرنے کے بعد مدینہ[13] کے دروازے کھٹکھٹانے لگا۔ اس نے دوران جنگ مفتوحہ علاقوں سے جتنے آدمی قیدی بنائے، سب کے کندھوں کو جوڑوں سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا۔ اسی وجہ سے عربوں نے اسے "ذوالاکتاف"[14] یعنی کندھوں کے جوڑ نکالنے والا

کہا۔ بعدازاں اسے تکریب کے قلعہ پر انتہائی فاش شکست ہوئی۔ زیادہ تر افواج قتل ہوئیں یا بھاگ گئیں تو جان بچانے کے لیے شاپور صحیح معنوں میں سر پر سینگ رکھ کر بھاگا۔ ایسا بھاگا کہ پوری زندگی عرب کی طرف منہ کر کے دیکھنے کی جرات نہیں کی۔

یمن میں قرون اولیٰ سے سبائی[15] حکومت قائم تھی۔ تاریخ میں یمن کا ایک حکمران حمیر بن سبا[16] بڑا معروف ہوا ہے۔ اسی کے نام سے حمیری سلسلہ شاہان یمن کی بنیاد پڑی۔ اس کی نسل میں سے مالک نام کا ایک بادشاہ ہوا ہے۔ اس کا دور حکومت دسویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ مالک عرب میں اپنی سفاکی اور درندگی کی وجہ سے پہچانا گیا۔ وہ باکرہ عورتوں کو اپنے محل میں بلا کر آبروریزی کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی چچازاد بہن بلقیس کو اسی مقصد کے لیے اپنے محل میں آنے کی دعوت دی۔ وہ انتہائی خوبصورت اور نیک سیرت تھی۔ اس نے انتہائی عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اسے جواب دیا کہ رات کو میرے محل میں آ جانا۔ گھر میں اس نے اپنے رشتہ داروں میں سے دو نوجوانوں کو مالک کے قتل کے لیے تیار کیا۔ جب مالک[17] بلقیس کی دعوت پر اس کے خلوت خانہ میں داخل ہوا تو مقرر کردہ نوجوانوں نے اسے قتل کر دیا۔ قتل کے بعد اہل یمن نے سکھ کا سانس لیا۔ اسی کارنامے کے سبب اہل یمن نے بلقیس کو عنان حکومت سونپ دی۔

قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ بلقیس دنیا کی پہلی عورت ہے جو سربراہ مملکت بنی اور یہی عورت ہے جس کا تخت حضرت سلیمان نے اٹھوا لیا تھا۔

تاریخ اب سبائی خاندان کو حمیری خاندان سے منسوب کرتی ہے۔ ملکہ بلقیس کے بعد کئی صدیوں تک حمیری حکمران تخت یمن پر متمکن رہے۔ اسی خاندان نے یمن والوں کو جدید کھیتی باڑی کا نظام دیا تھا۔ ڈیم بنا کر نہریں نکالیں انھوں نے یمن کے دارالحکومت مآرب کے قریب ایک بہت بڑا ڈیم بنایا تھا (جس کا قرآن میں ذکر سورۃ سبا میں کیا جاتا ہے) اس کا نام بھی بند مآرب[18] تھا۔ جب انھوں نے نہریں نکال کر پورے یمن کو سیراب کیا۔ آج بھی شاید اس قسم کا اعلیٰ کھیتی باڑی کا سسٹم دنیا میں ناپید ہے۔

جب اس قوم کے گناہوں اور نافرمانیوں کی فہرست طویل ہوگئی تو حق تعالیٰ نے اسی بند کے ٹوٹنے کا سبب پیدا فرما کر اس قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس سیلاب کے بعد اہل یمن معاش کی تلاش میں مختلف اطراف کو ہجرت کر گئے اس قوم سے بنولخم[19] بن عدی کی ایک جماعت نے دریائے فرات کے قریب خراسان میں ڈیرے ڈالے۔ انھوں نے شہر حیرہ کی بنیاد رکھی۔ جب اس خاندان کی حکومت بنی تو یہی شہر دارالحکومت قرار پایا۔ 634ء تک یہ لوگ کسریٰ ایران کی طرف سے عراق

Marfat.com

پر گورنر رہے۔اس کے بعد یہاں اسلام کا تسلط ہو گیا۔

بنولخم کی طرح بنوقحطان کی ایک جماعت نقل مکانی کر کے دمشق میں ایک چشمہ کے قریب جا بیٹھی۔اس چشمے کو غسان کہا جاتا تھا۔آخر یہ بھی شہر بن گیا۔اس خاندان نے پورے شام پر قبضہ جمالیا تو ان کے حکمران غسانیوں کے نام سے معروف ہوئے اور 200ء سے 336ء تک شام پر حکمرانی کرتے رہے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں شام پر لشکر کشی ہوئی تو اس خاندان کا آخری حکمران جبلہ بن ایہم بھاگ کر قیصر روم کے پاس چلا گیا۔اس طرح یہ علاقہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا۔

بنوقحطان کی ایک شاخ قبیلہ ازد کے دو بھائی اوس اور خزرج (یثرب) مدینہ چلے گئے۔ان کے ناموں سے اوس وخزرج قبائل کی بنیاد پڑی۔انھیں قبائل میں سے انصار مدینہ ہیں جن کی وجہ سے اسلام کی پہلی ریاست وجود میں آئی۔ان ہی لوگوں نے تحریک اسلامی کو اپنی جانیں، مال، گھر، کھیت، کاروبار دے کر دنیا میں پھیلنے کا موقع فراہم کیا۔

ان کے علاوہ سیل عرم[20] کے بعد کچھ قحطان اندرونِ عرب جا بسے جنھوں نے نجد کے علاقوں میں حکومتیں قائم کیں۔

کچھ لوگ یمن ہی میں رہ گئے تھے جو بدستور حکمران رہے۔ان حکمرانوں میں سے ایک کا نام شمر تھا۔اس نے عراق پر فوج کشی کی۔اسے فتح کرنے کے بعد چین کی طرف نکلا۔موجودہ روس کے علاقہ صغد میں پہنچا تو اس کے باشندے شہر سے نکل کر کسی قلعہ نما غار میں چھپ گئے۔شمر نے اطراف سے محاصرہ کر لیا۔جو لوگ آسانی سے ہاتھ لگے انھیں مروا دیا اور جن کو محنت کر کے پکڑا۔ ان کو غار اور قلعہ کھدوانے کے بعد قتل کر دیا۔شمر نے یہاں ایک شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام شمر قند رکھا۔عربوں نے اسے معرب کر کے سمرقند کہا۔

وہ وہاں سے اور آگے بڑھا، مگر اسے عذاب الٰہی نے گھیر لیا۔شمر اور اس کی فوج بھوک اور پیاس سے ہلاک ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد یمن میں تبان اسعد ابو کرب[21] حکمران بنا۔مشرقی علاقوں کی فتوحات سے واپسی پر مدینہ میں ٹھہرا۔وہاں اس نے اپنے بیٹے کو بطور گورنر چھوڑ دیا۔اس کے بیٹے کو بنی نجار میں سے کسی نے بن پوچھے کھجوریں توڑنے کی پاداش میں قتل کر دیا۔ابو کرب نے انتقاماً مدینہ پر حملہ کر دیا۔چاہتا تھا کہ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجادے۔ارادوں کو بھانپتے ہوئے بنی قریظہ کے دو یہودی عالموں نے سختی سے منع کر دیا۔اس نے وجہ دریافت کی تو انھوں نے جواب دیا کہ

عنقریب قریش[22] میں ایک نبی پیدا ہوگا جو مدینہ میں ہجرت کر کے آئے گا۔ اگر تو نے اس شہر کو تباہ کر دیا تو خدا کے غضب کا حق دار ٹھہرے گا۔ اسعد ابو کرب کے دل پر یہودی عالموں کی باتیں اثر انداز ہو گئیں۔ اس نے مذہب یہود اختیار کیا اور واپس روانہ ہوا۔ واپسی پر وہ چھ دن مکہ میں ٹھہرا۔ طواف کیا قربانیاں دیں۔ قبائلِ مکہ کی ضیافت کی۔ خانہ کعبہ کا دروازہ لگوایا۔ اس کو مقفل کیا اور چابیاں اہل مکہ کو دے دیں۔ خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا اور واپس چلا گیا۔

یاد رہے کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے خانہ کعبہ کو مقفل کیا اور غلاف دیا۔

تبان اسعد ابو کرب کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا حسان تخت یمن پر متمکن ہوا جسے اس کے چھوٹے بھائی عمر بن تبان نے قتل کر کے عنان حکومت خود سنبھال لی، مگر وہ بھی زندگی کو داغ مفارقت دے گیا تو ان کا ایک وزیر لخیعہ ذوشناتر کرسی اقتدار پر براجمان ہوا۔ یہ فطرتاً انتہائی کمینہ اور نیچ تھا۔ وہ شاہی خاندان کے لڑکوں سے لواطت[23] کیا کرتا تھا۔ تا کہ وہ شرمندگی کے مارے بادشاہ بننے کا نام نہ لیں۔ ویسے بھی یمنی قوم آج کے یورپین کی طرح نہ تھی۔ وہ تو اس عمل سے گزرنے والے فاعل اور مفعول دونوں سے نفرت کرتے تھے۔

زرعہ بن تبان اپنے بھائی حسان کے قتل کے وقت چھوٹا ہی تھا۔ وہ خوبصورتی اور حسن میں یکتا تھا۔ اس کے سر کے بال پیٹھ تک لمبے تھے۔ اسی وجہ سے اسے ذونواس یعنی لمبی زلفوں والا بھی کہا جاتا تھا۔ حسن وخوبصورتی کی وجہ سے لوگ اسے یوسف بھی کہا کرتے تھے۔

ایک دن ذوشناتر نے اسے بلا بھیجا۔[24] وہ چال سمجھ گیا۔ ایک تیز چھری یا خنجر اپنی ٹانگوں کے ساتھ باندھ کر لے گیا۔ جب خلوت خانہ میں ذوشناتر اس کے بغل گیر ہونے لگا تو اس نے چھری گھونپ کر اسے ہلاک کر دیا۔ غیرت مندی دیکھ کر اہل یمن نے ذونواس کو کرسی صدارت سونپ دی۔ ذونواس نے نجران پر فوج کشی کی۔ اہل نجران عیسائی تھے۔ انھیں یہودیت کی دعوت دی۔ وہ نہ مانے۔ فتح نجران کے بعد ایک خندق کھدوا کر آگ کا آلاؤ جلا دیا پھر جو عیسائی یہودیت سے انکار کرتا اسے دہکتے ہوئے الاؤ میں پھینک دیا جاتا۔ قرآن مجید نے ذونواس اور اس کے ساتھیوں کو اصحاب اخدود[25] کے نام سے موسوم کیا۔

565ء کو نجران کا ایک پادری ''دوس'' قیصر روم کے دربار میں حاضر ہوا۔ اسے نجران میں عیسائیوں پر ہونے والے مظالم کے متعلق بتایا۔ قیصر نے حبشہ کے والی نجاشی کو لکھا۔ نجاشی نے اپنے ایک جرنیل ارباط کو دوس کے ساتھ لشکر کشی کے لیے روانہ کر دیا۔ یہ لشکر کشی 528ء میں ہوئی۔ اس فوج میں نائب سپہ سالار (میجر جنرل) ابرہہ بھی تھا۔ ذونواس کو جنگ میں فاش شکست ہوئی۔

اذیت ناک موت کے ڈر سے وہ سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔

———(((اللہ اکبر)))———

یہاں سے یمن پر شاہ حبشہ کی حکمرانی شروع ہوئی۔ اس نے ارياط کو یمن کا گورنر مقرر کیا اور ابرہہ کو نائب، ابرہہ نے ارياط کو قتل کر کے عنان حکومت خود سنبھال لی۔ ارياط کا یمن پر دور حکومت 529ء سے 549ء تک ہے۔

ابرہہ نے 571 میں مکہ پر حملہ کیا جسے اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں سے فاش شکست دلوائی۔ ابرہہ کا پورا لشکر تباہ ہو گیا۔ وہ خود یمن کے دارالحکومت صنعا میں پہنچ کر کر بناک موت مر گیا۔ اس کی اس بدتمیزی کو قرآن نے تیسویں پارے کی سورۃ فیل میں محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یکسوم تخت نشین ہوا۔ کچھ عرصہ بعد اس کو بھی موت نے دبوچ لیا تو اس کا بھائی مسروق بن ابرہہ کرسی حکومت پر براجمان ہوا۔ وہ مر گیا تو اس کا بیٹا مبروق حکمران بنا۔ اہل یمن حبشی راج سے تنگ آ چکے تھے۔ یمن کے حمیری خاندان کا ایک نوجوان سیف بن ذی یزن قیصرِ روم کے دربار میں فریاد کناں ہوا۔ اپنے ملک کو حبشیوں کی بدامنی سے بچانے کے لیے اس نے قیصرِ روم سے مدد کی استدعا کی۔ قیصر نے کمال ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے حبشیوں کے خلاف مدد دینے سے نہ ہاں کی اور نہ ہی جواب دیا۔ مایوس ہو کر سیف بن ذی یزن سفر کر دربار کسریٰ ہوا۔ نوشیرواں کے دربار میں حاضر ہو کر اس نے عرض کی کہ بادشاہ سلامت یمن میں حبشیوں کے خلاف ہماری مدد کریں۔ اگر آپ ہماری مدد کریں گے تو ہم تمھارے باجگوار رہیں گے۔ نوشیرواں نے اپنے وزیر سے مشورہ کیا تو اس نے عرض کی بادشاہ سلامت ہمارے قید خانہ میں آٹھ سو آدمی واجب القتل ہیں۔ انھیں اس کے ساتھ بھیج دیا جائے۔ اگر مارے گئے تو ان کی سزا ان کو مل جائے گی۔ اگر فتحیاب ہوئے تو مفتوحہ علاقے آپ کے قبضہ میں آ جائیں گے جس سے سالانہ کروڑوں کی آمدنی ہوگی۔ بادشاہ نے تجویز پسند کی اور 800 قیدی ہرز کی قیادت میں سیف کے ساتھ یمن کی مہم پر بھیج دیے۔

انھوں نے 601ء میں یمن پر حملہ کیا۔ ہرز بڑا ماہر تیر انداز تھا۔ اس دور میں نشانہ بازی میں شاید ہی کوئی اس کا مقابلہ کرتا ہو۔ جب لوگوں نے اسے بتایا کہ فلاں خچر پر شاہ یمن مبروق بن یکسوم بیٹھا ہے۔ ہرز نے اس پر نشانہ باندھا اور سپاہیوں سے کہا کہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیں اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔ اس نے کمان کھینچ کر چلّے سے تیر چھوڑا تو سیدھا مبروق بن یکسوم بن ابرہہ کی پیشانی کو چیرتا ہوا گدی تک چلا گیا۔ مبروق بھی اپنے بڑوں کی طرح زندگی کو خیر باد کہہ گیا۔ اہل یمن پہلے ہی اس خاندان سے تنگ آ چکے تھے۔ اکثر و بیشتر سپاہی بھاگ نکلے۔

Marfat.com

معمولی معرکے کے بعد سیف بن ذی یزن نے حکومت سنبھال لی۔ یوں یمن پر حبشیوں نے 529ء سے 601ء تک بہتر (72) برس حکومت کی۔

یاد رہے کہ سیف بن ذی یزن حمیری خاندان میں سے ہے۔ حمیر بن سبا کا ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

سیف حبشیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو عنان حکومت ہزر کے ہاتھ آئی۔ اس کے بعد مرزبان اور پھر تینجان بن مرزبان حاکم یمن ہوا اس کے بعد تینجان کا بیٹا جانشین ہوا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد کسریٰ نے اسے معزول کر کے باذان کو گورنر مقرر کر دیا۔

ابرہہ کے مکہ پر حملہ کے چالیس دن بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ آپ کی عمر پانچ سال کی تھی جب کسریٰ ایران نوشیرواں نے وفات پائی۔ جب حضورؐ کو نبوت ملی تو باذان حاکم یمن تھا۔ جب حضورؐ نے کسریٰ ایران کو دعوت حق کے لیے خط لکھا تو اس نے باذان سے کہا کہ مکہ کے اس نبیؐ کو دعویٰ نبوت سے منع کرو۔ اگر نہیں مانتا تو (نعوذ باللہ) سر قلم کر کے میرے پاس بھیجو۔ باذان نے اپنے ایلچی حضورؐ کے پاس کسریٰ کے حکم کے ساتھ بھیجے تو حضورؐ نے فرمایا کسریٰ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو قتل ہو جائے گا۔ ایلچی جب یہ تحریر لے کر باذان کے پاس گئے تو اس نے یہ خط اس لیے اپنے پاس رکھ لیا کہ اگر بتائی ہوئی تاریخ پر کسریٰ قتل ہوا تو ثابت ہو جائے گا کہ نبیؐ سچا ہے۔ چنانچہ کسریٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر باذان اور اس کے ساتھی خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

---(((الحمد للہ)))---

Marfat.com

مذہب اور اخلاق پر ایک نظر

جب محمد ﷺ نے آنکھ کھولی تو دنیا کے طول و عرض میں جہالت اور گمراہی اپنی تمام فریب کاریوں کے ساتھ براجمان تھی۔ کہیں بتوں، کہیں انسانوں، کہیں آگ، کہیں درختوں اور کہیں ستاروں کی بھرپور انداز میں پوجا ہو رہی تھی۔ ادیان الٰہیہ کے ماننے والوں نے اپنے مذاہب کو ہوس پرستی کا گورکھ دھندا بنایا ہوا تھا۔ ہوس اقتدار کے لیے انسانوں کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔ بچوں کو دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا۔ انسانوں کو غلام بنا کر جانوروں کی طرح ہانکا جاتا۔ الغرض انسانیت خود اپنے ہاتھوں تڑپ رہی تھی۔ مصیبت زدہ انسان العطش! العطش! الحفیظ! الامان کی آوازیں لگا رہے تھے۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ زندگی خود اپنی نقاہت، لاچارگی پر نوحہ خواں تھی۔ انسانیت کا سب سے بڑا بداخلاق اور بدکردار معاشرے کا سب سے بڑا معزز اور سردار مانا جاتا تھا۔ وہ کون سی اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی ابتری تھی جو دنیا میں رائج نہ تھی۔

آیئے اس دور کی مذہبی و اخلاقی حالت کی سطحی سی تفصیلات کا جائزہ لیں۔

ہندومت:

ہندوستان میں ہندومت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ ہندوستان میں آریا نسل کی۔ آرین وسط ایشیا[26] (Middle East) کے رہنے والے تھے۔ یہ قوم وسط ایشیا سے اٹھ کر ہندوستان پر غالب آئی۔ یہ لوگ نوح علیہ اسلام کے بیٹے حام یا عجم کی اولاد میں سے تھے جو ہندوستان میں آئے۔ انھیں کے ناموں پر سندھ، ہند، ہیت (ٹھٹھہ) ملتان وغیرآباد ہوئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں کئی چھوٹی بڑی بادشاہیاں اور راجدھانیاں قائم ہوتی اور ٹوٹتی رہیں۔ متحدہ طاقت نہ ہونے کی وجہ سے آریا قوم پورے ہندوستان پر قابض ہوگئی۔ ان کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندومت نے جنم لیا۔ ہندوؤں کی مقدس کتابیں ویدانت گیتا، منو

Marfat.com

سمرتی، وید یعنی رگ وید، یجروید وغیرہ عہد قدیم کی یادگار ہیں۔

اس نسل کا دار الخلافہ ہستنا پور تھا۔ وقت نے ہستنا پور کے شاہی خاندان کو تقسیم کر دیا۔ یہ خاندان کورو[27] اور پانڈو[28] قبیلوں میں تقسیم ہو گیا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خاندان تقسیم در تقسیم ہوتا گیا۔ ان کے بعد ہندوستان کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ اکثر راجے مہاراجے خودمختار بن گئے۔ اس دور کے ہندوستانی حالات کا نقشہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں رگ وید، یجروید اور اتھروید میں بخوبی ملتا ہے۔

مرکزیت کے خاتمے نے ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیا۔ ہر طرف شہرت ناموری اور ہوس اقتدار نے ڈیرے جما لیے۔ اخلاق باختگی کے مقابلے شروع ہو گئے۔ پنڈتوں مہنتوں اور جوگیوں نے مذہب کو ہوس پرستی کا گورکھ دھندا بنا دیا۔ بت پرستی تو تھی ہی، اب بتوں کے چرنوں میں بچوں کو ہلاک کیا جانے لگا۔ اولاد کی قربانی کو اتنا قابل شرف بنا دیا گیا کہ لوگ بخوشی اپنے بیٹوں بیٹیوں کو قتل کر کے ان کے خون سے دیوتاؤں اور دیویوں کو غسل دیتے تھے۔

جوان لڑکیوں کو دیوداسیاں بنانے کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مندروں میں قید کر دیا جاتا۔ جہاں پنڈت ان کے ساتھ ہر قسم کی قرابتیں کرتے۔ راجوں مہاراجوں کو کوئی پریشانی یا بیماری لاحق ہوتی تو پنڈتوں کے منتخب کردہ جوان قتل کر کے مندروں پر چڑھاوا چڑھائے جاتے۔ مقتول کے خون سے دیوی دیوتاؤں کے چرنوں کو دھویا جاتا۔ مذہبی پیشوا جس وقت جس جگہ چاہتے کسی شریمتی جی سے خلط ملط ہو جاتے۔ ان کو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔

بھارت کی یہ حالت آج بھی وہی ہے۔ اخبارات میں ہر سال مندروں کی اس حالت پر خود بھارتی عوام کی چیخ پکار شائع ہوتی رہتی ہے۔ آج بھی ہر سال ہزاروں لڑکیاں نان ونفقہ کے خوف سے مندروں میں دیوداسیاں بنا دی جاتی ہیں۔ یہ پنڈتوں تاجروں اور سیاستدانوں کی عیاشی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

الغرض پنڈتوں اور راجوں مہاراجوں نے مل کر مذہب کے نام پر وحشت و بربریت پھیلائی ہوئی تھی۔ کہیں مذہب کے نام پر اور کہیں راجدھانی کے تقدس کے نام پر انسانیت سوزی ہو رہی تھی۔ اگر کسی عورت کا خاوند مر جاتا تو اس عورت کو خاوند کے ساتھ ستی یعنی زندہ جلا دیا جاتا۔ اس بیوہ عورت کا معاشرہ میں زندہ پھرنا منحوس سمجھا جاتا تھا۔ اس رسم کو مذہب نے ستی[29] کا نام دے رکھا تھا۔ یہ مذہب کے نام پر معاشرتی قتل عام نہیں تو اور کیا تھا۔ الغرض کوئی ایسا عیب نہ تھا جو اس معاشرے میں رائج نہ تھا۔

Marfat.com

یہودیت:

یہودی مذہب بھی مذاہب قدیمہ میں سے ہے۔اس قوم کو قرآن پاک میں بنواسرائیل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے"اسرا" کے معنی قیدی یا بندہ کے ہیں اور ایل کے معنی "اللہ" کے ہیں۔یوں اسرائیل کے معنی "اللہ کا بندہ" کے ہیں۔یہ نام حضرت یعقوبؑ کا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی ہدایت وراہنمائی کے لیے سینکڑوں نبی بھیجے،مگر یہ قوم بطور قوم کبھی ہدایت یاب نہیں ہوئی۔اس نے ہمیشہ انبیاء اکرم کی مخالفت کی۔نبیوں کو اذیتیں دیں۔نبیوں کے سامنے طرح طرح کے مطالبے رکھے۔ان کے پورا ہونے پر اگر کسی نبی کا ساتھ دیا بھی تو محض ذاتی اور نفسیاتی خواہشات کی برآوری کے لیے۔اس معمورہ عالم میں یہ واحد قوم ہے جس پر سب سے زیادہ نبی پیغام ہدایت لے کر مبعوث ہوئے،لیکن اس قوم نے ان نبیوں کو اذیتوں کے سوا کچھ نہ دیا۔اگر راہ ہدایت اختیار کی تو تھوڑے ہی عرصے بعد اسے چھوڑ دیا۔یوں اس قوم پر عذاب در عذاب آتے رہے اور یکے بعد دیگرے نبی مبعوث ہوتے رہے۔

یاد رہے کہ اس قوم پر دنیا کی اقوام سے زیادہ عذاب نازل ہوئے اور تمام اقوام عالم سے زیادہ ان میں نبی پیدا ہوئے۔اسی وجہ سے یہ قوم اس غلط فہمی کا شکار ہوگئی کہ یہودی اقوام عالم سے زیادہ بہتر قوم ہیں۔حالانکہ یہ قوم اگر بہتر قوم ہوتی تو اتنے عذاب آنے کی کیا وجہ تھی۔یا بار بار اتنے نبی بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔امت محمدیہ کی طرح ایک نبی کافی تھا۔اس کی ہی ہدایت وراہنمائی کافی تھی۔

ان کی طرف تورات اور زبور جیسی آسمانی کتابیں اتاری گئیں۔یہودیت کے پیروکاروں نے ان میں کانٹ چھانٹ کر کے ان کے حلیے بگاڑ دیئے۔تورات نے امن وآشتی کا درس دیا۔سود کو حرام گردانا،مگر اس قوم نے ہر اس حکم کی خلاف ورزی کی جس سے انھیں روکا گیا۔انھیں شرک سے روکا گیا تو انھوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہہ کر شرک کی انتہا کر دی۔

الغرض حضرت موسیٰ اور داؤد علیہ السلام کی تعلیمات چھوڑ دی گئیں۔عالموں نے نہ صرف مذہب کے بنیادی اصولوں میں رخنہ اندازی کی،بلکہ زبور اور تورات جیسی آسمانی کتابوں کو اصل سے مختلف کر دیا۔بعض یہودیوں نے فرشتوں کے فرضی بت بنا کر ان کی پوجا شروع کر دی۔اخلاقی لحاظ سے سب سے زیادہ کمینگی وکمتری اس قوم مین پائی جاتی تھی۔یہودی سب سے زیادہ متعصب،بزدل،منافق اور حاسد تھے۔عرب کے جن علاقوں میں یہودی قبائل اقلیت میں آباد

Marfat.com

تھے، وہاں کبھی امن نہیں ہوا۔

یاد رہے ان کی اب بھی وہی حالت ہے۔ اسرائیل اور فلسطین کے علاقوں کی حالت دیکھ لیجیے۔

یہ لگائی بجھائی کر کے مختلف قبائل کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے کیونکہ ان کی بقا اسی میں تھی۔ ان کا قبائلی اختلافات کے بغیر کاروبار نہیں چل سکتا تھا۔ لوگ جنگ وجدل سے دور رہتے تو قرض خوار کون ہوتا۔ سود در سود کا سلسلہ کیسے چلتا۔ بہر حال یہ خود غیر جانبدار رہ کر لوگوں کو قرض دیتے اور مجبور لوگوں پر شرح سود بھی بڑھاتے چلے جاتے۔

جس طرح آج کل آئی ایم۔ ایف اور ورلڈ بینک غریب ممالک کی مجبوریوں سے سے فائدہ اٹھاتا ہے، بالکل اسی طرح یہودی بھی قبائلِ عرب کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے۔ ہوسِ زر کے لیے یہ قوم بیٹیوں تک کو داؤ پر لگا دیتی تھی۔ دوسری قومیں اگر بیٹیوں کو بتوں کے چرنوں پر قربان کرتیں یا زندہ درگور کر دیتیں تو یہ قرض کی وصولیوں کے لیے بیٹیوں کو استعمال کرتے۔

یہودی قوم کی پوری تاریخ صدیوں پر محیط ہے مفصل حالات لکھنا موضوع کو خواہ مخواہ طول دینے کے مترادف ہوگا۔ اس لیے تفصیلات سے گریز کر رہا ہوں۔ مکمل تاریخ واحوال کسی اور وقت پر موقوف کرتے ہیں۔

عیسائیت:

عیسائیت روم، افریقہ، حبشہ، شام میں سرکاری طور پر اور عرب قبائل میں جزوی یا آزادانہ طور پر رائج تھی۔ خداوند تعالیٰ کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہی دین عیسیٰ رائج الوقت تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر چلنے والے ہی صرف دین حق پر تھے، مگر بدقسمتی سے عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات صدیوں پہلے اس قوم نے ترک دیں۔ نام کی حد تک یہ دین قائم تھا۔ عیسائیت کے نام پر ہوس پرستی کا گورکھ دھندا شروع تھا۔ انسانیت کے نام پر انسانیت شکنی ہو رہی تھی۔

تورات اور زبور کی طرح انجیل کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ انجیل کے نام پر جگہ لوقا۔ متی۔ مرقس اور یوحنا کی انجیلوں نے لے لی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر اٹھا لیا گیا، مگر یہ سمجھے کہ وہ مصلوب ہو گئے۔ صلیب کو انھوں نے مذہب کا سب سے بڑا رکن بنا لیا۔ انھوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو زوجۃ اللہ (نعوذ باللہ) یعنی اللہ کی بیوی بنا دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا

Marfat.com

بیٹا (نعوذ باللہ)۔

عیسائیت کے سب سے بڑے پروردہ قیصر روم کے حکم سے ہر روز سینکڑوں بے گناہ قتل کر دیئے جاتے۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ جنگ میں انتہائی وحشیانہ انداز میں قیدیوں کو قتل کرنا قابل فخر قومی فریضہ سمجھا جاتا۔ بدعہدی فرض عین تھی۔ زنا اور بدکاری پر کوئی معاشرتی یا قانونی قدغن نہ تھی۔ جنگ میں زخمیوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں کو سفاکانہ انداز سے قتل کرنا کمانڈر کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ بیوہ عورتوں کو ہمیشہ کے لیے گرجوں اور کلیساؤں میں قید کر دیا جاتا۔ ہر قسم کی اخلاقی ابتری معاشرے میں باعث عزت تھی۔

الغرض عیسائیت کو ذاتی گورکھ دھندے کے لیے کھلے بندوں استعمال کیا جا رہا تھا۔ پادریوں اور راہبوں نے مسئلہ کفارہ گھڑ کے ہر قسم کے گناہ کو جائز بنا لیا تھا۔ یعنی کفارہ ادا کر کے پادریوں کی جیب بھر دی جاتی تو بڑے سے بڑا گناہ آسانی سے معاف ہو جاتا۔

قارئین یورپ اور امریکہ میں مادر پدر آزادی اور مخلوط معاشرے نے اسی وجہ سے جنم لیا۔ مذہب میں موجود ایسے غلط تصورات کی وجہ سے ہی امریکہ اور یورپ میں ہم جنس پرستی نے جنم لیا اور آج ان کی یہ حالت ہے کہ وہاں مردوں کا مردوں کے ساتھ (استغفر اللہ) لواطت کرنا کوئی جرم نہیں رہا۔ زنا کرنا تو ہر مرد و عورت کے بنیادی حقوق میں شامل کر دیا گیا ہے۔

یاد رہے کہ لواطت ایک غیر فطری عمل اور انتہائی گھٹیا حرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ نا قابل معافی جرم ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر اسی عمل بد کی وجہ سے عذاب نازل ہوا۔ اب یورپین اور امریکن اپنے آپ کو دنیا کی مہذب ترین اقوام تصور کرتے ہیں۔ اسی لیے اللہ کی ذات بھی ان کو عمل لواطت کی سزا مہذب انداز سے دے رہی ہے۔ یعنی ان میں ایڈز جیسی موذی بیماری کو چھوڑ دیا گیا ہے جو وبا کی شکل میں تیزی سے پھیل رہی ہے۔

مجوسیت:

ایران مجوسیت کا مرکز تھا۔ کسریٰ کی طرف سے اسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ یہ لوگ آگ کی پوجا کرتے اور ان کے گھروں میں چوبیس گھنٹے آگ سلگتی رہتی جس کے سامنے وہ چوبیس گھنٹے سجدہ ریزی کرتے۔

انسان کی قدر و قیمت ان کے ہاں بھی بہت کم تھی۔ جنگ و جدل ان کا معمول تھا۔ کسریٰ ایران کے شاہی تختہ دار سے روزانہ سینکڑوں لاشیں نکلتیں بیت المقدس کی فتح کے وقت ایرانیوں

Marfat.com

نے ایک لاکھ کے قریب عیسائی قتل کیے۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنالینا تو رحم کرنے کے مترادف تھا۔ ان کے پیشوا کاہن کہلاتے تھے اور کاہن کا حکم عوام کے لیے کسریٰ کے برابر تھا، مگر شاہی خاندان اور کسریٰ اس کے حکم سے مبرا تھے۔

کسی بھی مذہبی کاہن اور حکمران کو عورتوں سے کھل کھیلنے کی پوری آزادی تھی۔ عورتوں کا انکار توہین مذہب سمجھا جاتا تھا۔ حکمران یا مذہبی کاہن کا انکار کرنے والی عورتوں کو زندہ آگ کے حوالہ کر دیا جاتا۔ ان کا تصور زیست ہندوؤں کے عقیدہ تناسخ سے تھوڑا سا مختلف تھا۔ ہندوؤں کے ہاں جنم جنم کا سودا چلتا ہے تو مجوسیوں کے ہاں اس زندگی کے بعد کچھ بھی نہ ہونے کا تصور پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ دنیا ہی سب کچھ ہے اس دنیوی زندگی کے بعد کچھ بھی نہ ہونے کا یقین ہے۔ حاکم وقت سب سے بڑا اوتار تھا۔ جس کو سجدہ کیا جاتا۔ اس کی مرضی سے انکار مذہب سے بغاوت کے مترادف تھا۔ وحشت اور بربریت میں یہ قوم یکتا تھی۔

بت پرستی:

دین ابراہیمی کے وارث حرم کے متولی بت پرستی[30] پر اتر آئے انھوں نے نہ صرف بت پرستی اختیار کی، بلکہ دنیا کے ہر جھوٹے سچے دین کو مکہ میں پوجا جانے لگا۔ حرم میں 360 بت گھڑ لیے گئے۔ ہر قسم کی خباثتیں اس قوم نے اپنا لیں۔

اخلاق باختگی میں مکہ والے سب سے آگے تھے۔ زنا کاری اور فحاشی قابل فخر اور باعث اعزاز تھی۔ یتیموں اور بیواؤں کا مال کھانا کوئی بری بات نہ تھی۔ مکہ میں حج کے لیے آنے والے زائرین کی بیٹیوں کو اٹھا کر سرعام بے عزت کیا جاتا۔ عورتیں کعبہ کا برہنہ طواف کرتیں۔ عکاظ۔ مجنہ اور عرب میں منعقد ہونے والے میلوں میں ننگا ناچتیں۔

اس وقت کا عربی ادب لغو اور فحش گوئی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ غلاموں اور لونڈیوں کی قیمت جانوروں سے بھی کم تھی۔ بکری اور اونٹ مہنگے اور انسان سستے تھے۔

ازدواجی زندگی کا تصور بھی مذہب کے لیے باعث شرم تھا۔ کسی عورت کا خاوند مر جاتا تو اس کے سوتیلے بیٹے اس کے ساتھ شادی کر لیتے۔ شراب نوشی، قمار بازی سود خوری، عصمت فروشی دل پسند پیشے تھے۔ ہندو اگر بتوں کے سامنے یا چرنوں میں اپنی اولادیں نظر کرتے تو مکہ کے بت پرست نموشی کے ڈر سے اپنی بچیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ہندو صرف بتوں کو ہی پوجتے تھے، جبکہ مشرکین مکہ بتوں کو خدا کے قرب کا ذریعہ گردانتے تھے۔ رسم حمس[31] ایجاد

Marfat.com

کر کے اہل مکہ نے تمام دنیا کو حقیر اور اپنے آپ کو افضل و اعلیٰ سمجھنا شروع کر دیا۔ ہر طرف، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، کا اصول رائج تھا۔ بات بات پر جنگ و جدل معمول تھا۔ کمزور اور لاوارث افراد کا کوئی دادرس نہ تھا۔ غریب کی عزت و شرافت اور بلند کرداری معاشرے میں حقارت کا نشان بن گئی تھی۔ بد اخلاق اور بدکردار لوگوں کو ہزار خباثتوں اور بدکاریوں کے باوجود سرداری کی دستار پہنا دی جاتی تھی۔

ازدواجی زندگی کے اہم اصول نکاح کو مسخ کر دیا گیا تھا۔ حقیقی نکاح بہت کم نظر آتا تھا اس وقت عرب میں چار [32] قسم کے نکاح رائج تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1۔نکاح متعارف:

آج کی طرح فریقین کی مرضی سے حق مہر وصول کر کے ایجاب و قبول کیا جاتا۔ حضورؐ کا پہلا نکاح اسی طریقہ پر ہوا۔ گویا یہی ایک نکاح تھا جو صحیح اور جائز تھا۔ باقی نکاح فسق اور گناہ تھے۔

2۔ نکاح طلبِ ولد (استبضاع):

حیض سے فارغ ہونے کے فوراً بعد خاوند اپنی بیوی سے کہتا کہ تو فلاں شخص سے مجامعت کرلے اور پھر اس وقت تک شوہر بیوی کو ہاتھ نہ لگاتا، جب تک متعلقہ آدمی سے اس کی بیوی کو حمل ٹھہر نہ جاتا۔

3۔نکاح جمع یا اجتماعی نکاح:

یہ ایک طرح کی گینگ ریپ تھی۔ پروگرام طے کر کے دس یا دس سے کم مرد یکے بعد دیگرے ایک عورت سے خلط ملط ہوتے۔ جب وہ عورت حاملہ ہو جاتی تو تمام زناکاروں کو بلاتی اور اعلان کرتی کہ فلاں شخص کا بچہ میرے پیٹ میں ہے۔ پیدا ہونے کے بعد وہی شخص اس کا باپ قرار پاتا اور وراثت کا حقدار ٹھہرتا۔

نکاح بغایا:

زناکار یا طوائف عورتیں اپنے دروازوں پر سفید جھنڈے کھڑے رکھتیں۔ جو بھی چاہتا بلا روک ٹوک اس کے پاس جاتا اور بدفعلی کرتا۔ جب وہ عورت حاملہ ہو جاتی تو بچے کی پیدائش تک

Marfat.com

انتظار کرتی۔ بچہ پیدا ہو جاتا تو اس عورت سے گزرنے والے تمام آدمی اس کے گھر اکٹھے ہو جاتے۔ ایک قیافہ یعنی نقش ونگار سے پہچان کرنے والے شخص کو بلایا جاتا۔ قیافہ شناس بچے کے نقش ونگار اور اعضا سے اندازہ لگاتا۔ جس شخص سے اس کی زیادہ مشابہت ہوتی، اس کا وارث بنا دیتا۔ یوں یہ بچہ ولدیت، حسب ونسب کے لحاظ سے اسی شخص سے منسوب کر دیا جاتا۔ یہ حالت تھی نبیوں کی نسل سے تعلق رکھنے والوں کی۔

اس کے علاوہ عرب میں موحد بھی پائے جاتے تھے۔ صرف اللہ کی توحید کے قائل تھے، مگر کوئی خاص تصور مذہب نہ رکھتے تھے۔ مکہ کے لوگ انھیں صابی یعنی باپ دادا کے دین سے پھرے ہوئے کہہ کر پکارتے تھے۔

تفصیلات بیان کرنے کی کتاب کا موضوع اجازت نہیں دیتا، مگر اتنے مختصر حالات نہ لکھنا بھی کنجوسی اور بخیلی کے مترادف تھا۔ اس لیے مذاہب کا سطحی سا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور کے پاکستانی نظام کا پروردہ نوجوان ان مختصر حالات کو بھی شاید ثقیل اور بھاری سمجھے کیونکہ اسے ڈش اور ویڈیو سے فرصت کہاں ملے گی۔

مذاہب کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ بعض ایسے ایسے اصول مذاہب میں شامل تھے۔ جنھیں لکھتے ہوئے قلم بھی شرم محسوس کرنے لگتا ہے ان وجوہات کی بنا سے مختصر کرنا پڑا۔ بہر حال اگلی فرصت میں کسی نئی تصنیف میں سیر حاصل تبصرہ کریں گے۔

—(((الحمد للہ)))—

عرب کی جغرافیائی اہمیت

آج جب ہم مغرب اور امریکہ کی تجارتی پالیسیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مشرق کے ساتھ تجارت کیے بغیر مغرب کا زندہ رہنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔ امریکہ اور مغرب کی مشترکہ لڑی جانے والی اقتصادی اور ثقافتی جنگ اس بات کی بہترین دلیل ہے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے انسانیت کے نام پر بنائی جانے والی پالیسیاں مغرب زدگی کا شکار ہیں۔ اس عالمی سرد جنگ میں غیر محسوس انداز سے اقوام متحدہ (UNO) مغرب اور امریکہ کی بغل بچہ کا کردار ادا کر رہی ہے۔ اس تنظیم کے اس کردار کو آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور سلامتی کونسل جیسے اداروں نے بالکل یکطرفہ بنا دیا ہے۔

عالمی سطح پر امریکہ اور مغرب کا اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی پیکج پوری دنیا پر مسلط کر دیا گیا ہے تیسری دنیا کے مشرقی اور مسلمان ممالک پیس کر رکھ دیے گئے ہیں۔ ان کے پاس سرمایہ داروں کے تلوے چاٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

خلیجی جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک نے تیسری دنیا کو جس احسن انداز سے گرفت میں لیا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ اب ایشیا خاص طور پر جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا (Midde East) کے پاس اقتصادی اور سیاسی غلامی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

عالمی سیاست کلی طور پر نیو ورلڈ آرڈر کی لپیٹ میں آ چکی ہے۔ مشرقِ وسطی کی کم فہم عرب ریاستیں نیو ورلڈ آرڈر کو متحرک کرنے میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔ اس لحاظ سے مشرق اور مغرب کے درمیان جو خلیج حائل تھی۔ اس کو مشرقِ وسطی (Middle East) کی عرب ریاستوں نے پاٹ دیا ہے۔ صدیوں سے مشرق کو جس پر اجارہ داری حاصل تھی۔ اب امریکہ، یورپ اور اقوام متحدہ کے مشترکہ کردار نے اسے ختم کر دیا ہے۔

یہ مشرق و مغرب کے درمیان بہت بڑی تجارتی شاہراہ ہے۔ قدرتی وسائل سے مالا مال خطہ ہے۔ عرب ریاستوں کی کم فہمی کی وجہ سے امریکہ اور یورپ نے اس پر اجارہ داری حاصل کر لی

ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کے تحت لڑی جانے والی خلیجی جنگ میں امریکہ اور اتحادیوں نے آپریشن ڈیزرٹ اسٹروم کے نام پر اقوامِ مشرق کو سیاسی اور معاشی غلامی کے ایسے چنگل میں پھانس لیا ہے جس کا خمیازہ اقوامِ مشرق کی آئندہ نسلوں کو صدیوں بھگتنا پڑے گا۔

———(((اللہ اکبر)))———

اسی طرح آج سے ہزاروں سال پہلے دنیا کی سیاسی بساط دنیا کے اسی نقشہ پر جمی تھی۔ اقوامِ مغرب کے پاس مشرق تک رسائی کے لیے تجارتی شاہراہ جزیرہ نمائے عرب ہی تھا۔ عربوں میں حبشہ، یمن، نجد، یثرب، حجاز، شام، عراق کے ساحل اور ایلا[33] کے علاقے خاص طور پر نمایاں تھے۔

اس عظیم تجارتی شاہراہ کی باگ ڈور عرب قبائل کے ہاتھ میں تھی۔ اس دور کی رومی سلطنتوں کے لیے مشرقِ بعید اور ہندوستان تک پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ بحرہ احمر اور جزیرۃ العرب تک کے تمام علاقے صاف کر لیے جائیں۔ چونکہ اُس دور میں جہاز عموماً بادبانوں کے ذریعے چلتے تھے۔ 45ء میں یونانی جہاز ران بحرۂ عرب میں چلنے والی مون سون ہواؤں کا رخ معلوم کر چکے تھے۔ اسی زمانہ میں ہندوستان کے مغربی ساحلوں سے لے کر عدن تک بحری جہازوں کی آمدورفت آسان ہو چکی تھی۔ عدن کی بندرگاہ سے قافلے بحیرہ احمر کے ساتھ ساتھ خشکی کا راستہ اختیار کر لیتے تھے۔ یہ راستہ ایلا تک چلا جاتا تھا۔ یہاں آج کل اسرائیلی بندرگاہ ایلات واقع ہے۔

ایلات سے آگے تین راستے دمشق، غزہ اور مصر وغیرہ کی جانب نکل جاتے تھے۔ اس سے آگے ترکی سے نکل کر یورپ میں داخلے کے لیے بَرّی راستے موجود تھے۔ یوں یہ شاہراہ مشرق و مغرب کے درمیان شاہ رگ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس شاہراہ کی قدیم اہمیت کو آج بھی ختم نہیں کیا جاسکا۔ آج بھی ترکی مشرق و مغرب کے درمیان (دروازی راستہ) گیٹ وے (Gate Way) کی حیثیت رکھتا ہے۔

عرب قدیم کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ اس تجارتی شاہراہ کے دونوں سروں پر مختلف وقتوں میں مختلف چھوٹی چھوٹی متمدن اور خوشحال ریاستیں وجود میں آتی رہیں۔

اس کے جنوب میں ہزاروں سال قبل مسیح خاندانِ سبا[34] کی حکومت قائم ہوئی۔ شمالی علاقوں پر نبطی حکومت کرتے رہے۔ موجودہ اردن کے دارالخلافہ بطرا میں قدیم کھنڈرات نبطی حکومت کی خوشحالی اور ترقی کا واضح ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ پہلی صدی عیسوی کی تاریخ اس نبطی حکومت کی

Marfat.com

سرحدیں دمشق تک لے جاتی ہے۔ بعدازاں 106ء میں نبطیوں کو رومیوں نے تاراج کر کے اس علاقہ کو سلطنت روم کا ایک صوبہ بنا دیا۔

کچھ عرصہ بعد وقت نے ایک اور کروٹ لی۔ یمن کے سبائی حکمرانوں نے اس خطہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ یمن کی تاریخ میں اسعد ابو کرب [35] نامی شخص کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ اس کے نام سے پورا عرب کانپتا تھا۔ یہ قوم کھیتی باڑی میں اپنے دور کی تمام اقوام پر غالب تھی۔ ان کا بنایا ہوا Dam بند مآرب ٹوٹ گیا تو پورا یمن سیلاب نے چاٹ لیا۔ اسے قرآن میں سیلِ عرم کے نام سے بیان کیا گیا۔

بند ٹوٹنے کے ساتھ ہی پورا ملک معاشی بدحالی کا شکار ہو گیا۔ مآرب یمن کا دارالحکومت تھا۔ مآرب جیسا عظیم الشان شہر تقدیر نے صفحۂ ہستی سے چاٹ لیا۔ مجبوراً دارالحکومت صنعاء میں منتقل کرنا پڑا۔ سبائی یا حمیری خاندان پورے عرب میں بکھر گیا۔

———(((اللہ اکبر)))———

جنوبی یمن میں ایک اور تغیر ہوا۔ نجران کا علاقہ جس کی سرحدیں یمن سے ملحق تھیں، چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں حمیری خاندان کے حکمران [36] ذونواس نے یہودیت کے زیر اثر نجران کے اکثر علاقوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ جو بھی عیسائی اس کے ہاتھ لگا مار دیا گیا۔ چند آدمی انجیل کے ساتھ لپٹے ہوئے قیصر روم کے دربار میں فریادی ہوئے۔ اس نے شاہ حبشہ کو اپنے ہم مذہبوں کی مدد کے لیے کہا۔ شاہِ حبشہ نجاشی تو عرصہ دراز سے جنوبی عرب پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے بحری جہاز پہلے ہی باب المندب پر قبضہ کر چکے تھے۔ حکم موصول ہوتے ہی 522ء کو اس نے یمن پر حملہ کر دیا۔ سبائی افواج نے بری طرح شکست کھائی۔ ذونواس کو علم تھا کہ حبشی عیسائیوں کے سب سے بڑے قاتل کو معاف نہیں کریں گے۔ سو اس نے اپنے گھوڑے کا رخ سمندر کی طرف موڑ دیا۔ گھوڑا گہرائی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سمندر نے اپنی گہرائیوں میں اُسے ایسا چھپایا کہ تاریخ میں اس کا ہلکا سا تعارف باقی رہ گیا۔ ذونواس کے ساتھ حمیری [37] خاندان کی بساط 72 سال کے لیے لپیٹ دی گئی۔

یوں ملک یمن حبشہ کی راجدھانی میں چلا گیا۔ اب کافی حد تک مشرقی تجارتی شاہراہ حبشہ کی وجہ سے رومیوں کے ہاتھ آ چکی تھی۔ اس سے آگے کا علاقہ عرب قبائل کے ہاتھ تھا جو کسی قسم کی سیاسی یا فوجی حکومت نہ رکھتے تھے۔ شاہِ حبشہ نے یہاں ارياط کو گورنر مقرر کیا اور ابرہہ کو نائب السلطنت۔ یہ تبدیلی عربوں کے لیے خوش آئند ہونی چاہیے تھی کیونکہ پورا عرب حمیری حکمرانوں کی

ریشہ دوانیوں سے توبہ کرتا تھا اُدھر قدرتِ الٰہی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

گورنر اریاط کو ابرہہ [38] اشرم نے قتل کر کے حکومت خود سنبھال لی۔ اس نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل و خوار کیا۔ پرندوں کے ہاتھوں اس کی فوج ماری گئی۔ یہ خود انتہائی زخمی حالت میں گھر پہنچ کر مر گیا۔ چند سال بعد اس کے پوتے صبروق سے حکومت سیف بن ذی یزن نے چھینی۔ اس کے بعد ہزر اور ہرز کے بعد باذان یمن کے تخت پر متمکن ہوا۔

(((اللہ اکبر)))

عرب کے شمالی قبائل ایران و روم کی جنگوں میں بھرپور کردار ادا کرتے رہے۔ نوشیرواں کسریٰ ایران اور قیصر روم کے درمیان جنگ بندی ہو چکی تھی۔ اس جنگ بندی کو رومی حلیف بنو غسان نے ایرانی حلیف بنولخم پر حملہ کر کے توڑ دیا۔ اس سے ایک بار پھر ہولناک جنگ شروع ہو گئی گو سرد جنگ تو دوران صلح بھی نہ رکی تھی۔ اب باقاعدہ جنگ شروع ہوئی تو شمالی عرب کے تمام قبائل اس میں بھرپور کردار ادا کر رہے تھے۔ آیئے تھوڑا سا جائزہ ہو جائے تاکہ پتا چل سکے کہ کیا وجہ تھی کہ دونوں سپر طاقتیں لق و دق صحرائے عرب کو کیوں اہمیت دیتی تھیں؟ عرب کی معمولی لڑائیوں کو اپنی انا کا مسئلہ کیوں بنا لیتی تھیں؟ یہ سب کچھ جاننے کے لیے محل وقوع کا جائزہ لینا پڑے گا۔

ایلات سے لیکر خلیج فارس تک۔ خلیج فارس سے لیکر حلب تک اور حلب سے ایلات تک کے نقشہ پر خط کھینچیں تو ایک تکونی شکل ابھرتی ہے۔ اس تکون کا شمالی حصہ وسیع و عریض میدان، جنوبی حصہ سطح مرتفع اور اس سطح مرتفع کی بلندیاں حجاز کے بلند تر پہاڑوں میں چلی جاتی ہیں۔ مشرق کی طرف رخ پھیرا جائے تو یہ بلندیاں خلیج فارس کے لق و دق صحراؤں میں جا گرتی ہیں۔

اس تکون کے تینوں حصوں پر بہت بڑے صحرا، نخلستان، آبادیاں اور چراگاہیں پائی جاتی ہیں۔ شمال میں صحرائے نفوذ اور جنوب میں ربع الخالی کے صحراؤں میں پہنچ کر آج بھی انسان موت کے تصور سے کانپ اٹھتا ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں، جبکہ ذرائع آمد و رفت نے کائنات کے فاصلوں کو سمیٹ لیا ہے، نجد اور نفوذ کے صحراؤں میں کھڑے ہو کر اس دور کے خانہ بدوش عرب قبائل کی سخت کوشی کا اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگتی۔

تاریخی شواہد کے مطابق قیصر و کسریٰ کی سرحدیں حلب سے اوپر دریائے فرات اور کاکشیا تک مقرر رہیں، مگر حلب سے نیچے اترنے کی انھیں کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہی تھی کہ عرب کے بے آب و گیاہ ریگزاروں میں قدم رکھتے ہی ان کے علوم و فنون، مہارتیں اور فکری تدبیریں بھوک، پیاس سے تڑپنا شروع کر دیتی تھیں۔ ان ریگزاروں کو پاٹنے کے لیے یقیناً

Marfat.com

ان کے پاس وسائل تو موجود تھے، مگر تربیت یافتہ صحرائی فورسز کا فقدان تھا۔

اس خطہ میں اُس دور میں صرف اونٹ ہی کام آ سکتا تھا۔ اونٹوں کا حاصل کرنا تو دونوں سپر طاقتوں کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ مشکل تو اونٹوں جیسی فطرت اور قوت برداشت رکھنے والے حُدی خوانوں کا پیدا کرنا تھا جو کم از کم ان کے بس سے باہر تھا۔ اسی لیے اس عظیم عالمی تجارتی شاہراہ پر ہمیشہ عربوں کا ہی اجارہ رہا۔ اسی تجارتی شاہراہ پر اجارہ داری کی وجہ سے دونوں طاقتیں اپنے اپنے حلیفوں پر جان چھڑکتی تھیں۔

ادھر یمن میں حمیری خاندان اور اس کے بعد حبشیوں کے انتشار کی وجہ سے اس علاقے میں بے عملی اور بے یقینی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حمیری خاندان اس شاہراہ پر صدیوں پوری طرح حاوی رہا۔ اب بڑی آسانی سے عالمی تجارت کا رخ مکہ کی طرف مڑ گیا۔ یمن کی خانہ جنگی نے مکہ سے گزرنے والے تجارتی راستوں کی اہمیت کو بڑھا دیا۔ اب پورا صوبہ حجاز جو بحیرۂ احمر کے ساحل اور محفوظ تجارتی راستوں کے قریب تھا، جغرافیائی اعتبار سے مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔

حاصل بحث یہ کہ اس وقت پورا عالمی نظام معاشرت ہچکولے کھا رہا تھا۔ مکہ کی گلیاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی ستائیس بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ مکہ کے بازار اور پہاڑ اور ریگزار محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بوس و کنار کر رہے تھے جو طرز کہن کو لپیٹ کر ایک نئے روحانی، معاشرتی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی نظام کی بنیاد رکھنے والے تھے۔ ان کا فکر و تدبر "حرا" کی تنہائیوں میں پنپ رہا تھا۔ دنیا کا عظیم ریگزاران کی تربیت و عمل اور فطرت میں صحرائی سکوت، بے باکی، اولوالعزمی اور وسیع القلبی جیسی صفات پیدا کر رہا تھا۔ مکہ کے بلند و بالا پہاڑ آپؐ کے وجودِ پاک میں جہد مسلسل اور برداشت کی حدوں کو تربیت دے رہے تھے۔ اللہ کے گھر کی قربت انھیں تخلیق حیات کے اعلیٰ وارفع مقاصد سے روشناس کروا رہی تھی۔ کائنات کا حسن و بانکپن وجودِ اطہر پہ ضوفشانی کر رہا تھا۔ زمین و آسمان کی بلندیاں اور گہرائیاں محمد ﷺ میں فراست اور دانائی کے رموز آشکار کر رہی تھیں سورج کی روشنی چاند کی چاندنی اور ستاروں کی رم جھم حضور ﷺ کے لطیف جذبات اور فصاحت و بلاغت کے انداز کو ہلارے دے رہی تھیں۔ شجر و حجر حضور ﷺ پر جھک جھک کر کائنات کے کسی نئے رخ کی نشاندہی کر رہے تھے۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

قبل اسلام، سیاسی پس منظر

بیسوی صدی عیسوی کے ان آخری سالوں میں جبکہ بین الاقوامی حالات اور سیاست نیو ورلڈ آرڈر اور گلوبلائزیشن (Globolisation) کا محور نظر آتی ہے۔ عرب دنیا پر تمام بڑی طاقتیں جدید اور ترقی یافتہ انداز میں حملہ آور ہیں۔ اگر اس دور کے حالات کی سوجھ بوجھ رکھنے والے کسی عام نوجوان کو یہ بتا دیا جائے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے عالمی سیاست کی بساط دنیا کے نقشے کی تقریباً انہیں لکیروں پر جمی تھی جن پر آج نظر آ رہی ہے۔ یقیناً اس نوجوان کے لیے یہ حیران کن خبر ہوگی، لیکن یہ کھلی حقیقت ہے کہ اسلام سے قبل بلادِ عرب کو بین الاقوامی سیاست و معیشت اور توازن اقتدار میں دنیا کی دو سپر طاقتوں کے مابین وہی مقام حاصل تھا جو آج خلیجی جنگ GULF WAR یا نائن الیون کے بعد نظر آ رہا ہے۔

خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد سے مشرقِ وسطیٰ کا پورا علاقہ جس بری طرح مشرقی و مغربی طاقتوں کی چھینا جھپٹی کا شکار ہوا، اس خطہ کی بالکل یہی حالت قبل از اسلام بھی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی کے عرب باشندے آج کے عربوں کی طرح چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر اپنے وجود میں کیل ٹھونک رہے تھے۔ ان کی سیاسی بساط کے مہرے مشرق و مغرب کی سپر طاقتوں کے ایوانوں میں چلے جا رہے تھے۔ آج کی معاشی لحاظ سے مضبوط، مگر بے مایہ عرب ریاستوں کی طرح ان دنوں بھی عرب ریاستیں دنیا کی دو سپر طاقتوں کی باہم جنگوں میں غیر جانبدار ہی تھیں۔

ان دو بڑی طاقتوں کی دشمنی حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے سے چلی آ رہی تھی۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پچاس سال قبل فارس[39] اور روم کے درمیان جنگِ حاران ہوئی جس میں فارسیوں نے 60 ہزار حملہ آور رومیوں کو حاران کے مقام پر ایسی ذلت آمیز شکست دی کہ بیشتر رومی لشکر ملیامیٹ ہو گیا۔ زیادہ تر سپاہ لقمہ اجل ہوئیں اور جو بچے، قیدی بنا لیے گئے۔

33 برس بعد اغسطیس[40] قیصر روم نے یہ قیدی بڑی مشکلوں سے واپس لیے۔ حاران کی شکست کا بدلہ تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد 115ء میں تراجن نے لیا۔ اس نے پورے عراق کو تاراج کر

Marfat.com

دیا۔ یہاں تک کہ وہ خلیج فارس کے ساحل تک جا نکلا۔ اب اس کی عمر اور صحت اس بات کی متقاضی تھی کہ واپس آ جائے واپس مڑتے ہوئے اس نے سرد آہ بھر کر کہا کاش میں سکندر کی طرح نوعمر ہوتا تو ہندوستان تک فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیتا۔

ایک بار پھر جون 363ء کی تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ عراق کے اسی بے آب و گیاہ ریگزار میں شہنشاہِ روم ''جولین'' کو تاریخ کی سب سے بڑی شکست ہوئی۔ جولین سے جنگ نے متاعِ حیات چھین لی۔ رومیوں کو اپنے بہترین پانچ صوبے فاتحین کے حوالے کرنے پڑے۔

یہ کشمکش تقریباً پانچ صدیوں پر محیط ہے۔ اس دور کی تاریخ دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے ان دونوں سلطنتوں کے تمام معاملات صرف اور صرف جنگ اور جنگی تیاریوں کے تابع تھے۔

———(((اللہ اکبر)))———

بیسوی صدی عیسوی کے آخری عشرے میں روس کے بکھر جانے سے جس طرح توازنِ طاقت کا جھکاؤ امریکہ کی طرف ہوگیا ہے۔ تیسری دنیا کے لیے یہ بڑی پریشان کن تبدیلی ہے۔ بالکل اسی طرح 445ء میں رومی سلطنت دو ٹکڑے ہوگئی اور کم ہوتے ہوتے مملکت روم بازنطین (قسطنطنیہ) اور اس کے مشرقی علاقوں تک محدود ہوگئی پھر بھی فارس کی روایتی حریف یہی کمزور رومی حکومت ٹھہری۔ روم کے مغربی علاقوں پر قابض وحشی قبائل ایران کے حلیف بن گئے۔

پچاس سال بعد نوشیرواں کے زمانہ میں حریفانہ روایات نے ہولناک جنگ کی صورت اختیار کرلی۔ پانچ دن کی شدید خونریزی کے بعد صلح ہوگئی۔ اس صلح کا ایران و روم کو تو یقیناً فائدہ تھا، مگر دنیا کی تیسری قدرے کمزور اور منقسم طاقت عرب کو کوئی فائدہ نہ تھا۔ ان کی خوشحالی بڑی طاقتوں کی جنگ میں پنہاں تھی۔

روم کے حلیف خالد بن غسان نے ایرانی حلیف اور حیرہ کے حاکم منذر پر حملہ کر دیا۔ نوشیرواں نے آگے بڑھ کر اسے اس خلاف ورزی کی سزا دی۔ معاہدہ کی رو سے رومی جھوٹے تھے۔ اس لیے انھوں نے مفتوحہ علاقوں حلب اور حمص پر ایرانی قبضہ تسلیم کرلیا۔

یوں لڑائی تو رک گئی، مگر زیرِ زمین سازشیں بدستور جاری رہیں یعنی ایک دوسرے کے خلاف تجارتی، سفارتی اور سیاسی سطح پر پروپیگنڈا وغیرہ۔ ادھر فارس پر خدا کا عتاب ہوا۔ 579ء میں نوشیرواں اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کا بیٹا ہرمز تخت نشین ہوا۔

یاد رہے نوشیرواں کی وفات کے وقت حضورؐ کی عمر مبارک آٹھ سال ہو چکی تھی۔

———(((اللہ اکبر)))———

Marfat.com

590ء کو گیارہ سال بعد ہرمز کو پرویز نے بذریعہ انقلاب ہٹا دیا۔ پرویز بذات خود عیاش اور نااہل آدمی تھا۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی بعض روایات میں ذکر ہے کہ پرویز شیروز، شیرویہ یا شیریں نام کی کسی رومی لڑکی سے پیار کرتا تھا۔ اس کے متعلق بہت سی داستانیں مشہور ہوئیں۔ یہی روایتیں سینہ بہ سینہ ہندوستان آئیں تو اس نے شیریں فرہاد جیسے مافوق الفطرت قصے کی شکل اختیار کر لی۔ دور نکل گئے۔ فوج نے پرویز کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس نے روم کے دارالحکومت قسطنطنیہ جا کر سیاسی پناہ لی۔ اس دور کی روایات کے مطابق رومیوں نے نہ صرف پناہ دی، بلکہ اسے اقتدار بھی واپس دلوایا۔ ادھر بارہ سال بعد رومی بادشاہ ماریشس (MORSUS) کے خلاف بغاوت اٹھی فوکاس (FOCAS) نے قیصر روم کو مع اہل وعیال قتل کر کے عنان حکومت خود سنبھال لی۔ ماریشس کسریٰ ایران کا محسنِ اعظم تھا۔ اس نے اپنے محسن کا بدلہ لینے کے لیے روم پر چڑھائی کر دی۔

رومی افواج بغاوت کی وجہ سے ذہنی کشمکش کا شکار تھیں۔ اس لیے وہ پرویز کے سامنے اَڑ نہ سکیں۔ ایرانی لشکر تاخت و تاراج کرتے ہوئے ایک طرف انطاکیہ اور دوسری طرف ایشیائے کوچک تک پہنچ گئے۔ قسطنطنیہ کے عوام نے فوکاس (FOCAS) کو کمزور دیکھ کر افریقہ کے گورنر سے امداد طلب کر لی۔ اس نے اپنے بیٹے ہرقل کو فوج دیکر بھیج دیا۔ عوام نے فوکاس کو معزول کر دیا اور ہرقل کا خیر مقدم کیا۔

اس وقت کسریٰ ایران نے جو جنگ اپنے محسن ماریشس کے انتقام میں شروع کی تھی، فطری طور پر مجوسیت اور عیسائیت کی جنگ میں بدل چکی تھی۔

عیسائیوں کے کچھ فرقے برسرِ اقتدار کلیسا کے خلاف تھے۔ وہ کسریٰ کے ساتھ مل گئے۔ یہودی قوم نے بھی اپنی فطرت کے مطابق بہاؤ کے رخ چلتے ہوئے کسریٰ کا ساتھ دیا۔

تاریخ نے ایک بار پھر رومیوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ قومی سلامتی کے سامنے کھڑے رہنا ہرقل کے بس کی بات نہ تھی۔ آخر کار 613ء میں دمشق پر ایرانی افواج قابض ہو گئیں اور ایک سال بعد 614ء میں بیت المقدس جیسی مقدس جگہ بھی رومیوں کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اس شہر میں محاورۃً ہی نہیں، صحیح معنوں میں خون کے دریا بہہ نکلے۔ صرف بیت المقدس کی شہری آبادی کے نوے ہزار (90000) عیسائی قتل کیے گئے۔

اس شکست نے عیسائیوں کی کمر ہمت توڑ کے رکھ دی۔ ان کی مقدس ترین عبادت گاہ محترم ترین کلیسا کنیسۃ القیامہ برباد کر دیا گیا۔ وہ صلیب، جس پر عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق عیسیٰ

Marfat.com

علیہ السلام مصلوب ہوئے تھے، مدائن پہنچادی گئی۔

یاد رہے کہ قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ قرآنی عقیدہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر اٹھالیا گیا تھا۔ وہ آسمانوں پر بقیدِ حیات ہیں انھوں نے ابھی زمین پر آنا ہے اور امتِ محمدیہؐ میں 41 شامل ہو کر دین محمدیہ کی پیروی کرنی ہے۔

اب ایرانی سپاہ کے آگے بند باندھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ تھے اور صاف و بے روک میدان۔ ایک سال کے قلیل عرصہ میں ایرانی افواج فلسطین، جزیرہ نمائے عرب اور مصر کے دروازے کھٹکھٹانے لگیں۔

(((اللہ اکبر)))

ادھر دنیا کی دونوں سپر طاقتیں صدیوں برسرِ پیکار رہ کر اپنی طاقت، اپنی معیشت، بلکہ کافی حد تک اپنی معاشرت کا بھی حلیہ بگاڑ چکی تھیں۔ ان جنگوں کے نتیجہ میں معاشی بدحالی پھیل گئی عوام پر ٹیکسوں اور محصولات کا بوجھ بڑھتا گیا۔ عوام میں پورے معاشرتی نظام کے خلاف نفرت پیدا ہوتی گئی۔ انتظامی اداروں کی سوچ، فکر اور منصوبہ بندی کی صلاحیت صرف اور صرف جنگ کے تابع ہو کر رہ گئی۔ جس کی وجہ سے معاشرتی بدانتظامی، خانہ جنگی اور انتشار نے سر اٹھایا۔ ہر آدمی کسی نجات دہندہ کے لیے دست دعا بلند کیے تھا۔

انتظامی بدامنی کی وجہ سے ادارے فیل ہو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف بدامنی، لڑائی جھگڑے، اختلاف، قتل و غارت گری، ڈکیتی اور راہزنی جیسے مہیب معاشرتی جرائم پھوٹ نکلے۔

عین اس وقت جب دنیا اپنے ہی تراشیدہ مظالم سے تنگ آ چکی تھی۔ انسانیت جھوٹی نخوت اور حرص کے عقوبت خانوں میں پڑی کراہ رہی تھی۔ اپنے ہی ہم نفسوں اور ہم جنسوں کے مظالم سے گھبرا کر کسی آسان اور آرام دہ موت کی تلاش میں ہلکان تھی۔ پوری کی پوری انسانیت آسمانوں کی طرف منہ اٹھائے کسی انسانیت پرور کے لیے لب کشا تھی۔ اس وقت مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں انسانیت کے اس نجات دہندہ پر پتھر برسائے جا رہے تھے۔ ان کی راہوں میں کانٹے بچھائے جا رہے تھے۔ ان کے قتل کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔

وہ نجات دہندہ جو نبی اُمّی تھے۔ سید الرسل تھے۔ کسریٰ اور قیصر کو توحید الٰہیہ کا درس دینے کے لیے اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے خطوط 42 لکھتے ہیں۔ کسریٰ یمن کے حاکم باذان کو لکھتا ہے کہ اس مدعیِ نبوت کا سر قلم (نعوذ باللہ) کر کے خدمت میں حاضر کیا جائے۔ باذان کے ایلچی حضورؐ

Marfat.com

کے پاس جاتے ہیں۔ حضورؐ ایلچیوں کو فرماتے ہیں کہ کسریٰ فلاں مہینے فلاں تاریخ کو قتل ہو گیا اور ایک دن رومی ایرانیوں پر غالب آ جائیں گے اور مسلمان مکہ والوں پر فتح پائیں گے یہ باتیں بظاہر تو بڑی کمزور (نعوذ باللہ) تھیں۔ عقل ماننے کو تیار نہ تھی کہ رومی اب پھر کبھی اٹھ سکیں گے۔ اُس نبیؐ کے چند پیروکار اہل مکہ کی اتنی بڑی طاقت کو مار دیں گے، مگر نبی کی بات تھی۔ صدقِ دل سے یقین کیا جا سکتا تھا۔

باذان کے ایلچی واپس پہنچے تو اس نے خط پڑھا اور یہ دیکھنے کے لیے اپنے پاس رکھ لیا کہ اگر مقررہ تاریخ پر کسریٰ قتل ہو گیا تو نبی کا دعویٰ سچا۔ اگر نہ ہوا تو جھوٹا۔ چنانچہ مقررہ تاریخ پر کسریٰ قتل ہو ہو گیا تو باذان خود خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔

اور پھر لوگوں نے دیکھ لیا کہ رومی ایران اور مسلمان مکہ پر غالب آ چکے ہیں۔ کچھ یہ سب کچھ دیکھنے دکھانے پہلے ہی ہدایت یاب ہو گئے۔ کچھ دیکھنے دکھانے کے بعد ایمان لے آئے۔ اور کچھ بدقسمت سب کچھ دیکھ کر بھی شقی القلب ہی رہے۔

پس دوستو کامران ہیں وہ لوگ جنھوں نے اندھا یقین (Blind Bleave) کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی اور وہ بھی کامیاب ہوئے جنھوں نے کسی نہ کسی حالت میں حضورؐ کی تصدیق کر دی خواہ زندگی کے آخری سانس میں ہی سہی۔

نامراد ہوئے وہ لوگ جنھیں اسی زندگی میں حضورؐ ملے، مگر وہ بدقسمت ایمان نہ لا سکے۔ اللہ ہمیں یقین و ایمان اور دین پر استقامت نصیب فرمائے آمین۔

اور سچ ہے:
غلامی سے بتر ہے بے یقینی۔

((الحمد للہ))

ابرہہ کا مذہبی و اقتصادی پیکج (عام الفیل)

کسی بھی ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے اندرونی وسائل کے ساتھ ساتھ بیرونی سرمایہ کاری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بیرونی سرمایہ کاری (Foreign Investment) کے لیے ملک میں امن و امان، سرمائے کا تحفظ، محصولات اور ٹیکسوں کی شرح کا کم ہونا اور سیاسی و انتظامی استحکام بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ آزاد نظامِ بینکاری بھی بہت ممد و معاون ہوتا ہے۔ جس طرح سوئٹزر لینڈ کے بنکوں میں دنیا کے تمام سرمایہ دار اپنے سیاہ و سفید دھن کو زیادہ محفوظ تصور کرتے ہوئے اپنا سرمایہ بنکاک یا سوئزرلینڈ کے بنکوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ یوں کرنسی کا زرمبادلہ حاصل ہونے کی وجہ سے اِس کی معیشت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔

آج سے صدیوں پہلے زمینی نقشہ پر یہی اہمیت یثرب اور حجاز کو حاصل تھی۔ ان دنوں ریگزار عرب قدرتی وسائل کی دولت سے بے بہرہ تھا۔ معاشی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے بھی مکہ اور مدینہ ریگزار عرب کی طرح بے آب و گیاہ تھا۔ بیرونی سرمایہ داروں کے لیے بظاہر کوئی کشش نہ تھی۔

ایران اور روم کے اس خطہ کی طرف متوجہ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں ماسوائے حکومتی اخراجات کو بڑھانے کے انھیں کوئی فائدہ نظر نہ آتا تھا۔ اس میں صرف ایک ہی فائدہ نظر آتا تھا کہ مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی شاہراہ پر قابض ہو کر ملکی سرمائے کو زیادہ سے زیادہ متحرک کیا جائے۔

ابرہہ کے اس طرف متوجہ ہونے کی وجوہات پر صرفِ نظر کرنے سے پہلے ہم یہاں کی علاقائی تجارت و ثقافت کا جائزہ لیتے ہیں۔

قارئین! ہم تاریخ کے آئینے میں دیکھتے ہیں کہ اس خطہ میں کوئی کشش نہ ہونے کے باوجود دنیا کے بڑے بڑے تاجر پورا سال اس علاقے کا رخ کرتے رہتے تھے۔ اس بے آب و گیاہ ریگستان میں ہر سال درجنوں ثقافتی اور تجارتی میلے[43] منعقد ہوتے۔ یہ میلے ثقافتی مظاہروں کے

Marfat.com

علاوہ مال تجارت وصنعت کی نمائش کا ذریعہ بھی بنتے۔ ان میلوں میں ثقافتی طائفے ثقافتی مظاہرے کرتے اور تاجر، صنعتکار اپنی دلچسپی کے مال واسباب کی خرید وفروخت کرتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ دنیا کی بڑی منڈیوں میں شمار ہونے لگا۔ دنیا کے سرمایہ کاروں کی دلچسپی کا رخ مکہ کی طرف ہوتا گیا۔ چونکہ دنیا کی سپر طاقتیں صدیوں سے برسرپیکار رہ کر اپنے عوام کو عدم تحفظ کا شکار کر چکی تھیں۔ ان ملکوں میں عیسائیت اور مجوسیت کا گہرا تعصب پایا جاتا تھا۔ ایک دوسرے کے مخالف نظریات رکھنے والے سوداگر مذہبی تعصب کا شکار ہونے سے ڈرتے تھے جبکہ ان کے مقابلہ میں اہل مکہ کوئی سرکاری مذہب یا نظریہ نہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ دونوں ملکوں کے نزدیک غیر جانبدار تھے۔ ان کو دونوں ملکوں میں جانے کے لیے کسی مذہبی ونظریاتی تعصب کا شکار ہونے کا ڈر نہ تھا۔ بیرونی سرمایہ کار مکہ اور اس کے نواح کی منڈیوں کا رخ کرتے۔ وہاں عرب تاجروں سے مال لیتے اور ان کو ہی مال فروخت کرتے تھے۔ اس سے بھی مکہ کی منڈی کو استحکام ملتا رہا۔

سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شہر مکہ میں دنیا کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مذہبی مرکز یعنی حرم شریف تھا۔ جہاں ہر مذہب اور ہر نظریے کے لوگوں کو آنے کی کھلی اجازت تھی۔ کسی کو کسی قسم کی عبادت کرنے کی کوئی ممانعت نہ تھی۔ مکہ میں موجود دس[44] قبائل نے حرم میں اپنے اپنے بت رکھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ تین سو ساٹھ بت نواحِ عرب کے باقی قبائل کے تھے۔ عرب کا ہر قبیلہ اپنے مخصوص بت کے سامنے سجدہ ریز ہوتا۔ عیسائیوں نے حضرت مریمؑ کی تصویر حرم میں لٹکا لی۔ وہ اس کے سامنے عبادت کرتے۔ یہاں کسی کو کسی قسم کی کوئی ممانعت نہ تھی۔ بلا اختلافِ مذہب وملت کوئی بھی فرد کسی بھی طریقہ سے عبادت کر سکتا تھا۔ دوران قیام وہ مکہ والوں کا مہمان تصور ہوتا۔ تمام دنیا کے لیے کعبہ ایک غیر جانبدار علاقہ تھا۔ (No Man Land) اور یہاں ٹیکس بھی نہ تھا یعنی (Tax Free Zone)

حرم کی حدود میں کسی قسم کے خون خرابے کی اجازت نہ تھی۔ حتیٰ کہ جہاں باقی عرب میں دو خونی بھائی بھی انتقام کے سلسلہ میں ایک دوسرے کو معاف نہ کرتے تھے، وہاں حدودِ حرم میں داخل ہو کر دو خونی دشمن بھی عارضی طور پر ہی سہی، انتقام بھلا کر ہم نوالہ وہم پیالہ بن جاتے تھے۔ یہاں پہنچ کر ہر طرح کی عصبیت دم توڑ دیتی۔ حج کے دنوں میں پورا عرب مکہ کی طرف کھنچا چلا آتا۔ اس کے علاوہ پورا سال تاجر اور عام لوگ کعبہ کی زیارت کی غرض سے تجارتی سامان کے ساتھ آتے جاتے رہتے۔

سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں کوئی باقاعدہ سیاسی حکومت نہ تھی جو انتظام و انصرام کی غرض سے بڑے بڑے ٹیکس اور محصولات وصول کرتی۔ ٹیکس اور محصول نہ ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ ایک طرح کا ''آزاد معاشی علاقہ (Tax Free Zone) تھا۔ مذہب کا عمل دخل نہ ہونے کی وجہ سے غیر جانبدار علاقہ No Man Land کی حیثیت اختیار کر گیا۔

ان اسباب نے مکہ کی منڈی (Chamber) کو علاقے کی تمام منڈیوں سے ممتاز کر دیا۔ سیاسی و مذہبی تعصب سے پاک ماحول نے علاقے کی تمام منڈیوں کو ہلا کے رکھ دیا۔

———(((اللہ اکبر)))———

جزیرۃ العرب کے جنوب مغرب میں ملک یمن واقع تھا۔ جو زرخیزی، زرعی صنعتکاری میں پورے عالم میں یکتا تھا (تفصیلات پچھلے ابواب میں لکھ چکے ہیں) حمیری حکومت حبشیوں کے ہاتھ آ گئی جو روم کے زیر اطاعت تھے۔ جنگی خلفشار اور انتظامی بدامنی کی وجہ سے اس کی معیشت پر کافی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ان اثرات کو عیسائیت کے تعصب اور ابرہہ کی ہوڑمت نے اور بھی گہرا کر دیا۔ یمن کے پڑوس میں کعبہ جیسے مذہبی مرکز اور مکہ کی آزاد معیشت اور غیر سیاسی و غیر جانبداری نے بھی تیزی سے متاثر کیا۔ مکہ کی منڈیوں کی براہِ راست زد یمن کی مارکیٹوں پر پڑی۔ مکہ کے چیمبر آف کامرس کی بڑھتی ہوئی شہرت نے حبشہ کے ٹریڈ چیمبروں میں مندے کے رجحان کو بڑی تیزی سے تقویت دی۔ یقیناً اہل حبشہ و یمن کے معیشت گروں نے ان اثرات کو زائل کرنے کی اپنی سی کوششیں کی ہوں گی۔

مختصراً۔ اِدھر معاشی لحاظ سے مکہ کی منڈی استحکام پکڑ رہی تھی، اُدھر عیسائیت کے غلط رویوں، حبشیوں کی متعصبانہ پالیسیوں کی وجہ سے مذہب عیسائیت سے نفرت پیدا ہو رہی ہوگی۔ تاریخ کی یہ اثر آفرینی جاری تھی کہ وقت نے ایک اور کروٹ بدلی۔

ارياط[45] پچھلے دس سالوں سے یمن کا گورنر چلا آ رہا تھا جو نجاشی[46] کا انتہائی وفادار اور قابل اعتماد ساتھی تھا۔ وہ فطرتاً خوبصورت، بلند قامت۔[47] بلند حوصلہ اور شریف النفس تھا۔

یمن کا نائب السلطنت ابرہہ تھا جو قدرے مکار، پست قامت ہوس پرست اور کم ظرف تھا۔

ایک دن گورنر ارياط اور ابرہہ کے درمیان حبشیوں کے چند معاملات پر اَن بَن ہو گئی جس نے انتشار کی صورت اختیار کر لی۔ فوج دو حصوں میں بٹ گئی۔ بھاری اور باحوصلہ لوگ گورنر کی صفوں میں اور مفاد پرست، جی حضوری اور کم ظرف ابرہہ کی صفوں میں چلے گئے۔ ابرہہ نے سوچا کہ براہِ راست مقابلہ خودکشی کے مترادف ہوگا۔ گورنر بہرحال والی حبشہ کا مقرر کردہ ہے۔ عوام کی

اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ اس لیے فطری مکاری سے کام لیتے ہوئے اس نے گورنر ارياط کو لکھا کہ سپاہِ حبشہ کو آپس میں لڑا کر تباہ کرنے سے بہتر ہے کہ تو میرے مقابلے میں نکل اور میں تیرے مقابلے میں۔ ہم میں سے جو مغلوب ہو اس کی افواج غالب کی اطاعت میں چلی جائیں۔

ارياط نے خط پڑھا تو کہنے لگا "تو نے پہلی دفعہ انصاف کی بات کہی ہے، میں اسے کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔" ارياط بہادر آدمی تھا اور بہادر ہمیشہ بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اس کے برعکس ابرہہ نہ صرف جسمانی اعتبار سے پست تھا، بلکہ اس کی سوچ اس کے قد سے بھی دو ہاتھ نیچے تھی۔ اس نے اپنے ذاتی غلام "عتودہ" سے کہا کہ تو مجھے ہارتا ہوا دیکھے تو پیچھے سے ارياط پر وار کر کے اسے ختم کر دینا۔

گورنر ارياط اور ابرہہ مقابلہ پر آئے۔ ارياط نے بڑی ہوش مندی سے ابرہہ کا وار روک کر جوابی حملہ کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں اس دور کا ایک جنگی ہتھیار "حربہ" تھا جو ابرہہ کی پیشانی ناک اور ہونٹوں کو تراشتا ہوا گزر گیا۔ ابرہہ نے بوکھلاہٹ میں اپنے غلام "عتودہ" کو اشارہ کیا، جس نے آگے بڑھ کر ارياط کو ایک ہی وار میں ختم کر دیا۔

معاہدہ کی رو سے گورنر کی سپاہ ابرہہ کی اطاعت میں چلی گئیں۔ ارياط کے حواریوں میں سے چند ایک نے ابرہہ پر مکاری کا الزام دھرا، مگر اس نے دیت[48] ادا کر کے بولنے والوں کو خاموش کر دیا۔

ابرہہ کے چہرے پر جو زخم ارياط نے لگائے، اس کی وجہ سے وہ تاریخ میں ابرہۃ الاشرم کے نام سے مشہور ہوا۔ اشرم[49] کے معنی ہیں چھدا ہوا۔

ادھر ارياط کے قتل کی خبر جب شاہ حبشہ نجاشی کو ہوئی تو اس نے قسم کھائی کہ وہ ابرہہ سے اپنے وفادار دوست کا انتقام ضرور لے گا۔ ابرہہ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

اس سے پہلے کہ نجاشی فوج کشی کرتا۔ ابرہہ نے اپنے سر کے بال منڈوا کر یمن کی مٹی ایک کٹورے میں بھر کر حبشہ کے دربار میں بھیجی اور لکھا "عالم پناہ ارياط بھی آپ کا غلام تھا اور میں بھی آپ کا غلام ہوں۔ آپ کے احکامات کی تعمیل کے سلسلہ میں ہمارے درمیان اختلاف ہوا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ معاملہ صرف اتنا ہے کہ میں حبشیوں کے متعلق اس سے کہیں زیادہ قوی، زیادہ اچھا منتظم اور معاملاتِ سیاست میں زیادہ ماہر ہوں، مجھے عالم پناہ کی قسم کی خبر پہنچی تو میں نے اپنا سر منڈوا دیا اور اپنی سرزمین یمن کی مٹی سے بھرا برتن خدمت اقدس میں پیش کر دیا ہے۔ حضور اس برتن کو اپنے پاؤں سے توڑ کر میرے متعلق کھائی جانے والی قسم پوری کر لیں۔

یہ تحریر پڑھ کر نجاشی خوش ہوگیا۔اس نے ابرہہ کی گورنری کا تحریری شاہی فرمان جاری کر دیا۔

———(((اللہ اکبر)))———

گورنری کا شاہی فرمان وصول ہوتے ہی ابرہہ نے معیشت سنبھالنے کی کوششیں تیز کر دیں۔ ساتھ ہی ساتھ مذہبی حالات کو درست کر کے لوگوں کا رخ مکہ کی بجائے یمن کے دارالحکومت صنعاء کی طرف موڑنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ اسے پوری طرح اس بات کا احساس تھا کہ مکہ کا مذہبی اور تجارتی توڑ کیے بغیر ہم اپنے مذہبی اور اقتصادی پیکج کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔اس کے خیال میں مکہ حرم اللہ کی وجہ سے دنیا کا بڑا چیمبر بنا ہوا تھا۔سو عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام جو کیا، وہ تھا یمن کے دارالحکومت صنعاء میں دنیا کے سب سے بڑے کلیسا کی تعمیر۔

یہودی اور نصرانی روایتوں میں اس کلیسا کا ذکر قدرے طوالت کے ساتھ ملتا ہے۔بعض میں اس کا نام "قلیس" لکھا گیا ہے،مگر اس نام میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ممکن ہے کچھ راویوں نے اسے قلیس بلندی کی وجہ سے کہا ہو۔ چونکہ صنعاء بلندی[50] پر واقع تھا اور ابرہہ کا تعمیر کردہ کلیسا پورے شہر سے بلند[51] تھا۔قلسوہ ٹوپی کو کہتے ہیں۔ٹوپی چونکہ جسم کے بلند ترین حصہ یعنی سر پر ہوتی ہے، اس لیے اکثر یورپین کلیسا کو اس یونانی لفظ کی ایک شکل قرار دیتے ہیں جسے قلیس یا کلیسا کہا جاتا ہے۔

بہرحال اس سے پہلے دنیا میں اتنا بڑا اور خوبصورت کلیسا کہیں اور موجود نہیں تھا۔تعمیر کی تکمیل کے بعد ابرہہ نے نجاشی کو لکھا "بادشاہ[52] سلامت میں نے آپ کے لیے ایک کلیسا تعمیر کیا ہے۔اس سے پہلے اس جیسا کسی کے لیے نہیں بنا۔میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کروں گا، بلکہ عربوں کے عزائم حج کو بھی اس طرف پھیر دوں گا۔"

یہ تھا ابرہہ کا مذہبی واقتصادی پیکج جس سے وہ دنیا کے سب سے بڑے مرکزِ حج، سب سے بڑے اجتماع اور عرب کی سب سے بڑی تجارتی منڈی کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔یہ خبط اس کے ضمیر میں اتنا سوار ہوا کہ اس کی تعبیر کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔

یہاں پر اکثر مورخوں نے یہی ظاہر کیا ہے کہ ابرہہ کٹر قسم کا مذہبی جنونی تھا،مگر ہمارے ادنیٰ خیال کے مطابق وہ مذہبی جنونی ہی نہیں تھا، بلکہ ہوس پرست اور اقتدار پرست جنونی تھا۔اس کے ثبوت میں ارباط کو قتل کرنے کی ہی دلیل کافی ہے۔

دوسرا اگر اس کے مقاصد صرف عیسائیت کا فروغ ہوتے تو وہ کعبہ کو مسمار کرنے کے بجائے

Marfat.com

قبضہ کر کے کلسیا کو خانہ کعبہ میں منتقل کر کے زیادہ جلدی اور تیزی سے پھیلا سکتا تھا۔ عیسائیت بھی خدا کا دین تھا اور کعبہ خدا کا گھر۔ دوسرے لفظوں میں عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم بھی توحید الٰہیہ کا فروغ تھا۔ حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات تو صدیوں قبل عیسائیوں نے خود ختم کر دیں تھیں۔ برائے نام دین رہ گیا تھا۔

سیاسی لحاظ سے ایک تجزیہ نگار یا وقائع نگار کی حیثیت سے تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قبائلِ مکہ کوئی مذہبی طاقت اور سیاسی حکومت بھی نہ رکھتے تھے، نہ ان کا مذہب کوئی سرکاری مذہب یا ریاستی مذہب تھا جس کی وجہ سے صنعاء کے کلسیا کو کوئی خطرہ ہوتا، نہ ہی ان کے پاس کوئی باقاعدہ فوج تھی جو لوگوں کو بزورِ شمشیر صنعاً کے کلسیا میں داخل ہونے سے روک لیتی کم از کم میرے خیال کے مطابق تو کعبہ کو مسمار کرنے کی یہی وجوہات تھی کہ وہ اپنے اقتصادی اور مذہبی پیکج پر عمل کرنا چاہتا تھا۔

اور مکہ کے مذہبی مرکز خانہ خدا اور اس کی وجہ سے قائم ہونے والی تجارتی منڈی کو ختم کیے بغیر اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اب یوں اپنے اقتصادی و مذہبی پیکج پر عمل پیرا ہونے کے لیے مکہ پر حملہ آور ہوا۔

———(((اللہ اکبر)))———

ابرہہ نے نجاشی کے پاس سفارت بھیج کر مکہ پر حملہ کی اجازت طلب کی۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ آرام سے بیٹھ کر نجاشی کی طرف سے جواب کا انتظار کرتا۔[53]

اس کی بدقسمتی اسے دعوت دے رہی تھی۔ اپنے کمانڈروں کو اس نے جلدی حرکت Move کا حکم دیا۔

چند دنوں میں بے شمار سامانِ حرب کے ساتھ اس کی افواج تیار تھیں۔ بے شمار گھوڑے اور ہاتھی کسی بھی وقت اپنے سواروں کو لے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ سپہ سالار کے لیے ایک خاص ہاتھی مخصوص تھا۔ جسے میمتھ (Mammoth) یا محمود کہا جاتا تھا۔

یاد رہے کہ اُس دور میں ہاتھیوں کی ایک خاص نسل کو میمتھ (Mammoth) کہا جاتا تھا جو آج کل ختم ہو چکی ہے۔ لفظ میمتھ اور محمود میں کافی لفظی مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہاتھی کا نام محمود کسی بھی حوالے سے ثابت نہیں۔ ہاں میمتھ (Mammoth) نسل سے یا نام کا میمتھ (Mammoth) ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ ہاتھی کا نام محمود مشابہتی غلطی کی وجہ سے بعض مورّخوں نے غلطِ عام کر دیا۔ غلطِ عام کو اپنائے رکھنا کوئی کارِ ثواب یا نیکی نہیں، بلکہ کم علمی اور جہالت کی غمازی کرتا ہے، اس

Marfat.com

لیے لفظ میمتھ کو میمتھ (Mammoth) ہی کہا جائے تو بہتر ہے۔

یہ ایک سیل رواں تھا جو مکہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سیل رواں کے آگے کم از کم عربوں میں کوئی نہ تھا جو بند باندھ سکے۔ عربوں کو خبر ہوئی تو بے بسی اور لاچارگی نے ان کو مایوس کر دیا۔

خانہ کعبہ کی توہین کا تصور ہی ان کے لیے جان لیوا تھا۔ ذونفر نامی ایک شخص، جو یمن کے سابق حکمران خاندان حمیر بن سبا کی نسل سے تھا، جس کا یمن میں کافی اثر و نفوذ تھا، اس نے تمام عرب قبائل کو جنگ کے لیے ابھارا۔ عربوں کی تھوڑی تعداد اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئی، مگر بدقسمتی سے وہ چند افراد کے ساتھ ابرہہ کا راستہ نہ روک سکا۔ اس نے بری طرح شکست کھائی۔ قیدی کی حیثیت سے ابرہہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ ابرہہ نے ذونفر[54] کے قتل کا حکم سنایا۔ اس نے درخواست کی بادشاہ سلامت! میرا آپ کے ساتھ زندہ رہنا میرے قتل سے زیادہ بہتر ہوگا۔"

ابرہہ نے اس کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا۔

پھر لشکر بنی خثعم[55] کے علاقہ میں داخل ہوا تو قبیلہ خثعم کی دونوں شاخوں "شہران" اور "ناہلس" کے ساتھ نفیل بن حبیب نے ابرہہ کی راہ روکنے کی کوشش کی، مگر ان کی یہ کوشش کوششِ ناتمام ثابت ہوئی۔ نفیل بن حبیب اور باقی قیدیوں کے قتل کا حکم دیا گیا۔ نفیل نے کہا:

"اے شاہِ یمن مجھے قتل نہ کیجیے۔ سرزمین عرب میں میں تمھاری راہنمائی کر سکتا ہوں اور میرے دونوں بازو ناہلس اور شہران تمھاری اطاعت میں آجائیں گے" اسے اور اس کے قبیلے کو اطاعت کے عوض چھوڑ دیا گیا۔

آخر کار یہ لشکر سطحِ سمندر سے پچیس سو (2500) میٹر کی بلندی پر واقع شہر طائف میں داخل ہوا، جہاں قبیلہ بنو ثقیف نے اپنے بت "لات" کی خیر کے عوض اطاعت قبول کر لی۔ بنو ثقیف نے "ابو رغال" کو مکہ تک راہنمائی کے لیے لشکر کے ساتھ بھیج دیا۔ مغمس[56] کے مقام پر پہنچ کر ابو رغال فوت ہو گیا۔ (مغمس مکہ سے دس میل کے فاصلے پر ایک وادی یا مقام کا نام ہے)

مرنے کے بعد لوگوں نے اس کی قبر پر پتھر برسائے اور اب بھی اس کی قبر کے قریب سے گزرنے والے پتھر مارنا فرض سمجھتے ہیں۔

مغمس میں پڑاؤ کر کے ابرہہ نے اسود بن مقصود کی قیادت میں ہر اول دستہ (VanGuard) مکہ کی طرف روانہ کیا۔ وہ تہامہ[57] سے عبدالمطلب کے دو سو اونٹوں کے ساتھ ساتھ قریش مکہ کے سینکڑوں جانور ہانک لایا۔

ان دنوں مکہ میں دس[58] قبائل آباد تھے۔ ہر قبیلے کا ایک سردار تھا۔ ہر سردار مکہ کی مجلسِ عاملہ کا

Marfat.com

ممبر ہوتا تھا۔ قریش مکہ اس عاملہ کو دارالندوہ کہتے تھے یہ مجلسِ عاملہ "سردارِ مکہ" (Chief Exective) کا انتخاب کرتی تھی۔ اس دارلندوہ کا ہر روز حرم شریف میں اکٹھ ہوتا تھا۔ ان دنوں سردارِ مکہ حضورؐ کے دادا عبدالمطلب تھے۔

———(((اللہ اکبر)))———

عبدالمطلب نے اس معاملہ پر غور کے لیے اجلاس بلایا تو دارالندوہ کے تمام ممبران نے اَبرہہ کے خلاف نہ لڑنے کی تجویز دی۔ یہ لوگ ابھی کسی فیصلہ پر پہنچے نہیں تھے کہ ابرہہ نے حناطہ حمیری کو رئیسِ مکہ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ "میں یہاں جنگ کرنے نہیں آیا، بلکہ عبادت گاہ کو گرانے آیا ہوں۔"

ایلچی کا یہ پیغام سنتے ہی عبدالمطلب نے فرمایا "بخدا[59] ہم بھی جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے اور نہ ہی ہم میں جنگ کی طاقت ہے۔ یہ اللہ اور اس کے خلیل علیہ السلام کا عظمت والا گھر ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرے گا تو اس میں اس گھر کی اور گھر والے کی اپنی عظمت ہے اور اگر اس نے حرم اور اَبرہہ کے درمیان راستہ صاف کر دیا تو خدا کی قسم ہمارے پاس اس کو بچانے کی کوئی تدبیر نہیں۔"

پھر ایلچی کے ساتھ عبدالمطلب فوجی پڑاؤ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے ان کی نظر دیرینہ دوست ذونفر پر پڑی جو اَبرہہ کی قید میں تھا۔ اس کا حال دریافت کرنے کے بعد آپ نے پوچھا، ذونفر یار اس آفت سے بچنے کی کوئی تدبیر بتاؤ۔ ذونفر نے جواب دیا۔ ایک ایسے شخص کے پاس کیا تدبیر ہو سکتی ہے جو خود قید میں پڑا موت کا منتظر ہے۔ ہاں ایک بات ہے اَبرہہ کے ہاتھی کا مہاوت "انیس" میرا دوست ہے۔ میں اسے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کی سفارش کر دے اور پھر ذونفر نے اَبرہہ کے فیل بان انیس سے عبدالمطلب کا تعارف یوں کروایا۔

"یہ مکہ کے رئیس عبدالمطلب ہاشمی قریشی ہیں۔ یہ اہل مکہ کی آنکھوں کی پتلی ہیں۔ مہمان نوازی ان کا ایمان ہے۔ شہر میں شہریوں اور ریگزار میں بدوی اور وحشی لوگوں کی ضیافت کرنا ان کا محبوب ترین شغل ہے۔ ابرہہ کے پاس اس کے اور اس کی قوم کے سینکڑوں اونٹ ہیں۔ دربار میں ان کی ہر ممکن مدد کرو۔" انیس نے جواب دیا: میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔

اکثر مورخوں اور سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ جب عبدالمطلب کو ابرہہ کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کے جلال، خوبصورتی اور بارعب شخصیت نے ابرہہ کو مسحور کر دیا۔ شش و پنج میں پڑھ گیا کہ کس طرح پیش آئے۔ خود تخت پر بیٹھ کر اس پروقار اور وجیہ شخص کو نیچے بٹھا کر بات کرنا مناسب نہیں اور حبشیوں کے سامنے تخت پر برابر بٹھانا بھی مناسب نہیں۔ پریشان ہو گیا: کیا کیا جائے۔

Marfat.com

آخر سوچ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ خود ہی اس کے ساتھ فرش پر بیٹھ جائے۔ سو وہ فرش نشین ہوا اور عبدالمطلب کو بھی ساتھ بٹھالیا۔ رئیسِ مکہ سے اس کی خواہش پوچھی گئی تو اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔ مجھے میرے اونٹ واپس کر دو۔ یہ الفاظ سن کر ابرہہ کہنے لگا میں تو آپ کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا تھا، لیکن تمھارا مطالبہ سن کر مجھے افسوس ہوا ہے کہ تم نے اس گھر کی کوئی بات نہیں کی جو تمھارا اور تمھارے باپ دادا کا مرکزِ دین ہے۔

عبدالمطلب نے جواب دیا۔"میں اونٹوں کا مالک ہوں میرا کام اونٹوں کی حفاظت کرنا ہے۔ جو اس گھر کا مالک ہے، خود ہی اپنے گھر کی حفاظت کرے گا۔" چنانچہ آپ کو اونٹ واپس کر دیئے گئے۔ وہ اونٹ لے کر واپس آ گئے آخری دیدار کے لیے حرم میں گئے اور حرم کے دروازے کا حلقہ پکڑ کر آپ نے انتہائی رنجیدگی سے دعا کی: "یا اللہ! بندہ اپنی سواری کی حفاظت کر سکتا ہے، [60] تو بھی اپنے حرم پاک کی حفاظت فرما۔ کل صبح ان کی قوتیں تیری قوتوں سے ٹکرائیں گی۔ ان کی صلیب تیری قوتوں پر غالب نہ آ جائے" اگر تو نے ہمارے کعبے کو اس کی حالت پر اور دشمنوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا اور بچاؤ نہ کیا تو تجھے اختیار ہے جو تجھے مناسب لگے وہ کر۔

رئیسِ مکہ تمام قبائل مکہ کو لے کر نواحی پہاڑوں میں چلے گئے اور انتظار کرنے لگے کہ دیکھئے ان کے آبائی معبد صدیوں پرانی عبادت گاہ، جسے انکے مورث اعلیٰ حضرت خلیلؑ اور حضرت ذبیح علیہ السلام نے ہزاروں سال قبل مسیح تعمیر کیا تھا، جسے زمانے کی گرد آلود ہواؤں نے کبھی میلا نہیں کیا، جس عبادت گاہ نے ہزاروں سال زمانے کی نخوت اور رعونت کو اپنے قدموں میں ڈھیر ہوتے دیکھا، 570ء یا 571ء کے اس مہینے میں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

قارئین! یہ ایک طرح کی تدبیر خداوندی ہے کہ وہ ذات وقت اور زمانے کو جس طرح چاہتی ہے، چلا لیتی ہے۔ اس کے سامنے کوئی کچھ بھی نہیں اور جسے ہم کچھ نہیں سمجھتے، اس ذات کے نزدیک بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ شداد اور ہامان جیسے بڑے بڑے دولت مند، بڑے بڑے متکبر، بڑی بڑی رعونتوں والے ابلیس جیسے نافرمان اس ذات کا کیا بگاڑ سکے۔ اس ذات باری کا کچھ بگاڑنا تو دور کی بات ہے۔ وہ لوگ اپنی ذات کا کیا سنوار سکے۔ اپنے لیے کیا کر سکے۔

نمرود نے بہت بڑی چتا حضرت ابراہیم علیہ سلام کو جلانے کے لیے بنائی جب آگ جلا کر ابراہیم علیہ السلام کو پھینکا گیا تو وہ آگ ان کے لیے حکم خداوندی سے گلزار ہو گئی۔ ذرا غور کیجئے کہ آگ کا کام جلانا ہے، مگر ابراہیم علیہ کو نہیں جلایا کیونکہ وہ حکم خداوندی کی محتاج تھی۔

Marfat.com

پانی پوری کائنات کے لیے تعمیر و ترقی کا ذریعہ ہے۔ کئی نبیوںؑ نے قحط سالی میں نمازِ استسقاء پڑھ کر پانی کے لیے بارش کے لیے دعائیں مانگیں، مگر نوحؑ علیہ السلام کی قوم کے لیے وہی پانی بہت بڑا عذاب بن جاتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا جاتا ہے کہ بیٹا ذبح کر دو۔ وہ بیٹے کی گردن پر نبوت کے پورے زور سے چھری چلاتے ہیں۔ چھری اسماعیلؑ کی گردن کاٹنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہی چھری اوپر پھینکتے ہیں۔ مکڑی ذبح ہو جاتی ہے۔ نیچے آ کر مچھلی کو ذبح کر دیتی ہے اسماعیل علیہ السلام کی جگہ جنت سے دنبہ لا کر رکھ دیا جاتا ہے تو وہی چھری اس دنبے کی گردن کے آر پار ہو جاتی ہے۔

فرعون نے نجومیوں کے کہنے پر لاکھوں بچے اس خوف سے مروا دیے کہ کہیں موسیٰ پیدا ہو کر اس کی ہزیمت، اس کی تباہی کا نشان نہ بن جائے۔ قدرتِ خداوندی دیکھیے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کا کیا انتظام فرمایا۔ اسی فرعون کے گھر اس کی ہی بیوی آسیہ کی گود میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کے اسباب پیدا فرما دیے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ پانی سیلابی شکل میں وبال بن گیا ہے۔ فائدہ نہیں دے رہا۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ وہ جلا نہیں رہی۔ چھری کا کام کاٹنا ہے۔ وہ کاٹ نہیں رہی۔ جس خوف سے بچوں کو مروایا جا رہا ہے۔ وہی خوف (موسیٰ علیہ السلام) فرعون کی اپنی گود میں کھیل رہا ہے۔

وہ ذات جو چاہے، کر سکتی ہے۔ اگر خدا چاہتا تو قریش مکہ کے ہاتھوں بھی ابرہہ کو ذلیل و خوار کر سکتا تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا کہ قریش مکہ خود بے ہدایتے تھے۔ وہ تھے تو اولادِ ابراہیم علیہ السلام جس نے بت شکنی کر کے دنیا کو توحیدِ الٰہی کا سبق دیا تھا، مگر اس کی اولاد نے پھر سے انھیں بتوں کو ابراہیم کے ہاتھوں سے بنائے ہوئے خانہ خدا میں رکھ کر پوجنا شروع کر دیا تھا۔ انھیں نمرودی بتوں کو توڑنے کے لیے ان کے جدِ امجد نے زندگی بھر مشقتیں اٹھائی تھیں۔ اسی خدائے کعبہ کے حکم کی اطاعت میں اپنے لختِ جگر پر چھری چلانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ اب اس کی اولاد نے ہی توحید کی جگہ شرک اور خدا کی جگہ بتوں کو سجدہ شروع کر دیا تھا۔ اس لیے خدائے بزرگ نے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے مشرکین کی بجائے ابابیلوں یعنی چھوٹے پرندوں کو چنا اور ان سے وہ کام لیا جو شاید بہت بڑا لشکر بھی نہ کر پاتا۔

چھٹی صدی عیسوی کے آخری سالوں میں اللہ نے دنیا کو ایک بار پھر حیرت زدہ کر دیا۔ ایک بار پھر اپنی عظمت اور بڑائی کا ثبوت پیش کیا۔ حجت قائم کر دی۔ ایک بار پھر دکھا دیا کہ خدا نے جلوہ گری کے لیے صرف طور ہی منتخب نہیں، بلکہ وہ ذات جس وقت جس جگہ چاہے اپنی جلوہ آفرینی کر

Marfat.com

سکتی ہے۔اس ذاتِ باری نے اس مرتبہ جلوہ آفرینی کے لیے کوہ طور کی بجائے شہر مکہ کا انتخاب فرمایا۔موسیٰ کی قوم نے جلوہ گری کے طریقے سے ہٹ کر نیا انداز اختیار کیا۔یعنی اب جگہ بھی نئی تھی اور وسیلہ بھی نیا۔آیئے اس کی تفصیلات میں جھانک کر دیکھیں۔شاید اسی وسیلے سے ہمارے دل بھی منور ہو جائیں۔توحیدی حقانیت پوری آب و تاب سے ہمارے دلوں میں جاگ اٹھے۔

———(((اللہ اکبر)))———

اگلی صبح لشکر کو مکہ میں داخل ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔نفیل بن حبیب نے ہاتھی کے کان پکڑ کر کہا اے میمتھ (Mammoth) بیٹھ جا یا جس راستے سے آیا ہے واپس چلا جا۔تو اللہ کی عظمت والے گھر اور [61]حرمت والے مہینہ میں ہے۔یہ کہہ کر نفیل بن حبیب وہاں سے سے کھسک گیا۔

پھر ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔اسے بہت مارا پیٹا گیا، مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔جب اس کا رخ شمال میں ملک شام کی طرف یا یمن کی طرف یا یثرب کی طرف یا شرق کی طرف کیا جاتا تو وہ دوڑنا شروع کر دیتا۔مکہ کی جانب رخ پھیرا جاتا تو وہ زمین پر بیٹھ جاتا اور ہلنے کا نام نہ لیتا۔بالآخر ابرہہ بغیر ہاتھی کے مکہ میں داخل ہوا۔ادھر اللہ کی طرف سے حجت تمام ہوئی۔

اس نے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے غول [62] ابرہہ اور اس کی سپاہ پر مسلط کر دیے۔قرآن میں سورۃ فیل میں ان پرندوں کا اور اصحاب فیل کا مفصل ذکر ملتا ہے جسے مفسرین نے احادیث کے حوالے سے تفسیر میں نقل کیا ہے۔ان پرندوں کا نام ابابیل تھا۔ان کے پاس تین تین کنکریاں تھیں۔دو دو ان کے پنجوں میں اور ایک ایک چونچوں میں۔وہ کنکریاں وزن اور حجم میں چنے کے دال برابر تھیں۔

یہ ایک طرح کے اینٹی ابرہہ میزائل تھے۔جس کے اوپر وہ غلیلہ یا کنکری گرتی، جہاں پر گرتی، بس وہ اعضا جھڑ جاتے۔بتاتے ہیں کہ فوج میں سے ایک پیادہ بھی صحیح حالت میں واپس نہیں جا سکا۔پورے کا پورا لشکر نفیل بن حبیب کو پکار رہا تھا تا کہ اس کی راہنمائی میں گھر کا راستہ تلاش کر سکے نفیل بن حبیب نے نہ ملنا تھا نہ ملا۔قرآن نے ان لوگوں کی حالت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ان حالات کا اندازہ لگانے کے لیے یہی کافی ہے۔

''اور ان کو ایسے کر دیا جیسے کھایا ہوا بھس/ چارہ''

واقعہ کی منظر کشی میں نفیل بن حبیب کے اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے [63]''بھاگ کر جانے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔قہر خدا تو تلاش کرتا پھر رہا تھا اور اشرم یعنی ابرہہ اپنی تمام طاقتوں کے باوجود چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے، ایسی شکست کہ جو کبھی فتح میں نہ بدل

سکے گی اور قوم کا ہر فرد نفیل ہی کو دریافت کر رہا تھا کہ اس سے واپسی کا راستہ پوچھے۔ ہاں اے ردینا ہماری طرف سے تجھے سلام ہو۔ تمھاری سلامتی سے ہماری آنکھیں صبح سویرے ٹھنڈی ہوں۔ ردینا کاش تو وہ منظر دیکھ سکتی۔ خدا کرے تو وہ منظر کبھی نہ دیکھے جو ہم نے وادیٔ محصّب کے پاس دیکھا ہے۔ اگر تو وہ منظر دیکھتی تو مجھے معذور سمجھتی۔ میرے کام کی تعریف کرتی اور ہماری آپس کی جدائی کا غم نہ کرتی (لگتا ہے یہ عورت نفیل کی بیوی یا محبوبہ تھی جو مکہ پر حملہ آور فوج میں جانے کی وجہ سے نفرت کرنے لگی تھی)"

اور جب ہم نے پرندے دیکھے تو اللہ کا شکر ادا کیا اور ساتھ ہی ساتھ ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر گرنا نہ شروع ہو جائیں۔

میرے خیال میں کافی اچھی دلیل ہے منظر کشی کے حوالے سے ویسے اس واقعہ پر عربی شعر و ادب میں دفتروں کے دفتر ملتے ہیں جن کا یہاں بیان کرنا مضمون اور موضوع کو خواہ مخواہ طول دینے کے مترادف ہے۔ آیئے ذرا دیکھتے ہیں کہ جرنیل کا اس میں کیا حال ہوا۔

اَبرہہ انتہائی شکست خوردہ حالت میں چند سپاہیوں کے ساتھ جب صنعاً میں داخل ہوا تو حالت انتہائی قابل دید تھی۔ ہاتھ پاؤں کی ساری انگلیاں جھڑ چکی تھیں۔ زخموں سے پیپ بہہ رہی تھی۔ جسم کے اعضائے رئیسہ کام چھوڑ چکے تھے۔ بس ایک لوتھڑے کی طرح پڑا کراہ رہا تھا۔ دو دن بعد انتہائی کربناک اور دلدوز چیخ کے ساتھ اس کا سینہ پھٹ گیا۔ سینہ اس شدت سے پھٹا کہ دل سینے سے نکل کر دور جا گرا اور یوں خدائے بزرگ و برتر کی عظمتوں سے ٹکر لینے والا صحیح معنوں میں پاش پاش ہو کر ماضی کی گرد میں دفن ہو گیا۔

اس کے بعد اس کا بڑا بیٹا یکسوم جانشین بنا۔ موت نے کچھ عرصہ بعد اسے بھی چاٹ لیا تو اس کا چھوٹا بیٹا اور اس کے بعد اس کا پوتا جانشین ہوا جسے ہرز نے قتل کیا اور حکومت سیف بن ذی یزن کے ہاتھ آئی۔ اس کے بعد تختِ یمن پر ہرز متمکن ہوا اور آخر میں باذان والیٔ یمن بنا جس نے مکہ آ کر اسلام قبول کیا۔ تفصیلات پچھلے ابواب میں بیان کی جا چکی ہیں۔

———(((اللہ اکبر)))———

جیسا کہ پچھلے صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ابرہہ کا مقصد خانہ کعبہ کو مسمار کر کے مذہبی و معاشی استحکام حاصل کرنا ہی تھا۔ مکہ کا تجارتی مرکز عالمی منڈی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ صنعاً میں اس نے کلیسا تعمیر کر کے مذہبی اور اقتصادی پیکج کو پروان چڑھانا چاہا۔ اس میں ناکام ہوا تو اس نے اپنے تمام وسائل کو مکہ کے میدانِ جنگ میں جھونک دیا۔ مکہ فتح کرنے کے لیے اتنی بڑی

طاقت کا مظاہرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مکہ پر قبضہ تو معمولی سیاسی لوٹ پھیر سے بھی کیا جا سکتا تھا۔

تجربات شاہد ہیں کہ ہوس پرست جنونی ہوتا ہے اور جنونی ہمیشہ عقل وفکر سے عاری رہتے ہیں۔ اگر وہ عقل مند ہوتا تو کعبہ کو مسمار کرنے کی بجائے کعبہ میں بیٹھ کر دین کی تبلیغ شروع کر دیتا۔ اس سے معیشت بھی سنبھل جاتی اور شاید حکومت واقتدار کو بھی طول مل جاتا اور ساتھ ہی ساتھ دین عیسوی کی خدمت کر کے اسے روحانی طمانیت بھی حاصل ہوتی۔

بغیر کسی غور وفکر کے جب اس نے خدائے بزرگ و برتر کی عظمتوں سے ٹکرانے کی ٹھان لی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی قدرت کا ایسا مظاہرہ دکھایا جو عموماً صدیوں بعد رونما ہوتا ہے، مگر ایسا ہوتا جبھی ہے جب انسان معمولی طاقت، اقتدار اور وسائل کے نشے میں عقل وفکر سے عاری ہو کر خدا کی عظمت وجلال سے ٹکر لینے پر اتر آتا ہے۔ وہ اپنی اوقات کی تمام حدیں پھلانگ جاتا ہے اور خدا کی ذات اس کی عقل وفکر اور اس کے وسائل کا ایسا تماشا بناتی ہے کہ قیامت تک آنے والی انسانیت خدا کی قدرت کاملہ پر عش عش کر اٹھتی ہے۔

المختصر قرآن نے یمن کے اس لشکر کو اصحاب فیل کہا۔ اس موضوع کے تحت یہ واقعہ بیان ہوا اس کو سورہ فیل کہا گیا۔ جن راستوں سے یہ سپاہ گزریں، ان کو عربوں نے صراط الفیل کے ناموں سے منسوب کیا۔ جن چشموں کو اس بدقسمت فوج نے استعمال کیا، انھیں عین الفیل کا نام دیا گیا۔ جس راستے سے لشکر شہر مکہ میں داخل ہوا اس کو باب الفیل کا نام ملا۔ 571ء کے اس سال کو عام الفیل کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

اس واقعے سے بھی اہم واقعہ یہ ہوا کہ اس صفحۂ ارضی پر اللہ تعالیٰ کی ذات نے قیامت تک آنے والی نسل انسانی کی رشد وہدایت کے لیے جو مذہب، جو دین متعارف کروانا تھا۔ اس دین کو متعارف کروانے والے انسانیت کے سب سے بڑے جس ہیرو کو اس خاکدان ارضی پر لانا تھا اس ذات اقدس کو اللہ تعالیٰ نے عام الفیل کے اس سال میں اصحاب فیل کے وقوعہ کے پچپن یوم بعد حرم کعبہ میں پیدا فرما دیا۔

جس طرح یہ واقعہ انسانی تاریخ میں انمول، نادر اور عجیب ہے، اس سے کئی گنا زیادہ اہمیت اس نبی اُمّی ﷺ کی ولادت کی ہے۔ آپؐ کی پیدائش کے چند سال بعد تاریخِ انسانی ایک نیا موڑ مڑ جاتی ہے۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

حواشی:

1- رحمت اللعالمین، جلد سوم، تاریخ ابن خلدون۔ سیرت النبی، سیرت سرور عالم۔
2- قصص الانبیاء۔
3- تاریخ فرشتہ وغیرہم۔
4- تاریخ فرشتہ جلد اول۔ قصص القران۔
5- رحمت اللعالمین، تفہیم القرآن۔
6- تاریخ فرشتہ۔ جلد اول۔
7-8- تفہیم القرآن تفسیر سورۃ اعراف، موضع القرآن سورۃ اعراف۔
9-10- کتاب پیدائش باب 37 آیۃ 25 حزقیل باب 27 آیہ 20 تا 27۔
نوٹ، یہ تمام واقعات:۔ تورات انجیل، سیرت اور تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ موجود ہیں۔
11- تاریخ کامل ابن کثیر، سیرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم۔
12- لغتِ بائیبل بائی پادری جان براون، مطبوعہ نیویارک امریکہ 1883...... بحوالہ سیرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم۔
13- پرانا نام یثرب تھا۔
14- تاریخ ابن اثیر، سیرت ابن ہشام۔
15- سیرت رسول عربیؐ، سیرتؐ ابن ہشام۔
16- قرآن پاک سورۃ سبا آیۃ 15-16 تفہیم القرآن۔
17- القرآن سورۃ رکوع 2۔ آیۃ 19-43 تفہیم القرآن، تفسیر عثمانی، ابن ہشام قصص الانبیاء ذکر سلیمان علیہ السلام۔
18- سیرت ابن ہشام جلد اول، تفہیم القرآن، تفسیر عثمانی، سورہ سبا اور سورہ نمل۔
19- ابن اثیر جلد اول۔ ص 79
20- قرآن میں سیلاب یمن کو سیلِ عرم کا نام دیا گیا ہے۔
21- سیرت ابن ہشام۔
22- رسول عربی، معجم البلدان، ابن ہشام۔

Marfat.com

23- ابن ہشام جلد اول۔

24- ابن ہشام۔

25- سورۃ بروج، ابن ہشام۔

26- سیرت سرورِ عالم۔ تاریخِ فرشتہ۔

27-28- تفصیلات تاریخِ فرشتہ میں درج ہیں۔

29- اس کو رسم ستی کہا جاتا تھا۔ جو گورونانک کے دور میں بھگتی تحریک کے ذریعہ ختم کی گئی۔

30- ابن ہشام جلد اول باب عربوں میں بت برستی کی ابتداء۔

31- ابن ہشام جلد اول، رسمِ حمس۔

32- رسول عربی، سیرت رسول عربی۔

33- اسرائیلی مشہور بندہ گاہ ایلات کا پرانا نام ہے۔

34- ابن ہشام۔ قرآن مجید۔ سورہ سبا، سورہ نمل۔

35- پہلے باب میں اس کا ذکر آچکا ہے۔

36- ابنِ ہشام۔ جلد اول۔

37- حمیری اور سبائی ایک ہی خاندان کا نام ہے حمیر بن سبا، سبا کا بیٹا تھا۔

38- تفصیلی حالات پہلے باب میں اور ابرہہ کے مکہ پر حملہ کے باب میں دیکھیں۔ یا تفسیر سورۃ فیل ملاحظہ فرمائیں۔

39- ایران کا پرانا نام فارس تھا۔

40- ایک رومی بادشاہ کا نام تھا۔

41- بہشتی زیور از مولانا اشرف علی تھانوی۔

42- ابنِ ہشام۔ رحمت اللعالمین۔ سیرت النبی بخاری باب سیرت سرور عالم۔

43- ابنِ ہشام۔ سیرت النبی۔ رحمت اللعالمینؐ۔

44- ابنِ ہشام جلد اول۔ بخاری باب السیرتؐ۔

45- ابن ہشام، جلد اول۔ تاریخ اسلام جلد اول دوم۔ تاریخ ابنِ خلدون جلد اول۔

46- حبشہ کے والی کو نجاشی کہا جاتا تھا اور یمن حبشہ کا صوبہ تھا۔

47- ابن ہشام جلد اول۔ سیرت سرورِ عالم۔ سیرت النبیؐ۔

48- قاتل جو رقم مقتول کے ورثا کو ادا کرتا ہے اسے دیت کہتے ہیں اُن دنوں دیت کی رقم 100

Marfat.com

اونٹوں کے برابر تھی۔

49- ابن ہشام، جلد اول۔

50- ابن ہشام، جلد اول۔

51- ابن ہشام، جلد اول۔

52- ابن ہشام، جلد اول۔

53- ابن ہشام۔ رحمت اللعالمین۔ سیرت النبیؐ۔

54- ابن ہشام، جلد اول۔

55- ابنِ ہشام، جلد اول۔

56- سیرت النبی۔ سیرت سرورِ عالم۔

57- ابنِ ہشام، جلد اول۔

58- ابن ہشام، جلد اول۔

59- تاریخ ابن خلدون، ابن ہشام، سیرت النبیؐ، ابن سعد، انوار القران سورۃ فیل۔

60- اسلام سے پہلے کا عربی ادب اصحابِ فیل کے واقع سے بھرا پڑا ہے۔

61- عربوں کے نزدیک ذوالعقدہ۔ ذوالحجہ۔ محرم اور رجب، چار مہینے حرمت والے تھے ان میں جنگ وجدل حرام تھی۔

62- تفہیم القرآن سورۃ فیل، تفسیر ابن کثیر، تفسیر عثمانی، تفسیر مظہری، ابن خلدون، ابن ہشام، سیرت النبیؐ۔

63- ابن ہشام، جلد اول۔

Marfat.com

باب:2

ولادت و پرورش

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور پرورش

حرم کو پامال کر کے صنعاء میں کلیسا کی رونقیں دو بالا کرنے کی سر توڑ کوشش کرنے والے ابابیلوں کے ہاتھوں ذلت آمیز طریقہ سے برباد ہوئے، اپنی طاقت اور حکومت کی نخوت میں حرم شریف کو روند دینے کی منصوبہ بندی کرنے والے خود اپنی زندگی بچانے کی تدبیر نہ کر سکے۔

کعبہ کی عظمتوں کو چھین کر خود ساختہ کلیسا کی جھولی میں ڈال دینے والوں کی دنیوی جاہ وحشمت بھی چھین لی گئی۔ مکہ کی معیشت کا رخ یمن کی طرف پھیر دینے والے آج کے روس کی طرح اپنی معاشی وسیاسی بدحالی کی داستانیں تاریخ کے حوالے کر کے مسافرانِ عدم ہوئے۔

زندگی کو وسائل اور تدبیر کے پیمانوں سے ناپنے والے کس قدر نہتے اور بے تدبیرے ثابت کر دیے گئے، حالانکہ عقل و منطق کے ترازو میں وسائل کو تولا جائے تو یقیناً آج خانہ کعبہ (نعوذ باللہ) کی بجائے کلیسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ایسا نہیں ہوا، ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس لیے کہ ایسا نہیں ہونے دیا گیا۔ کوئی تو تھا جس نے اسباب کو بے سبب کر دیا۔ کون تھا؟ شقی القلب لوگوں کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ تو خدائے بزرگ و برتر ہی تھا۔ جس نے حقیقتاً ہاتھیوں کو چڑیوں کے ہاتھوں مروا دیا۔ بھائیو! مان جاؤ۔ دوستو یقین کر لو۔ اپنا سب کچھ خدا کو سونپ دو۔ توحید پرست اور تقدیر پرست بن جاؤ۔ نہیں بنو گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اقوامِ ماضی کی طرح تاریخ ہمارا بھی منہ چڑائے۔ وقت ہے، فائدہ اٹھا لو۔ دیکھو وہ ذات کیا کچھ نہیں کر سکتی ہے۔ عین اس وقت جب اَبرہہ کو شکست دینے والا کوئی نہیں تھا۔ کوئی سبب موجود نہیں تھا۔ اس وقت انتہائی شکست سے کیوں دو چار کر دیا گیا اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ہاتھوں۔ یہ ایک بہت بڑا راز تھا جسے نہ تو یمن والے سمجھ سکے اور نہ قریش مکہ۔

Marfat.com

بعد کے قرآئن اور حالات اس اسرار الٰہیہ کی ایک دلیل اور پیش کرتے ہیں کہ ذاتِ خداوندی دنیا کی تاریخ میں ایک اور حسین باب کا اضافہ کرنا چاہتی تھی۔ تاریخ کی ایک اور کروٹ بدل کر قیامت تک آنے والی انسانیت کی راہنمائی کرنا چاہتی تھی۔

———(((اللہ اکبر)))———

571ء میں اصحاب فیل کی ذلت آمیز شکست کے صرف پچپن دن بعد حرم شریف میں مقامِ حطیم کے پاس ایک نومولود کی پیدائش نے قدرت کے حالیہ کھیلے گئے اور آئندہ کھیلے جانے والے کھیل کی تصدیق کر دی۔

وہ نوآموز رئیسِ مکہ عبدالمطلب کا پوتا عبداللہ کا بیٹا اور حضرت آمنہ کا شکم پروردہ محمد ﷺ تھا۔

یوں حضور ﷺ کی ولادت با سعادت 9 ربیع الاوّل[1] عام الفیل کو اصحاب الفیل کے واقعہ سے پچپن دن بعد ہوئی۔ یہ 22 اپریل 571 عیسوی تھا۔ بوقت سحری آپؐ دنیا میں تشریف لائے۔

پیدائش کے وقت حضور ﷺ ناف بریدہ[2] تھے۔ معمول کے برعکس زچگی کی بدبو کی بجائے عنبر یا کستوری نما تیز خوشبو پھیل گئی۔ آپؐ کے دادا عبدالمطلب کو اطلاع دی گئی تو وہ آئے اور نوخیز بچے کو اٹھا کر حرم کے اندر لے گئے۔ پھر طواف کیا۔ خدا کی اس حسین و جمیل عطا پر شکر ادا کرتے رہے۔ جب بچے کو اس کی ماں کی گود میں واپس دیا تو ساتھ ہی نام بھی تجویز کر دیا۔ پوتے کو ''محمد'' جیسے وسیع المعنی نام سے نواز دیا۔ گویا دادا جان کی طرف سے حضور ﷺ کی والدہ کو یہ سلامی دی گئی یعنی پورے عرب سے علیحدہ اور ممتاز نام کا انتخاب۔

زچگی کے وقت حضور ﷺ کی دائی ثوبیہ تھی۔ یہ آپ کے چچا ابولہب کی لونڈی تھی۔ اس نے جب ابولہب کو اطلاع کی تو ابولہب نے خوشخبری کی سلامی کے طور پر ثوبیہ کو آزاد کر دیا۔ آکر بچے کو دیکھا تو دیکھتے ہی پکار اٹھا ''محمد جیسا خوش جمال پورے عرب نے پیدا ہی نہیں کیا۔''

پھر دادا جان نے حضورؐ کے بال کٹوا کر ان کے بالوں کے برابر چاندی یا سونا تقسیم کر دیا۔ یہ رسم عقیقہ تھی (اب یہ سنتِ موکدہ ہے)۔

چند دن آپؐ نے اپنی والدہ اور پہلی دایہ ثوبیہ کا دودھ پیا۔ چند دن بعد اہلِ مکہ کے رواج کے مطابق پرورش کے لیے حلیمہ کے حوالے کر دیے گئے جس کا قبیلہ ریگستانِ عرب میں بدوی زندگی بسر کرتا تھا۔

———(((اللہ اکبر)))———

Marfat.com

اہل مکہ کی روایت تھی کہ اپنے بچوں کو پیدائش کے بعد مکہ سے باہر کسی دایہ کے سپرد کر دیتے تھے۔ اکثر مورخین و محدثین اس کی وجہ شہری (Urban) ماحول میں آلودگی بتاتے ہیں۔ ممکن ہے بچوں کو شیر خوارگی میں شہر سے باہر بھیجنے کی یہی وجہ ہو، لیکن تھوڑا سا غور و فکر کرنے سے اور بھی وجوہات سامنے آتی ہیں۔ مثلاً:

(1) یہ کہ عرب کی قبائلی زندگی میں افراد کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ عرب قبائل ہمیشہ افرادی قلت محسوس کرتے رہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ تھا۔ کہ یوں مکہ سے باہر ریگزار میں رہنے والے افراد سے تعلقات بڑھتے تھے۔ ایک ہی عورت کا دودھ پینے والے بچے آپس میں رضائی بہن بھائی کہلاتے تھے۔ رضائی بہن بھائیوں کو سگے بہن بھائیوں کے برابر عزت و تکریم دی جاتی تھی۔ یوں بڑے ہو کر یہ بچے جنگ و جدل میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے۔

(2) دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ صحرائے عرب اس دور میں دنیا کا سخت ترین (Hard Area) علاقہ تھا۔ ریگزارِ عرب میں پہنچ کر زندگی اپنے تصور وقتی طور پر سہی، بدل لیا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایران اور روم جیسی سپر طاقتوں کو صحرا کو پاٹنے سے ڈر لگتا تھا۔

وہاں کی شہری زندگی قدرے ست اور آسان تھی۔ اہل مکہ اپنے شیر خوار بچوں کو اس لیے شہر سے باہر بھیجتے تھے کہ وہ بچپن سے ہی صحرا نشینی اور ریگستانی سخت کوشی کے خوگر ہو جائیں۔ صحرائی سخت کوشی ایام شیر خوارگی سے ہی انکی فطرت کا حصہ بن جائے۔ شہر سے باہر کا سخت ماحول اور ترش آب و ہوا ان کی جبلت میں سرایت کر جائے تا کہ آئندہ عملی زندگی میں ریگزارِ عرب کی تلخیاں ان کے سفر و تجارت و جنگ میں رکاوٹ نہ بننے پائیں۔ کاروباری یا حربی آزمائش میں صحرا کی تپش یا گرمی انھیں بزدل نہ بنا سکے۔

—(((اللہ اکبر)))—

موسم بہار کے اوائل میں بادیہ قبائل کی عورتیں جمع ہو کر مکہ کا رخ کرتیں تا کہ شیر خوار بچوں کو رضاعت میں لے کر دودھ پلائیں۔ اس کے عوض کچھ تو معاوضہ بھی مل جائے گا اور سب سے بڑھ کر فائدہ یہ ہوگا کہ اس طریقہ سے قریش کے بزرگوں کے ساتھ انکے خاندانی تعلقات اُستوار ہو جائیں گے جو آئندہ زندگی میں افرادی قلت کے کسی نہ کسی موڑ پر کام آئیں گے۔

یاد رہے کہ قریش مکہ حرم کے متولی تھے جس کی وجہ سے پورا عرب ان سے تعلقات بڑھانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

حسبِ معمول اس سال بھی بنو سعد[3] بن بکر اور ہوازن کی کئی اور عورتوں کا دستہ مکہ آیا، مگر وہ

Marfat.com

تمام عورتیں محمد ﷺ کو ایک یتیم اور لاوارث سمجھ کر چھوڑ گئیں۔ صرف حلیمہ سعدیہ ایسی واحد عورت تھی جسے کسی نے کوئی بچہ گودی نہ دیا۔ چاروناچار خاوند سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے یتیم اور لاوارث بچے کو گود لیا۔

حلیمہ سعدیہ کہتیں ہیں کہ یہ قحط سالی کا موسم تھا۔ میرا اپنا بچہ دودھ کی قلت کی وجہ سے بلکتا رہتا تھا۔ میری چھاتی[4] سوکھی رہتی تھی۔ خشک سالی اور چارہ کی کمی کی وجہ سے ہماری اونٹنی بھی دودھ کم ہی دیتی تھی۔ ہم میاں بیوی اکثر بھوکے رہتے تھے۔ مجھے کوئی ثروت مند گھرانے کا بچہ نہ ملا تو میں نے اپنے خاوند سے کہا خالی ہاتھ لوٹنے سے بہتر ہے، یہ یتیم بچہ ہی لے لیں۔ بڑا ہو کر اس کا شمار بھی قریش کے بزرگوں میں ہوگا۔

قارئین یتیم اور لاوارث سمجھ کر چھوڑنے والی عورتوں کو اگر بتا دیا جاتا کہ یہی تو وہ ہیں جو وجۂ ظہورِ کائنات ہیں۔ یہی تو ہیں جن کی وجہ سے کائناتِ ارضی کا میلہ سجا ہوا ہے۔ یہی تو ہیں جو سردارِ انسانیت ہیں تو وہ سب کچھ کھو کر بھی اس بچے کو دودھ پلانا باعث فخر سمجھتیں۔

حلیمہ کو بھی تو صرف اتنا ہی احساس تھا کہ یہ بھی بڑا ہو کر قریش کے بزرگوں میں شمار ہوگا۔ اس بے چاری کو کیا پتا تھا کہ وہ دنیا و آخرت کے بزرگ کی رضاعت کا شرف حاصل کر رہی ہیں۔ حلیمہ کہتی ہیں خاوند کے ہاں کہنے پر میں نے محمد ﷺ کو گود لے لیا۔ ابھی ہم مکہ سے تقریباً آدھی[5] منزل دور نکلے تھے کہ میں اپنے اندر ایک تغیر محسوس کرتی ہوں۔ چھاتی میں چھبن سی ہوتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے چھاتی دودھ سے پھٹی جا رہی ہے۔ میں نے دونوں بچوں کو دودھ پلانا شروع کر دیا۔ دونوں نے سیر ہو کر دودھ پی لیا۔ حیرانی ہوتی ہے۔ دودھ ابھی باقی ہے۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے، میرا اپنا بچہ بھوک سے بلکتا رہتا تھا۔ آج دونوں نے سیر ہو کر پی لیا۔ وہ کہتی ہیں جب ہم اپنی منزل پر پہنچے تو میرے میاں نے اونٹنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: حلیمہؓ دیکھو اونٹنی کے تھن اکڑ چکے ہیں۔

بات پھر وہی اسباب کی کہ خدا کی ذات اسباب خود ہی پیدا کر لیتی ہے۔ حلیمہؓ سعدیہ مفلوک الحال اور قحط زدہ تھیں۔ خوشحالی نے اس کے گھر ڈیرے جما لیے۔ ہر قسم کے خیر اور برکتیں ان کے گھر اتر آئیں۔

دو سال تک حضورؐ اس گھر میں رہے۔ دو سال بعد 573ء کے لگ بھگ آپ کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ اس عرصہ میں کئی کمالات حلیمہؓ کے گھر والوں نے دیکھے۔ آپؐ جب دھوپ میں نکلتے تو بادل[6] سایہ فگن ہو جاتے۔ اس بچے کی برکات سے حلیمہؓ کے گھر کی قسمت ہی بدل گئی۔

Marfat.com

حلیمہ فرماتی ہیں کہ میرا بچہ دودھ نہ ہونے کی وجہ سے یا بھوکا رہ جانے کی وجہ سے ساری ساری رات جاگتا رہتا جس کی وجہ سے ہمیں بھی جاگنا پڑتا تھا، لیکن جس دن سے میری گود محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آشنا ہوئی، اس دن سے دونوں بچے سیر ہو کر دودھ پیتے اور آرام سے سوئے رہتے۔ میرا شوہر بوڑھی اونٹنی کی طرف جاتا تو دیکھتا کہ اس کے تھن پھٹے جا رہے ہیں۔ وہ دودھ دوہتا اور ہم سب خوب سیر ہو کر پیتے۔ وہ فرماتی ہیں کہ خدا کی قسم میں نے زندگی بھر بنوسعد کی بستیوں سے زیادہ کسی کو قحط زدہ نہیں دیکھا، مگر جب سے حضورؐ کی تشریف آوری ہوئی تو میرے گھر کی حالت ہی بدل گئی۔

شام کو ہماری بکریاں چراگاہ سے لوٹتیں تو خوب دودھ سے بھری ہوتیں۔ ہم دودھ دوہتے اور خوب پیتے۔ قبیلہ کے دوسرے لوگوں کی بکریاں دودھ سے بالکل خالی ہوتیں۔ کوئی بھی بکریوں سے قطرہ تک دودھ نہ دوہ پاتا۔ ہمارے قریب رہنے والے بزرگ اپنے چرواہوں سے کہتے۔ ارے کم بختو ابوذویب کی بیٹی کا چرواہا جہاں بکریاں چراتا ہے تم بھی وہیں چروایا کرو۔ وہ ایسا ہی کرتے، مگر پھر بھی وہ بکریاں دودھ سے خالی لوٹتیں۔ یہ واقعات دیکھ کر میرا شوہر کہتا: حلیمہؓ خوب سمجھ لو کہ تم نے ایک ذات مبارکؐ کو پایا ہے۔

الغرض ہم اللہ تعالیٰ کی جانب سے خیر و برکت ہی دیکھتے رہے۔ دو سال کے عرصہ میں آپؐ کی نشوونما ایسی ہوئی کہ آپؐ عام بچوں سے زیادہ تنومند تھے۔ دو سال بعد ہم محمدؐ کو لے کر اس کے گھر والوں کے پاس چھوڑنے چلے گئے۔

دل نہیں چاہتا تھا۔ ہم اسے مزید اپنے پاس رکھنے کے آرزومند تھے۔ ہم نے سیدہ آمنہؓ سے منت سماجت کر کے بچے کو مزید رکھنے کی اجازت لے لی۔

واپس لے آنے کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جو تاریخ اور سیرتؐ میں شقِ صدر کے نام سے موسوم ہے۔ حلیمہ سعدیہ فرماتیں ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس آنے کے چند ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ آپؐ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ گھر کے پچھواڑے میں بکریوں کے بچوں میں کھیل رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رضاعی بھائی ہانپتا ہوا گھر آیا۔ کہنے لگا۔ میرے بھائی کو سفید کپڑوں میں ملبوس دو آدمیوں نے پکڑ لیا ہے اور اس کا پیٹ چاک کر کے مار رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں اور آپؐ کے رضاعی والد اس طرف دوڑ پڑے۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ آپؐ اکیلے کھڑے ہیں۔ رنگ فق ہو چکا ہے۔ میرے شوہر نے اٹھا کر گلے لگا لیا اور پوچھا بیٹے کیا ہوا تھا۔

آپؐ نے فرمایا "میرے پاس سفید کپڑوں میں ملبوس دو آدمی آئے۔ انھوں نے مجھے لٹا کر

Marfat.com

میرا پیٹ چیر دیا اور اس میں سے کوئی چیز تلاش کرتے رہے ہیں۔ میں نہیں جان سکا، وہ کیا تلاش کر رہے تھے۔

بعثت کے بعد کی ایک روایت، جو ابن اسحاق نے ثور بن یزید کے حوالہ سے بیان کی، اس میں شق صدر کے متعلق حسب ذیل تفصیلات موجود ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

میں اور میرا رضائی بھائی گھر کے پچھواڑے[8] میں بکریوں کے بچے چرا رہے تھے کہ دو آدمی سفید کپڑوں میں ملبوس میرے پاس برف سے بھرا ہوا طشت لے کر آئے انھوں نے مجھے پکڑا اور پیٹ چاک کر دیا۔ میرا دل نکالا اور اسے بھی چاک کر کے کالے گوشت کا ایک ٹکڑا نکال کر پھینک دیا۔ پھر برف سے دل خوب دھو کر صاف کر دیا۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا کہ اسے اس کی اُمت کے دس آدمیوں کے برابر تولو۔ تولا گیا تو میرا وزن زیادہ نکلا۔ پھر اس نے کہا کہ اُمت کے سو اشخاص سے تولو ان کے ساتھ تولا گیا تو میں وزن میں ان سے بھی بڑھ گیا۔ پھر کہا گیا کہ اُمت کے ہزار افراد کے ساتھ تولو تولا گیا تو میرا وزن ان سے بھی بڑھ گیا۔ اس کے بعد اس شخص نے کہا اسے چھوڑ دو۔ تم اگر اسے اس کی پوری اُمت کے ساتھ تولو گے تو بھی یہ وزن میں بڑھ جائیں گے۔"

یہ دیکھ کر حلیمہ کے شوہر نے کہا کہ مجھے خوف ہے کہ اسے کوئی اثر ہو گیا ہے۔ اس اثر کے ظاہر ہونے سے قبل اس کے گھر پہنچا دو۔ 553 عیسوی کے آخری ایام میں آپؐ کو آپؐ کی والدہ کے سپرد کر دیا گیا۔ چار سال تک حضورؐ والدہ کے زیر سایہ رہے۔

آپؐ کے ننھیال مدینہ میں تھے۔ 577ء میں آپؐ کی والدہ مدینہ میں عدی بن نجار کے پاس آئیں۔ مقصد ماموؤں کو ملانا اور والد کی قبر دکھانا تھا جو مقام ابوا میں تھی۔ بدقسمتی سے آپ کی والدہ مقام ابوا پر ہی انتقال فرما گئیں۔ یوں حضورؐ آغوش مادر کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے۔ آپ مقام ابوا پر والد کے پہلو میں والدہ کو دفنا کر مکہ چلے آئے۔

اب کفالت دادا محترم عبدالمطلب کے ذمہ ہوئی۔ دو سال بعد عمر مبارک آٹھ سال ہوئی۔ غالباً 579ء سن عیسوی تھا کہ دادا محترم بھی داغ مفارقت دے گئے اس کے بعد کفالت کا ذمہ چچا محترم ابو طالب نے اٹھایا۔

آفرین ہے ابو طالب پر جنھوں نے اپنی زندگی کے آخری سانس تک اس عظیم ذمہ داری کو کماحقہ نبھایا۔ اولاد سے بڑھ کر پیار دیا۔ اولاد سے زیادہ عزیز رکھا اور محبت اور شفقت دی۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

عملی زندگی کا آغاز

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کا آغاز اس عمر سے شروع ہو جاتا ہے جس عمر میں بچوں کو ہنسنے کھیلنے اُچھلنے کودنے اور لاڈ پیار کے سوا کسی چیز کی خبر نہیں ہوتی۔

چار سال دو ماہ اپنی گود رکھنے والی دایہ حلیمہ سعدیہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو والدہ محترمہ حضرت آمنہؓ کے سپرد کر دیا۔ چھ سال[9] کی عمر میں والدہ کے سائے سے محروم ہو گئے والدِ محترم پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے اب والدہ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے۔ یتیم ولاوارث بچے کا منہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ذرا دل کی گہرائیوں سے تصور کیجئے کہ اس حالت میں کوئی خوشی بطور خوشی احساسات کو تھپیڑے دے سکتی ہے۔ احساسات اور خوشیاں مر نہیں جاتیں؟ غم اور تنہائیاں لمبی نہیں ہو جاتیں؟ زندگی بے معنی سی نہیں ہو جاتی؟ دادا کے دل میں جھانک کر کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ پوتے کی یتیمی دیکھ کر دل ہی دل میں پسیج رہے تھے۔ بچے کو چاچے اور چاچیوں پر چھوڑنے کی بجائے بڑھاپے میں خود ہی بوجھ اٹھا لیا۔ خود ہی زیرِ کفالت لے لیا۔

دادا نے یتیم ولاوارث بچے کو دل و جان سے عزیز رکھا۔ وہ اپنی تمام تر شفقتِ پدرانہ اپنے پوتے پر نچھاور کر دینا چاہتے تھے۔ کہتے ہیں عبدالمطلب نے اس سے پہلے کسی بیٹے بیٹی کو اتنا پیار نہیں دیا جتنا کہ محمدؐ بن عبداللہ کو دیا۔ اپنے بیٹے، بیٹیاں پال پوس کر فارغ ہونے کے بعد اس بڑھاپے میں پھر سے پوتے کے پالنے کی ذمہ داری آ پڑی جسے عبدالمطلب نے بخوشی قبول کیا۔

مگر قدرتِ خداوندی کو یہ سب کچھ منظور نہیں تھا۔ وہ ذات باری تو آپؐ کو دنیاوی احسانات سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ وہ ذات تو بدستِ خود آپ کی تربیت و پرورش اور حفاظت کرنا چاہتی تھی۔

جب عمر مبارک آٹھ سال[10] کی ہوئی تو دادا بھی چل بسے۔ اب حضورؐ بالکل بے سہارا ہو گئے۔ بظاہر تاریکیاں ہر طرف سایہ فگن تھیں، محرومیاں تھیں کہ بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ یکے بعد دیگرے بالکل کچی عمر میں صدمے پر صدمہ ابھی تو اتنے دودھ کے دانت بھی نہیں گرے تھے جتنے غم

Marfat.com

ٹوٹ پڑے۔ اس حالت میں مونس اور ہمدرد چچا ابو طالب نے کفالت کا بیڑہ اٹھالیا اور ایسا سہارا دیا کہ زندگی کے آخری سانس تک ہر طرح سے نبھایا۔

آفرین ہے! ابو طالب نے جس طرح حق سرپرستی ادا کیا، شاید سگے والدین بھی اس طرح نہ کر پاتے۔ وہ بھتیجے کو اپنے ساتھ سلاتے، اپنے ساتھ کھلاتے۔ سفر تجارت اور محفل و پنچائیت ہر جگہ آپ کو ساتھ رکھتے اُن کے اہل خانہ کبھی حضورؐ کی غیر موجودگی میں کھانا شروع کر دیتے تو ابو طالب فوراً روک کر کہتے، [11]ٹھہرو میرے بیٹے کو بھی آ جانے دو پھر حضورؐ آ جاتے تو کھانا شروع کیا جاتا۔ باوجود اس کے محرومی کا فطری غم اور ترشی تو یوں ختم ہونے سے رہی۔

بھائیو! محرومیوں کے ایسے اندھیروں میں اگر کوئی اور ہوتا تو شاید رونے جھگڑنے اور مجرمانہ تاریکیوں میں بھٹک جانے کے سوا کچھ نہ کر پاتا، لیکن آفرین ہے آپؐ نے کبھی بے صبری اور محرومی کو مقاصدِ زندگی پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

دادا کی وفات کے وقت آپ لڑکپن کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جب انسانی سرشت (Nature) میں موجود منفی رجحانات اور عوامل انسانی شخصیت میں عجیب و غریب قسم کا تغیر پیدا کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مثبت (Positive) تبدیلیاں بھی اپنے نقطۂ عروج کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہوتی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اس عمر میں تعمیر و تخریب کے مادے شخصیت کے بحرِ ذخار میں تلاطموں کی سی کیفیت پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر انسان محرومیوں کا پروردہ ہو تو جوانی تک پہنچنے سے پہلے ہی تخریبی عوامل تعمیر کی تمام صلاحیتوں کو مغلوب کر کے انسان کو گناہ اور جرم کی ان گہرائیوں میں دھکیل دیتے ہیں جہاں پوری زندگی انسان بھٹکتا رہتا ہے۔ پستیاں اور ذلالتیں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔

نبی کی قوتِ ارادی اور نفیس سوچ نے محرومی کی ان تیرہ و تار راتوں میں بھی زندگی کے اعلیٰ و ارفع مقاصد کو تمام حالات پر حاوی رکھا۔ منفی رجحانات کو نزدیک آنے ہی نہیں دیا۔ بیکار سوچوں اور گھٹیا صلاحیتوں کو محنت و مشقت کی دبیز تہوں میں دفن کر دیا۔ آپؐ غمزدہ خیالات میں کھوئے رہنے کے بجائے بکریاں ہانک کر پہاڑوں کا رخ کر لیا کرتے۔ جب کوئی کام نہ ملتا تو دوسروں کی بکریاں مزدوری پر چرانے چلے جاتے اور قراریط[12] یعنی دینار کا دسواں حصہ مزدوری وصول کرتے۔ جنگل میں بھوک اور پیاس سے ترہتر محرومیاں پیچھا کرنے لگتیں تو پیلوں[13] کے پودوں سے سیاہ رنگ کی پکی ہوئی پیلکیں کھا کر محرومیوں کے اس جھٹکے سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے۔

ریگزارِ عرب کی جھلسا دینے والی دھوپ میں آپ اپنی پیاس کبھی بکریوں کے دودھ سے اور

Marfat.com

کبھی درختوں کے پتوں سے بجھاتے۔ ذرا غور کیجیے یہ کرب انگیز حالت تسلسل کے ساتھ طاری کر دی گئی ہے۔ کہیں یہ آئندہ زندگی میں پیش آمدہ حالات کا پیش خیمہ تو نہیں۔ کیا ایسا تو محسوس نہیں ہوتا کہ قدرتِ خداوندی پیش بندی کے طور پر بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تربیت دے رہی ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

بارہ سال کی عمر تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے گردونواح میں گلہ بانی کرتے رہے۔ 583ء اور بارہ عام الفیل کو قریش کا ایک تجارتی قافلہ ابو طالب کی نگرانی میں سفرِ شام کے لیے تیار ہوا۔ قافلہ چلنے لگا تو آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ [14] لپٹ گئے۔ ان کا بھتیجے کو اس طرح لپٹے ہوئے دیکھ کر دل بھر آیا۔ انھوں نے بازوؤں میں ہمدردی سے کھینچتے ہوئے کہا، خدا کی قسم میں اپنے بیٹے کو ضرور ساتھ لے جاؤں گا۔

یہ حضور کی عملی زندگی کا پہلا تجارتی سفر تھا جو اپنے شفیق چچا ابو طالب کی زیرِ سرپرستی کیا۔ جب قافلہ شام کے شہر بُصریٰ کے قریب پہنچا تو وہاں ایک عیسائی راہب بحیرہ نے نوٹ کیا کہ ایک بادل کا ٹکڑا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر سایہ فگن ہے۔ درخت اور پتھر جھک جھک کر سلام پیش کر رہے ہیں۔ اس کے دل میں بچے کے متعلق تجسس سا اُبھرا۔

قافلۂ قریش کو روکنے کے لیے اس نے ایک دعوت کا اہتمام کیا اور تمام چھوٹے بڑے اہلِ قافلہ کو مدعو کر لیا۔ جب سب لوگ کھانے پر بیٹھ گئے تو بحیرہ نے پوچھا تم میں سے کوئی آدمی پیچھے تو نہیں رہ گیا۔ ایک آدمی نے جواب دیا کہ ایک لڑکا کجاووں [15] کے پاس بیٹھا ہے۔ اس نے کہا، اسے بھی بلا لاؤ۔ کھانے کے بعد راہب نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خواب، [16] معاملات اور نجی مصروفیات پر چند سوالات کیے اور پھر قمیض اٹھا کر پشت پر مہرِ نبوت کی تصدیق کر لینے کے بعد ابو طالب کو نصیحت کی کہ اس کو واپس لے جاؤ۔ یہ بچہ آخری نبی بننے والا ہے۔ اگر یہودیوں نے اسے دیکھ لیا تو اسے مار ڈالیں گے۔ ابو طالب بحیرہ کی نصیحت کے مطابق لوٹنے لگے تو اس نے زادِ راہ کے لیے خشک [17] روٹی اور زیتون کا تیل تحفتہً دیا۔

سفرِ شام سے واپس آ کر آپ پھر معمول کے مطابق گلہ بانی سے منسلک ہو گئے۔ سفرِ شام کے چند سال بعد عربوں کی مشہور جنگ "فجار" ہوئی ابنِ ہشام عمر 14 یا 15 سال بتاتے ہیں۔ جبکہ ابنِ اسحاق، ابنِ سعد، بلاذری اور ابنِ جریر سے جو روایتیں منسوب ہیں، ان کے مطابق جنگ بیس عام الفیل کو لڑی گئی۔ یہ دوسری روایت چونکہ کثرتِ رائے پر مبنی ہے، اس لیے اکثر مورخوں نے

Marfat.com

اسی سے اتفاق کیا ہے۔

اس حساب سے جنگِ فجار 591ء کو حضورؐ کی عمر کے بیسویں سال لڑی گئی یہ عرب کی چوتھی بڑی جنگ تھی۔ اسے جنگِ فجار اس لیے کہا گیا کہ یہ حرمت والے مہینوں میں لڑی گئی۔ یہاں ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں حضور بھی اپنے خاندان کے ساتھ شریک تھے۔

اس جنگ میں عرب قبائل دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک فریق بنی کنانہ کا تھا جس میں قریش بھی شامل تھے، دوسرا فریق قیس عیلان کا تھا جس میں طائف کا قبیلہ ثقیف اور قبیلہ ہوازن شامل تھے۔

اس جنگ میں نبی اکرمؐ نے شرکت کی۔ آپؐ صرف اس حد تک شریک تھے کہ اپنے چچا ابو طالب کو ترکش سے تیر نکال کر دیتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں عملاً لڑائی نہیں لڑی۔ نبوت ملنے کے بعد اکثر اس پر افسوس کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ کاش میں جنگِ فجار میں اتنا حصہ بھی نہ لیتا۔

اب جبکہ لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ خود ہی نگرانی اور حفاظت فرماتے رہے۔ جاہلیت کی بدعات، گندگی اور مکہ کے اوباش ماحول سے آپؐ کو فطری طور پر نفرت رہی اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے آپؐ عام جوانوں سے ہٹ کر انتہائی سنجیدہ، معاملہ فہم اور پختہ کار نظر آتے تھے۔ معاملات میں سچے اور صاف گو، اخلاق میں بہترین، صبر و تحمل میں عظیم تر، عزت نفس کے لحاظ سے انتہائی خوددار، انکسار پسند، فحاشی، عریانی اور جھوٹ سے متنفر اور کردار کے لحاظ سے انتہائی پاکباز دکھائی دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جوانی کے گمراہ ناموں اور طعنوں کی بجائے پوری قوم آپ کو صادق و امین کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ مکہ کی اس معاشرت میں یہ بہت بڑا اعزاز (Role of honour) تھا۔ بہت بڑا تمغۂ حسنِ کارکردگی تھا۔ اخلاق اور حسنِ کارکردگی کا یہ عالم کہ دوست تو دوست، دشمن بھی معترف تھے۔ وفاداری پابندیٔ عہد اور دیانت ضرب المثل تھی۔

سنن ابی داؤد میں عبداللہؓ بن ابی حمسہ سے ایک روایت مذکور ہے کہ ایک دن آپؐ نے عبداللہؓ بن ابی حمسہ سے کسی کاروباری سلسلے میں کسی جگہ ملنے کا وعدہ کیا۔ حضرت عبداللہؓ بن ابی حمسہ فرماتے ہیں کہ مجھے وعدہ یاد نہ رہا۔ اتفاقاً تیسرے دن اس مقام سے میرا گزر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ عبداللہؓ کو دیکھ کر صرف اتنا کہا تو نے خواہ مخواہ مجھے اتنی تکلیف دی۔ اس کے علاوہ کوئی نامناسب لفظ استعمال نہیں کیا اور وہاں سے چلے گئے۔

ایفائے عہد کی اس سے بہتر کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ یہ نبوت سے پہلی زندگی کے معمولات ہیں۔ نبوتؐ کے بعد جو واقعات پیش آئے اور جو آپؐ نے صبر اور شکر کیا، موقع کی مناسبت سے انشاء اللہ درج کریں گے۔ ویسے یہ حقیقت واضح اور اپنی جگہ اٹل ہے کہ سیرت نبویؐ کا پورا پورا احاطہ کرنا کم از کم کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ ایک ایک پہلو پر چودہ سو سال سے لکھا جا رہا ہے، مگر ہر دور میں تشنگانِ سیرت و سنتِ نبویؐ اسی پہلو سے نئے انداز اور نئے زاویے اختیار کرتے رہے۔ سیر حاصل تصانیف پھر بھی نہ لا سکے۔ خود لکھنے والے ہر دور میں اس تشنگی کا اظہار کرتے رہے۔

ممکن ہے تربیت اور طبیعت کی پختگی میں کچھ نہ کچھ حصہ بزرگوں یا خاندان کی تربیت کا بھی ہو، مگر قرائن اور حالات تو اسی پر بضد ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ودیعت کردہ ہے۔ چونکہ بزرگوں کی عمر نے کوئی اتنا وقت ہی نہیں دیا کہ جی بھر کے ان کی صحبت سے استفادہ کرتے۔ یکے بعد دیگرے سرپرستوں کی اموات نئے دکھ اور نئے مصائب لاتی رہیں۔ ان کی زندگی کو پڑھنے اور سمجھ کر چلنے کا موقع ہی کب ملا۔

باوجود حالات کی دگرگونی کے آج ہم دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کا آغاز نجی حوالہ سے تو بہت ہی مغموم ہے، لیکن انسانی، معاشرتی اور کائناتی حوالے سے انتہائی خوبصورت، خوشنما اور پختہ تر ہے۔ پھر یہ تو محض ابتدا ہے جو انتہائی کسمپرسی کی حالت میں اتنی شاندار ہے۔ اس کی انتہا جبکہ مطلع قدرے صاف ہو چکا ہوگا، دیکھتے ہیں کیسی ہوگی۔

———(((الحمد للہ)))———

انسانی حقوق کی پہلی عالمی تنظیم
(حلف الفضول[18])

صحرائے عرب میں سینکڑوں قبائل مختلف اصولوں اور روایات کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ تمام اہلِ قبیلہ کی ریاست، سیاست، اور حکومت قبیلہ ہی ہوتا۔ کوئی فرد ریگزارِ عرب میں قبیلے سے علیحدہ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مصائب و مشکلات میں قبیلہ ہی مددگار ہوتا اور صحرائے عرب کا ہر قبیلہ خواہ وہ دیہاتی (Rural) تھا یا شہری اپنے اصول و روایات کے لحاظ سے ایک خودمختار ریاست بھی تھا اور حکومت بھی۔ اس قبائلی ریاست و حکومت کے قلمدانِ تصرف میں گو قبیلہ کے چند افراد ہی ہوتے تھے، لیکن عرب کا یہ قبیلہ اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں خودمختار اور آزاد تھا۔ اس پر کوئی (UNO) اقوام متحدہ، سلامتی کونسل، آئی ایم ایف یا ورلڈ بنک مسلط نہ تھی۔ ریگزارِ عرب میں اس طرح کی سینکڑوں[19] قبائلی ریاستیں قائم تھیں۔ ان کی اپنی قبائلی اور قدرے خودمختار حکومتیں بھی تھیں جن کا سربراہ (Chief Exective) قبیلے کا سردار ہوتا۔ ان قبائلی حکومتوں کے پاس انتظام و انصرام کے لیے پولیس تھی، نہ دفاع کے لیے فوج اور نہ انصاف کے لیے باقاعدہ عدالتیں۔ بس احساسِ ذمہ داری تھا جس کے بل بوتے پر افراد قبائل کی شکل میں زندہ تھے۔ بعض اوقات بعض قبائلی ریاستیں مختلف موسموں میں (Move) حرکت کر کے دوسری جگہ ڈیرے جما لیتیں دوسرے موسم میں پھر واپس اپنے علاقے میں آ جاتیں۔ بہرحال مختلف قبائل کے پاس اپنے اپنے علاقے تھے۔

ضرورت پڑتی تو جرگے یا پنچائتیں فیصلہ سناتیں۔ اس پنچائیت یا جرگے کا فیصلہ تیسری دنیا کی موجودہ عدالتوں سے زیادہ موثر ہوتا۔ دفاع کی ضرورت پڑتی تو قبیلے کے تمام بوڑھے بچے اور نوجوان لشکر کی شکل اختیار کر لیتے۔ یوں تمام قبائل کی خودمختاری نے علاقے میں بظاہر طاقت کا توازن برابر کر دیا تھا۔

اگر آج کوئی قبیلہ ڈکیتی کرتا تو اگلے دن اسے بھی لٹنا پڑتا۔ بظاہر طاقت کا توازن برابر تو تھا،

مگر کوئی مرکزی حکومت یا باقاعدہ انتظامی فورس کے فقدان کی وجہ سے راہزنی، ڈکیتی، آبروریزی اور کئی دوسری معاشرتی برائیوں کا گراف آسمانوں کو چھو رہا تھا۔

بعض اوقات فردِ واحد کی غلطی کا خمیازہ پورے قبیلے کو بھگتنا پڑتا۔ کسی ایک شخص نے غلطی کی اور آناً فاناً جنگ چھڑ گئی پھر نسل در نسل انتقامی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

جنگِ داحس[20] اور جنگِ فجار[21] اور مدینہ میں اوس و خزرج کی جنگیں معمولی معاملات یعنی چراگاہوں یا پانی یا دوسری معمولی باتوں کی وجہ سے چھڑی تھیں۔

اس حوالہ سے کسی بھی فرد پر کوئی انفرادی ذمہ داری نہ تھی ہر شخص کا جینا مرنا، چلنا پھرنا، اوڑھنا بچھونا قبیلے کے لیے تھا۔ کوئی قتل کا مرتکب ہوتا تو قاتل کا انتقام پورے قبیلے یعنی بوڑھوں، بچوں اور عورتوں سمیت لیا جاتا۔ پھر قبائلی زندگی تھوڑی مہذب ہوئی تو انھوں نے قصاص اور دیت کے اصول وضع کر لیے۔ گو ان پر کسی حد تک عمل ہوا اور کسی حد تک نہیں، بلکہ اس ضابطے پر بھی طاقت، رشوت اور اقربا پروری کا اجارہ رہا۔ طاقتور قبائل من مانی ہی کرتے رہے۔

زندگی تھوڑی سی اور مہذب ہوئی تو افراد میں عزت نفس اور ذاتی حفاظت کا احساس پیدا ہوا۔ لوگوں کی سوچ اور شعور میں تبدیلی آئی۔ مختلف قبائل نے آپس میں فوجی اور تجارتی معاہدے[22] کر لیے۔ ان معاہدوں کا افراد کی نجی زندگی یا امن و امان کی صورتحال پر تو کوئی اثر نہ ہوا، البتہ جو قبائل دوسروں کو حلیف بنانے میں ناکام ہوئے یا کسی بڑے قبیلے کے ساتھ فوجی اور تجارتی معاہدے سے منسلک نہ ہو سکے۔ وہ مادی اور معاشی لحاظ سے کمزور ہوتے گئے اور جو دوسرے قبائل کو ملانے میں کامیاب ہو گئے، وہ نہ صرف تجارتی اور معاشی لحاظ سے سنبھل گئے، بلکہ اجتماعی معاہدوں سے مادی قوت میں بھی دوسروں سے مضبوط طاقت بن گئے۔ اب بجائے بے راہ روی رکنے کے طاقتوروں کے دانت اور بھی تیز ہو گئے۔

مکہ میں چونکہ دس قبائل آباد تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو گئے تو ان کی طاقت کا پلڑا پورے عرب پر بھاری ہو گیا۔ باہر سے آنے والوں پر مکہ میں اگر کوئی ظلم ہوتا تو مظلوم کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ واپس جا کر اپنے قبیلے کو لائے اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا حساب لے، لیکن اس صورت میں بھی اسے مکہ میں موجود دس قبائل کی افرادی قوت کا سامنا کرنا پڑتا۔ مکہ والوں سے حساب لینا اب قصۂ دیرینہ تھا۔ موجودہ قبائلی ترقی نے معاشرے کو مکمل طور پر جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول میں ڈھال دیا۔ شاید اسی وجہ سے اب مکہ آنے والے زائرین پر آئے دن ظلم کا کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہو جاتا۔ مظلوم بیچارہ نہ کسی سے انصاف طلب کر سکتا

اور نہ انتقام لینے کی جرأت کرتا۔

—(((اللہ اکبر)))—

حج کا مہینہ تھا۔ کہیں دور دراز سے بدوی قبیلے[23] کا ایک آدمی حج کی غرض سے مکہ آیا۔ اس کی نوجوان اور خوبصورت لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی۔ مکہ میں ایک آدمی نے مسافر کی لڑکی کو اغوا کر لیا۔ اغوا کنندہ کو معلوم تھا کہ مغویہ کا قبیلہ اتنا چھوٹا ہے کہ مکہ کے دس قبیلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مغویہ کے باپ نے مکہ میں مدد کے لیے بہت واویلا کیا۔ کسی نے ایک نہ سنی۔ کوئی بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔

اُدھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی خبر ہوئی تو انھوں نے مکہ کے چند نوجوانوں کو اکٹھا کیا۔ جن میں ان کے چچا زبیر بن عبدالمطلب بھی تھے۔ آپؐ نے فرمایا ''اہلِ مکہ کو اس قسم کی بے ہودہ اور ظالمانہ روایت قائم نہیں کرنی چاہیے۔ سب نے معاملہ کو غیرت مندی سے لیا۔ اگلے دن اکٹھے ہو کر اس قسم کے واقعات کو روکنے کی تدبیر اختیار کرنے کا وعدہ ہوا۔

اگلے دن زبیر بن عبدالمطلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کئی اور نوجوان عبداللہ بن جدعان[24] کے گھر اکٹھے ہوئے۔ باہمی اتفاق سے ایک منشور طے کیا گیا اور منشور پر حلف اٹھانے کے لیے تمام حضرات متفق ہوئے۔

یاد رہے کہ یہ مشورہ تین ذی الحجہ 20 عام الفیل 581ء کو طے ہوا۔

عبداللہ بن جدعان حضرت ابوبکرؓ کے بھتیجے اور حضرت عائشہؓ کے چچیرے بھائی تھے۔ اس تنظیم کا نام حلف الفضول پڑا۔ تمام ممبران نے حلف اٹھایا جس کے الفاظ کچھ یوں تھے۔

''ہم حلف اٹھاتے ہیں کہ ظالم کو مظلوم[25] کا حق دینے پر مجبور کر دیں گے اور ہم عہد کرتے ہیں کہ مظلوم خواہ امیر ہو یا غریب بغیر کسی طمع و لالچ کے اس کی مدد کریں گے۔''

قارئین! یوں تو آدم علیہ السلام سے حضورؐ کی نبوت تک انبیاء اکرام اور ان کے پیروکاروں کی طرف سے جتنی تحریکیں اٹھیں۔ ساری کی ساری انسانی زندگی کے دنیوی اور اُخروی حقوق کے لیے تھیں، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے ممبرانِ حلف الفضول کی اس تنظیم کو ہم انسانی حقوق کی پہلی عالمی تنظیم اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے پہلے اس قسم کی سیکولر تنظیم کہیں نظر نہیں آتی۔ اس حوالے سے بھی ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان دنوں حضورؐ ابھی مبعوث بھی نہیں ہوئے تھے اور اس میں مذہب کا کوئی عمل دخل بھی نہیں تھا۔ اگر موجودہ دور میں چلنے والی حقوقِ انسانی کی تنظیموں (NGO's) سے حلف الفضول کا موازنہ کیا جائے تو یہ ہزار درجہ بہتر نظر آتی ہے۔ مکہ کی

Marfat.com

اوباش سوسائٹی میں اس طرح کی رضا کار تنظیم قائم کرنا اور ظالموں کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا کوئی خالہ جی کا باڑہ نہیں تھا۔

بہر حال مذکورہ بالا حلف اُٹھانے کے بعد تمام رضا کاروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملکر حجرِ اسود[26] کو آبِ زمزم[27] سے دھویا اور اس کا پانی پیا تا کہ قسمیں پکی ہو جائیں۔ ان دنوں مکہ میں قسمیں اور حلف اسی طریقہ سے پکے کیے جاتے تھے۔

حلف اُٹھانے کے فوراً بعد تمام ممبران اس شخص کے گھر گئے جس نے لڑکی اغوا کی تھی۔ گھر کو محاصرے میں لے کر حکم دیا گیا کہ لڑکی اپنے باپ کے حوالے کر دی جائے۔ اغوا کنندہ نے کہا مجھے آج رات کی مہلت دے دو۔ کل صبح ہوتے ہی میں لڑکی کو اس کے باپ کے حوالے کر دوں گا۔ رضا کاروں نے حکم دیا کہ ابھی اور اسی وقت لڑکی کو اس کے باپ کے حوالے کرو، ورنہ ہمارے ساتھ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ طوہاً وکرہاً اسے اسی وقت لڑکی چھوڑنا پڑی۔

چند ماہ بعد یمن کا ایک تاجر، جس کا نام زبیر[28] تھا، مال تجارت کے ساتھ مکہ آیا۔ ابو جہل نے اس سے سارا مال خرید کر قبضہ میں لے لیا جب اس نے وصولی کا مطالبہ کیا تو ابو جہل نے لیت ولعل سے کام لینا شروع کر دیا۔ وہ بیچارہ سردارانِ مکہ میں سے ایک ایک کے در پر جا کر رویا۔ کسی نے جھوٹا دلاسہ تک نہ دیا۔ جب اس واقعہ کی خبر حلف الفضول کے ممبران کو ہوئی تو انھوں نے ابو جہل کو مال کی پوری قیمت ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔

بعد ازاں مکہ یا مکہ کے نواح میں جس کسی کو کوئی مشکل در پیش ہوتی، وہ سیدھا کارکنانِ حلف الفضول کے پاس پہنچتا اور یہ نوجوان بلا تامل مدد اور راہنمائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔

حلف الفضول کے متعلق حضور نبوت[29] کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ "اس کے عوض اگر کوئی مجھے سو سرخ اونٹ بھی پیش کرتا تو میں اونٹ چھوڑ دیتا، مگر تنظیم چھوڑنے پر رضامند نہ ہوتا۔ اگر آج بھی کوئی مجھے اس قسم کی تنظیم میں شمولیت کی دعوت دے تو میں بخوشی قبول کروں گا، سو سرخ اونٹ کی قیمت آگے درج ہے۔ (البدایہ والنہایہ) سیرت النبیؐ۔

—(((اللہ اکبر)))—

حلف الفضول کا قیام کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پوری تاریخِ انسانی میں اس سے پہلے تصور مذہب سے پاک ایک غیر جانبدار اور اتنی موثر تنظیم کہیں نظر نہیں آتی۔ ذہن میں رہے کہ یہ نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے اور نبوت سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانیت سے لگاؤ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

Marfat.com

پورے ریگزار عرب میں حلف الفضول نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ مکہ کی غیر مہذب معاشرت میں اس قسم کا تصور بھی محال تھا کہ ظالم سے اس کے ظلم کی پوچھ گچھ بھی ہو سکتی ہے۔ مظلوم کی حمایت اور دادرسی بھی کی جاسکتی ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے حلف الفضول کی داغ بیل ڈال کر یہ ثابت کر دیا کہ مظلوم کا حسب نسب کتنا ہی چھوٹا اور قبیلہ خواہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، اس کی دل و جان سے مدد کرنا انسانیت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔

اس کے علاوہ یہ واقعہ اس لیے بھی بڑا اہم ہے کہ حضورؐ میں نبوت سے پہلے بھی اعلیٰ قسم کی اخلاقی، معاشرتی، جماعتی قدریں موجود تھیں۔

پچھلے صفحات پر ایک روایت لکھی گئی ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں اس تنظیم کے بدلے سو سرخ اونٹ بھی ٹھکرا سکتا تھا۔ یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ کسی بھی مادہ پرست (Materialistic) معاشرے میں اس قسم کے عزائم رکھنا اور قدم اٹھانا یقیناً جان جوکھوں کا کام ہے۔ آیئے ذرا اُس دور میں سو سرخ اونٹوں کی قیمت اور اہمیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔

اُس وقت مکہ میں ایک عام[30] اونٹ کی قیمت چار سو (400) دینار تھی جبکہ سرخ اونٹ عرب کی منڈیوں میں چار سو دینار سے لیکر سات سو دینار تک بکتا تھا۔ ایک بردہ یعنی غلام آٹھ درہم سے لے کر ایک سو پچاس درہم تک قیمت پاتا۔ اس میں جوانی، خوبصورتی اور ڈیل ڈول کے حساب سے بولی دی جاتی تھی۔ مکہ میں نیزہ کی قیمت چار درہم جبکہ اونٹ کا کجاوہ تیرہ درہم میں فروخت ہوتا تھا، کدال کی قیمت چھ درہم جبکہ گندم کی روٹی کی قیمت بھی چھ درہم تھی۔ گندم کی روٹی کی زیادہ قیمت نے بھی اونٹ کو مہنگا کر دیا تھا، کیونکہ اکثر لوگ اونٹنی کے دودھ اور کھجوروں پر ہی گزارہ کرتے تھے۔ مروجہ قیمتیں دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ اس دور میں انسان سستے، جانور اور اشیائے خورد و نوش مہنگی تھیں۔

اگر ایک سرخ اونٹ کی اوسط قیمت -/600 چھ سو درہم لگائی جائے تو سو سرخ اونٹ کی قیمت چھیاسٹھ ہزار بنے گی اور ہمارے آج کے روپے سے موازنہ کیا جائے تو قیمت پچیس یا تیس لاکھ کے درمیان چلی جائے گی ذرا غیر جانبداری سے سوچیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانیت پروری کا اندازہ لگائیے۔

آج جبکہ سلامتی کونسل انسانی حقوق کے نعرے بلند کرتے تھکتی نہیں۔ ہزاروں قسم کی غیر سرکاری رضاکار تنظیمیں (Non Governmental Orgnisational Associations) کام کر رہی

Marfat.com

ہیں۔اس کے باوجود انسانیت تیزی سے بے عزت ہو رہی ہے۔ان تنظیموں اور ایسوسی ایشنوں کے لوگ بذات خود طمع، لالچ اور ناموری کے حصول کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ان کے کارکنان بذات خود انسانیت کے لیے بہت بڑا داغ ہیں جس طرح (U.N.O) اقوام متحدہ، امریکہ اور مغربی ممالک کے ہاتھوں کھلونا ہے۔اسی طرح غیر سرکاری رضا کار تنظیمیں بھی تو مفاد پرستوں کے ہاتھوں کھلونا ہیں۔

ذرا غیر جانبداری سے چودہ صدیاں پیچھے مڑ کر مکہ کی اوباش معاشرت میں جھانکنے کی کوشش کریں تو حلف الفضول موجودہ غیر سرکاری رضا کار تنظیموں سے ہزار گنا زیادہ موثر نظر آتی ہے۔

پھر یہ بات بڑی اہم اور اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے کہ موجودہ رضا کار تنظیموں کی بنیاد آج سے چودہ سو سال قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ کے چند نوجوانوں نے ''حلف الفضول'' جیسی موثر رضا کار تنظیم بنا کر ڈال دی تھی، مگر موجودہ دور کی ان رضا کار غیر سرکاری تنظیموں کے سربراہان یا بانی شخصیات ذاتی مفادات کے اندر جکڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔جبکہ حلف الفضول صدیوں بعد بھی انسانیت کی مبلغ اور نجات دہندہ کے روپ میں اوراق گم گشتہ کی متاع بے بہا بن کے بیٹھی ہے۔

الحمد اللہ یہ سارا اعجاز نبی اُمی رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر متضاد اور باعمل شخصیت و کردار ہی کا تھا۔

(((الحمد للہ)))

Marfat.com

تاریخِ حرم کا بہترین پنچایتی فیصلہ

مکہ میں بارش کا سالانہ اوسط آج کی طرح اس زمانے میں بھی بہت کم تھا، لیکن 606 عیسوی کو مکہ کی سرزمین پر بادل خاصی بے رحمی سے برسا۔ یہ غالباً 35 عام الفیل کا سال تھا۔

خانہ کعبہ ان دنوں ایک نارمل آدمی کے قد کے برابر[31] اونچا تھا۔ بغیر چھت کے اور وادیٔ مکہ کے نشیبی علاقہ میں تھا۔ دیواریں عام پتھروں سے کھڑی کی گئیں تھیں۔ بارشوں کی زیادتی کی وجہ سے پانی کے بہاؤ نے نشیبی وادی میں کٹاؤ کیا تو کعبہ کی دیواریں زمین بوس ہو گئیں۔

حرم کے اندر ایک چوبچہ[32] نما غلہ تھا۔ زائرین سونے اور چاندی کی صورت میں نذریں اس غلے میں پھینک دیا کرتے۔ اب چونکہ بارش کی زیادتی نے دیواریں زمین بوس کر دیں تو اندر داخلہ آسان ہو گیا۔

ابولہب[33] بن عبدالمطلب نے بنی ملیح بن عمر کے آزاد کردہ غلام "دُوَیک" سے مل کر خزانہ چوری کر کے دُوَیک کے گھر چھپا دیا۔ اکابرین نے چوروں کا سراغ لگاتے لگاتے خزانہ دُوَیک کے گھر سے برآمد کر لیا۔ برآمدگی چونکہ دُوَیک کے گھر سے ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے قبائلی دستور کے مطابق دُوَیک کے ساتھی بریٔ الذمہ[34] قرار پائے، جبکہ دُوَیک کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

اس کے علاوہ بارش سے چند روز پہلے خانہ کعبہ کی عمارت میں آگ[35] لگ گئی جس سے عمارت کو کافی نقصان پہنچا۔

آگ کا لگنا، خزانہ کا چوری ہونا اور بارش کی وجہ سے عمارت کا گرنا۔ یہ تینوں واقعات وقفے وقفے سے سن 606 عیسوی اور 35 عام الفیل میں پیش آئے۔

ان واقعات نے اکابرین قریش کو خانہ کعبہ کی تعمیرِ نو کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا۔ سردارانِ مکہ کی ایک مجلسِ شوریٰ تھی۔ جسے دارالندوہ کہا جاتا تھا۔ یہ شوریٰ معاملات پر کثرتِ رائے سے فیصلے کیا کرتی تھی۔ دارلندوہ نے کثرتِ رائے سے کعبہ کی تعمیرِ نو کا بل پاس کیا جس میں معاملات

یوں طے پائے۔

بوسیدہ اور ٹوٹی پھوٹی عمارت شہید کر کے قدرے بلند اور پختہ عمارت تعمیر کی جائے۔ اوپر چھت بھی ڈال دی جائے۔ فنڈز کی دستیابی کے لیے تمام قبائل کی شرکت کو ضروری قرار دیا گیا۔

آج جس طرح وطن عزیز میں مخیّر حضرات میں سے کچھ شیخی خورے لوگ ظاہری شان و شوکت کا بھرم رکھنے کے لیے رشوت، راہزنی، ڈکیتی، ہیرا پھیری، فراڈ اور بعض مخصوص طبقوں میں عصمت فروشی سے حاصل ہونے والی آمدنی کو حرام اور قابلِ مذمت سمجھنے کی بجائے باعثِ فخر تصور کیا جانے لگا ہے، بالکل اسی طرح چودہ سو سال پہلے مکہ کی مدنی زندگی پر بھی ان بدقماشوں کی بھرپور یلغار تھی۔ اب مسئلہ چونکہ خالصتاً خانہ کعبہ کی تعمیر نو کا تھا۔ اس کے لیے ناجائز آمدنی کا تصرف ناجائز ہی نہیں حرام بھی تھا۔ اس لیے وہب بن عمر نے حکما کہہ دیا:[36] "اے قریش کے لوگو اس جگہ زناکاری، سود اور کسی پر ظلم کر کے حاصل کیا ہوا پیسہ خرچ نہ کیا جائے۔" یہ تمام معاملات طے پا جانے کے بعد چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی گئی۔

حسنِ اتفاق سے ایک کشتی رومِ صغری[37] سے یمن کی طرف ایک بہت بڑے کلیسا کے لیے سامان لے جا رہی تھی۔ سمندری طوفانوں نے اسے گھما پھرا کر سعیبس[38] یعنی جدہ کے قریب خشکی پر پٹخ دیا۔ یہاں زمین کافی دلدلی تھی جس میں کشتی دھنستی جا رہی تھی۔ اس میں ایک آزمودہ کار معمار بکوم (Bacum) بھی موجود تھا۔

جہاز ڈوبنے کی خبر سن کر ولید[39] بن مغیرہ جدہ پہنچا۔ اس نے معمار بکوم (Bacum) سے کہا کہ دلدل میں پھنستے اور دھنستے جہاز کو نکالنا ممکن نہیں رہا۔ یقیناً اس میں موجود سامان بہت جلد دلدل کی گہرائیوں میں اتر جائے گا۔ اگر تو اجازت دے تو ہم یہ سامان اُتار کر کعبہ کی تعمیر نو کے لیے استعمال کر لیں اور ہاں تو ایک ماہر معمار ہے اگر تو قبول کرے تو ہم تعمیرِ کعبہ کی ذمہ داری تجھے دینے کو تیار ہیں۔

یہ رومی معمار رومِ صغریٰ (ترکی) کے دارالحکومت بازنطین یعنی استنبول کا رہنے والا تھا۔ اس نے یہ تجویز مان لی اور سامان اُتروا کر مکہ پہنچانا شروع کر دیا۔

(((اللہ اکبر)))

اس سے پینتیس (35) برس قبل جب ابرہہ اشرم نے خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ابابیلوں کا عذاب نازل کر کے اسے لشکر سمیت صفحۂ ہستی سے ملیامیٹ کر دیا۔ اس

Marfat.com

لیے اہلِ مکہ کعبہ کو گرانے سے ڈرتے تھے کہ کہیں ہم پر کوئی عذاب مسلط نہ کر دیا جائے۔

ابنِ ہشام تعمیرِ کعبہ کے باب میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ بیت اللہ میں ایک بہت بڑا اژدہا رہتا تھا جو نہ کسی کو ڈستا اور نہ ہی تنگ کرتا۔ اگر کوئی اسے تنگ کرتا تو وہ پھنکارتا اور اسے کھانے کو دوڑتا۔ اس کے خوف کی وجہ سے بھی لوگ بیت اللہ کو گرانے سے ڈرتے تھے۔

ایک دن وہ سانپ دھوپ میں بیٹھا ستا رہا تھا کہ آسمان سے ایک عقاب آیا۔ اسے اٹھا کر لے گیا۔ اس سے اہلِ مکہ سمجھ گئے کہ وہ جو کام کرنا چاہتے ہیں، اللہ نے اژدہے کے شر سے نجات دلا کر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ اس سانپ کے متعلق عربی ادب میں کافی اشعار ملتے ہیں۔ چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

اس کی جلد سے کبھی تو خاص قسم کی آواز ہوا کرتی تھی اور کبھی کبھی حملہ [40] بھی کیا کرتا تھا اور جب ہم کعبہ کی تعمیرِ نو کے لیے اٹھے تو سانپ ہم پر حملہ کر کے ڈراتا اور خود بھی ڈرتا تھا۔ پھر جب اس کی نقصان رسانی سے ہم ڈر گئے تو آسمان سے عقاب آیا جس کا نزول اسی کے لیے ہوا تھا۔ اس عقاب نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا اور ہمارے لیے کعبہ خالی کر دیا اور ہم متفق ہو کر تعمیرِ کعبہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زبیر بن عبدالمطلب کے اشعار سے لیا گیا ہے۔

سانپ کے اٹھنے کے بعد بھی لوگ کعبہ کو گرانے سے ڈرتے تھے۔ سب سے پہلے ولید بن مغیرہ نے رکن کی جانب سے ایک پتھر اکھاڑا اور دعا کی "یا اللہ ہم تو بھلائی ہی کے طالب ہیں۔ باقی لوگ رات بھر انتظار کرتے رہے کہ اگر ولید پر عذاب آیا تو ہم اس کام سے رک جائیں گے۔ اگلی صبح تک ولید بالکل امن و امان سے رہے۔ تب لوگوں نے مختلف حصے بانٹ لیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں بنیاد رکھی تھی وہاں تک عمارت شہید کر دی گئی۔

سب سے پہلے تعمیر کے لیے پتھر جمع کیے گئے۔ ہر قبیلہ علیحدہ علیحدہ پتھر جمع کرتا اور اپنے حصے کی دیوار پر لگا دیتا۔ اس کام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس اپنے قبیلے کے ساتھ پتھر اکٹھے کرتے رہے۔ پتھر اکٹھے کرتے اور اٹھاتے اٹھاتے آپ کے کندھے زخمی ہو گئے۔ قدرت کی شانِ ملاحظہ ہو کہ جس گھر کی بنیاد ابراہیم نے رکھی اور دعا کی آج اسی دعا کا مقصود یعنی عزتوں والے نبی تعمیرِ کعبہ میں زخمی ہو رہے ہیں۔

یوں بالآخر کعبہ کی تعمیر تو مکمل ہو گئی۔ حجرِ اسود کے نصب کرنے پر ہر قبیلہ دعویٰ کرنے لگا کہ

Marfat.com

اس پتھر کا نصب کرنا صرف اسی کا حق ہے۔ اس پر تو تو میں میں سے بڑھ کر نوبت لڑائی تک جا پہنچی۔

بنی عبدالدار نے خون سے بھرا ہوا پیالہ لا رکھا۔ بنی عدی اور بعض دوسرے قبائل نے اس خون میں انگلیاں ڈبو کر چاٹتے ہوئے قسمیں کھائیں کہ وہ یہ حق کسی اور کو نہیں دیں گے۔ تاریخ نے ان لوگوں کو لعقۃ الدم[41] یعنی خون چاٹنے والے کا نام دیا۔

چار پانچ روز اسی کھینچا تانی میں گزر گئے۔ قریب تھا کہ خون کی ہولی شروع ہو جاتی۔ اتنے میں ولید بن مغیرہ کے بڑے بھائی اُمیہ بن مغیرہ، جو عمر میں پورے مکہ والوں سے بڑا تھا، نے بیچ میں آ کر کہا: "اے گروہِ قریش کل جو سب سے پہلے حرم میں داخل ہو، اسے حکم یعنی ثالث مان لیا جائے۔" اس بات سے تمام اکابرین نے اتفاق کیا۔

اگلے دن سب سے پہلے حرم میں داخل ہونے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ انھیں دیکھ کر تمام لوگ پکار اٹھے۔ ھذا الامین[42]۔ ھذا الامین، ھذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ امین ہیں۔ یہ امین ہیں۔ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رَضینا رَضینا۔ ہم راضی ہو گئے۔ ہم راضی ہو گئے۔

جب حضورؐ کو تمام معاملے کی خبر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: میرے پاس ایک چادر لاؤ۔ چادر لائی گئی۔ آپؐ نے وہ چادر زمین پر بچھائی اور حجرِ اسود اس میں رکھ دیا۔ تمام قبائل کا ایک ایک آدمی اس چادر کے اٹھانے پر لگا دیا۔ جب چادر مقررہ جگہ پر پہنچ گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرِ اسود اُٹھا کر نسب کر دیا۔

صدیوں پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حجرِ اسود نسب کرنے کے بعد یہ دعا مانگی تھی: "یا اللہ میری نسل میں سے ایک نبی پیدا فرما۔" اللہ تعالیٰ نے اسی ہونے والے مرسل کے ہاتھ سے حجرِ اسود نسب کروا دیا۔

قارئین اس واقعہ کو گہرائی سے دیکھیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت پورے مکہ میں اخلاق و کردار کے حوالے سے یا عقل و تدبر کے حوالے سے کوئی ایک آدمی ایسا نہ تھا جس کے فہم و فراست پر یا غیر جانبداری پر اعتبار کیا جا سکے۔ یہ ساری خوبیاں صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھیں۔ عین اس وقت جب چنگاری اڑ کر مہیب آلاؤ کی شکل اختیار کرنے والی تھی، محمدؐ کی اعلیٰ عدالتی، تنظیمی اور سیاسی فراست نے معاملے کو نہ صرف رفع دفع کر دیا، بلکہ اس انداز سے سنبھالا کہ کسی فریق کو ذرہ بھر اعتراض کرنے کی گنجائش نہ ملی۔

Marfat.com

یقیناً یہ بہت بڑی ثالثی ذمہ داری تھی جسے حضورؐ نے کما حقہ، ادا کیا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو حکم یا ثالث مقرر ہو جانے کے بعد شاید ہی اتنا جامع اور قابل قبول فیصلہ کر پاتا۔ وقتی اعزاز سے ناجائز اور نجی خواہشات کے مطابق بھر پور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔

آپؐ نے نہ صرف حجرِ اسود اپنے ہاتھوں سے نسب کیا، بلکہ اس شرف سے تمام اہلِ مکہ کو بھی باریاب کیا۔ یوں تاریخ نے آپؐ کی ثالثی، عدالتی صلاحیتوں کا صلہ دینے کے لیے مستقبل قریب اور بعید میں آپؐ کی صلاحیتوں کو متعارف کرانے کے لیے بڑے حسین اور نرم انداز سے اس واقعہ کو اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا۔

—(((الحمد للہ)))—

Marfat.com

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تجارتی منیجر

پچھلے ابواب میں ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی زندگی کا تھوڑا سا تجزیہ پیش کر چکے ہیں۔ ان کے چند معاشرتی اور سیاسی اقدامات کا ذکر کر چکے ہیں جن میں رضا کار تنظیم حلف الفضول اور تعمیرِ کعبہ کے دوران بہترین ثالث کی حیثیت سے اپنے آپ کو متعارف کروانا ہے۔ یہ واقعات اس بات کے کھلے دلائل ہیں کہ آپؐ میں پیغمبر بننے سے پہلے ہی بے پناہ خداداد صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان اقدامات سے آپؐ کی عام لوگوں پر صلاحیتوں کے اعتبار سے برتری واضح ہو جاتی ہے۔

سیاسی و معاشرتی و پنچایتی اور عدالتی مسائل کو لوگوں سے ہٹ کر دیکھنے کی عادت دراصل اس بات کا بہترین ثبوت ہے کہ آپؐ اس منصب جلیل پر فائز ہونے کی پوری پوری صلاحیت اور استعداد رکھتے تھے جس پر (40) چالیس عام الفیل 610ء میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سرفراز فرمایا۔

آپؐ اجتماعی اور سماجی معاملات کے علاوہ نجی اور ذاتی کردار کے لحاظ سے مکہ کے نیک ترین انسان کی حیثیت سے پورے معاشرے میں متعارف ہو چکے تھے۔

آپؐ کی حق گوئی ایفائے عہد، پابندئ وقت، ایمانداری اور سچائی پورے عرب میں ضرب المثل تھی۔ پورا مکہ، بلکہ پورا عرب آپؐ کو صادق اور امین کے القاب دے چکا تھا۔ معاشی اور تجارتی میدان میں ایک سچے اور مخلص دوست اور وعدہ کے سچے تاجر کی حیثیت سے چار دانگِ عرب میں پہچانے جا چکے تھے۔

آپؐ کے شفیق چچا ابو طالب آپؐ کی بصیرت اور صلاحیتوں کے متعلق پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، اگر غربت اور معاشی بدحالی نے تنگ نہ کیا ہوتا۔

اس وقت تجارت سرمایہ کاری کا بہترین ذریعہ تھا۔ لوگ قافلوں کی شکل میں سامان تجارت سے لدے صحرائی جہاز یعنی اونٹ لے کر نکلتے۔ بعض سرمایہ دار مختلف چیزوں کی خرید و فروخت میں شراکت کر لیتے اور کچھ لوگ جو خود نہ جا سکتے دوسروں کو اپنے سامانِ سوداگری کی خرید و فروخت کے

Marfat.com

لیے بھیج دیتے۔ دوسرے لفظوں میں سرمایہ کاری کے لیے مینجنگ ڈائریکٹر رکھ لیتے۔

ان دنوں مکہ قدرتی وسائل سے بے بہرہ تھا۔ زرعی اعتبار سے بنجر اور دہکتا ہوا ریگزار تھا۔ وسائل صرف گلہ بانی اور تجارت تک محدود تھے۔ اسی لیے مکہ کی سرمایہ کاری، یمن، حبشہ، شام، عراق، روم، ایران اور ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ تجارت کے سلسلہ میں انھیں فطری برتری حاصل تھی۔

ایران و روم کی چپقلش کی وجہ سے ان ملکوں کے تاجر دبکے بیٹھے تھے۔ خاص کر ایک دوسرے کے ممالک میں داخل ہونے سے گریز کرتے تھے۔ عرب تاجر چونکہ غیر جانبدار تھے۔ اس لیے انھیں دونوں ممالک کی منڈیوں میں پذیرائی مل جاتی۔ وہ تیزی سے سرمایے کو گردش دیتے۔ یثرب وحجاز یعنی مکہ اور مدینہ کی تجارتی سرمایہ کاری کا گراف نواحِ عرب کی باقی ریاستوں سے کہیں اوپر چلا گیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ غیر یقینی حالات میں بھی وہ حوصلے اور غیر جانبداری سے سرمایہ کاری کرتے رہے۔

معاشی زندگی کا انحصار سرمایہ کی تیز گردش پر ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی سرمایہ دار اکیلا اپنے سرمایے کو ایک حد سے زیادہ گردش نہیں دے سکتا۔ اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ سرمایہ کاری کے لیے کمپنی ترتیب دی جائے اور اس کمپنی میں قابل اور دیانتدار افرادی قوت بھرتی کر کے سرمائے کو تیزی سے متحرک کیا جائے۔

اس کام کے لیے سرمایہ کار کمپنی جتنی جلدی ایماندار افرادی قوت پیدا کرے گی، اتنی تیزی سے سرمایہ گردش کرے گا اور بڑھے گا۔

—(((اللہ اکبر)))—

مکہ میں کئی عالمی لیول کے سرمایہ کار موجود تھے۔ ان سب کی خواہش تھی کہ محمدؐ ان کا تجارتی انتظام سنبھال لیں۔ تجارت کے سلسلہ میں آپؐ پہلے بھی بیرونِ ملک دورے کر چکے تھے۔

ان دنوں ایک تجارتی کمپنی سرمایہ کاری کے لحاظ سے پورے عرب میں نہ سہی، کم از کم مکہ میں نقطۂ عروج پر تھی جس کی بانی اور سربراہ ایک بیوہ عورت خدیجہؓ تھی۔ عورت کی حیثیت سے تجارتی دوروں پر نکلنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اسے ہمیشہ کسی نہ کسی ایماندار اور محنتی منتظم (M.D) تاجر کی ضرورت رہتی۔

خدیجہؓ بنت خویلد ایک شریف [43] اور پاکباز عورت تھی۔ پاکبازی اور حیاداری اس کا طرۂ

Marfat.com

امتیاز تھا۔ اس امتیازی وصف کی وجہ سے پورا مکہ اسے "طاہرہ" یعنی "پاکباز" کے نام سے یاد کرتا تھا۔ ایسی حیادار اور پاکباز عورت کی معصومیت کیسے گوارا کرتی کہ وہ بذات خود دنیا کی منڈیوں میں ماری ماری پھرے۔ وہ ہمیشہ کسی مناسب آدمی کو مال کی مناسب شرح کے عوض محدود مدت کے لیے مالِ تجارت میں شریک کر کے بیرون ملک جانے والے قافلوں کے ساتھ بھیج دیتی۔ اس لیے وہ ہمیشہ باکردار ایماندار تاجروں کی تلاش میں رہتی۔

ابو طالب کے ساتھ آٹھ[44] سال کی عمر سے آپؐ نے تجارتی سفروں کا آغاز کیا۔ بعدازاں شام، یمن اور حبشہ تک کئی سفر کیے۔ اس عرصہ میں آپؐ نے مال کی اعلیٰ ادنیٰ اقسام اور قیمتِ خرید اور قیمت فروخت کا بخوبی تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ آپؐ کی ایمانداری اور دیانت کی شہرت نواحِ عرب میں پھیل چکی تھی۔ لوگ آپؐ کو صادق اور امین کے القاب سے پکارتے تھے۔ جن لوگوں کے ساتھ آپؐ نے تجارتی سفر کیے یا کچھ لین دین رکھا، وہ ہمیشہ آپؐ کے حسنِ معاملہ کے معترف رہے۔

حضرت سائبؓ[45] جب مسلمان ہونے کے لیے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو پاس بیٹھے کسی آدمی نے تعارف کروانا چاہا۔ آپؐ نے فرمایا میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ حضرت سائبؓ نے کہا آپؐ پر میرے ماں باپ قربان، میں آپ کا شریک تجارت رہا ہوں۔ آپؐ نے ہمیشہ معاملہ صاف صاف رکھا۔

حضرت قیس[46] بن سائب مخزومی بھی آپؐ کے شریک تجارت رہے۔ وہ بھی حضورؐ کے حسنِ معاملہ کے متعلق اسی قسم کے الفاظ کا اعادہ کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن ابی حمسہ[47] کا واقعہ پچھلے ابواب میں بیان کر چکے ہیں کہ کسی معاملہ میں انھوں نے کچھ دیر بعد آنے کا وعدہ کیا اور انھیں وعدہ یاد نہ رہا۔ تیسرے دن ان کا گزر اس جگہ سے ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپؐ اسی جگہ کھڑے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپؐ نے دیکھ کر صرف اتنا کہا کہ تم نے خواہ مخواہ مجھے زحمت دی۔

یہ واقعات صرف اخلاق و کردار کے حوالے سے ہی اہمیت نہیں رکھتے، بلکہ پیشے سے لگن اور محنت کا بھی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس احساسِ ذمہ داری اور پیشہ ورانہ لگن کا ہی نتیجہ تھا کہ بڑے بڑے تاجر آپؐ کی شراکت میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے تھے۔ اُن دنوں آپؐ کی صرف صداقت اور امانت ہی مشہور نہ تھی، بلکہ آپ مکہ کے بہترین تاجر کی حیثیت سے بھی متعارف ہو چکے تھے۔

Marfat.com

جب آپؐ کی دیانت، صداقت اور پیشہ ورانہ مہارت کی خبر حضرت خدیجہؓ کو ہوئی تو انھوں نے بلا کر درخواست[48] کی کہ آپؐ میری سرمایہ کاری میں کمیشن پر شریک ہو جائیں تو میں آپؐ کو دوسروں سے زیادہ کمیشن دوں گی۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں آپؐ بصریٰ یمن اور شام کی منڈیوں سے بخوبی واقف تھے۔ معاملہ طے پا گیا تو آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے تجارتی شراکت کا پہلا سفر شام کی طرف کیا۔ حضرت خدیجہؓ نے اپنا غلام میسرہ بطور خدمتگار (Runner) ساتھ بھیج دیا۔ چونکہ یہ پہلا سفر تھا اس لیے میسرہ کے ذمہ مخبری کا کام بھی تھا۔

آپؐ نے یہ سفر (25) پچیس[49] عام الفیل 596ء میں اور عمر کے پچیسویں سال کیا۔ بُصریٰ پہنچے تو کلیسا کے قریب ایک درخت کے نیچے قیام فرمایا۔ اس کلیسا کا متولی ایک راہب تھا۔ جس کو نسطورا[50] (Nastorees) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو درخت کے نیچے دیکھا تو میسرہ کو بلایا۔ میسرہ پہلے بھی کلیسا میں قیام کرتا تھا۔ اس لیے نسطورا (Nastorees) اسے جانتا تھا۔ اس نے پوچھا میسرہ یہ شخص کون ہے۔ اس نے کہا یہ قریشِ حرم میں سے ہے۔ نسطورا نے کہا کہ اس درخت کے نیچے آج تک نبی کے سوا کوئی نہیں بیٹھا۔

بہرحال آپؐ نے بُصریٰ کی مارکیٹ میں سامان فروخت کیا اور نیا سامان خرید کر واپسی اختیار کر لی۔ اب میسرہ نے مشاہدہ (Observation) کرنا شروع کر دیا۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ بادل سایہ کیے ہوئے آپؐ کی رفتار کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

جو مالِ تجارت لے کر گئے تھے۔ دوگنی قیمت پر فروخت ہوا اور جو مال خرید کر لائے تھے اس کے بھی مکہ کی منڈی میں اصل زر سے دوگنا زیادہ دام ملے۔ اس طرح اصل زر جو بی بی خدیجہؓ صاحبہ نے خرچ کیا صرف ایک ہی تجارتی دورے میں بہت بڑھ گیا۔

اتنا زیادہ منافع چونکہ پہلے کبھی کسی نے نہیں دیا تھا، اس لیے طے شدہ کمیشن کے علاوہ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو ایک[51] سرخ اونٹ بطور انعام دیا۔

اس ٹریڈنگ کمپنی میں بطور منیجر آپ کا یہ پہلا دورہ تھا۔ اس کے علاوہ اسی تجارتی کمپنی کے لیے حباشہ، جرش، بحرین اور کئی اور تجارتی مرکزوں کے دورے کیے۔ ہر سفر کی واپسی پر ایک اونٹ بطور تحفہ یا انعام دیا جاتا رہا۔

ہر سفر میں میسرہ حضورؐ کے ساتھ رہا اور ہر دفعہ خدیجہؓ اس سے سفر کی تفصیلات اور محمد صلی اللہ

Marfat.com

علیہ وسلم کے طریقۂ کار کے متعلق معلومات حاصل کرتی رہیں۔ آپ کی شرکت سے بی بی خدیجہؓ کے حصص بڑی تیزی سے اوپر جا رہے تھے۔ ڈائریکٹر کی پیشہ ورانہ مہارت حضرت خدیجہ کو مرعوب کیے جا رہی تھی۔ سیرت وصورت، اخلاق و بلند ظرفی اور پیشہ ورانہ محنت نے بی بی صاحبہ کو بالکل مسحور کر دیا۔ قابلیت، شرافت اور فطری صلاحیتوں نے جادو بن کر سر چڑھ کے بولنا شروع کر دیا۔ محترمہؓ کے دلِ پاکباز میں اس احساس نے بڑی شدت سے انگڑائی لی کہ کیوں نہ اس حسن وقابلیت کے عظیم شاہکار کو شریکِ تجارت کی بجائے شریکِ حیات بنا لیا جائے۔ کیوں نہ اس کی شراکت میں زندگی گزارنے کا تجربہ کیا جائے۔

ان سوچوں کے ساتھ ہی حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے ساتھ ازدواجی رشتہ میں منسلک ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ تفصیلات اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیے۔

———(((الحمد للہ)))———

ازدواجی زندگی کا آغاز

دنیا کے ہر انقلابی لیڈر کی ایک نجی زندگی بھی ہوتی ہے جسے گھریلو یا پرائیویٹ زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کسی بھی لیڈر کی ازدواجی زندگی کا مطالعہ کیے بغیر اس کی جگہ یا مقام کا تعین کرنا ناممکن ہے، مگر بدقسمتی سے تاریخ نے دنیا کے بیشتر لیڈروں کی نجی زندگی کو اپنی زمین میں رہنے ہی نہیں دیا۔ اگر کسی لیڈر کی نجی زندگی کا کہیں کسی کونے کھدرے میں حوالہ دیا بھی تو اہلِ خانہ کے ناموں کے سوا ذکر ضروری نہیں سمجھا۔

خوش قسمتی سے یہ شرف صرف رسولِ خداؐ کو حاصل ہے کہ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک پہلو تاریخ میں درخشندہ و تاباں ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ عربوں کا بہت بڑا احسان ہے کہ آج ہم اُٹھنے بیٹھنے اور جاگنے سونے سے لیکر سیرتؐ کے ہر شعبے سے راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ آج ہم انتہائی مستند حوالوں سے بخوبی جانتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں کس وقت کیا ارشاد فرمایا۔ گھر میں کھانا کس انداز سے کھایا، کاروبار، تجارت، معاملات، بول چال میں کونسا انداز اپنایا۔ گھر والوں کے ساتھ زندگی کیسے گزاری۔ مہمانوں کو کیسے ڈیل کیا۔ غرض زندگی کا کوئی حصہ آج بھی مخفی نہیں۔

اس کی شاید بڑی وجہ یہ تھی کہ اکثر لیڈر اپنی زندگی کو پبلک اور پرائیویٹ دو حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ یوں نجی زندگی عوام الناس سے پوشیدہ رکھی جاتی ہے تاکہ گھریلو خامیاں اور کمزوریاں باہر آنے سے لیڈری کا بھرم نہ کھل جائے۔ اس کے برعکس آپؐ نے کبھی اپنی زندگی (پرائیویٹ یا پبلک) دو حصوں میں تقسیم نہیں کی۔ آپؐ تو ہر میدان اور ہر شعبے کے راہنما تھے۔ اس لیے زندگی کا کوئی پہلو لوگوں سے پوشیدہ نہیں رکھا۔ آپؐ نے تو مثال بننا تھا۔ قیامت تک آنے والی نسل انسانی کو اپنی تحریک کے لبادے میں لپیٹنا تھا۔ کیسے اور کیوں چھپاتے۔ اگر کسی پہلو کو چھپا لیتے تو لوگ آج سنتوں سے مستفید کیسے ہوتے۔ اس لیے آپؐ کا گھر سے لے کر ایوان اقتدار تک ہر عمل، بلکہ ہر لمحہ قابل رشک تھا۔ قابلِ رشک ہے اور قابلِ رشک رہے گا۔

Marfat.com

سو آپؐ کے گھر کا ماحول انتہائی پاک، نفیس اور سادہ تھا، صرف یہی نہیں، بلکہ قابلِ رشک اور قابلِ تقلید بھی ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

کوئی بھی انقلابی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک بانیٔ تحریک کے افرادِ خانہ اس کے مددومعاون نہ بن جائیں۔ بانیٔ تحریک کی سب سے بڑی طاقت اس کے افرادِ خانہ ہی ہوتے ہیں۔ اگر افرادِ خانہ ہی مخالف ہوں تو نوح علیہ السلام کی صدیوں کی جدوجہد بھی تحریک کو ثمر آور نہیں ہونے دیتی۔

یہ تحریک، جس کے بانی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے، دنیا کی اکثر تحریکوں سے مقاصد، ترتیب، نظریات اور زمان ومکان کے لحاظ سے بالکل مختلف تھی۔ اس سے پہلے اور بعد میں آنے والی تحریکیں، خواہ وہ انبیاء اکرامؑ نے برپا کیں یا خالص مادہ پرست لیڈروں کے ذریعہ آئیں، ان کے مقاصد کسی خاص قوم، کسی خاص علاقہ یا کسی خاص نسل کو زیرِ اثر لانا تھا جبکہ رسولِ اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے برپا کی جانیوالی تحریک قبیلوں، نسلوں، علاقوں اور وقت کی قیود سے بالا قیامت تک آنیوالی پوری کی پوری نسلِ انسانی کو اپنے دائرہ اثرات میں لپیٹ لینے والی تھی۔ گویا یہ دنیا کی پہلی اور آخری سب سے بڑی انقلابی تحریک تھی۔ اس کا فریم ورک بھی اس کے حساب سے اتنا ہی بڑا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ بانیٔ انقلاب کی شریکِ حیات (Life Partners) بھی وہ ہستیاں قرار پائیں جو مستقبل قریب میں پیش آمدہ مشکلات ومصائب میں بانیٔ تحریک سے زیادہ نہیں تو کم از کم اس کے قریب قریب صبر واستقامت کا حوصلہ رکھتیں ہوں۔

———(((اللہ اکبر)))———

اور دیکھیے مکہ کی امیر ترین عورت جسے پورے مکہ میں ''طاہرہ'' یعنی پاکباز کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، جسے پانے کے لیے مکہ کے تمام رئیس زادے اپنی سی کوششیں کر رہے ہیں، مگر اس کی نظروں میں کوئی جچتا ہی نہیں۔ جچتا بھی کیسے، پوری سوسائٹی تو آلودہ اور بے حیا تھی۔ ''طاہرہؓ'' کی معصومیت اور پاکبازی کیونکر آلودہ معاشرت زدہ نوجوانوں کو پسند کرتی۔ اسے تو کسی ''طاہر'' کی تلاش تھی۔ طاہر بھی ایسا جس کی معصومیت کی گواہی مکہ ہی نہیں، بلکہ پورا عرب دے سکے اور اس کڑی شرط پر کون پورا اُترتا۔ اس قسم کا آئیڈیل محمدؐ کے سوا کون ہوتا۔

جیسا کہ پچھلے باب میں عرض کیا جاچکا ہے کہ حضرت خدیجہ طاہرہ ہی نہ تھیں، بلکہ مکہ کی سب سے بڑی مالیاتی ومعاشی منتظم بھی تھیں۔ سب سے بڑی ثابت کرنے کے لیے یہی دلیل کافی ہے

کہ جب بھی کوئی قافلہ بیرونِ ملک جاتا، اس میں تمام تاجروں کے برابر سامانِ تجارت حضرت خدیجہؓ کا ہوتا۔

پچیس عام الفیل۔ 596ء عیسوی اور حضورؐ کی عمر کا پچیسواں سال تھا جب خدیجہؓ آپؐ کے اخلاق و کردار اور نظم و نسق کے اعلیٰ محاسن کی گرویدہ ہو جاتی ہیں۔ آپؐ سے اپنے تجارتی انتظام و انصرام کی درخواست کرتی ہیں جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرما لیتے ہیں۔

596ء کے ابتدائی ایام میں آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کے تجارتی مال کے ساتھ مالیاتی تجارتی دوروں کا آغاز کیا۔ حضرت خدیجہؓ معترف تو پہلے بھی تھیں، مگر اب منافع کی چوگنی شرح نے اور بھی گرویدہ بنا دیا۔

یاد رہے ان دنوں حضرت خدیجہؓ سنِ پختگی کی آخری دہلیز پر کھڑی تھیں۔ ان کی دو شادیاں پہلے [52] ہو چکی تھیں۔ دونوں شوہر قضائے الٰہی سے رحلت فرما گئے۔ پہلے دونوں شوہروں کی نشانیاں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ان کے پاس موجود تھیں۔

اس سال بیرونی دوروں کی تعداد سیرت نگاروں کے نزدیک دو یا تین ہے۔ تمام دوروں پر حضرت خدیجہؓ نے اپنے ذاتی غلام میسرہ کو بطور "خدمتگار" (Batman) ساتھ بھیجا۔ ہر سفر سے واپسی پر میسرہ نے اپنی آقا کو حالات، مشکلات اور محمدؐ کے معمولات کی تفصیلات بتائیں۔ ان تفصیلات میں [53] نسطورا راہب کا بھی واقعہ تھا۔ اس چالیس سالہ خاتونِ محترم نے واقعات سن کر فیصلہ کیا کہ اس نوجوان کو شریک حیات بنا لیا جائے۔ دوسرے سفر سے واپسی کے تین دن بعد اس نے اپنے غلام میسرہ کو یہ پیغام دے کر بھیجا: [54] "اے میرے چچا کے بیٹے، آپؐ کی وسیع النظری اور پاکبازی دیکھتے ہوئے آپؐ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کی درخواست گزار ہوں۔ غور فرمائیے گا۔"

ان دنوں عرب میں شرم و حیا کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی پسند کے رشتے طے کرنے کی اجازت تھی۔ [55] بالغہ یا نابالغہ کی کوئی پابندی نہ تھی، البتہ اپنے قبیلہ سے باہر کسی فرد کو پسند کرنے کی اجازت نہ تھی۔

حضرت خدیجہؓ کے والد جنگ فجار سے چند دن پہلے انتقال کر چکے تھے جبکہ چچا، عمر بن اسد زندہ تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے بھی رشتے کے ابتدائی مراحل خود ہی طے کیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیغام وصول ہونے کے بعد اپنے چچا ابو طالب سے مشورہ کیا تو انھوں نے رضامندی ظاہر کر دی۔

(((اللہ اکبر)))

پہلے مفصل بیان کیا جا چکا ہے کہ عرب قبائل سیاسی، معاشرتی اور انتظامی لحاظ سے ایک خود مختار ریاست اور حکومت کا درجہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی قبیلہ فردِ واحد کو اپنی مرضی سے دوسرے قبائل سے لین دین کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ دوسرے قبائل سے تعلقات باہم صلاح مشورے سے قائم کیے جاتے تھے۔

جب بنو اسد کے سربراہ اور حضرت خدیجہؓ کے سگے چچا عمر بن اسد کو اس بات کی اطلاع دی گئی تو اس نے اپنی بھتیجی سے کہا کہ: ''میں مانتا ہوں کہ محمدؐ صادق اور امین ہیں، لیکن مالی اعتبار سے بالکل کمزور ہیں۔ جب خاندانِ بنو اسد اور دوسرے قبائل مکہ کو علم ہوگا کہ خدیجہؓ ایک غریب آدمی سے شادی کر رہی ہے تو وہ ہم پر طعنہ زنی کریں گے کہ کیا مکہ میں شوہروں کا قحط پڑ گیا تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نادار سے شادی کر رہی ہیں۔

جی ہاں قحط ہی تو پڑ گیا تھا۔ عرب میں پاکبازی و حیاداری، امانتداری اور دیانتداری کا، جو خود طاہرہ تھیں، اسے تو بس اسی دولت کی تلاش تھی۔ ممکن ہے حضرت خدیجہؓ کو کوئی مالدار مل جاتا، مگر محمدؐ جیسا سردارِ دو جہاں محبوب کبریا چھاننے سے بھی نہ ملتا۔ جب آئیڈیل سامنے تھا تو وہ کیوں کسی اور کو تلاش کرتیں۔

ادھر جب ابو طالب کو علم ہوا تو انھوں نے بنو اسد کے تمام معززین کو کھانے پر بلا لیا۔ کھانا کھلانے کے بعد ابو طالب نے تمام مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''اگرچہ فی الحال [56] محمدؐ ایک غریب آدمی ہیں، لیکن یہ مت بھولیے گا کہ وہ ہاشمی خاندان کے ایک شریف اور دیانتدار چشم و چراغ ہیں۔ حسب و نسب کے لحاظ سے وہ اگر بنو اسد سے اعلیٰ نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک خوبصورت اور خوب سیرت نوجوان ہیں۔ خوبصورتی اور بلندیٔ کردار بھی تو بہت بڑا خزانہ ہے۔ اے عمر بن اسد تو اس رشتے کی مخالفت کر کے خدیجہ کا دل توڑنے کا مرتکب ہوگا اور خدیجہؓ کے لیے شاید کوئی مالدار شوہر تو مل جائے، لیکن محمد جیسا خوبصورت صادق اور امین پورے عرب میں نہیں ملے گا۔''

قارئین ایسے لگتا ہے جیسے ابو طالب کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ انھیں یقیناً یہ کہنا چاہیے تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں کہیں نہیں ملے گا۔

بہر حال ابو طالب کی تقریر اثر آفرین ثابت ہوئی۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ مقررہ تاریخ پر معززین بنو اسد اور بنو مطلب خدیجہؓ کے گھر اکٹھے ہوئے۔ ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا۔ پانچ

Marfat.com

سوطلائی درہم حق مہر مقرر ہوا۔ ابن ہشام کے مطابق حق مہر میں بیس جوان اونٹنیاں دی گئیں، لیکن یہ روایت اصول روایت پر پورا نہیں اُترتی۔ اس لیے اکثر تاریخ نگاروں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اس لیے بالاتفاق روایت یہی ہے کہ حق مہر پانچ سو طلائی درہم تھا۔ شادی کی خبر سن کر آپ کی دایہ اور رضائی والدہ حلیمہ سعدیہؓ مبارک لے کر آئیں تو حضرت خدیجہ نے انھیں پانچ اونٹ تحفہ کیے۔ چند ماہ بعد دُوبارہ خدمت اقدسؐ میں حاضر ہوتی ہیں تو رسول اللہؐ نے اسے ایک اونٹ اور چالیس بکریاں مرحمت فرمائیں، حتیٰ کہ جب تک حلیمہ زندہ رہی حضورؐ اس کی اسی طرح خدمت کرتے رہے۔

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد آپؐ نے چچا ابو طالب کے بیٹے حضرت علیؓ کو اپنی سرپرستی میں لے کر متبنیٰ کیا۔ چونکہ ابو طالب آپؐ کے محسن تھے اور خدا کی ذات نبیؐ پر کسی کا احسان نہیں رہنے دیتی سو حضرت علیؓ کی سرپرستی احسان اتارنے کا ذریعہ تھی۔

انسانیت پرستی کا ایک اعلیٰ نمونہ دیکھیے۔ شادی کے تحفہ میں حضرت خدیجہؓ نے اپنا عیسائی غلام زید بنؓ حارث آپؐ کو بخش دیا۔ انسانوں کو غلام رکھنا آپؐ کی شانِ رحمت کے شایان نہ تھا۔ آپ نے تحفہ ملتے ہی اسے آزاد کر دیا۔

زیدؓ کے والد کو جب علم ہوا کہ اس کا بیٹا مکہ میں بقیدِ حیات ہے تو وہ اسے لینے کے لیے آ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید سے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اپنے والد کے پاس رہو اور اگر چاہو تو میرے پاس۔ زیدؓ بن حارث نے اپنے والد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے متبنیٰ قرار دے دیا۔

آپ عہدۂ نبوت سے سرفراز ہوئے تو حضرت علیؓ کے بعد اسلام لانے والے حضرت زیدؓ تھے۔ اب وہ زید بن محمدؓ کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ منع کر دیا۔ اَدْعُوهُم لِآبَائِهِم۔ یعنی بیٹوں کو ان کے اصل باپوں کے نام سے پکارو۔

———(((اللہ اکبر)))———

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات قدرے بہتر ہو گئے تھے، مگر صفات نبویؐ دیکھیے زندگی کے بہترین ایام میں بھی کبھی فضول خرچی نہیں کی۔ عمر بھر کبھی دو ڈشوں پر مشتمل کھانا نہیں کھایا۔ اکثر ایسا ہوا کہ اپنے حصے کا کھانا غریبوں کو کھلا دیتے۔ خود بھوکے رہتے۔

اس سے پہلے کسی شخص نے غریبوں، یتیموں، مفلسوں اور بے سہارا لوگوں کے لیے اتنی تڑپ کا

Marfat.com

مظاہرہ نہیں کیا، جتنا آپؐ کرتے تھے۔ مکہ کی امیر ترین عورت جب آپؐ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتی ہے تو مکہ دیکھتا ہے کہ عمروں کے بُعد کے باوجود کبھی ترش روئی نہیں ہوئی۔ حضرت خدیجہؓ بعثت کے بعد اپنی پوری جائیداد آپؐ کے مشن کی تکمیل کے لیے وقف کر دیتی ہیں حتیٰ کہ مفلسی اور فاقہ کشی کا وقت آجاتا ہے۔ انتہائی صبر اور تحمل سے حالات کا مقابلہ کرتی ہیں۔

حضرت خدیجہؓ سے تین بیٹے ہوئے جو بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ چار بیٹیاں ہوئیں جن کے نام رقیہؓ، زینبؓ، اُمِ کلثوم اور فاطمۃ الزہرہ تھے۔

آپؐ شادی کے بعد حضرت خدیجہؓ کے خاندان سے ایسے وابستہ ہوئے۔ لگتا تھا جیسے ان کے ہی خاندان کا حصہ ہیں۔ ازدواجی محبت کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر ایک دوسرے کو اونچی آواز سے نہیں بلایا۔ مبادا احترامِ محبت میں فرق نہ پڑ جائے۔ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں۔ دوسری شادی کا نام تک نہیں لیا۔

جب نبوت پر ایمان لانے کی باری آئی تو آپؓ ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے آمنّا و صدقنا کہا۔ وفا شعار اور ہمدرد بیوی کی وجہ سے ہمیشہ آپ کو حوصلہ دیا اور تحریک کو تقویت دی۔ آپ مخالفوں کی ناپسندیدہ باتوں سے رنجیدہ گھر تشریف لاتے تو وفا کے اس مجسم وجود کو دیکھتے ہی بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ کچھ دیر صحبت میں رہتے تو زوجۂ محترمہ ایسے کمر ہمت بندھاتیں کہ تازہ دم ہو کر پھر تحریکی دعوت و عمل پر لگ جاتے۔

گویا وہ صرف حضرت خدیجہؓ ہی تھیں جنھوں نے تحریک کو دوام بخشنے کے لیے نہ صرف مال و دولت لٹا دیا، بلکہ برابر آپؐ کے تکلیفیں سہیں۔ کئی کئی دن فاقے کاٹے۔ حضرت خدیجہؓ کے تحریک اسلامی پر احسانات کا اندازہ لگایئے خود اللہ تعالیٰ کی ذات نے متشکرانہ انداز میں اُخروی انعامات کا اعلان فرمایا۔

ابن ہشام مختلف روایتوں سے رقم کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے حکم ملا کہ خدیجہؓ کو ایک قصب یعنی کھوکھلے موتیوں کے گھر کی خوشخبری سنا دو جس میں نہ تکلیف ہے اور نہ شور۔''

ابن ہشام ایک اور جگہ اسی طرح کی روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جبریلؑ میرے پاس آکر کہنے لگے کہ خدیجہؓ کو اُن کے رب کا سلام پہنچا دیجیے۔ میں نے کہا خدیجہؓ یہ جبریلؑ ہیں اور تمھارے پروردگار کا پیغام تمھیں پہنچا رہے ہیں۔ جنابِ خدیجہؓ نے جواب

دیا اللہ تو خود ہی سلام ہیں۔ سب کو اسی سے سلامتی ملتی ہے اور جبریل پر بھی میرا سلام ہو۔"

قارئین حضرت نوح علیہ السلام کم وبیش ساڑھے نوسو برس تبلیغ کرتے رہے، مگر اتنی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا بیٹا کنعان اور نوحؑ کی بیوی تک مخالفت پر تلے رہے۔ ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نوحؑ کی بیوی اگر حضرت خدیجہؓ کی سی سیرت وکردار کی حامل ہوتی تو دجلہ وفرات کے درمیان کوئی ایسا ذی روح نہ رہتا جو راہِ ہدایت پر نہ آ جاتا۔ طوفانِ نوحؑ کے وقت اللہ کے نبی اپنے اہلِ خانہ کی خیریت کے لیے دعائیں مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسا کرنے سے منع فرما دیتا ہے۔

سبحان اللہ ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھیے کہ آپؐ کی زوجۂ محترمہ پر خدا کے مقرب فرشتے خدا کی طرف سے سلام لے کر اُتر رہے ہیں۔ یقیناً صرف حضورؐ ہی نہیں، بلکہ ان کے اہلِ خانہ اور ان کے صحابہ کرامؓ کی زندگیاں بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

اللہ سلامتی کرے اُن پر اور نظرِ رحمت فرمائے ہم پر۔ آمین!

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی صدیوں پہلے اخبار

عرب کی قدیم تاریخ کا مطالعہ بڑا دلچسپ اور چونکا دینے والا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے صدیوں پہلے جب ختم الرسل کا تصور بھی موجود نہ تھا، یہ سوچنا بھی قرین قیاس نہ تھا کہ مکہ کی بے آب وگیاہ اور سنگلاخ زمین پر نبوت کا پودا نمو پائے گا۔ خاندانِ ہاشمی کے کسی یتیم ولاوارث نوجوان کے سر پر دستارِ ختم الرسل سجادی جائے گی، لیکن تاریخ عرب کے بیشتر صفحات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیش گوئیوں سے بھرے پڑے ہیں انھیں دیکھ کر حقیقتاً قاری متحیر رہ جاتا ہے۔

ولادتِ رسولِ اُمی صلی اللہ علیہ وسلم سے سینکڑوں 57سال قبل شاہانِ یمن میں سے ایک کا نام ربیعہ بن نصر تھا جو بڑے طمطراق والا بادشاہ تھا۔ ایک دن محل میں بسترِ استراحت پر محوِ آرام تھا۔ کوئی عجیب وغریب خواب دیکھ کر ہڑبڑا کر اُٹھتا ہے۔ وزیروں مشیروں کو بلا کر حکم دیتا ہے، ایسے نجومیوں، فال گو، جادوگروں اور کاہنوں کو حاضرِ خدمت کیا جائے جو میرا خواب اور اس کی تعبیر بتا سکیں۔ منہ سے نکلنا تھا کہ نجومیوں کی فوجِ ظفر موج حاضر ہوگئی۔ اعلان کرتا ہے کہ مجھے بتاؤ میں نے خواب میں کیا دیکھا ہے جو یہ بتادے گا میں سمجھوں گا کہ وہ اس کی تعبیر بھی بتا سکے گا۔ اُن میں سے ایک شخص اٹھ کر کہتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی خواہش توشق اور سطیح پوری کر سکتے ہیں۔ اُن دونوں کے علاوہ اس قسم کا علم کسی اور کے پاس نہیں۔ چنانچہ دونوں کو لانے کے لیے حکام کو بھیج دیا گیا۔

(یاد رہے کہ شق اور سطیح اپنے دور کے ماہرِ علم نجوم تھے)

پہلے سطیح حاضرِ خدمت ہوا۔ بادشاہ نے کہا میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا ہے۔ تو نے اگر خواب بتادیا تو سمجھوں گا تو تعبیر بھی بتادے گا۔ سطیح گویا ہوا: بادشاہ سلامت تو نے ایک شرارہ دیکھا ہے جو اندھیرے سے نمودار ہوا اور نشیبی زمین پر جا گرا۔ وہاں موجود ہر دماغ والی چیز کو کھا گیا۔ یہ سن کر بادشاہ عش عش کر اُٹھا۔ کہنے لگا اے سطیح تو نے ذرا برابر غلطی نہیں کی اور ہاں بتا اس کی تعبیر کیا ہے۔

Marfat.com

سطیح نے کہا: دونوں پتھریلی زمینوں کے درمیان پائے جانے والے حشرات الارض کی قسم!! تمھارے ملک پر حبشی نازل ہوں گے اور مقامات ابین[58] و جُرش کے درمیانی علاقے پر قبضہ کرلیں گے۔ یہ سن کر بادشاہ نے کہا ارے سطیح تیرے باپ کی قسم! یہ تو بڑے غیظ وغضب اور دردوالم کی بات ہے۔ آخر یہ کب ہونے والا ہے؟ کیا میرے زمانہ میں یا میرے زمانہ کے بعد؟ کہا نہیں تیرے مرنے کے ساٹھ ستر سال بعد۔ پوچھا کیا ان کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ رہے گی؟ کہا نہیں ساٹھ ستر سال بعد ختم ہو جائے گی۔ یا تو وہ حبشی مارے جائیں گے یا یمن سے نکل جائیں گے۔ پوچھا اُن کا قتل واخراج کس کے ہاتھوں ہوگا؟ جواب دیا، عدن سے ارم ذی یزن[59] اُن پر حملہ آور ہوگا۔ وہ غالب بن فہر بن مالک بن نضرؒ کی اولاد سے ہوگا اور اس کی حکومت زمانے کے اختتام تک رہے گی۔ بادشاہ حیران ہوکر پوچھتا ہے کیا زمانے کو اختتام بھی ہے؟ کہا ہاں جس روز اگلے پچھلے سب جمع ہوں گے نیک لوگ خوش قسمت ہوں گے۔ برے لوگ بدنصیب ہوں گے۔ بادشاہ نے مزید استفسار کیا۔ یہ جو کچھ تم مجھے بتا رہے ہو کیا صحیح ہے؟ اُس اللہ کے بندے نے جواب دیا: قسم ہے شفق کی رات کے اندھیرے اور صبح صادق کی۔ میں جو خبر تجھے سنا رہا ہوں، سچ اور اٹل ہے۔

(((اللہ اکبر)))

سطیح کے بعد ایک اور اللہ کا بندہ حاضر ہوا جس کا نام ''شق'' تھا۔ بادشاہ نے شرف بازیابی کے لیے بلا کر وہی سوال کیا جو اس نے سطیح سے کیا تھا، مگر پہلے سے ہونے والی گفتگو سے باخبر نہیں ہونے دیا۔

شق نے کہا بادشاہ سلامت آپ نے ایک شرارہ دیکھا جو اندھیرے سے نمودار ہوا نشیبی اور ٹیلے والی زمین کے درمیان گرا اور ہر ذی روح کو کھا گیا۔ بادشاہ نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا ارے شق تو نے خواب کے متعلق ذرا بھر غلطی نہیں کی۔ اب ذرا اس کی تعبیر پر روشنی ڈالو۔

اس نے جواب دیا: دونوں پتھریلی زمینوں کے درمیان بسنے والے لوگوں کی قسم! تمھاری سرزمین پر حبشی نازل ہونگے جو تمام سبزہ زاروں پر قبضہ کرلیں گے۔ ابین سے نجران تک تمام علاقے اُن کے زیر تصرف آجائیں گے۔ بادشاہ نے پوچھا: آخر یہ سب کچھ کب ہونے والا ہے۔ میرے زمانے میں یا میرے بعد؟ شق نے جواب دیا یہ سب کچھ تیرے مرنے کے بعد ہوگا۔ پھر تیری نسل کو اُن سے ایک عقل ودانش والا نجات دلائے گا اور قابضین کو خوب مزہ چکھائے گا۔ پوچھا یہ عقل ودانش والا کون ہوگا۔ اللہ کے بندے نے جواب دیا: ایک نوجوان جو نہ کمزور ہوگا، نہ معاملات میں کوتاہی کرنے والا اور وہ ذی یزن[60] کے خاندان سے ہوگا۔ اُس کی حکومت ایک خدا

Marfat.com

کے بھیجے ہوئے کی وجہ سے ختم ہو جائے گی جو دینداروں اور انصاف کے ساتھ آئے گا اور اس کی حکومت قوم میں فیصلے کے دن [61] تک رہے گی۔ پوچھا کیا فیصلے کا دن بھی ہوگا؟ کہا: ہاں وہ دن جس روز حکام کو اُن کے کاموں کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس دن آسمان سے پکار آئے گی جو زندہ مردہ سب سنیں گے۔ تمام لوگ وقتِ معینہ پر جمع ہو جائیں گے۔ پرہیزگاروں کو کامیابیاں اور نیکیاں نصیب ہونگی۔ پوچھا جو کچھ تو کہہ رہا ہے، درست ہے؟

شق نے جواب دیا، آسمان و زمین کے درمیان جو کچھ پستی و بلندی میں ہے، ان سب کی قسم! جو خبر میں نے تجھے دی بلاشبہ یہ غلطی اور شک سے مبرا ہے۔

———(((الله اکبر)))———

ربیعہ بن نصر کے بعد حکومت کی باگ ڈور تبان اسعد ابو کرب کے ہاتھ آئی۔ وہ مدینہ سے گزرا تو واپسی پر اپنے بیٹے کو وہاں چھوڑ گیا۔ بنی عدی بن نجار نے اسے قتل کر دیا۔ بیٹے کے انتقام میں اس نے مدینہ پر فوج کشی کی۔ بنی قریظہ کے دو یہودی عالموں نے اسے نصیحت کی کہ وہ اس شہر کو مسمار نہ کرے کیونکہ یہ مقام ہجرتِ نبویؐ ہے جو مکہ میں قریش کے ہاں پیدا ہوگا اور ہجرت کر کے مدینہ آئے گا۔ اگر تو نے اس شہر کو مسمار کرنے کی کوشش کی تو ممکن ہے، خدا تجھے کسی عذاب سے دو چار کر دے۔ یہودی عالموں کی باتوں سے متاثر ہو کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور مذہبِ یہودیت اختیار کر کے واپس چلا گیا۔ واپسی پر اُس نے مکہ مکرمہ میں چھ یوم قیام کیا۔ کعبہ کا طواف کیا۔ سر کے بال منڈوائے۔ اونٹ اور بکریاں ذبح کر کے قربانی کی اور قریشِ مکہ کی گوشت اور شہد سے ضیافت کی۔ خانہ کعبہ کا دروازہ بنایا۔ اسے قفل لگوایا۔ حرم شریف پر ٹاٹ کا غلاف چڑھایا اور واپس چلا گیا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا حسان بن تبان شاہی کرسی پر متمکن ہوا جسے اس کے بھائی عمر بن تبان نے قتل کر دیا اور حکومت خود سنبھال لی۔ یوں یمن کے شاہی خاندان کا شیرازہ بکھر گیا جس سے فائدہ اُٹھا کر لخیعہ ذوشناتر نے حکومت چھین لی۔ لخیعہ انتہائی بدکردار اور کمینہ تھا۔ وہ شاہی خاندان کے لڑکوں سے لواطت کیا کرتا تا کہ لوگ انھیں حکومت میں نہ آنے دیں۔ اس بدکردار کو شاہی خاندان کے ایک خوبصورت اور غیرت مند نوجوان نے قتل کر دیا۔ اس کی اس جرأت پر یمن والوں نے اسے اپنا حکمران بنالیا۔

بدقسمتی سے یہ بھی امن وامان بحال نہ کر سکا۔ بدامنی سے تنگ آ کر یمن کا ایک آدمی قیصرِ روم سے امداد طلب ہوا۔ قیصرِ روم نے شاہِ حبشہ کو لکھا۔ شاہ حبشہ نے ارياط کی قیادت میں ستر ہزار

Marfat.com

حبشی دے کر بلادِ یمن پر چڑھائی کی۔ اس کے ہاتھوں اہلِ یمن کو ہزیمت اُٹھانا پڑی۔ فتح و کامرانی کے بعد ارباط گورنر بنایا جسے نائب سپہ سالار ابرہہ نے قتل کر دیا اور حکومت کی گدی خود سنبھال لی۔

571ء میں ابرہہ نے مکہ[62] پر چڑھائی کی جسے اللہ تعالیٰ کے عذاب نے گھیر لیا۔ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ہاتھوں اسے فاش شکست ہوئی۔ صنعاء واپس پہنچ کر غارت گرِ عدم ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا۔ بیٹے کے بعد پوتا اور پوتے کے بعد پرپوتا مسروق گورنر بنا۔

مسروق سے ارباط تک (72) بہتر سال حبشیوں کی حکومت رہی۔ مسروق سے سیف بن ذی یزن نے کسریٰ ایران کی مدد سے حکومت چھینی جسے حبشیوں نے قتل کر دیا۔

یاد رہے کہ یہ وہی سیف بن ذی یزن ہے جس کے متعلق سطیح اور شق نے پیش گوئی کی تھی۔

سیف بن ذی یزن کے قتل کے بعد ہرز گورنر ہوا۔ اس کے بعد اُس کا بیٹا مرزبان اور مرزبان کے بعد ہرز کا پوتا تینجان اور اس کے بعد اس کا بیٹا کرسیِ یمن پر سرفراز ہوا جسے کسریٰ ایران نے معزول کر کے باذان کو نامزد کر دیا۔

ادھر مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی مبعوث فرمائے جا چکے تھے۔

نبوت سے پہلے آٹھ سال کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ سفرِ شام پر گئے تو بحیرہ راہب نے آپؐ کی بعثت کی پیش گوئی کی تھی۔

پھر حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر گئے تو نسطورا راہب نے خدیجہؓ کے غلام میسرہ کو رسالتِ محمدیؐ کے متعلق بتایا تھا۔ واقعات پیچھے بیان کیے جا چکے ہیں۔

علاوہ ازیں حضرت سلمان فارسی کا قبولِ حق اور قبولِ اسلام بھی آپؐ کے متعلق کی جانے والی پیش گوئیوں کا حصہ تھی۔

بہر حال حضورؐ اب مبعوث ہو چکے تھے۔ انھوں نے مختلف حکمرانوں کو خطوط لکھے جن میں کسریٰ ایران بھی شامل تھا۔ اس نے آپؐ کا نامہ مبارک چاک کر دیا اور اپنے گورنر باذان کو لکھا اس مدعیِ نبوت کو پکڑ کر دربار میں حاضر کرو۔ باذان نے ایلچی بھیجے جنھیں آپؐ نے فرمایا کہ کسریٰ فلاں دن فلاں تاریخ کو اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔

جب ایلچی باذان کے پاس گئے تو یہ سن کر حیران رہ گئے کہ حضورؐ کی پیش گوئی کا ایک ایک حرف سچ ثابت ہوا۔ باذان نے سنا تو خود خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔

اسی ذاتِ اقدسؐ کے متعلق سطیح اور شق نے ربیعہ بن نصر کو خبریں دی تھیں۔ اسی رسولِ اُمی کے متعلق بنو قریظہ کے یہودی عالموں نے تبان اسعد ابو کرب کو بتایا تھا۔

Marfat.com

معزز قارئین یہ عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ ان واقعات کے علاوہ انجیل اور تورات میں بے شمار واقعات ایسے ہیں جو آپؐ کی نبوت کی شہادت دیتے ہیں جن کا احاطہ کرنا بذات خود ایک تصنیف کا متقاضی ہے طوالتِ تحریر کے خوف سے یا تو واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا یا پھر اشارۃً بیان کیا ہے۔ تفصیلات کو انشاء اللہ اگلی فرصت میں تصنیفی شکل دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

وما توفیقی الا باللہ

———(((الحمد للہ)))———

حواشی:

1- سیرت اور تاریخ کی اکثر کتب میں 9 ربیع الاول ہے اور کچھ میں دس سے بارہ تک تاریخ پیدائش بتائی گئی ہے، بہر حال جمہور علما کے نزدیک تاریخ ولادت 9 ربیع الاول بوقت سحری ہے۔

2- رحمت اللعالمین، ابنِ ہشام، سیرت النبی، تاریخ اسلام، ابن خلدون وغیرہ۔ بچہ کی پیدائش کے وقت ناف ماں کی ناف سے ایک ناڑ کے ذریعہ جڑی ہوتی ہے جسے دایہ کاٹ کر علیحدہ کرتی ہے، مگر خلاف معمول پیدائش کے وقت حضور ناف بریدہ تھے۔

3- بنوسعد بن بکر قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ کا نام تھا۔

4- سیرت النبی، ابن سعد، ابن ہشام اور حدیث کی تمام کتب میں واقعہ درج ہے۔

5- بخاری باب السیرت۔

6- ایضاً۔

7- حلیمہ کے خاوند کا نام حارث بن عبدالعزیٰ تھا۔

8- سیرت ابنِ ہشام جلد اول۔

9- ابن ہشام۔ سیرت النبی۔ سرور عالم اور کم و بیش تمام احادیث کی کتب میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔

10- ایضاً۔

11- بخاری باب السیرت، رحمت اللعالمین، سیرت النبی۔

12- بخاری شریف۔

13- ابنِ ہشام۔

Marfat.com

14- ابنِ ہشام۔

15- ایضاً۔

16- ایضاً۔

17- ترمذی۔

18- سیارہ ڈائجسٹ رسول نمبر نے حلف الفضول کو بالا عنوان سے لکھا ہے۔

19- سیرت، تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں ان قبائل کی تفصیلات عرب کے شعر و ادب سمیت درج ہیں۔

20-21- ابنِ ہشام، رحمت اللعالمین، ابن خلدوں، تاریخ اسلام (پیر معین الدین ندوی)۔

22- جنگ داحسن اور فجار دونوں طرف مختلف قبائل اپنے حلیفوں کے ساتھ اکٹھے ہو کر لڑے۔

23- یہ واقعہ مشہور مورخ سہیلی نے بیان کیا ہے۔

24- ابنِ ہشام۔

25- ابن ہشام۔

26- وہ پتھر جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے خدا کے حکم سے حرم میں نسب کیا تھا۔

27- وہ چشمہ جو حضرت اسماعیل کے بچپن میں ایڑیاں مارنے سے پھوٹا تھا۔ اس کے علاوہ ان نافذات کے اخذ کرنے میں سیارہ ڈائجسٹ رسول نمبر کا بھی حصہ ہے۔

28- سیرت سرورِ عالم جلد دوم۔

29- ابنِ ہشام۔

30- سیرت النبی، البدایہ والنہایہ۔

31- ابنِ ہشام۔

32- ابنِ ہشام۔

33- ابنِ ہشام، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ شبہ تین آدمیوں پر تھا لیکن اس مال کی برآمدگی چونکہ دُوَیک کے گھر سے ہوئی اسی لیے اسے چور ٹھہرایا گیا۔

34- سیرت سرورِ عالم جلد دوم۔

35- ابنِ ہشام وغیرہ۔

36- سیرت سرورعالم، سیرت النبی، ابن ہشام۔

37- ترکی کا پرانا نام روم صغریٰ تھا۔

Marfat.com

38- جدہ کا پرانا نام شعیبس تھا۔
39- سیرت سرورِ عالم، ابنِ ہشام۔
40- ابنِ ہشام، سورہ ابابیل میں بھی ابرہہ کی تباہی کا ذکر اور مفسرین نے تفسیر میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔
41- رسولِ عربی، بخاری وغیرہ۔
42- سرورِ عالم، رسولِ عربی وغیرہ۔
43- سیرت النبی، ابن ہشام، حیات محمدؐ۔
44- تفصیلات باب نمبر 7 میں درج ہیں۔
45- سنن ابی داؤد جلد دوم۔
46- اصابہ جلد 5۔
47- سنن ابی داؤد جلد دوم۔
48- ابنِ ہشام۔
49- ابنِ ہشام۔
50- سیرت سرورِ عالم۔
51- سیرت النبی، مسند احمد بن حنبل جلد 4۔
52- سیرت النبی، ابن ہشام۔
53- پچھلے باب میں تفصیلات درج ہیں۔
54- پانچویں پشت پر حضرت خدیجہ کا سلسلہ نسب حضورؐ سے جا ملتا ہے اسی لیے چچا کا بیٹا کہا۔
55- سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم
56- سیرت النبی، ابنِ ہشام، رحمت اللعالمین۔
57- ابنِ ہشام میں تمام تفصیلات درج ہیں۔
58- دو مقامات کے نام ہیں جیسے ہم کہیں خیبر سے کراچی تک۔
59- یمن کا حمیری حکمران جس نے ابرہہ کے خاندان سے حکومت چھینی۔
60- ذی یزن کا بیٹا سیف بن ذی یزن۔
61- فیصلے کے دن سے مراد روزِ قیامت ہے۔
62- تفہیم القرآن تفسیر سورہ فیل، تفسیر عثمانی تفسیر ابنِ کثیر، موضح القرآن، ترجمان القرآن

باب:3

بعثت

طلوعِ آفتاب نبوت صلی اللہ علیہ وسلم

ریگستانِ عرب میں فسانہ کا رواج عام تھا۔ راتوں کو شباب و کباب کی محفلیں جمتیں۔ رقاصائیں نیم برہنہ ناچتیں، گاتیں۔ پوری پوری رات ایسی ایمان دریدہ محافل گرم رہتیں۔ رقاصہ تھک جاتی تو کوئی دل جلا گویا اُٹھتا۔ کوئی ہجو، قصیدہ یا کوئی داستان شروع کر دیتا۔ حاضرین میں سے کوئی سردار، کوئی تاجر یا امیر کبیر خاموشی سے اپنی دل نشین رقاصہ بغل میں دبا کر کسی خلوت خانہ میں لے جاتا۔

رات ساز کی تانوں پر تھرکتی، بلکہ پھڑکتی رہتی۔ سامعین اور ناظرین پوری پوری رات محفل کی لطف آفرینیوں میں گزار دیتے۔

ایسی ہی شباب و کباب سے مہکتی ہوئی ایک رات کو کسی سازندے یا گویے نے ساز کے نازک تار چھیڑ کر فضائے مکہ میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ سحر آگیں سُر ین دلوں پر لوٹنے پوٹنے لگیں۔ پروانوں کی طرح اہالیان مکہ شمعِ موسیقی کی طرف کھچے چلے آتے۔

سوئے اتفاق [1]محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس محلے سے گزر رہے تھے کہ ان خیالات نے پاؤں پکڑ لیے۔ محفل میں پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے، مگر قدرت کے ارادوں میں کچھ اور ہی تھا۔ خدا کی ذات آپؐ کو ان آلودگیوں سے صاف دیکھنا چاہتی تھی۔ محفل میں بیٹھتے ہی نیند نے آغوش میں لے لیا اور جب آنکھ کھلی تو منظر غائب تھا۔ نہ سازندے تھے، نہ ساز، نہ تماشہ تھا، نہ تماشائی، صبح کی کرنیں بھرپور انداز سے قندیلوں سے روشن رات کی تاریکیوں پر مسکرا رہی تھی۔ یوں حضورؐ بغیر کچھ دیکھے سنے اُٹھ کر چلے گئے۔

ایک بار اور کسی ایسی ہی رات کو صحنِ محفل میں بیٹھنے پر نیند کی شدت نے یہی سلوک کیا۔ بعض

Marfat.com

روایتوں میں ہے کہ آپؐ نے اس طرح کی تین راتوں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی، مگر قدرتِ خداوندی آپ پر بیٹھتے ہی ایسی نیند طاری کرتی کہ صبح تک کوئی ہوش نہ رہتا۔

یونہی ایک دن مکہ کے ایک میدان میں بچوں[2] نے شور مچا رکھا تھا۔ وہ کسی کھیل میں مگن تھے، بچے تو ویسے بھی معصوم ہوتے ہیں۔ اُنھیں زمانے کی ترتیب وترکیب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ دنیا سے بے توجہ ہوتے ہیں جس کام کو دل آ جاتا ہے نفع ونقصان اور عزت وبے عزتی کا خیال کیے بغیر وہ کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ایک دوسرے پر پتھر پھینکنے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ پہلے چھوٹے، پھر بڑے اور پھر اس سے بڑے پتھر پھینکنے کا مقابلہ ہوا۔ ایک لڑکے نے جوش میں بڑا پتھر اُٹھاتے ہوئے تہہ بند اُتار کر کندھے پر رکھ لیا اور برہنہ پتھر اُٹھانے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی تمام کھلاڑیوں نے اپنے تہہ بند اُتار دیئے اور برہنہ کھیلنے لگے۔

اس کھیل میں محمدؐ بن عبداللہ بھی شامل تھے۔ انھوں نے بھی ہمجولیوں کی طرح ستر سے چادر اُتار کر پھینک دی اور دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں پتھر اُٹھا کر پھینکنے ہی لگے تھے۔ اچانک ایک باریش سفید کپڑوں میں ملبوس اجنبی نمودار ہوا۔ اس نے محمدؐ بن عبداللہ کو مکا رسید کرتے ہوئے کہا تجھے برہنہ پھرتے شرم نہیں آتی۔ دھوتی اُٹھاؤ اور باندھو۔ آپؐ نے دھوتی اُٹھائی، باندھ لی اور دوبارہ کھیل میں مصروف ہو گئے۔

اب اُن کھیلنے والے بچوں میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے تھے جو ستر پوش تھے۔ گویا نبوت سے پہلے ہی خدا کی ذات تمام معاشرتی آلودگیوں سے محفوظ رکھنے کا اہتمام کر رہی تھی۔

اسی طرح کسی آدمی نے اپنے مخصوص بت[3] کے قدموں میں سر رگڑتے ہوئے کوئی منت مانی۔ سوئے اتفاق، اس کی خواہش پوری ہوگئی۔ منت میں اس نے اُونٹ کا نذرانہ مانا تھا۔ سو اس نے اونٹ ذبح کیا۔ اسے پکایا اور لوگوں میں بانٹ دیا۔ سبھی نے خوشی خوشی کھایا، مگر جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا گیا تو انھوں نے کھانے سے صاف انکار کر دیا۔

ان واقعات کے علاوہ امانت، صداقت، عدالت اور تجارت کے متعلق چند ایک واقعات ہم پچھلے ابواب میں لکھ آئے ہیں۔ یہ تمام واقعات نبوت سے پہلے آپؐ کے نظریات اور خیالات کی بڑی واضح دلیلیں ہیں۔ آپؐ نبوت سے پہلے بھی مکہ کی عام معاشرت اور نظریات سے یا تو خود ہٹ کر رہ رہے تھے اور یا پھر ہٹا دیا گیا تھا۔

دوسرے الفاظ میں نبوت سے پہلے بھی آپ مکہ میں معاشرتی اور نظریاتی لحاظ سے اکیلے ہی

Marfat.com

تھے۔

---(((اللہ اکبر)))---

آپ کا خاندان اسی کعبہ کا متولی اور کلیدار بردار تھا جسے صدیوں پہلے ایک بت شکن ابراہیم خلیل اللہؑ اور اس کے بیٹے ذبیح اللہؑ نے تعمیر کیا تھا۔ یہ خدا کے دو برگزیدہ نبیوں نے بنایا تھا۔ زمانے کی ستم ظریفی کہ آج اسی حرم میں معمارِ حرم کی اپنی اولاد نے ہی سینکڑوں بت سجا لیے تھے۔ توحیدِ الٰہیہ کے مرکزِ اول کو بت شکن کی اپنی ہی اولاد نے بت پرستی کا گورکھ دھندا بنا دیا۔ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اپنی ہی نسل بتوں پر چڑھاوے چڑھاتی منتیں مانتی اور سجدے کرتی اور ڈٹ کر ان کی عبادت کرتی۔ الغرض سوچ فکر سے عاری عقل نے ہر سو ڈیرے جمائے ہوئے تھے۔

اس گئی گزری حالت میں بھی چند لوگ ایسے تھے جو کسی قسم کے حقیقی طریقہ عبادت کو پانے کے لیے سرگرداں تھے، مگر کہیں سے کوئی راہنمائی ملتی ہی نہ تھی۔ ورقہ بن نوفلؓ زید اور عثمان کے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کو سجدہ کرنا، منتیں ماننا حماقت اور کم عقلی ہی تو ہے۔ سبھی راہِ حق کی تلاش میں ٹکریں مارتے مارتے رہ جاتے ہیں، مگر کہیں سے راہنمائی نہیں ملتی۔

ورقہ اور عثمان تو عیسائیت اختیار کر لیتے ہیں، مگر زید یہ کہتے کہتے مرجاتے ہیں کہ اے خدا اگر تیری عبادت کرنے کا طریقہ معلوم ہو جاتا تو میں اسی طریقہ سے تیری عبادت کرتا۔ خداوند تعالیٰ کی قدرت جلیلہ دیکھیے کہ ادھر باوجود کوشش کے کوئی راہنمائی نہیں ملتی۔ ادھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ راہنمائی خود بخود ہو رہی ہے۔ معاشرتی آلودگیوں اور قباحتوں سے انتہائی غیر محسوس انداز سے محفوظ رکھا جا رہا ہے۔

دراصل شرک و بدعت، عریانی و فحاشی، ظلم و تعدی، مکر و فریب اور معاشرتی ناہمواری سے معمور ماحول آپؐ کی پاکباز طبیعت کو سازگار نہ تھا۔ نتیجتاً جیسے جیسے عمر میں بڑھ رہے تھے، ایسے ایسے ماحول سے نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو یہ نفرت ایک کرب مسلسل کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔

نزولِ وحی سے دو سال پہلے کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ آپؐ پر مسلسل محرومی چھائی رہتی تھی۔ کھویا پن حاوی ہونے لگا تھا۔ آپؐ جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے۔ جہاں بھی جاتے مختلف وسوسے اور خیالات سوال بن کر اُبھرتے کہ میں کیا ہوں۔ دنیا کیا ہے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ کن کن چیزوں پر یقین کروں۔ طور اور حرا کی فلک شگاف چوٹیوں میں کچھ

Marfat.com

تلاش کروں یا درختوں، کھنڈرات اور میدانوں سے سوال کروں اور کبھی گردشِ لیل و نہار چمکتے ستاروں اور برستے بادلوں سے پوچھتے، تم کیا ہو؟ میں کیا ہوں؟ تمھارا مقصدِ حیات کیا ہے؟ مجھے کس لیے پیدا کیا گیا، مگر کسی نے کوئی جواب دینا تھا نہ دیا۔

مایوسیاں اور محرومیاں زیادہ تنگ کرتیں تو آپ جبلِ نور میں واقع غارِ حرا میں جا بیٹھتے۔ مہینوں وہیں تحنث[6] و عبادت میں مصروف رہتے۔ خود شناسائی کی کوشش کرتے۔

اس وقت آپ کی عبادت و ریاضت کس قسم کی ہوتی، اس کے متعلق کچھ زیادہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں ایک دفعہ کسی صحابیؓ نے بعثت سے قبل غارِ حرا میں کی جانے والی عبادت کے متعلق پوچھا تو آپ نے جواب دیا[7]: "غور و فکر اور عبرت پذیری۔"

اس پر مزید غور کیا جائے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نبوت سے پہلے کی عبادت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت سے پہلے جیسی عبادت تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے جب ستاروں کی تجلی کو دیکھا تو دھوکا ہوا، چاند کی تجلی کو دیکھا تو اور بھی دھوکا ہوا، سورج کی روشنی کو دیکھنے پر شبہ اور بڑھ گیا اور جب سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ابراہیم علیہ السلام بے ساختہ پکار اُٹھے:

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ٥

یعنی میں فانی چیزوں کو نہیں دیکھتا۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ٥

یعنی میں اپنا منہ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے زمین و آسمان پیدا کیا۔

———(((اللہ اکبر)))———

یہ چالیس عام الفیل اور 611 عیسوی تھا۔ آپ کی عمر مبارک چالیس سال ہو چکی تھی۔ تقریباً چھ[8] مہینوں سے آپ کو عجیب و غریب خواب آنا شروع ہو گئے جو بالکل سچے ہوتے۔ جو کچھ رات کو خواب میں دیکھتے، وہی دن کو حقیقت بن کر وقوع پذیر ہو جاتا۔

یہ وحیِ الٰہیہ کی تعبیر تھی۔ ایک طرح کی مشق یا ریہرسل تھی۔ وحی سے پہلے اس قسم کی ریہرسل نہ ہوتی تو ممکن تھا آپ پہلی وحی کا بوجھ برداشت نہ کر پاتے۔ انسان کی فطری کمزوریوں کے باعث خدا نے وحی کی تمہید باندھنا شروع کر دی تا کہ اعصاب اس مافوق الفطرت واقع کو برداشت کرنے کے قابل ہو سکیں۔

اس سال حسبِ معمول رمضان کا چاند دیکھ کر آپ سامانِ خورد و نوش کے ساتھ غارِ حرا میں مُعتکف ہو گئے۔ سترہ دن اللہ کی عبادت اور تزکیہ نفس میں مصروف رہے۔ سترہ[9] رمضان المبارک

کو رات کے وقت اچانک سید الملائکہ یعنی فرشتوں کے سردار حضرت جبریلؑ خدا کا پیغام لے کر حاضر ہوئے۔

اس[10] نے ایک کپڑا سامنے پھیلایا جس پر سورہ علق کی چند آیات لکھی ہوئی تھیں اور کہا اقرأ پڑھو۔ حضورؐ نے جواب دیا ما انا بقاری میں پڑھ نہیں سکتا۔ جبریلؑ نے آ کر گلے لگایا اور زور سے بھینچا۔ جب آپؐ کی قوت برداشت جواب دینے لگی تو چھوڑ دیا۔ پھر کہا اقرا (پڑھو) حضورؐ نے مکرر جواب دیا میں پڑھ نہیں سکتا۔ جبریلؑ نے پھر گلے لگایا اور زور سے بھینچا۔ جب قوت برداشت جواب دینے لگی تو چھوڑ دیا اور کہا اقرا (پڑھ) آپؐ نے سہ کرر جواب دیا میں پڑھ نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ یہ عمل تین بار کیا گیا اور تینوں بار یہی جواب ملا کہ میں ان پڑھ ہوں۔ تیسری بار جواب سن کر جبریلؑ نے کہا۔

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۝

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۝

جس نے انسان کو گوشت[11] کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔

اِقۡرَاۡ وَ رَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۝

پڑھ تیرا رب بڑا کریم ہے۔

الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝

جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔

عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ۝

انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔

یوں سترہ رمضان المبارک کو آغاز وحی اور آغاز نبوت سورہ علق کی ان آیات سے بوقتِ سحر ہوا۔

آغاز نبوت اللہ کے بابرکت نام سے کیا گیا۔ یہ اللہ کی توحید اور برتری کا پہلا سبق تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا گیا۔ اس سے اشارہ مل گیا کہ آئندہ زندگی میں کسی کام کی ابتداء اللہ کا نام لیے بغیر نہ کی جائے۔

پھر قرآن کے ہر مضمون سے پہلے (ماسوائے سورۃ توبہ کے) بسم اللہ کے الفاظ کو لازمی کر دیا گیا۔

Marfat.com

پہلی آیت میں ہی ایسا مضمون باندھا گیا ہے کہ عرب کی مشرک تہذیب اور بت پرست تمدن کی عمارت دھڑام سے گرنے لگتی ہے۔ پہلے سبق ہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منوالیا گیا ہے کہ عبادت تو صرف اسی کی ہونی چاہیے جس نے انسانوں اور تمام کائنات کو تخلیق کیا۔

دوسری آیت میں انسانی تخلیق کا نظریہ، بلکہ فارمولا بتا کر اس کی کم مائیگی اور اصلیت کو کھول کر رکھ دیا تا کہ اسے احساس ہو۔ چوٹ لگے اس کی نخوت پر، غرور پر اور پتا چلے اپنے عملِ ترویج و ترقی کا کہ وہ کس بات پر اکڑ رہا ہے۔ کس چیز پر فرعون بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا وہ بھول گیا ہے اپنی اوقات کو۔ کیا وہ بھول گیا ہے ان لمحات کو جب پانی کے ایک گندے قطرے سے اس کے عناصر کو ترتیب دیا جا رہا تھا۔ اگر اس کی جزئیات چند ظاہری اسباب کے ذریعہ جمع نہ کی جاتیں تو اس نخوت کے پتلے کی تخلیق ہی نہ ہو پاتی۔

اگلی آیت بھی انسان کی حیثیت اور اصلیت کا مذاق اڑا رہی ہے۔ دیکھو آج تہذیب و شائستگی کا دعویدار، چاند، مشتری اور مریخ پر قدم رکھنے والا، علم و ترقی کو اپنے ہاتھوں اور اپنی محنتِ شاقہ کا کرشمہ کہنے والا اپنے عناصر ترتیب کو بھول گیا ہے اس وقت کو بھول گیا ہے جب وہ ماں کے پیٹ میں صرف جمے ہوئے خون کا لوتھڑا تھا۔ بالکل بے جان تھا۔ یہ تو سارا کمال اس خالقِ حقیقی کا ہے جس نے اس کے اعضا ترتیب دیئے اور عالمِ ارواح سے ایک روح اس کے جسم میں داخل کر دی۔ صرف یہی نہیں، پیدا کرنے والے نے پیدا کرنے کے بعد بھی اس پر احسانات کیے۔ کائنات کے علوم وفنون سے بہرہ ور کیا۔ ان علوم وفنون کو قلم کے ذریعے محفوظ کرنے کے ہنر بھی بتا دیئے تا کہ ترویج و ترقی ایک تسلسل کے ساتھ حاصل کر سکے اور یوں اسے کائنات کے ارتقائی عمل کا موجد بنا دیا۔ اس کی سوچوں سے بالا اسرار و رموز کے دروازے کھول دیئے۔ اب وہ سمجھتا ہے میں ایسا ہی تھا۔ ذرا اپنے ماضی پر نظر تو کر کے دیکھے اس کی نخوت، اس کا غرور، اس کا علم، اس کی ایجادات اس گندے قطرے کی طرح پانی پانی ہوتی ہیں کہ نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی یعنی ان پڑھ تھے۔ پہلے ہی پیغام میں علوم وفنون کی اہمیت اور قدر و قیمت واضح کر دی گئی۔ ادیانِ سابقہ کی تاریخ دیکھیں کسی دین کی ابتداء اس انداز سے نہیں کی گئی۔ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ کائنات کا آخری ارتقائی عمل اسی اُمت کے ہاتھوں مکمل ہونا ہے۔ کائنات سے مراد صرف یہی خطۂ ارضی نہیں، بلکہ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ دارالعمل اور دوسرا حصہ دارالحساب اور اس کے بعد کا ہے۔ ایک حصہ تو انسان کی یہی فانی زندگی اور دوسرا حصہ اس کی لافانی زندگی کا ہے۔

Marfat.com

اصولاً فانی یا فناہ ہو جانے والی یا توڑ پھوڑ کا شکار ہو جانے والی زندگی ترقی یافتہ زندگی کہلانے کی حقدار نہیں۔ یہ ترقی پذیر کے زمرے میں آ سکتی ہے۔ ترقی یافتہ زندگی وہ ہو سکتی ہے جو لا فانی بھی ہے اور ابدی بھی۔ اس حوالے سے وہ انسانی ارتقا کی آخری سیڑھی ہے۔ جس پر تبھی پاؤں رکھا جا سکتا ہے جب اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے۔ اس دنیا کے علوم و فنون سے کما حقہ فائدہ اٹھانا تو وہی ہوا جو اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا۔

انسان کے تخلیقی اور تدریجی عوامل کے ذکر کے فوراً بعد علم اور قلم کا ذکر کر کے اُمت پر پیش آنے والی ذمہ داریوں کو واضح کر دیا گیا ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے ختم الرسل ﷺ کے لیے یہ پہلا پیغام تھا۔ پہلا سلام تھا جو خدا کے مقرب فرشتے جبریل علیہ السلام نے پہنچایا۔ فرشتہ پیغام سنا کر، بلکہ پڑھا کر چلا گیا تو حضور ﷺ نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر نقاہت غالب آ گئی۔ اعصاب نے انتہائی تھکن کا احساس دلایا۔ اٹھنے کی کوشش میں چکر آنے لگے تو آپ وہیں[12] بیٹھ گئے۔ کافی دیر اس تذبذب میں بیٹھے رہے۔ پھر ہمت کر کے اٹھے اور گھر کی طرف چلنا شروع کیا۔ چلتے ہوئے ٹانگیں ایسے لڑکھڑا رہی تھی جیسے کندھوں پر بہت زیادہ بوجھ ہو۔

پھر جب جبل نور کے درمیان پہنچے تو ایک آواز نے روک لیا۔ کوئی کہہ رہا تھا "محمد ﷺ[13] آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں۔"

آپ آواز دینے والے کو دیکھنے کی کوشش میں آسمان پر نظر دوڑاتے ہیں تو وہاں جبریل انسانی شکل میں کھڑے کہہ رہے تھے۔ "محمد ﷺ آپ اللہ کے رسول ہو اور میں جبریل ہوں حیرانی اور بڑھ جاتی ہے۔ اسی حالت میں آپ آسمان کی جس سمت نظر پھیرتے ہیں۔ اسی سمت جبریل اس آواز کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ محمد ﷺ تم اللہ کے رسول ہو اور میں (فرشتہ) جبریل ہوں۔

دیکھتے دیکھتے اعصاب تڑاخ تڑاخ ٹوٹنے لگے۔ مگر آپ مبہوت کھڑے چاروں طرف دیکھتے ہی گئے۔ آخر فرشتہ خود ہی تعارفی کلمات سناتے سناتے غائب ہو گیا۔ آپ گھر کی طرف چل نکلے۔

ادھر وفا شعار[14] بیویؓ کافی دنوں سے اداس بیٹھی تھیں۔ انھوں نے بلانے کے لیے غلام دوڑائے جو غارِ حرا میں دیکھ کر ناکام واپس چلے آئے۔

آپ حسبِ معمول طواف کعبہ کے بعد گھر واپس پہنچے تو محترمہ خدیجہؓ کے قریب بیٹھ گئے۔ وہ

غور کرتی ہیں کہ آپ کی آواز نحیف و خستہ ہے، رنگ اڑا جا رہا ہے۔ دفعتاً خیال آتا ہے کہ ضرور کوئی محیر العقول واقعہ ہوا ہے جو یہ حالت ہوئی جا رہی ہے۔ پوچھتی ہیں اے ابوالقاسم[15] آپ کہاں تھے میرے نوکر مکہ کے بلند[16] حصے یعنی غار حرا تک تلاش کر آئے، مگر آپ نہیں ملے۔

آپ نے شروع سے آخر تک جو کچھ پیش آیا کھول کر بتا دیا۔ خدیجہؓ نے سنتے ہی کہا "بس خوش ہو جایئے اور ثابت قدمی اختیار کیجئے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں خدیجہؓ کی جان ہے مجھے امید ہے کہ آپ اس امت کے نبی ہوں گے۔"

آپ نے فرمایا۔

لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰي نَفْسِيْ یعنی مجھے اپنی جان کا ڈر ہے اور پھر کہا مجھے اڑھا دو۔ مجھے اُڑھا دو محترمہؓ نے اُڑھا دیا۔ کافی دیر تک کپڑا اوڑھ کر سوئے رہے۔ اٹھے تو دل ٹھہر گیا گھبراہٹ دور ہو چکی تھی۔

حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عیسائیت پر یقین رکھتے تھے۔ عبرانی زبان لکھنے پڑھنے میں کافی ماہر تھے۔

ورقہ نے چند سوالات پوچھنے کے بعد کہا: "قدوس ہے قدوس ہے[17] یعنی پاک ہے پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ورقہ کی جان ہے۔ یہ وہی ناموسِ اکبر یعنی عالم بالا سے وحی لانے والا فرشتہ ہے جو موسیٰ کے پاس آیا تھا اور پھر آپ اس امت کے نبی ہیں۔ تردد نہ کرنا۔ ثابت قدم رہنا۔ اب آپ کو جھٹلایا جائے گا۔ اذیتیں دی جائیں گی۔ جلاوطن کیا جائے گا۔ آپ پر قوم تشدد اور جنگ وارد کرے گی۔

پھر ورقہ نے حضورؐ کے سر کے وسط میں بوسہ دیا اور کہا کاش مجھے وہ وقت دیکھنا نصیب ہوتا تا کہ آپ کی کوئی مدد کر سکتا۔

ورقہ بن نوفل سے ملنے کے بعد آپ کی ذہنی و فکری کشمکش شدت اختیار کر گئی۔ اوپر سے فترتِ وحی یعنی کئی دنوں تک وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب سوچ فکر کی کشمکش کا تسلسل پل بھر کے لیے ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ایک بے کلی اور بے چینی نے گھیر رکھا تھا۔ اسی ذہنی ہیجان میں پہاڑ کی چوٹی پر[18] چڑھ کر چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں۔ عین اس وقت جب آپ گرانے کی پوزیشن لے چکے ہوتے۔ دفعتاً جبریلؑ نمودار ہو کر کہتے۔ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں۔" گرانے کا عمل پھر موخر ہو جاتا۔

———(((اللہ اکبر)))———

Marfat.com

قارئین انسانی جسم میں برداشت کی کچھ حدیں مقرر ہیں۔ انسانی ہڈیاں اور اعصاب متعینہ برداشت سے زیادہ کوئی چیز قبول نہیں کرتے۔ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے آج کے جدید سائنسی تجربات کے دور میں بھی انسان اپنی فطری کمزوریوں پر قابو نہیں پاسکا۔

مثلاً دھماکے اس دور کا معمول ہیں بلکہ پاکستان جیسے تیسری دنیا کے ممالک میں تو ثقافت کا حصہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن کوئی ایسا دھماکہ جسے سننے کے لیے ہم پہلے سے تیار نہ ہوں اگر اچانک ہمارے نزدیک وقوع پذیر ہو جائے تو اکثر اوقات اعصاب کو شل کر کے ہمارے جسم پر انتہائی تھکن اور بخار کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ کوئی خبر جو ہماری توقعات سے بڑی ہو۔ اچانک سننے پر اکثر آدمی اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ حادثاتی خبریں اچانک سننے پر کئی لوگوں کے دل پھٹ جاتے ہیں۔ اکثر اوقات آسمانی بجلی کا کڑکا ہمارے جسم پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔

کوئی ایسی ذمہ داری جسے قبول کرنے کے لیے ہم تیار نہ ہوں یا جس کی انجام دہی اپنے دستِ قدرت سے بالا سمجھتے ہوں، اگر ہم پر زبردستی ٹھونس دی جائے تو عموماً ہمارے جسم پر اس کا اثر اعصابی و جسمانی تھکن اور ہلکے ہلکے بخار کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

بس یہی یا اسی طرح کی صورتحال حال حضورؐ کے ساتھ پہلی وحی کے بعد ''فترت وحی'' کے عرصہ میں پیش آئی ہوگی۔ ایسی حالت میں جبکہ نبی اکرمؐ کے سامنے خدا کی ذات کا بھی کوئی واضح تصور موجود نہ تھا۔ بس ہلکی سی تلاش ربانی کے علاوہ کچھ پتا نہ تھا۔ اس حالت میں اچانک فرشتے کا ظاہر ہونا اور خدا کا پیغام دینا۔ وہ بھی نبوت و رسالت جیسی عظیم ذمہ دارانہ خوشخبری کے ساتھ، پوری آئندہ نسل انسانی کے قائد و راہنما بنا دیئے گئے۔ کروڑوں اربوں انسانوں کی ذمہ داری آپؐ کے کندھوں پر ڈال دی گئی۔ یہ اچانک پن، ظاہر ہے، اعصاب کو مضمحل کر گیا ہوگا۔

اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ اچانک غار حرا میں خلاف معمول جبریلؑ کے آ جانے سے حضورؐ پر خوف طاری ہوا۔ اس کے جانے کے بعد اسی خوف نے تھکن، نقاہت اور لڑکھڑاہٹ کی شکل اختیار کر لی۔ واپسی پر رسول اللہ ہونے کی خوشخبریاں سنیں۔ اُفق پر چاروں طرف جبریلؑ کو چھائے ہوئے دیکھا تو اعصاب شکنی کے عمل میں اور اضافہ ہو گیا۔

آگے چل کر وحی رکنے کے واقعات پر غور کریں تو مزید پتا چلتا ہے کہ آپؐ کو جو ذمہ داری سونپی گئی وہ آپؐ کی توقعات سے کہیں بالا تھی۔ آپؐ کے جسمانی قویٰ کی برداشت سے باہر تھی۔ حالانکہ چھ مہینے پہلے سچے خواب دکھا کر زمین ہموار کی جاتی رہی۔ باوجود اس کے پہلی وحی کے بعد سلسلہ وحی کچھ دنوں کے لیے روک دیا گیا، جو اس بات کی دلیل ہے، کہ ابھی وحی الٰہیہ کے تسلسل کو

Marfat.com

برداشت کرنے کی آپؐ میں ہمت نہ تھی۔

تین دن اسی حالت میں گزرے تین دن بعد سورۃ مدثر کی پہلی سات آیات نبوت کا پروگرام اور کام کا طریقہ کار لے کر نازل ہوئیں۔ انداز اتنا سادہ اور عام فہم تھا کہ مخاطب کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

"اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے اٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے دور رہو اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔"

گویا یہ کام کی ترتیب اور تفصیل ہے جب ابتداء کے لیے حکم مل گیا تو حضورﷺ ہیجان اور کشمکش سے نکل کر منصبِ رسالتؐ کے کام میں لگ گئے اور ایسے لگے کہ زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ خفیہ طریقہ سے لوگوں کو پیغام الٰہی پہنچانا شروع کر دیا۔ آیئے اگلے باب میں تفصیلات کا جائزہ لیتے ہیں۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

پہلی زیر زمین تحریک کا آغاز

حضور ﷺ انتہائی اضطراب کی حالت سے گزر رہے تھے۔ اضطراری حالت[19] میں کبھی پہاڑوں پر چلے جاتے اور کبھی جنگلوں میں نکل جاتے۔ کہیں یا کسی پل وہی فرشتہ پھر دکھائی دے۔ مزید راہنمائی کرے، مگر وہ نہیں ملا اگر ملا بھی تو صرف اتنا کہہ کر چلا گیا کہ تم اللہ کے رسول ہو۔ اس سے اضطراب اور بھی بڑھ جاتا۔ تھک ہار کر واپس آ جاتے اور چادر اوڑھ کر سونے کی کوشش کرتے۔ زوجہ محترمہ اس کیفیت سے نکالنے کے لیے اپنی سی کوششیں کرتی رہی۔ دلاسے دیتی رہیں، مگر نہ تو پل بھر آرام ملا اور نہ ہی سو سکے۔

غم واندوہ کی اس کیفیت میں تین دن گزر گئے۔ تین دنوں پر محیط یہ عرصہ بڑا لمبا کٹھن اور بوجھل تھا۔

یاد رہے کہ اس عرصہ کو فترت وحی یعنی وحی کا رک جانا کہتے ہیں پھر ایک دن حکم خداوندی سے وہی فرشتہ نیا پیغام لے کر حاضر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی اضطراری حالت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے مخاطب ہوتا ہے۔

یَاۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝

اٹھو اے اوڑھ کر سونے والے۔

خطاب کرنے والے کا انداز حضورؐ کی پریشانی اور مضطرب حالی کی بھرپور عکاسی کر رہا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے مخاطب کو جھنجھوڑ کر اٹھایا جا رہا ہے۔ جیسے پکارا جا رہا ہے اس کیفیت میں پڑے رہنا آپؐ کا منصب نہیں۔

قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

اٹھو خبردار کرو یا ڈراؤ۔

آپؐ کا منصب یہ نہیں کہ پریشان حال پڑے رہو۔ اپنے آپؐ پر کڑھتے رہو۔ نہیں! نہیں! اب آپؐ کے منصب کے سامنے آپ کی اپنی آسائش کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ انسانیت شرک و بت

Marfat.com

پرستی، ضلالت و بے حیائی، ظلم و تعدی میں پڑی ہے اور تم سو رہے ہو۔ اٹھ کر انھیں ڈراؤ۔ ان کے عقائد باطلہ اور توہمات لایعنی پر تنقیدی نظر ڈالو۔ تباہی کے دہانے پر کھڑی قوم کو خبردار کرو کہ تمھارا اگلا قدم بس تباہی کے عمیق گڑھوں میں گرنے والا ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے مڑ کر صحیح راہ متعین کرو۔

توحید الٰہیہ کا راستہ بتاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ آنے کی تلقین کرو۔ ہزاروں قسم کی پرستشوں کی بجائے صرف خدائے واحد کی عبادت کے لیے بلاؤ۔ خدا کی اتنی بڑائی بیان کرو کہ قوم صنم توڑ کر توحید خداوندی میں گم ہو جائے۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ٥

اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔

پہلی آیات کے ساتھ تقابل سے پتا چلتا ہے کہ پاک رکھنے سے مراد صرف جسم اور کپڑوں کی ہی پاکی نہیں، بلکہ اخلاقی و روحانی، معاشی و معاشرتی پاکیزگی بھی ہے چونکہ پورا معاشرہ اخلاقی و روحانی اعتبار سے بے حد کثیف تھا۔ بظاہر خطاب محمد ﷺ سے ہے۔ اگر صرف آپؐ ہی کو عملی لحاظ سے مخاطب تصور کر لیا جائے تو منصبِ رسالت و نبوت کی وسعت محدود ہو جائے گی گویا کپڑے پاک رکھنے کی وسعتوں میں پوری کی پوری تحریکی فکر چھپی ہوئی ہے جس کے لیے زمان و مکان کا بھی تعین نہیں اور جس پر نبی امی ﷺ نے آئندہ دنوں میں خفیہ یا اعلانیہ عمل پیرا ہونا ہے۔

اگلی آیت میں گندگی سے دور رہنے کا حکم ہے اس سے مراد عقائد و خیالات۔ اعمال و اخلاق۔ جسم و لباس، معیشت و معاش اور تہذیب و تمدن کی پاکیزگی ہے۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ٥

اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔

یہ بھی دراصل ان آلام و مصائب کی طرف اشارہ کر کے ذہن نشین کروایا جا رہا ہے۔ یہ کام، یہ ذمہ داری اتنی آسان نہیں، بلکہ ظلم و ستم کی اندھیری راتیں آنے والی ہیں۔ مصائب کے پہاڑ ٹوٹنے والے ہیں۔ تصورات سے بھی بڑے ظلم اور تکلیفیں اس منصب سے چمٹی ہوئی ہیں۔ اس وقت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ذہن بنا لو۔ اس انتہائی برے وقت کے لیے جب کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت صبر کا دامن چھوڑ بیٹھو۔ صرف اور صرف رضائے الٰہیہ کے لیے صبر و شکر کے ساتھ لپٹے رہنے کی عادت بنا لو اور اس قسم کا مظاہرہ کرتے رہنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

———(((اللہ اکبر)))———

Marfat.com

ان آیات کے بعد جبریلؑ نے ایک جگہ پاؤں [20] مارا۔ وہاں سے چشمہ پھوٹ پڑا۔ اس پانی سے جبریلؑ نے وضو کیا۔ دو رکعت نماز ادا کی۔ حضورؐ نے بھی اس کی طرح وضو کیا۔ جبریلؑ کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ یہ اسلام کی سب سے پہلی نماز ہے جو حضورؐ نے دو رکعت کی صورت میں پڑھی۔

جبریلؑ چلے گئے تو حضور ﷺ گھر تشریف لائے۔ ظاہر ہے اس پیغام کے بعد فکری تفکرات نے گھیر لیا ہوگا کہ کام کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ کن کن لوگوں سے دعوت کی ابتدا کی جائے۔ خاندان والوں کو کیسے دعوتِ حق کی طرف بلایا جائے۔ پتا نہیں وہ قبول کریں گے یا نہیں۔ اپنوں اور غیروں کے سامنے کس انداز سے دعوتِ حق پیش کی جائے۔ اسی قسم کے تفکرات اور سوچوں نے گھیر لیا تھا۔ گھر پہنچے تو اندر کے تفکرات چہرے پر بھی عیاں تھے۔

ظاہر ہے کوئی بھی عقل مند عورت اپنے شوہر کو سمجھنے کو پوری کوشش کرتی ہے۔ پچھلے دس سالوں سے حضورؐ کا ایک ایک لمحہ حضرت خدیجہؓ کے سامنے تھا۔ پچھلے دس سالوں سے حضورؐ کے حضرت خدیجہؓ سے زیادہ قریب تو کوئی نہیں تھا۔ حضورؐ کا کردار، معاشرت، لین دین، اقوال وافعال، اعمال واخلاق، عبادات، تحنث وتخنت، امانت وصداقت سب کچھ ہی تو خدیجہؓ جانتی تھیں۔ پہلی وحی سے سچے خوابوں کے زمانہ تک، ان کے غلام میسرہ کے ساتھ سفر کے حالات، نسطورا راہب کی پیشن گوئیاں، پہلی وحی اور دوسری وحی کے درمیان کے حالات، ورقہ بن نوفل سے وحی اول کا بیان اور ورقہ بن نوفل کا آپؐ کے نبی ہونے کی تصدیق کرنا مکہ کی قبیح معاشرت اور سود خور معیشت سے آپ کی نفرت کو بھی خوب جانتی تھیں۔ غرض حضرت خدیجہؓ سب کچھ ہی سے واقف تھیں۔ حضور ﷺ کو پریشان حال دیکھا تو حوصلہ دینے کی اور ہمت بڑھانے کی کوشش کی۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

خدیجہ [21] نیند اور سکھ کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اس وقت جبریلؑ نے اللہ کی طرف سے مجھے حکم دیا ہے کہ لوگوں کو اس کی طرف آنے کی دعوت دوں کہ وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق ہے۔ لیکن خدیجہؓ میں کس سے کہوں۔ میری بات کون سنے گا۔"

خدیجہؓ آپؐ کی حقانیت اور سچائی کی پہلے ہی معترف ہو چکی تھیں۔ حضورؐ کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لیے اسلام قبول کر لیا۔ اس لحاظ سے خدیجہؓ دنیا کی وہ ہستی ہیں جنھیں سب سے پہلے امتِ محمدیہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اس کے بعد بڑوں اور حضورؐ کے دوستوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دائرۂ اسلام

Marfat.com

میں داخل ہوئے۔ ان کے بعد آپ ؐ کے متبنیٰ حضرت زید بن ؓ حارث اور چچازاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ پانچ افراد پر مشتمل (مرد و زن) کی یہ پہلی جماعت ہے جس نے خفیہ دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا۔

یہ بھی بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ایمان لانے کے کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کی پیدائش ہوئی اس لحاظ سے یہ امتِ مسلمہ میں پہلی ہستی ہیں جن کے کان میں سب سے پہلے اذان کہی گئی۔ یا جوامت میں سب سے پہلے بطور مسلمان پیدا ہوئیں۔

یہ ہستیاں بلا تامل امت مسلمہ میں شامل ہو کر دعوت و تبلیغ کے کام میں لگ گئیں۔ حضرت ابوبکر ؓ کی معمولی تحریک سے ان کے قریبی ساتھی یا قریبی دوستوں کے دوست حضرت عثمان غنی ؓ حضرت عبدالرحمٰن ؓ بن عوف، حضرت زبیر بن عوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ یہ پانچوں صحابہ کرام ؓ عشرہ مبشرہ [22] میں بھی شامل ہیں۔

ان کے بعد حضرت ارقم بن ؓ ابی ارقم۔ عبداللہ ؓ بن مسعود۔ عثمان ؓ بن مظعون۔ ابوعبیدہ ؓ۔ عبیدہ بن حارث۔ عمار ؓ بن یاسر۔ خالد ؓ بن سعید۔ خباب ؓ بن ارت اور حضرت صہیب ؓ رومی مشرف بہ اسلام ہوئے۔

ان کے علاوہ عورتوں کی خاصی تعداد بھی تھوڑے عرصہ میں اسلام و ایمان سے سرفراز ہوگئی۔ اسلامی تحریک کا یہ عمل تین سال تک خفیہ رکھا گیا۔ غالباً 611ء 614ء تک انتہائی خفیہ طریقے سے تبلیغ و اشاعتِ اسلامی ہوئی۔

ان تین سالوں میں صرف ان کے سامنے تحریکی نصب العین پیش کیا جاتا جن کے بارے علم ہوتا کہ دعوت قبول کرلیں گے۔ ان میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی جو امت کے کسی نہ کسی ساتھی کے حلقہ اثر میں تھے انھیں معمولی دلائل یا براہین سے بت پرستی چھوڑنے پر آمادہ کرلیا جاتا۔

اب اسلام لانے والوں کی تعداد خاصی ہوگئی تھی۔ سو اب اس نے ایک باقاعدہ زیرزمین تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ لوگوں کی خاصی تعداد دعوت و تبلیغ کے اس خفیہ عمل میں شریک ہوگئی۔

—(((اللہ اکبر)))—

قارئین کے لیے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ تحریک اسلامی کا یہ خفیہ تین سالہ عمل امت مسلمہ کے لیے بہت بڑی کامیابی کی نوید تھا۔ 133 [23] یا 134 افراد دائیرہ اسلام میں داخل ہو کر ہادیٔ برحق کے انقلابی و تحریکی مشن کو انتہائی رازداری سے دوسروں تک پہنچانے میں لگے ہوئے

Marfat.com

تھے۔ چہ جائیکہ نوح علیہ السلام ساڑھے نو سال دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے اور تنگ آ کر قوم کے لیے خدا تعالیٰ سے عذاب مانگنا پڑا۔ طوفانِ نوح کے وقت چالیس کے قریب افراد پر مشتمل جماعت تھی جو حقانیت سے بہرہ ور ہوئی۔

اس تحریک کے لیے صرف تین سال کی مختصر مدت اتنی بڑی جانثاروں کی تعداد یقیناً بہت بڑی کامیابی کی نوید نہ تھی تو اور کیا تھی۔ یہ لوگ مکہ کی مختلف گھاٹیوں میں چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے اور اپنے گھروں میں انتہائی رازداری سے تعلیم و تعلم کا کام انجام دیتے۔ تین سال تک تو اسلام لانے والوں کے سوا کسی کو خبر تک نہیں ہوئی کہ یہاں کسی عالمی تحریک کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔

ایک دن زیرِ زمین کام کرنے والوں کا یہی گروہ مکہ کی گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں ادائیگی نماز کا فریضہ انجام دے رہا تھا کہ مشرکین کے گروہ نے انھیں دیکھ کر گالی گلوچ شروع کر دی۔ بات بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے طیش میں آ کر اونٹ کی ہڈی گالی دینے والوں میں سے ایک کے سر پر دے ماری۔ مضروب کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ بعض روایات میں ہے کہ مضروب مر گیا، مگر اربابِ سیر کے نزدیک مرا نہیں، صرف سر پھٹا اور خون بہنے لگا۔ بہرحال! اب خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں مشرکین کھلی وادی میں بیٹھے دیکھ کر حملہ نہ کر دیں۔

اس لیے تحریک اسلامی کے بانی و قائد حضرت محمد ﷺ نے حضرت راقمؓ بن ابی ارقم کے گھر کو دعوت و تبلیغ اور سیکھنے سکھانے کے لیے منتخب کیا۔ یہ خاصا کشادہ اور قدرے محفوظ تھا اور کوہِ صفا کے قریب بھی تھا۔

تاریخ اسلام میں اس گھر کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی تحریک کا یہ پہلا صدر دفتر/ہیڈ کوارٹر (Genral Head Quartere) تھا۔ یہ پہلی اکیڈمی ہے یہ پہلا نظریاتی سکول (Schoole of Thought) ہے۔

علانیہ تبلیغ کے بعد بھی ہجرت تک اسی گھر میں تعلیم و تعلم اور تحریکی منصوبہ بندی ہوتی رہی۔ ہجرت تک دائرہ اسلام میں آنے والے اپنی نئی تحریکی زندگی کی ابتدا یہیں سے کرتے۔ بہرحال اسلامی تحریک و تنظیم میں دارارقم کا وہی رول ہے جو اسلامی تاریخ میں مسجد نبوی یا صفہ اکیڈمی کا ہے۔

—(((الحمد للہ)))—

Marfat.com

اور جب خفیہ پن ختم ہوا

610ء سے 614ء تک تحریکِ اسلامی کا تحریکی و نظریاتی کام انتہائی خفیہ اور رازداری سے ہوتا رہا۔ اسلامی انقلابی تحریک کا یہ پہلا خفیہ منصوبہ تھا۔ جس نے تحریک کو امید افزا کامیابی بخشی۔ 133 یا 134[24] افرادان تین سالوں میں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

اس دور کی زیرزمین اور انقلابی تحریکوں سے موازنہ کیا جائے تو موازن انگشت بدندان رہ جاتا ہے۔ نظر خود بخود قائدِ تحریک اور نظریہ تحریک کی طرف اٹھ جاتی ہے اور حضور رسولِ اُمی ﷺ کی قائدانہ صلاحیتوں کی مدح سرائی کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

پوری دنیا کے مروجہ قوانین، نظام معاشرت و معیشت، رسوم و رواج، تہذیب و ثقافت اور نظریات و مذاہب سے ٹکر لینے والا نظام فکر و عمل پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جماعتی کام کو تین سال زیرزمین رکھنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔ سب سے بڑی اور حیران کن بات یہ تھی کہ اتنی تعداد میں کارکنان پیدا کرنا اور کارکنان بھی ایسے جنھیں کوئی لالچ کوئی رشتہ داری، کوئی تشدد تحریکی فکر و عمل سے لحہ بھر کے لیے بھی غافل نہ کر سکا۔

سب سے بڑی اور حیران کن بات یہ تھی کہ انقلابی تحریکوں یا سرد سیاسی تحریکوں اور جماعتوں کے پاس وسائل کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں تو ایسی تحریکوں کی منصوبہ بندی میں وسائل اور پشت پناہ طاقتوں کے عنایت کیے جانے والے وسائل کو مدنظر رکھ کر ہی کام کی ابتدا کی جاتی ہے، مگر ریگزارِ عرب سے اٹھنے والی اس عالمی تحریک کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ حضورؐ کے پاس وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ آپؐ غریب ہی نہیں، ان پڑھ بھی تھے۔ آپؐ کو کسی قسم کی بیرونی یا اندرونی پشت پناہی بھی حاصل نہ تھی۔ اس کے باوجود آپؐ ایسی منصوبہ بندی پر خفیہ انداز سے عمل پیرا ہوتے ہیں تو تین سال میں اتنا بڑا ہدف (ٹارگٹ) حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ کہیں سے کوئی کمزور پہلو (Loop Hole) کسی کو ملنے نہیں پاتا۔ کسی کو نقب زنی کا موقع ملنا تو کجا، خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ خفیہ پن مضبوطی سے رازداری کو پکڑے رکھتا ہے۔

Marfat.com

تحریک کا مقاصد اور جامعیت کے لحاظ سے جائزہ لیں کہ یہ تحریک زمان و مکان کی قیود سے بالا ہے اس کا مقصد علاقے اور ملک کو اپنی حدود میں لپیٹنا یا کسی ایک نسل تک محدود ہونا نہیں، بلکہ پوری دنیا کی قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی کو اپنے نظریاتی و مذہبی حصار میں لینا ہے۔ اتنی وسیع اور جامع تحریک کے لیے یقیناً تین 25سال میں یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

قارئین!! حضرت نوح علیہ السلام صدیوں تبلیغ فرماتے رہے، مگر سو پچاس آدمیوں کے علاوہ ان کی پوری قوم گمراہی کے گڑھے سے نہ نکل سکی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بتوں کی مخالفت اور توحید کے پرچار کی پاداش میں آگ کے حوالے کر دیئے گئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بچالیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے تحریکی کارکنانِ من وسلویٰ کے طعام وانہضام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے، مگر بوقت امتحان انھیں چھوڑ گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے اپنے تحریکی کارکنوں نے مصلوب کرنے کی ناکام کوشش کی۔

مگر غور فرمایئے!! تحریکِ اسلامی کی تعلیم وتربیت اور تنظیم وتعلق پر کہ تین سال کی مختصر مدت میں تحریکی کارکنان کی ایسی نظریاتی جماعت پیدا کر لی جاتی ہے جن کی نظر ایمان و اسلام اور حضور ﷺ پر جانثاری کے سوا کسی چیز پر ٹکتی ہی نہیں۔ جو نہ صرف مکہ کی سوسائٹی، بلکہ پوری دنیا کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے تیار ہیں۔

اسی مختصر انقلابی جماعت نے 23 سال کے مختصر عرصہ میں ساڑھے بارہ لاکھ مربع میل کے رقبہ پر اسلام کو غالب کر دیا۔

یہ اس شخص کی منصوبہ بندی ہے جو اُمّی یعنی ان پڑھ ہیں۔ مکہ کے مفلس اور بے سروسامان ہیں۔ یتیم اور لاوارث ہیں۔ مزدوری پر لوگوں کی بکریاں چرانے والے ہیں۔ وراثت میں یتیمی کا لبادہ اوڑھنے والے ہیں، مگر انسانی نظریہ زندگی کو ایسا فطری اور کامیاب پیرہن اوڑھا رہے ہیں کہ تنظیمی کارکنان تو ایک طرف ان کی ذات اقدس سے مانوس ذرات بھی زندگی کے اسی نظریاتی حصار میں جانثاری پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یقیناً زیر زمین منصوبہ بندی کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ نفسیاتی جنگ اور سرد جنگ کے ماہرین اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ نظریاتی انقلابی تحریکوں کے مشن کو زیادہ دیر زیر زمین رکھنا ناممکن ہی نہیں، کافی مشکل ہوتا ہے۔ عقلی اور منطقی وجوہات کے علاوہ کچھ فطری اور نفسیاتی تقاضے بھی ہوتے ہیں جو خفیہ پن چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

تحریکی کارکن معاشرتی دباؤ میں کام کر رہے ہوتے ہیں اور انھیں اپنے مقاصد کے حصول

سے غرض ہوتی ہے، کام کے اوقات سے نہیں۔ وہ اپنی تحریک کو بہت جلد کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ بہت جلد انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں۔ مقاصد کا جلد حصول تحریکی اور انقلابی کارکنوں کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ اس لیے فطری نفسیات تقاضا کرتی ہے کہ تحریک قدم قدم آگے بڑھے تاکہ جانثار نفسیاتی اُکتاہٹ سے نکل آئیں۔ اعصابی دباؤ کم کرلیں۔ نئے عزم اور امید افزا ماحول کو جنم دیں۔ نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کو جھٹک دیں۔

یوں خفیہ پن کو مزید نبھانے کی کوششیں بعض اوقات بددلی پھیلانے کا سبب بنتی ہیں۔ وسوسے جنم لیتے ہیں۔ شخصی بے ترتیبیاں جنم لیتی ہیں اور یوں تحریک ابتدائی سالوں میں غیر موثر ہو جاتی ہے۔

پچھلے باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ مشرکین نے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں دیکھ لیا تھا جس پر جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے اونٹ کی ہڈی سے ایک مشرک کا سر پھوڑ دیا۔ اب تحریک کھل کھلا کر سامنے آ گئی تو بانی تحریک نبی اُمّی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر اسلام کی علانیہ تبلیغ و اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ حضرت ارقم بنؓ ابی ارقم کے گھر کو تحریکی صدر دفتر قرار دیا جو تربیت کے لیے خفیہ تبلیغ و اشاعت میں بھی استعمال ہوتا رہا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات نے مسلمانوں پر نظرِ شفقت کی اور حضور ﷺ کو علانیہ تبلیغ کی ہدایت (Directive) جاری کردی:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ [26]

ترجمہ "مشرکوں سے علیحدہ ہو کر کھول کر بتا دو جس کا تمھیں حکم ملا ہے"

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ [27]

ترجمہ:۔ اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ یعنی دعوت دو۔ [28]

اس حکم کے بعد منصوبہ بندی کے لیے قریبی رشتہ داروں کی نفسیات، عادات، معمولات، ذہنی اور علمی سطح کا جائزہ لیا گیا۔

حضور ﷺ کے سب سے قریبی اور محسن ابوطالب تھے جو سگے چچا اور رئیس بنو ہاشم تھے۔ اخلاق و عادات کے لحاظ سے شریف النفس اور نیک انسان تھے، لیکن نظریاتی اعتبار سے کہنہ سال، کہنہ مشق اور کٹر قسم کے روایت پرست تھے۔

دوسرے نمبر پر حضور ﷺ کے چچا ابولہب تھے جو مکہ کا مالدار، خوبصورت اور سفید پوش شخص تھا۔ وہ مذہب کو صرف کاروباری بہتری کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اس کی مذہب سے وابستگی ذاتی

Marfat.com

مفادات کی حد تک تھی۔ اپنی سرخ و سفید رنگت پر اتراتا اور دولت پر ناز کرتا تھا۔ اس سے زیادہ توقعات وابستہ کرنا دیوانے کے خواب کے مصداق تھا۔ ابولہب کی بیوی اُم جمیلہ مکہ کی تعلیم یافتہ، خودسر و خود پسند عورت تھی۔ ہجو گوئی میں استاد مانی جاتی تھی۔ لوگ ہجویہ شاعری میں اس سے اصلاح لیتے تھے۔ اس کے دو بیٹے حضور ﷺ کے داماد تھے۔ چاروں افرادِ خانہ مزاج، طبیعت، اخلاق، عادات، اور کردار کے لحاظ سے یک جان کئی قالب تھے۔ سب کی ظاہری اور باطنی دنیا کا محور فخر و ریا، نمود و نمائش، بات بات پر اترانا، لگائی بجھائی کرنا اور بڑھا چڑھا کر باتیں کرنا تھا۔

تیسرے قریبی رشتہ دار چچا حضرت حمزہؓ تھے جو عرب کے نامی گرامی پہلوان تھے۔ قول کے پکے، دل کے سچے، مخلص اور خاندانی نام و نمود پر مر مٹنے والے تھے۔ ان کی تمام دلچسپیاں علاقے میں منعقد ہونے والے میلوں اور دنگلوں تک محدود تھیں۔ مذہب سے دلچسپی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

چوتھے قریبی عزیز حضور ﷺ کے والد مرحوم حضرت عبداللہ کے سب سے چھوٹے بھائی عباس تھے۔ پیشہ صرافی اور ساہوکاری تھا۔ مکہ، مدینہ، حبشہ، یمن اور طائف تک ان کے کاروباری رابطوں کا تسلسل تھا۔ ان کی کائنات میں قرضہ لینے اور دینے والوں کے سوا کسی اور کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ چوبیس گھنٹے اسی سوچ فکر میں ہلکان رہتے کہ قرض خواروں سے ربا یعنی سود کی زیادہ سے زیادہ شرح کس طرح وصول کی جائے۔ قرضہ کن شرائط پر دیا جائے اور کون کونسے سے وثیقے اور ضمانتیں حاصل کی جائیں۔ ان کی دولت کا اس بات سے اندازہ کرلیں کہ مکہ کے اکثر چلتے پھرتے گھرانے ان کے مقروض تھے۔ وہ دولت پرست اور منجھے ہوئے محبّ المال تھے۔ شخصیت، کردار اور عادات کے لحاظ سے بہت اچھے تھے۔ بہرحال دعوت حق کی قبولیت سے متعلق ان سے بھی توقعات وابستہ کرنا عبث تھا۔

———(((اللہ اکبر)))———

حضور ﷺ اپنے تمام عزیز و اقارب کی نفسیات اور کہنہ جہالت سے بخوبی واقف تھے، مگر مزید دیر یا خفیہ پن تحریک کے لیے نقصان دہ تھا اور خداوندِ ذوالجلال کا حکم بھی وارد ہو چکا تھا۔ حکم خداوندی سے سرتابی ناممکن اور بجا آوری بہرحال ضروری تھی۔

غور و خوض کے بعد آپؐ نے قبیلہ کے چالیس [29] افراد کو اپنے گھر مدعو کیا۔ باختلاف روایت تعداد پینتالیس تھی۔ معتبر تعداد چالیس ہی ہے۔ حضرت علیؓ چونکہ نبی ﷺ کی کفالت میں تھے، اس لیے میزبانی کے فرائض انھوں نے انجام دیئے۔ یہ اسلامی تحریک کے لیے دی جانے والی پہلی

Marfat.com

دعوت تھی جو اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھوں سے پکائی۔ یہ دعوت صرف ایک ڈش پر مشتمل تھی۔ حضرت علیؓ نے دعوت کا مختصر سا کھانا مہمانوں کے آگے رکھ دیا جو مہمانوں کی تعداد کے لحاظ سے بہت کم دکھائی دیتا تھا۔

حضور ﷺ نے مہمانوں سے درخواست کی کہ کھانا بسم اللہ پڑھ کر شروع کیا جائے پھر کیا ہوا؟ مہمان سیر ہو چکے ہیں، مگر کھانا اتنا ہی پڑا ہے جتنا برتن میں رکھا گیا تھا۔ ایک ہی پیالے میں پانی پیش کیا گیا۔ سب مہمانوں نے باری باری پانی پیا، مگر جام ابھی تک بھرا پڑا ہے۔ پانی ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ کیا ماجرا ہے جو کھانا پانچ بندوں کے لیے ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ چالیس 45 نے کھالیا پھر بھی بچا پڑا ہے۔ اتنی تعداد سے ایک پیالہ پانی ختم نہ ہوا۔ واقعی حیران کر دینے والا معاملہ تھا۔ مہمان تو چونک ہی گئے۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ششدر کر دینے والا سکوت طاری ہو گیا۔ سب ایک دوسرے سے سوالیہ نظروں سے پوچھ رہے تھے۔ دفعتاً کسی شقی القلب کی آواز نے سکوت توڑا "یہ سب محمد ﷺ کا جادو ہے" (نعوذ باللہ) یہ سنتے ہی تمام مہمان میزبان کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر تتر بتر ہو گئے۔

یہ جملہ کہنے والا کوئی اور نہیں تھا حضور ﷺ کا سگا چچا ابولہب تھا جو حضورؐ کا سمدھی بھی تھا حضورؐ کی دو بیٹیاں اس کے بیٹوں کے نکاح میں تھیں۔ کتنی تکلیف ہوئی ہوگی اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر شفیعِ اُمی ﷺ کو کتنا چرکا لگا ہوگا رحمت اللعالمین کو!!!

قارئین یوں تو نبوت بذات خود بہت بڑا معجزہ ہے۔ پہلی وحی سے آخری وحی تک پورا کلامِ الٰہی معجزہ ہے، لیکن تبلیغی اور تحریکی حوالے سے آج کا کھانا اور آج کا پانی سب سے پہلا معجزہ تھا جس نے مشرکین کو چونکا کے رکھ دیا۔

سیرتؐ اور حدیث کی کتب میں اس قسم کی کئی ایک دعوتوں کا ذکر ہے۔ طوالت کے خوف سے دو تین سے زیادہ کا ذکر نہیں کریں گے۔

اس قسم کی کسی اور دعوت میں بنو ہاشم حضور ﷺ کے گھر بیٹھے تھے۔ قبل اس کے کہ نبیؐ دعوتِ حق سناتے، ابولہب بول اٹھا "محمدؐ یہ تمھارے چچا اور چچا زاد[30] بھائی ہیں۔ ان سے جو کچھ چاہو کہو، مگر دین سے پھرنے کی بات نہ کرو۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارا قبیلہ تمام عرب سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ تمھیں اس بات سے ہاتھ پکڑ کر روکنے کے سب سے زیادہ حقدار ہم ہیں۔ اگر تم نے یہ کام جاری رکھا تو تمھیں روکنا اس سے زیادہ بہتر ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عرب کے دوسرے قبائل تم پر ٹوٹ پڑیں۔ میں نے آج تک ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جو تم سے

Marfat.com

زیادہ (نعوذ باللہ) اپنے خاندان کے لیے مصائب لایا ہو۔"

آج بھی اس شخص نے حضور ﷺ کو بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ آج بھی محفل دعوت سنے بغیر برخواست ہوگئی۔

حضور ﷺ کے دل میں جو بات آچکی تھی، اس کو منظر عام پر لانا رو کے رکھنے سے زیادہ قرین مصلحت تھا۔ سو اب کے بار پھر اہلِ خاندان کو نبیؐ کے گھر بلایا گیا۔ مہمانوں کو آیات قرآنی سنائی گئیں۔ حق کی طرف بلایا گیا۔ پیغام سننے کے بعد شفیق چچا ابو طالب نے کہا: "میں[31] اپنے باپ دادا کے دین کو نہیں چھوڑ سکتا مگر آپ کو جس کام کا حکم ملا ہے، اسے پورا کرو۔ میں آپکی مدد اور حفاظت کرتا رہوں گا۔"

ابولہب یہ الفاظ سن کر تلملا اٹھا۔ بڑبڑا کر کہنے لگا "خدا کی قسم[32] یہ بہت بُری بات ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑو۔ اس سے پہلے کہ دوسرے اس کا ہاتھ پکڑیں۔"

ابو طالب نے جواب دیا: "خدا کی قسم[33] جب تک ہماری جان میں جان ہے، ہم محمد ﷺ کی حفاظت کرتے رہیں گے"۔ آفرین ہے کہ ابو طالب نے حضورؐ کی حفاظت کا حق ادا کر دیا۔ زندگی کی آخری سانس تک سایۂ شفقت کیے رکھا۔

یہ دعوت اپنے تاثرات کے ساتھ ختم ہوئی تو تحریکی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے نئی منصوبہ بندی کی گئی۔ عرب میں رواج تھا کہ بیرونی حملے کا خطرہ محسوس ہوتا یا کوئی چھاپہ مار پارٹی کہیں نظر آجاتی تو دیکھنے والا قریبی ٹیلے ٹیکری یا پہاڑی پر چڑھ کر علاقہ میں مقیم قبائل کا نام لے کر پکارتا۔ چھوٹے بڑے مرد وزن بوڑھے جوان آواز سنتے ہی آواز دینے والے کی طرف دوڑ پڑتے۔

نبی اکرمؐ کو اپنوں سے کوئی امید افزاء جواب نہ ملا۔ اگلی صبح کوہِ صفا کے کندھوں پر چڑھ قریش مکہ کو بلانا شروع کیا۔

یاد رہے، یہ وہی کوہِ صفا ہے جس پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہاجرہؓ بیٹے کے لیے پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں۔ قدرتِ خداوندی دیکھیے، آج اسی کی نسل میں سے، اسی کا بیٹا، نبی آخر الزمان ﷺ اسی کوہ صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر مشرکین مکہ کو پیغام حق سنا رہے ہیں۔ اُدھر بھی ایک پیاس تھی، اِدھر بھی ایک پیاس ہے۔ ایک جسم کی پیاس تھی، ایک روح کی پیاس ہے۔ اُدھر بیٹے کی فکر تھی، اِدھر اہل مکہ کی فکر ہے۔ اُدھر مکہ کے سنگلاخ بیابان میں ایک خاندان، ایک نسل، ایک قوم کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، اِدھر انھیں کے مشن تکمیل کے لیے دین اسلام کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔

اسی وادی میں، اسی سلسلہ کوہ کے دامن میں ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے دنیا کے پہلے اور آخری حرم،

Marfat.com

سجدہ گاہ اور خانہ خدا کی عمارت تعمیر کی۔ ادھر آج اس دینؐ کی بنیاد رکھی جا رہی ہے جس نے قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی کی تعمیر نو کرنا ہے، مگر اِدھر اور اُدھر، آج اور کل کے درمیان صدیوں کا بُعد ہے۔ سینکڑوں تہذیبوں کا فرق ہے۔ نسلِ انسانی کی ہزاروں فصلوں کی دوری ہے۔

یا معشر القریش! یا معشر القریش! یا معشر القریش! کی آواز سن کر تمام مکہ صفا کی طرف دوڑ پڑا۔ بوڑھے بچے جوان سبھی چلے آ رہے تھے۔ جو خود نہ آ سکے انھوں نے کسی کو خبر لانے کے لیے بھیج دیا۔ پہاڑی کے دامن میں ایک جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا۔ شاہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پہلا جلسہ تھا اور اتنے بڑے جلسے سے پہلا خطاب تھا۔ خدا کی توحید کا پہلا عوامی اعلان تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بول رہے تھے اور لوگ سن رہے تھے۔

''اے لوگو! اگر میں[34] تمھیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے پیچھے بہت بڑا لشکر کھڑا ہے جو تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم سچ مان لو گے۔ سب نے یک زبان کہا۔ ہاں ہاں ہم نے تمھیں ہمیشہ سچ بولتے دیکھا ہے۔ فرمایا اچھا تو میں تمھیں ایک اذیت ناک عذاب کی خبر دیتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اس کی گرفت سے بچانے کی فکر کرو۔ دنیا میں میرا اور تمھارا خون کا رشتہ ہے۔ قیامت کے دن میری رشتہ داری صرف خدا کے ماننے والوں سے ہو گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس دن تم دنیا کا وبال سروں پر اٹھائے مجھے مدد کے لیے پکارو۔ میں اس وقت تمھارے کسی کام نہیں آ سکوں گا، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور راہِ ہدایت پر چلے۔''

اقوامِ مکہ کے سامنے نبیؐ کا یہ پہلا خطبہ تھا۔ یہاں بھی چچا ابولہب کی زبان پھڑک کر دہن سے نکلی، ''ستیاناس ہو تیرا[35] (نعوذ باللہ) تو نے اسی لیے ہمیں یہاں بلایا تھا۔ تو نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ تمھاری ان باتوں سے ہمارے کاروبار زیادہ اہم ہیں۔ پھر ابولہب نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ اس کی باتوں پر کان مت دھرو۔ یہ تو اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔ جاؤ اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔

قارئین یہ وہ شخص ہے جس نے نبی اکرمؐ کو تنگ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، مگر حضورؐ نے ناقابلِ برداشت حد تک صبر کیا۔ آخر خدا کی ذات نے سورہ لہب کی شکل میں اس کی خوب گوشمالی کی۔ خوب گت بنائی۔ جس کی تفصیلات سرد جنگ کے باب میں آئیں گی۔

اس جلسے میں حضرت علیؓ نے علانیہ کہا ''محمدؐ اگرچہ میں عمر میں چھوٹا ہوں مگر تمھارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس اعلانِ عام کے بعد رسول اللہ ﷺ اور انکی تربیت کردہ مختصر انقلابی جماعت اپنے کام

Marfat.com

میں پورے زور شور سے متحرک ہوگئی۔ نبیؐ نے ہر جگہ قرآن سنانا شروع کر دیا۔ راستے میں، گلی میں، بازار میں، دکان میں، چوک میں، حرم میں، جہاں کہیں کوئی شخص مل جاتا اس کی قرآنی آیات سے تواضع کرتے۔ بتوں کی پوجا چھوڑ دینے کی تلقین کرتے۔ سننے والوں میں کوئی سنتا، کوئی نہ سنتا۔ کوئی سن کر گالیاں دیتا تو کوئی سن کر پتھر مارتا، مگر آپؐ اور آپؐ کے صحابہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی وضاحت میں مگن ہوگئے۔ توحید کا پرچار کرتے ہی چلے گئے۔

آپ کبھی کاروباری محفلوں میں کبھی عمرہ حج اور زیارتِ کعبہ کے لیے آنے والوں سے ملاقاتیں کرتے اور دینِ حق کی وضاحت فرماتے۔ پھر یہ سلسلہ عکاظ اور ذوالمجاز کے میلوں تک پھیل گیا۔ غلام و آقا۔ مرد و زن، خاص و عام سبھی تحریکِ اسلامی کی دعوت کا محور تھے۔ جیسے جیسے دعوت کا عمل تیز ہوتا گیا، ایسے ہی مخالفین کی مخالفت میں تیزی آتی گئی۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، اعلانِ نبوت کے پہلے دن سے لے کر فتح مکہ تک دارالندوہ ہر لمحہ، ہر پل اسلام کی مخالفت میں ہلکان رہا۔ یاد رہے کہ دارالندوہ اہلِ مکہ کی مجلس عاملہ تھی، مکہ میں موجود ہر قبیلے کا سردار اس کا ممبر تھا۔ اس عاملہ کا اجلاس صحن حرم میں ہوتا تھا۔ اب کہ یہ مجلسِ عاملہ، یہ ایوان مسلمانوں کے خلاف خفیہ اور علانیہ برسرِ پیکار ہوگیا۔ ایک سرد جنگ مسلمانوں پر مسلط کر دی گئی۔

اس سرد جنگ میں مسلمانوں کو ثقافتی، ابلاغی، خاندانی، سیاسی، معاشی اور زندگی کے ہر شعبے میں مقابلہ کرنا تھا۔ ہر سطح پر ہر ادارے کی تنظیم نو کرنا تھی۔ اس کام کو مخالفوں کی مخالفت نے آسان کر دیا۔

بہر حال مکی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جسے مشرکین کی ریشہ دوانیوں سے پاک قرار دیا جا سکے۔ ہر قسم کی وحشت، ہر قسم کی دہشت گردی ہر قسم کی غنڈہ گردی تحریکِ اسلامی اور اس کے پیروکاروں کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

دارالندوہ کی سرد یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت ارقمؓ بن ابی ارقم کا گھر منتخب کیا گیا جو تاریخ میں دارارقم کے نام سے موسوم ہوا۔ اسلامی تاریخ کا یہ وہ پہلا ادارہ ہے جس میں کارکنان کو زندگی کے اعلیٰ و ارفع مقاصد سے روشناس کروایا گیا۔ اسلام کی یہ وہ پہلی اکیڈمی ہے جس نے مومنین کو قوت برداشت کی معراج پر پہنچا دیا۔ یہ اسلام کی وہ پہلی تربیت گاہ ہے جس میں تربیت پانے والے اپنا حسب و نسب، اپنا مال و متاع، گھر بار چھوڑ کر مساوات کے مثالی رشتوں پر فخر محسوس کرنے لگے۔ اس سے فارغ التحصیل ہونیوالے آئیندہ چند سالوں میں نہ صرف عرب، بلکہ پوری

Marfat.com

دنیا پر چھا گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی ساڑھے بارے لاکھ مربع میل میں ایک مثالی فلاحی ریاست کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس نظریاتی سکول (School of Thought) سے تعلیم لینے والے آئندہ نصف صدی میں افریقہ وسط ایشیا اندلس برصغیر اور سسلی تک چھا گئے۔ ان کے جہاز آبنائے ہرمز سے بھی آگے دکھائی دینے لگے۔

آیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریکی مساعی کا جائزہ لیں۔ اس موضوع کی طرف چلیں جس نے اس گناہ گار کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ سرد جنگ جو نبیؐ کے خلاف مسلط کی گئی۔ جو تاریخ کی سب سے بڑی اور لمبی سرد جنگ ہے۔ اُسے احاطہ تحریر میں لائیں۔

---(((الحمد للہ)))---

حواشی:

1- سیرت النبی، ابن ہشام۔
2- ابن ہشام۔
3- بخاری باب المناقب۔
4- رحمت اللعالمین، ابن ہشام وغیرہ۔
5- کارلائل The Heroes۔
6- بخاری شریف، ابن ہشام، سرور عالم، رحمت اللعالمین۔
7- شرح بخاری، سیرت النبی ﷺ۔
8- ابن ہشام، سرور عالم، رحمت للعالمینؐ، سیرت النبیؐ۔
9- اس تاریخ میں بعض روایتوں میں اختلاف ہے مگر اکثر علماء کرام سترہ پر متفق ہیں اس لیے یہی درج کر دی ہے۔
10- بخاری، طبری، ابن فلاون، ابن ہشام وغیرہم۔
11- ان آیات کا ترجمہ۔ موضح القرآن، تفسیر عثمانی اور تفہیم القرآن تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے۔
12- طبری بروایت خدیجہؓ۔
13- ابن ہشام جلد اول۔
14- ابن ہشام جلد اول۔
15- حضور ﷺ کی کنیت تھی۔

Marfat.com

16- ابن ہشام۔
17- ابن ہشام، سرور عالم۔
18- صحیح بخاری باب التعبیر۔ سیرت النبی۔ فتح الباری جلد 12۔ حیات محمدؐ۔ محمد حسین ہیکل۔ تفصیلات انوار القرآن۔ تفہیم القرآن۔ تفسیر ابن کثیر۔ تفسیر عثمانی۔ سورۃ العلق کی تفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔
19- انوار القرآن (بروایت امام زہری اور حضرت جابرؓ) ڈاکٹر ملک غلام مرتضٰی۔
20- ابنِ ہشام، سرور عالم۔
21- سیرت محمد، از محمد حسین ہیکل۔ صفحہ 154۔
22- عشرہ مبشرہ ان صحابہ کو کہا جاتا ہے جنھیں اس دنیاوی زندگی میں جنت کے سرٹیفکیٹ مل گئے تھے۔
23- سیرت النبی، جلد اول۔
24- سیرت سرور عالم، جلد دوم۔
25- سیرت النبی، ابن ہشام، سیرت سرور دو عالم۔
26- سورہ الحجر۔
27- سورۃ الشعراء۔
28- حیات محمد از محمد حسین ہیکل، ترجمہ ابو یحیٰی امام خاں۔
29- بلاذر اور ابن اثیر 45 اور باقی سیرت نگار تعداد 40 بتاتے ہیں۔
30- بلاذری انساب الاشراف۔
31- تاریخ کامل ابن اثیر، بلاذر انساب الاشراف۔
32- ایضاً۔
33- ایضاً۔
34- بخاری، ابن ہشام، سیرت النبی، سیرت سرور عالم الغرض حدیث اور سیرت کی تمام کتب تفصیلات درج ہیں۔
35- ابن ہشام۔ سیرت النبی۔ سیرت سرور عالم۔ بخاری شریف۔

Marfat.com

باب:4

سرد جنگ

سرد جنگ کا آغاز

"Muhammad[1] "peace be upon him" was the only man in history who was supremely successfull on both the religious and secular levels"

ترجمہ:۔"تاریخ انسانی میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایسی شخصیت ہیں جو دینی اور دنیوی لحاظ سے کامیابی کے انتہائی اونچے مقام پر ہیں۔"

یہ الفاظ ایک مغربی غیر مسلم کے ہیں۔ حضورﷺ کی شخصیت ویسے تو اتنی اکمل اور جامع ہے کہ انسان ساری عمر بھی لکھتا رہے۔ کسی ایک پہلو پر لکھتے لکھتے عمر بیت جائے۔ تشنگیٔ تحریر اتنی ہی رہے گی، جتنی پہلے دن تھی، مگر قائدانہ صلاحیتوں کی داد کے لیے یہی کافی ہے کہ آج تک مخالفین کو تاریخِ انسانی میں ایسی ہستی نظر نہیں آئی جو حضورؐ کی گرد کو ہی چھو سکے۔ بلاشبہ نسلِ انسانی میں حضورﷺ جیسی نہ کوئی ہستی تھی، نہ ہے اور نہ ہوگی۔ بدقسمتی تھی اہل مکہ کی جو آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی اندھے رہے جو شاہِ دو عالم کے قریب رہتے ہوئے بھی دور رہے۔ جو ساگرِ فیوض سے فیض نہ پا سکے۔ جو آفتابِ عالم کی شعاؤں سے دور تاریکیوں میں بھٹکتے رہے۔ جو رحمتوں سے فیضیاب ہونے کی بجائے خدا کے عذاب کو دعوت دیتے رہے۔

کسی بھی انقلابی دعوت کی طرف جب لوگوں کو بلایا جاتا ہے تو اُس کے خلاف رائج الوقت نظام اور معاشرتی اقدار کے راسخ العقیدہ بت بر سرِ پیکار ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر جس تحریک کی بنیادیں معاشرتی آلودگی اور نظریاتی ماحول کا صفایا کرنے پر کھڑی کی جائیں اور وہ تحریک نادار، مظلوم اور محروم طبقہ کی آواز بن جائے تو اس کے حلاوت آگیں اثرات کو زائل کرنے کے لیے گمراہ

کن پروپیگنڈا استعمال کیا جاتا ہے۔ غلط خبریں (Disinformation) پھیلائی جاتی ہیں۔ الزامات اور غل غپڑہ کے ساتھ ساتھ نشرواشاعت کے ایسے اسلوب اپنائے جاتے ہیں کہ لوگوں کے شور شرابے سے شکوک واوہام جنم لے کر صاف فضا کو آلود کر دیتے ہیں۔ یوں تحریک کی افادیت اور ہمہ گیری کا پتا ہی نہیں چل پاتا۔ یوں تحریک مؤثر پروپیگنڈا یا مخالفین کا سیاسی اثر ورسوخ یا ان کی معاشی ومعاشرتی بالاتری کے ظاہری اثرات میں دب جاتی ہے۔ یہ نہ ہو تو کم از کم اتنا ضرور ہو جاتا ہے کہ اثر آفرینی سست روی کا شکار ہو جاتی ہے۔ انقلاب کا وقت طویل ہو جاتا ہے۔ وقت کی طوالت کارکنان کے اعصاب کو شل کر دیتی ہے۔ اس دوران مخالف پروپیگنڈا کا مؤثر توڑ صرف تحریکی نعرے، تحریکی نصب العین اور تحریک کی بانی شخصیت ہی ہوتے ہیں۔ اگر نعرے کمزور پڑ جائیں تو یقینی بات ہے۔ انقلاب مقررہ وقتی اندازے سے لمبا ہو جائے گا۔ کارکنان میں مایوسی اور بددلی کو تحریک ہوگی۔

آج سے چودہ سو سال قبل ختم الرسل ﷺ نے جب کوہِ صفا کے کندھوں پر چڑھ کر اقوامِ قریش کو پیغام حق سنایا تو پورا عرب اپنی تمام رعونتوں اور وسائل کے ساتھ آپ کا دشمن بن گیا۔ یہ ایک انقلاب آفریں آواز تھی۔ انسانیت پرور پیغام تھا۔ معاشی ومعاشرتی مساوات کا درس تھا۔ وہ معاشرتی دستاویز جو گورے کالے، ادنیٰ واعلیٰ، غلام وآقا کے امتیازات سے سیاہ فام تھی۔ سیاہ قوانین کا سرچشمہ تھی۔ یہ نعرہ اس کے خلاف الٹی میٹم تھا۔ اعلان جنگ تھا۔

ادھر قصرِ نخوت وغرور، اصنامِ ذات پات اور جھوٹی شان وشوکت، غلامی اور ناہمواری کے بت پاش پاش ہونے لگے تو مشرکینِ مکہ اپنے تمام وسائل، تمام ذرائع آمدورفت اور تمام ذرائع نشرواشاعت کے ساتھ اس تحریک اور اس کے ہمہ گیر اثرات کو روکنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ صرف لفظ گری ہی نہیں۔ اس کی بیشمار مثالیں قرآن، سیرت اور تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ہماری اس ادنیٰ سی جسارت کا مقصد بھی مشرکین کی مخالفتوں اور ان کے انھی رویوں پر نقد ونظر کرنا ہے۔ سرد جنگ کے مختلف موضوعات کے تحت اسی تاریخ مکہ کو احاطۂ تحریر میں لانا ہے۔

اسلام ایک دینِ فکروعمل اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ ان دنوں روسائے مکہ سے اس کے بنیادی اصول لا الہ الا اللہ کو منوانا اور اس کے نصب العین محمد رسول اللہ کی پیروی کروانا دورنتائج کا حامل تھا۔ ایک طرف تو ان کے آباؤاجداد کے دین سے انکار ہونا تھا اور دوسری طرف قریشِ مکہ کو پورے عرب میں کعبہ کے متولی اور کلید بردار ہونے کی وجہ سے جو اعزاز حاصل تھا اسے چھن جانا تھا۔

Marfat.com

پرانے معاشرتی وسیاسی نظام کے ساتھ ان کے ہر قسم کے مفادات وابستہ تھے۔ وہ عرب میں اپنی سیادت وقیادت اور اعلیٰ طبقاتی اعزاز کو بچانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ لوگ اس انقلابی تحریک کو اس کی جڑیں مضبوط اور گہری ہونے سے پہلے ہی اُکھاڑ پھینکنے کو تیار ہو گئے۔ وسائل اور عددی برتری کی وجہ سے وہ درست سمجھتے تھے کہ وہ اسلام کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔ واقعی انھوں نے مخالفت کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

اس کے برعکس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وسائل بہت کم تھے۔ ان کے تحریکی اور انقلابی پروگرام کو لے کر چلنے والے زیادہ تر افراد بھی نادار اور مفلس تھے۔ مشرکینِ مکہ کے پاس ذرائع نشرواشاعت بھی بڑے مؤثر تھے۔ حضور ﷺ کے پاس صرف وحی الٰہی سب سے وزن دار اور جاندار ذریعہ جو تمام تحریکی کام کا منبع تھی جو لوگوں کو متاثر کرسکتی تھی۔ کارکنان کی تعداد میں روز بروز اضافہ کا باعث بن سکتی تھی۔ دوسرے خود اس تحریک کے بانی محمد رسول اللہ کی بے داغ اور باعمل شخصیت تھی۔ جن کے کردار واصول کے مخالفین بھی معترف تھے۔ ایک تو خدا کا کلام دلنشیں اور سحر آگیں۔ دوسرا محمد ﷺ کی شخصیت قرآن کی جامع تشریح اور تفسیر۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اس وقت تک کوئی تحریک معاشرے پر صرف اپنے اصول اور پروگرام کی وجہ سے اثر انداز نہیں ہوسکتی جب تک ان اصولوں اور پروگرام کے ساتھ ایک پرکشش شخصیت وابستہ نہ ہو۔ ایسی شخصیت جو افعال واقوال میں تحریک کے ایک ایک لفظ، بلکہ ایک ایک حرف کی عملی تصویر اور نمونہ نہ ہو۔ نازل ہونے والا قرآن جس حقیقت کا ادراک اور شعور پیش کررہا تھا۔ بانیٔ تحریک اس کا مجسم نمونہ اور تفسیر تھے۔ یہ صرف کہنے کی بات نہیں ہے، اس کی شہادت خود قرآن پیش کررہا ہے۔

وَاَنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝[2]

بے شک آپ حسنِ اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپؐ کے کردار کو قرآن کی عملی تصویر بتایا۔

کان خُلُقُهُ الْقُرآن ۝

اخلاق حسنہ کے لحاظ سے آپ سراپا قرآن تھے!!

بہت بیوقوف تھے وہ لوگ جنھوں نے آپ کی شخصیت اور کردار کو جانتے ہوئے بھی مخالفت کی، حالانکہ اُنہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ محمد ﷺ کی برپا کی ہوئی تحریک کے اثرات کو زائل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ یہ آزادی اور مساوات کا حسین وفرحت انگیز تصور تھا۔ اس دنیا کے

بعد دارالآخرت میں پیروکاروں کو جنت کی نوید اور جنت میں بے پناہ حسین وجمیل انعامات ملنے کا مژدہ تھا۔ کوئی خوف کوئی لالچ کوئی سبز باغ کوئی طمع تحریکی کارکنوں کو ان مقاصد کے حصول کی کوششوں سے باز نہیں رکھ سکے گا۔ ایسا ہی ہوا، بلکہ ایسا ہوکر ہی رہا۔

آج اس جدید دور میں، جبکہ الیکٹرانک میڈیا نے دنیا کو آواز اور تصویر میں سمیٹ لیا ہے، کوئی بھی ترقی یافتہ ملک جنگ کیے بغیر تیسری دنیا کو صرف ثقافتی یلغار سے محکوم رکھ سکتا ہے۔ ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ وطن عزیز جیسے تیسری دنیا کے کئی ممالک اب نیو ورلڈ آرڈر اور گلوبلائزیشن کی گرفت میں ہیں۔ اقوام متحدہ جو انسانی حقوق کی علمبردار تھی، آج نیو ورلڈ آرڈر کے اہم رکن یا کل پرزے کے طور پر چل رہی ہے۔ ہمارے اوپر غلامی مسلط کرنے کے لیے اس کا ذیلی ادارہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک ہی کافی ہے۔ میں آج جب یہ سوچتا ہوں کہ ہم کیسے اس عذاب سے نجات حاصل کر سکتے ہیں تو آناً فاناً میرے سامنے چودہ سو سال پہلے مکہ میں لڑی جانے والی سرد جنگ کا نقشہ اُبھرتا ہے۔ نبیِ اُمّی ﷺ کی سیرتِ طیبہ ذہن ودل کو گدگدانے لگتی ہیں۔ جماعتِ صحابہ کرامؓ کی زندگیاں مشعلیں بن بن کر اُبھرتی ہیں اور دنیا کو امن وآشتی کا جانفزا نغمہ سنانے لگتیں ہیں۔ وہ واشگاف کہتی ہوئی نظر آتیں ہیں کہ جہاں بانی سے ہے دشوار تر ہے کار جہاں بنی اور کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے......

آج سرد جنگوں کے محاذ پر اکثر ممالک اپنے مخالفین کے خلاف پروپیگنڈا، سفید، سیاہ اور بھورا پروپیگنڈا، ثقافتی حربے، معاشی حربے، نشرواشاعت کے تمام ذرائع اور دہشت گردی جیسے ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ کہیں سیاسی اور سفارتی محاذ کھولے جاتے ہیں کہیں لسانی اور قبائلی تعصب اُبھارا جاتا ہے۔ بالکل آج کی طرح آج سے چودہ صدیاں قبل جاہل اور ناخواندہ مشرکینِ عرب نے اسلامی تحریک کو دبانے کے لیے اس کے اثرات اور پھیلاؤ کو سبوتاژ کرنے کے لیے یہی حربے (Tactitices) استعمال کیے، مگر خاتم النبیینؐ، جو بذات خود اُمّی یعنی ان پڑھ اور ناخواندہ تھے، انھوں نے نہ صرف مخالفین کی ہر سازش کا بلند ظرفی سے منہ توڑ جواب دیا، بلکہ 23 سال کے مختصر عرصہ میں ساڑھے بارہ لاکھ مربع میل رقبے پر اس لافانی تحریک کی حکمرانی قائم کردی جو آگے چل کر خلفائے راشدین کے دور میں دنیا کے طول وعرض یعنی سندھ سے لیکر آبنائے باسفورس یعنی فلسطین تک پھیل گئی۔

آیئے اس کے خلاف کی جانے والی سازشوں کی تفصیلات کو بے نقاب کرتے ہیں۔ شاید کہ اس تناظر میں ہمیں بھی قومی اور ملی زندگی کا کوئی راستہ مل جائے۔ شاید کہ ہم کو بھی بتانِ رنگ وخون

توڑ کر ملت میں گم ہونے کا گر میسر آ جائے۔شاید کہ ہم ہی خدا کی رحمتوں کے حقدار ٹھہر جائیں۔
شاید کہ ہم میں سے ہی کوئی امین الامت بن کر اٹھے اور ظلم و وحشت کے لیے موت ثابت ہو۔اکیسویں صدی کا نجات دہندہ بن جائے۔شاید کہ بارانِ رحمت کے فیوض اسی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچ جائیں!!!!

———(((الحمد للہ)))———

حواشی

1- مائیکل ایچ ہارٹ ''سو شخصیات'' صفحہ 33۔باب نمبر 1 مطبوعہ 1978ء

Michael H. Hart "The 100" page No. 33 Artical-I

2- قرآن مجید۔

Marfat.com

باب:5

سیاسی محاذ

سرد جنگ کا محاذ سیاست

ہمارے اردگرد آج بھی دنیا کے کئی ممالک اور اقوام کے درمیان سرد جنگیں برپا ہیں۔ کہیں اس کے مقاصد سیاسی، کہیں معاشی، کہیں تہذیبی اور کہیں ثقافتی۔ اصل مدعا سبھی کا ایک ہی ہوتا ہے یعنی کسی قوم کے بنیادی نظریات، تہذیب وثقافت یا تاریخ کو دھندلا کر آئندہ نسلوں کو قومی وملی دھارے سے کاٹ دیا جائے۔ کہیں بین الاقوامی پلیٹ فارم پر بے بس کرنے کے لیے ان اقوام کی مقتدر وباکردار شخصیات کی کردار کشی کی جاتی ہے اور کہیں مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے پورے ملک اور پوری قوم کو بین الاقوامی لیول پر بدنام کر کے ان کے سیاسی رابطے اور ہمدردیاں چھین لی جاتی ہیں۔ کبھی یہی مقاصد ذاتی، خاندانی اور ملکی اثر ورسوخ یا دباؤ کے ذریعہ حاصل کیے جاتے ہیں۔

اسلام کے خلاف اسلام کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں دارالندوہ کی جو حکمت عملی طے پائی اس کے مطابق شروع شروع میں سیاسی لیول پر حضور ﷺ کو متاثر کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔ ہر قسم کا سیاسی اثر ورسوخ استعمال کیا گیا۔ ہر قسم کا لالچ دیا گیا۔ ان کے کارکنان پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا گیا تا کہ محمد ﷺ کو سیاسی لحاظ سے بے بس کر دیا جائے۔ تحریک اسلامی کے کارکنان پر سیاسی میدان میں تنہائی کا تصور بیدار کر دیا جائے تا کہ وہ بددل ہو کر اسلامی تحریک سے کنارہ کش ہو جائیں۔ کلی طور پر نہ سہی، کم از کم جزوی لحاظ سے ہی محمد ﷺ اور اس کے پیروکار باقی معاشرے سے سیاسی طور پر الگ تھلگ ہو جائیں۔

سرد جنگ میں عموماً کسی قوم، لیڈر یا تحریک کے متحرکین پر سیاسی دباؤ بڑھا کر تحریک کے کام کو سست کیا جاتا ہے۔ طرح طرح کی ترغیب اور لالچ دے کر کارکنان کو بددل کیا جاتا ہے۔ یوں

Marfat.com

تحریک سست ہوتے ہوتے ناکام ہوجاتی ہے۔

دارِارقم جتنی تیزی سے اپنے مشن میں آگے بڑھ رہا تھا، اس سے کئی گنا زیادہ تیزی سے دارالندوہ میں بیٹھنے والے وڈیروں کے دماغ اس کے خلاف منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔

امیہ بن خلف،[1] عتبہ بن ربیعہ، حکم بن مروان، ولید بن مغیرہ، نظر بن حارث دارالندوہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ محمد ﷺ کی شخصیت اوران کی تحریک موضوع بحث تھی۔ سب کی سوچ اور فکر پر اس تحریک کا اثر تھا۔

خاموشی اور سکوت کو توڑتے ہوئے عتبہ بن ربیعہ نے حاضرین کو مخاطب کیا: ''اگر تم پسند کرو[2] تو میں محمدؐ کے پاس جا کر بات کر کے دیکھوں''۔ پریشان حال فکر اور سوچ میں محو حاضرین نے تجویز منظور کر لی۔

حضور ﷺ حرم شریف کے ایک کونے میں محوِ یادِ الٰہی تھے۔ عتبہ اُٹھ کر آپؐ کے پاس گیا اور مخاطب ہوا۔ بھتیجے ہمارے ہاں جو عزت تم کو حاصل تھی، آپ ﷺ خود بہتر جانتے ہو۔ حسب نسب میں آپؐ ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ ہو۔ پھر آپؐ نے اچانک اپنی قوم کو یہ کس مصیبت میں ڈال دیا۔ جماعتِ قریش میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بیوقوف کہنے لگے اور ہمارے معبودوں اور دین کی برائی شروع کر دی۔ ہمارے باپ دادا جو مر چکے ہیں ان کو گمراہ کہہ کر بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اب تم ذرا میری بات سنو۔ میں چند تجاویز تمھارے سامنے رکھتا ہوں۔ ان پر غور کرو شاید ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو۔

حضور ﷺ نے فرمایا ''اے ابو ولید! آپ کہیں میں سنوں گا۔'' اس نے کہا بھتیجے یہ کام جو آپؐ نے شروع کر رکھا ہے، اگر اس کے پیچھے تمھارا مقصد مال کا حصول ہے تو ہم سب مل کر تمھیں مکہ کا مالدار ترین شخص بنا دیں گے۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ کسی معاملے کا فیصلہ تمھارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم سب ملکر تاجپوشی کر دیتے ہیں۔ اگر کسی جن بھوت کا سایہ ہے تو ہم اپنے خرچ پر تمھارا علاج کروا دیتے ہیں۔ عتبہ یہ باتیں کرتا رہا آپؐ خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا ''اے ابو ولید! جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کہہ چکے یا کچھ اور کہنا چاہتے ہو۔'' اس نے کہا بس میں نے جو کہنا تھا کہہ چکا۔ آپؐ نے فرمایا ''اچھا اب میری سنیے۔'' اور پھر آپؐ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا اور سورہ حٰم السجدہ کی تلاوت فرمائی۔ آیتِ سجدہ پر سجدہ کیا اور سر اُٹھا کر کہا اے ابو ولید! میرا جواب آپ نے سن لیا۔ اب تم جانو اور تمھارا کام'' عتبہ سرداران قریش کی مجلس کی طرف چلا تو شخصیت میں بوکھلاہٹ اور

Marfat.com

لڑکھڑاہٹ نمایاں تھی۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں نے کہا خدا کی قسم عتبہ وہ نہیں رہا جو گیا تھا۔ جب آ کے وہ بیٹھا تو حاضرین نے پوچھا کیا سن آئے۔ عتبہ نے جواب دیا بخدا میں نے ایسا کلام سنا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ خدا کی قسم! نہ یہ شعر ہے، نہ سحر اور نہ کہانت۔ اے اہل قریش میری بات مانو۔ اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میرا خیال ہے۔ یہ کلام رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو تم اپنے بھائی پر ہاتھ اٹھانے سے بچ جاؤ گے۔ دوسرے اس سے نمٹ لیں گے، لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی عزت تمہاری عزت ہو گی۔ اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی ہو گی۔ دانشوران دار الندوہ یہ بات سنتے ہی سٹپٹا اٹھے کہ "اے ابو ولید آخر اس کا جادو تم پر چل ہی گیا۔

ابو ولید نے کہا یہ تو میری ایک رائے[3] تھی جو عرض کر دی تمہارا جو دل چاہے کرو۔

بات دراصل یہ ہے کہ مذاکرات کی میز پر وہی لیڈر کامیاب ہوتا ہے جو مخالف کو اپنا موقف بیان کرنے کا پورا پورا موقع دیتا ہے۔ سرد جنگ کی ٹیکٹس کے مطابق مخالف کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیتا ہے اور خود انتہائی ٹھنڈے دل سے مخالف کے ایک ایک لفظ پر غور کرتا ہے۔ ہر وقت مزاج بخیر رکھنے والے لیڈر مذاکرات کی میز پر کبھی ناکام نہیں ہوتے، بلکہ مخالفین پر بڑے گہرے نقوش مرتب کرتے ہیں۔ اپنی تحمل مزاجی، پراسراریت، سحر انگیز لب و لہجہ اور سچ کی تدبیراتی حلاوت آگینی سے مخالف کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کا شکار کر دیتے ہیں۔

غالباً یہی کچھ عتبہ کے ساتھ ہوا ہو گا جب وہ واپس مڑا تو ٹانگوں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ حواس بھی تحمل تھے۔ ذہن میں سچ اور جھوٹ کے فرق کا ہیجان تھا۔

لوگوں نے دیکھتے ہی کہا بخدا عتبہ وہ نہیں رہا جو گیا تھا۔ اس نے حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، میں نے ایسا کلام سنا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ واللہ! وہ نہ شعر ہے۔ نہ سحر اور نہ کہانت۔ اے اہل قریش اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس میں ہماری بہتری ہے۔ اگر دوسرے عربوں نے اسے مغلوب کر لیا تو وہ خود بخود ختم ہو جائے گا اور تم اپنے بھائی پر ہاتھ اٹھانے سے بچ جاؤ گے۔ اگر اس نے تمام عرب پر غلبہ پا لیا تو اس کی عزت تمہاری عزت اور اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی ہو گی۔ عتبہ کے یہ الفاظ سن کر سب سیخ پا ہو کر بولے: عتبہ تم پر بھی جادو چل گیا۔

عتبہ نے کہا یہ میری رائے تھی جو عرض کر دی اب تمہارا جو جی چاہے کرو۔

———(((البلد الکبیر)))———

Marfat.com

انسانی حقوق اور آزادی کی وہ تحریکیں جن کی بنیاد توحید اور خوف خدا ہو، سیاسی ہتھکنڈوں سے کبھی مات نہیں کھاتیں، بلکہ مخالفت اس کی تشہیر اور نشر و اشاعت کا عنوان بن جاتی ہے۔

بڑے سبز باغ لے کر گئے بادشاہت دینا چاہتے تھے۔ مال و منصب کی پیش کش لے کر گئے تھے۔ پھر کیا ہوا قرآن کے حلاوت آگیں اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

تجسس سا اُبھرتا ہے۔ وہ کونسی بات تھی جس نے ابو ولید کو متاثر کیا۔ وہ کونسی دلیل تھی جس کی وہ تاب نہ لا سکا۔ وہ کونسا جواب تھا جو اس کی شخصیت ہی مضمحل کر گیا۔ جس نے اعصاب میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دی۔ وہ کونسا کلام تھا یا اس کلام میں کونسی عظمت تھی جسے سن کر عتبہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا جسے سن کر اسے کہنا پڑا کہ یہ نہ شعر ہے، نہ سحر ہے اور نہ کہانت۔ جس کی تاثیر نے اسے یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ یہ کلام ضرور کوئی رنگ لا کر رہے گا۔ اس لیے میری رائے ہے کہ محمد ﷺ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔

قارئین آیئے سورہ حم السجدہ میں موجود حلاوت آگیں پیغام کا سطحی سا جائزہ لے کر دیکھیں تو سہی۔ اس میں موجود واقعات کو دقت نظر سے دیکھیں تو سہی۔ اس پردے کے پیچھے کیا ہے۔

دراصل مشرکین قرآن کو کلامِ الٰہی ماننے[4] سے انکار کرتے تھے۔ سورہ کا آغاز ان کے اس اعتراض سے ہوتا ہے۔ پھر ان کا اعتراض تھا کہ بندہ وہ بھی ہم جیسا، ہم میں سے نبی کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کے اس اعتراض کو آگے چل کر لپیٹ لیا گیا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ...... آیتہ: 6

مفہوم:۔ "کہہ دیجئے کہ میں بھی تم جیسا آدمی ہوں البتہ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود یکتا ہے سیدھے اس کی طرف توجہ کرو۔ اس سے مغفرت مانگو۔"

یہ حضور ﷺ کے منصبِ رسالت کی وضاحت ہے۔ یعنی میری تعلیمات بس یہی ہیں۔ اللہ کو ایک مانو۔

ہر معاملے میں اسی سے رجوع کرو۔

اپنی سابقہ کوتاہیوں پر، شرکیہ زندگی پر، اس سے معافی مانگو۔

بعد ازاں زمین و آسمان کی تخلیق، ان میں موجود لوازمات معیشت اور ان کے اطاعت قبول کرنے کا ذکر ہے۔

یہ قرآن کا انداز تخاطب ہے، اسلوب بیان ہے، بلکہ حسنِ ادا ہے کہ انتہائی لطیف انداز سے

Marfat.com

کلام کا آغاز ہوتا ہے۔ ترغیب اور شکوک کا ازالہ کرنے کے بعد سادگی اور برجستگی کے ساتھ تمثیلی انداز میں تنبیہ یا وعید کی جاتی ہے کہ اگر تم راہ راست پر نہ آئے تو تمھارے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے گا جو حق کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا رہا۔ بندے بن جاؤ بندے۔ ورنہ تم کوئی مقدس اور مطہر نہیں ہو جو تمھیں یونہی چھوڑ دیا جائے۔ قرآن کا تمثیلی اندازِ تنبیہ ملاحظہ ہو۔ آیۃ 18-17

مفہوم: ''پھر اگر یہ منہ پھیر لیں تو کہہ دو کہ تمھیں ایک چنگھاڑنے کے عذاب سے آگاہ کرتا ہوں جیسے عاد و ثمود پر عذاب آیا جب ان کے پاس نبی آگے سے اور پیچھے سے آئے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو تو وہ کہنے لگے ہمارا رب چاہتا تو فرشتے اتار دیتا جو کچھ تم دے کر بھیجے گئے ہو۔ ہم اس کو نہیں مانتے ......اور جو ثمود تھے ہم نے اُن کو سیدھا راستہ دکھایا' مگر انھوں نے اندھا رہنا پسند کیا تو ان کو ایک کڑک نے آ پکڑا۔ وہ ذلت کا عذاب تھا اور جو ایمان لائے، ہم نے ان کو بچا لیا''۔

اس کے بعد آخرت کی منظر کشی کی گئی ہے جس میں ہر آدمی اپنے اعمال کے ساتھ پیش ہوگا۔ اس وقت انسانی اعضا خود انسان کے خلاف گواہی دیں گے پھر قرآن کی عظمت کا اعتراف ہے اور نجات کا راستہ صرف قرآن سے متعلق کر دیا گیا ہے۔ ہدایت صرف قرآن سے منسلک کر دی گئی ہے۔ اس پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا ہونے والوں کو خوشخبری دی گئی ہے۔ اس کے بعد آیتِ سجدہ ہے جس میں چاند اور سورج کو خدا کی تخلیقات میں سے بتایا گیا ہے اور ان کی عبادت سے منع کیا گیا ہے۔

اور پھر زمین کی مثال دے کر موت کے بعد کی زندگی پر مطلع کیا گیا ہے اور قرآن کی حفاظت کا دعویٰ، موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی کتاب زبور کا حوالہ نیز قیامت اور انسانی فطرت کا ذکر کیا گیا ہے۔

آخر میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ عنقریب ایسی نشانیاں دکھائیں گے کہ قرآن کی حقانیت خود بخود کھل کر سامنے آ جائے گی۔

قارئین! یہ ہے اس سورہ کا سطحی سا خاکہ جو عتبہ کے سامنے پیش کی گئی۔ عتبہ ایک عرب تھا۔ ادب اور اسلوب کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ سن کر حواس باختہ ہو گیا۔ ایک ایک لفظ اسے جھنجھوڑتا رہا اور سن سن کر اس کے اعصاب تڑاخ تڑاخ ٹوٹتے رہے۔

مولانا مودودی نے سیرت سرور عالم میں بیہقی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب حضور ﷺ اس

Marfat.com

سورہ کی آیت نمبر 13 یعنی عاد و ثمود کے عذاب والی آیت پر پہنچے تو عتبہ [5] نے بے اختیار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہنے لگا کہ ایسی بات نہ کہو۔ اپنی اس حرکت کا سبب لوگوں کو یہ بتایا کہ تم جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کہی ہوئی بات جھوٹی نہیں ہوتی اس لیے مجھے بھی عذاب کا خوف محسوس ہوا جو یہ حرکت کی۔

یہ واقعہ بذات خود تجسس کا بھرپور تاثر لیے ہوئے ہے۔ تجسس کو اُبھارنا سرد جنگ کی بہترین تدبیر ہے۔ یقیناً جب یہ کلام عام لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہوگا تو وہ لوگ جو تاریخ سے نابلد تھے عاد و ثمود اور چنگھاڑ کی تفصیلات جاننے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ آیئے ذرا اس اچھوتے ور پُر تجسس پہلو کو بھی احاطۂ تحریر میں لا کر دیکھیں تا کہ قرآن کے واقعاتی، تمثیلی اور تاریخی اسلوب کے خرمنوں سے کچھ خوشہ چینی ہم بھی کر سکیں۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

قومِ عاد

(حضرت ہود علیہ السلام کی قوم)

قومِ عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام سام تھا۔ طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد مختلف سمتوں میں پھیل گئی اور نوح علیہ السلام کے بیٹے سام نے ارضِ "احقاف" کو اپنا مسکن بنایا۔ یہ حضرموت کے شمال میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں عمان اور شمال میں ربع الخالی ہے۔ مغربی دریائے فرات کے کنارے یہ لوگ آباد تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی سطوت اور حکومت اور وسعت دی کہ بعض مورخین کے نزدیک حضرموت سے لے کر خلیج فارس اور یمن تک اور خلیج فارس کے ساحلوں سے لے کر حدودِ عراق تک ان کا طوطی بولتا تھا۔

قوم عاد کا جدِّ اعلیٰ "عاد" نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی اولاد میں سے تھا۔ ان کی ترقی وعروج کا زمانہ 750 سال بعد نوح علیہ السلام کا ہے۔

قرآن نے اس قوم کو مِنۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوحٍ کہہ کر نوح علیہ السلام کے اخلاف میں شمار کیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد شام کی دوبارہ آبادکاری ہوئی اور اممِ سامیہ کی ترقی یہی سے شروع ہوتی ہے۔ قومِ عاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار (2000) قبل مسیح کا ہے۔ بعض تاریخوں میں عاد کے دو بیٹوں شدید اور شداد کا ذکر ہے۔ شدید کا دورِ حکومت 700 سال بتایا جاتا ہے سات سو سال حکومت کرنے کے بعد شدید راہئ ملک عدم ہوا تو اس کا چھوٹا بھائی شداد سریر آرائے سلطنت ہوا۔

گردشِ ماہ و سال کی گرد میں نوح علیہ السلام کی تعلیمات ماند ہوئیں۔ قوت و اقتدار نے عادیوں کو خدائے واحدۂ لاشریک سے یکسر بیگانہ کر دیا۔ یہ ان کی بدبختی کی انتہا تھی۔

قومِ نوحؑ کی طرح ان کے ہیکلوں میں بھی ود، سواع یغوث، اور نسر رکھ دیئے گئے۔ ایک خدا

کی بجائے سینکڑوں فرضی خداؤں کو پوجا جانے لگا۔ آوازۂ حق کا شہدان کے ہر طبقہ میں مسموم ہو گیا۔ ان کے معدودے چند لوگوں توحید کا صرف تصور باقی تھا حقیقت موجود نہ تھی۔ ہر طرف ظلم و بربریت کا بازار گرم تھا۔ حکمران اور سردار ظالم تھے، بلکہ ظلم ان کا طرۂ سرداری اور حکمرانی تھا۔

جب قوم کی یہ حالت ہو جائے تو خدا کا عذاب یقینی ہو جاتا ہے اور یہ عذاب آسمانوں سے چمک کر زمین سے پھٹ کر یا رعد بن کر گمراہ قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

شداد انتہائی ظالم و جابر تھا، بدکردار تھا۔ اس کی بدکرداری کی کئی داستانیں تاریخ کے اوراق میں موجود ہیں۔

تاریخ کے مطابق شداد یا اس کی قوم کے زوال کے کئی سو سال بعد جب کلال بن یغوث حمیدی نے اپنی قوم کے نشانِ رفتہ تلاش کرنے کے لیے کھدائی کی تو اسے چاندی کے تخت پر ایک نوجوان لڑکی کا ڈھانچہ پڑا ملا جس کی پیشانی پر ایک پلیٹ پر لکھا ہوا تھا۔

''میں شداد کی بیٹی ہوں جس نے میرے ساتھ دست درازی کی''۔ ہوا یوں کہ ایک دن شداد شراب کے نشے میں بدمست تھا۔ اس کی اپنی بیٹی ضبغہ کسی ضروری کام سے اس کے کمرے میں آئی۔ اس نے پوچھا کون؟

میں ہوں ضبغہ۔ وہ بولی۔

اس نے کن انکھیوں سے لڑکی کو دیکھا اور کہا ادھر آؤ۔

ضبغہ اس کے قریب چلی گئی۔

اس نے کچھ تامل کے بعد بیٹی سے دست درازی شروع کر دی اور وہ بیچاری ابا حضور! ابا حضور! پکارتی رہی۔

چاہیے تو یہ تھا کہ اسی وقت شداد اور اس کی قوم کو غرق کر دیا جاتا، لیکن نہیں سنتِ خداوندی کچھ اور ہی کہتی ہے۔ خدا تعالیٰ عذاب سے قبل اپنے بندوں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے کسی نبی کو مبعوث فرماتا ہے تا کہ حُجت پوری ہو جائے۔

قومِ عاد کا تعلق عرب کی قدیم اقوام ''امم سامیہ'' سے تھا۔ عرب کے قدیم باشندے اپنے آبائی وطن سے نکل کر مصر شام اور بابل کی طرف ہجرت کر گئے۔ اس کی تاریخی وجہ طوفانِ نوحؑ نظر آتی ہے۔ اس بات کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ قومِ عاد حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کی نسل میں سے ہے۔ انھی کی مختلف اقسام کو عاد ثمود طسم اور جدیس کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے انہی کو اقوام عادِ اولیٰ کا نام بھی دیا ہے اور انھی کو ارامی بھی کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

ان کی زبان عربی تھی، عاد عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بلند و بالا کے ہیں اور ارم کے معنی بھی بلند اور مشہور کے ہیں۔

عرب مورخین انھیں امم بائیدہ کہتے ہیں جس کے معنی برباد ہو جانے کے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ بلند و بالا یعنی بہت دراز قد تھے۔ مضبوط ڈھانچوں والے تھے طاقتور اور جری تھے۔ زمین پر پاؤں مار کر زمین میں گھٹنوں تک دھنس جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں سیاسی قوت و اقتدار بھی حاصل تھا۔

ان کے قد کے متعلق بعض اسرائیلی روایات مبالغہ آمیز حد تک بیان کی جاتی ہیں جن کی قرآن یا کسی مستند تاریخ سے کوئی تصدیق نہیں ملتی۔ اس لیے ستر یا اسی گز کا قد محض مبالغہ آمیزی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے متعلق منطقی تاریخی دلیل ناپید ہے۔

قوم عاد کی ستر قبائلی شاخیں تھیں۔ پہاڑ کاٹ کر انھوں نے بڑی عمارتیں تعمیر کیں۔ کئی کئی منزلہ محلات بنائے۔

یوں ان اقوام میں فرعون ہامان شداد اور نمرود جنم لیتے ہیں۔ بے کس اور مجبور انسان محرومیوں کے اندھے غاروں میں دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ اخوت رواداری اور معاشرتی رکھ رکھاؤ کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ حق کی آواز صدا بہ صحرا ہو جاتی ہے۔ حکمرانوں کی خواہشات مذہب کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مذہبی علماء حاکموں کی خوشنودی کے لیے طرح طرح کے توہمات اور عقیدے گھڑ لیتے ہیں۔ یوں تصورِ واحدانیت سے خالی عقیدوں کے بت گھڑ لیے جاتے ہیں۔ قوم کو انھی کی عبادت پر لگا دیا جاتا ہے۔

یہ تمام راستے دینوی بربادی اور اُخروی جہنم کی طرف جاتے ہیں۔

انھی دنوں کی بات ہے جب خباثتیں بامِ عروج پر تھیں۔ قومِ عاد کی سب سے زیادہ معزز قبائلی شاخ ''خلود'' کے ایک آدمی، جس کا نام عبداللہ تھا، بعض روایتوں کے مطابق سلخ تھا، کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا جس کا نام عبر رکھا گیا جو بڑے ہو کر ہود علیہ السلام کے نام سے منصب نبوت پر فائز ہوئے۔

ہود علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ان کے والد کی عمر 70 سال تھی۔ اس سے بھی قومِ عاد کی طویل عمری کی تصدیق ہوتی ہے۔

ابتدائے پیدائش سے ہی ہود علیہ السلام عام معاشرتی اقدار و روایات سے متنفر تھے۔ بچپن سے ہی ان کی طبیعت میں بتوں سے بیزاری، ظالم سے نفرت، مظلوم اور بے کس پر ترحم، تکبر و نخوت

Marfat.com

سے دوری، دور اندیشی، بردباری اور صبر کے جذبات موجود تھے۔

جوں جوں عمر بڑھتی گئی، وہ معاشرے سے الگ تھلگ اور ماحول سے علیحدہ علیحدہ سے رہنے لگے۔ عجیب وغریب قسم کے تدبر اور فکر میں غلطاں رہنے لگے۔

ایسی حالت میں ایک دن جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ خدا کا پیغام دیا کہ اللہ واحدہٗ لا شریک نے آپ کو خلعتِ نبوت سے نوازا ہے اور حکم دیا ہے کہ قومِ عاد کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاؤ۔

یہ حکم ملنا تھا کہ ہود علیہ السلام تبلیغ اسلام میں ہمہ تن لگ گئے۔ اپنی قوم سے فرمایا:

"اے میری قوم میری بات سنو۔ اللہ تعالیٰ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے مجھے تمھاری طرف نبی بنا کر بھیجا ہے تا کہ تمھیں ہدایت یاب کروں۔

یہ اعلانِ نبوت کرنا تھا کہ پوری قوم میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر جگہ ہود علیہ السلام کی دعوت کا چرچا ہونے لگا۔ اس اعلان کے بعد آپ بیٹھے نہیں۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے۔ دن کو رات، جہاں کوئی ملا، جہاں سے گزرے، اس دعوت کا عمل دہراتے چلے گئے۔

جواب میں لوگ احمق اور جھوٹا کہتے۔ بیوقوف اور دیوانہ گردانتے، لیکن آپؑ بس توحید کی رٹ لگاتے ہی چلے گئے۔

ایک دن شداد کو اس کے دربار میں کسی نے ہود علیہ السلام کی دعوت کے متعلق خبر سنائی۔ وہ سنتے ہی غضبناک ہو کر کہنے لگا: مجھے آج تک کسی نے بتایا ہی نہیں۔ دربار میں سناٹا طاری تھا۔ حکم دیا کہ ہود کو حاضر کیا جائے۔

ہود علیہ السلام کسی جگہ لوگوں سے تبلیغی مشن پر مخاطب تھے کہ سرکاری کارندے شداد کا حکم لے کر پہنچے۔ آپ ان کے ساتھ چل دیئے۔

دربار میں شداد ہود علیہ السلام کو دیکھ کر لال پیلا ہو گیا۔ پورا دربار نظر جھکائے مرعوب کھڑا تھا۔ آپ تن کر کھڑے رہے۔ مورخین کہتے ہیں کہ شداد ہود علیہ السلام کا سراپا، جلالت، وجاہت اور طمانیت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ مرعوب سے انداز میں مخاطب ہوا۔

تم ہی ہو جو دعویٔ نبوت کرتے ہو۔

آپ نے کہا، ہاں میں ہی ہوں۔

پھر کہنے لگا تم کہتے ہو کہ ہم سواع، یعوق، ثمود، ود، یغوث اور نسر کی عبادت ترک کر دیں۔

آپؑ نے جواب دیا، تم نے ٹھیک ہی سنا۔ اس کے بعد بڑے جچے تلے اور محبت بھرے انداز میں دعوت دی۔ شداد سن کر مرعوب ہو گیا۔ کہنے لگا تمھارے دین کی قبولیت کے عوض ہمیں کیا ملے گا۔

Marfat.com

اُن قوموں کے علاقے جن کا ذکر سورہ اعراف میں ہے

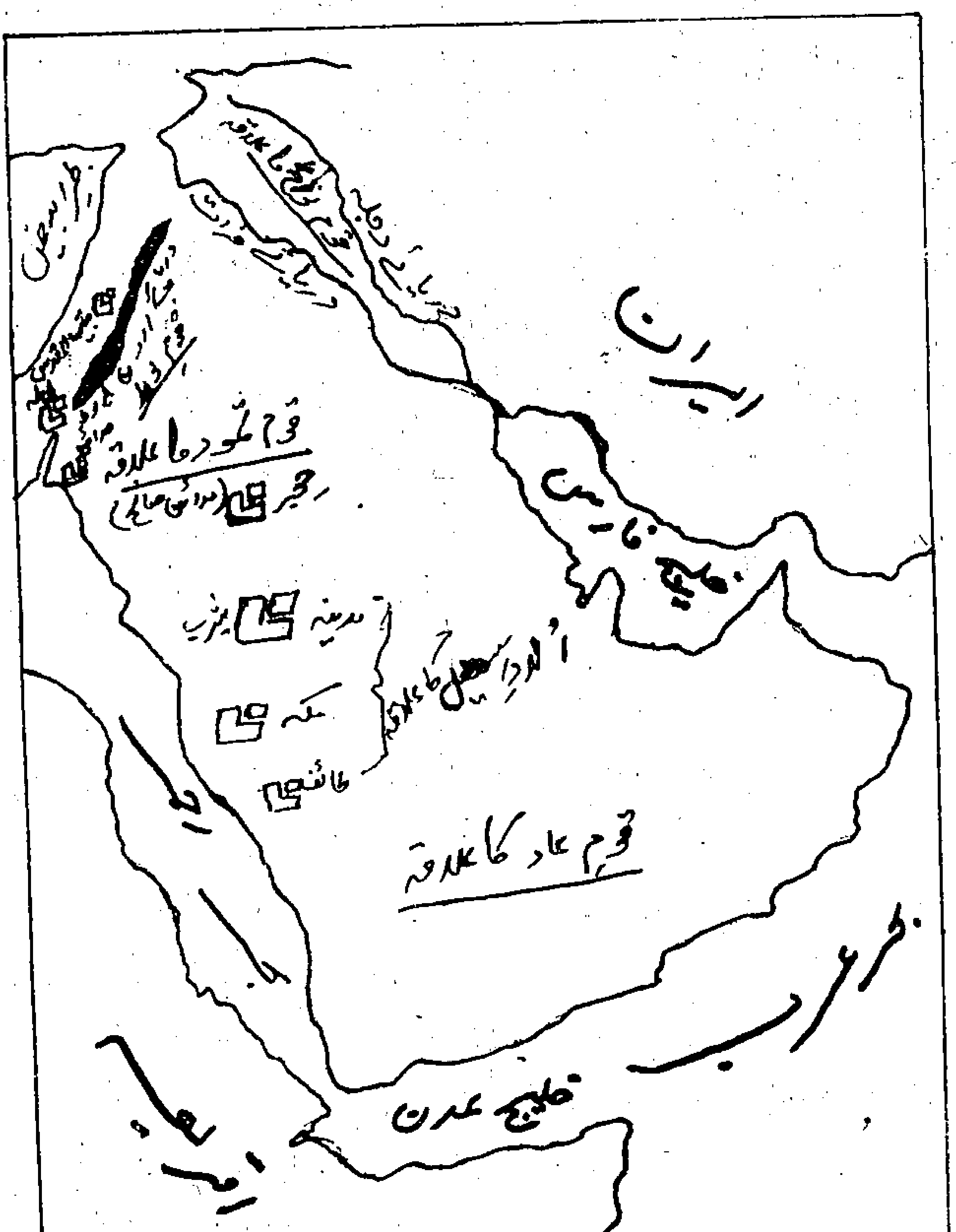

اس کے جواب میں ہود علیہ السلام نے پچھلے گناہوں کی معافی اور خدا کے رحم و کرم کی بارش کا مژدہ سنایا نیز جنت کی منظر کشی کر کے آخرت میں ملنے والے انعامات کی خوش خبری دی۔

سن کر کہنے لگا مجھے بہشت کا لالچ دیتے ہو۔ایسی بہشت تو میں بھی بنا سکتا ہوں۔ مجھے تیرے خدا کی جنت کی کوئی ضرورت نہیں۔(نعوذ باللہ)

آپ نے سمجھانے کی ہزار ہزار تدبیریں کیں جو سب کی سب نقش بر آب ثابت ہوئیں۔

اور پھر شداد نے کئی سالوں میں جنت تیار کروائی۔اس کے افتتاح کے لیے ابھی جنت میں داخل بھی نہ ہوا تھا یعنی گھوڑے سے اُتر رہا تھا کہ خدا کا حکم آ گیا۔اسے عزرائیل علیہ السلام نے اس حالت میں آ لیا کہ اس کا ایک پاؤں گھوڑے کی رکاب میں اور دوسرا باغِ ارم میں تھا۔روحِ متکبر و مغرور جسم سے نجات پا گئی اور زمین نے مصنوعی جنت کو اپنے اندر نگل لیا۔

اس سانحے سے بھی چند لوگوں کے سوا کسی نے اثر نہ لیا۔چند خوش نصیبوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔

دعوتِ حق کے مقابلے میں قوم کی بے ہودگی بڑھتی گئی۔ نبی پر طنز و تنقید اور گالی گلوچ کا طوفان بدتمیزی اُٹھتا چلا گیا۔قوم دعوتِ حق کے مقابلے میں علانیہ عذاب مانگنے لگی۔کہتے لے آ عذاب جو لانا چاہتا ہے، روز روز کی رٹ چھوڑ۔اور۔اور پھر کیا ہوا ایک دن نبی کو خبر ملی کہ قوم انھیں قتل کر دینے کا منصوبہ بنا چکی ہے۔تنگ آ کر حضرت ہود علیہ السلام نے عذاب کے لیے دعا مانگی جو قبول ہوئی۔

قوم کو قحط نے آ گھیرا۔سات سال تک قحط رہا۔بارانِ رحمت برسنا بند ہو گیا آبی ذخائر ختم ہو گئے۔پانی گہرا ہوتا گیا۔بھوک اور افلاس سے تنگ آ کر لوگ بادیہ نشیں ہو گئے۔مومنین کو تنگ کرنے والے ان کے منہ سے یہ الفاظ سن رہے تھے کہ۔

اب کہو ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر سے کہ تمھیں بچائے۔مگر ان کے لیے عذاب مقدر ہو چکا تھا۔ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

پھر ایک دن جبریل تشریف لائے اور عرض کیا: اے نبی اللہ تمھیں اپنے اُمتیوں کے ساتھ یہاں سے کوچ کر جانے کا حکم ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام چار ہزار صحابہ کرام کے ساتھ شہر سے کوچ کر گئے۔

اور ایک دن سیاہ بادل اُٹھے اور ہوائیں چلنے لگیں۔ ہوائیں آندھیوں اور آندھیاں طوفانوں میں بدل گئیں۔

ان کی عمارتیں ایک ایک کر کے گرنا شروع ہو گئیں۔ان کی عظمت اور شان و شوکت کے

نشان مٹنے لگے۔قومِ عاد کو پھر ہوش نہ آیا۔زمین کے اندر گھٹنوں تک دھنس کر کہنے لگے! دیکھتے ہیں، ہود علیہ السلام کی ہوا ہمیں کیا نقصان پہنچاتی ہے۔

ہوا کا یہ عذاب سات رات آٹھ دن مسلسل چلتا رہا۔قرآن نے اس ہوا کو بادِ صَر صَر بھی کہا ہے۔قوی ہیکل قوم جسے اپنی جسمانی مضبوطی اور طاقت کا گھمنڈ تھا، ان کی لاشیں چار سو اس طرح بکھری پڑی تھیں جیسے تناور درخت آندھی میں اُکھڑ کر گر پڑتے ہیں۔قلعہ نما مکانات ریت کے ٹیلے بن گئے۔خوبصورت وادیاں ویران ہو گئیں۔

یہ عادِ اولیٰ کی وہ داستان ہے جس کا ذکر قرآن کی دس سورتوں میں ملتا ہے۔اس قوم کی طرف مبعوث کیے جانے والے نبی حضرت ہود علیہ السلام کا اسم گرامی قرآن کی تین سورتوں میں سات جگہ لکھا گیا ہے۔

قوم کی بربادی کے بعد حضرت ہود علیہ السلام اپنے اُمتیوں کو لے کر یہاں سے نکل گئے۔ انھوں نے بقیہ زندگی حضرموت کے قریب یادِ الٰہی میں گزاری۔

ان کی شادی کب اور کہاں ہوئی۔قرآن اس معاملے میں خاموش ہے۔ہاں بعض غیر مستند اسرائیلی روایات میں اتنا ذکر موجود ہے کہ ان کی شادی ''لیشا'' نام کی ایک خاتون سے ہوئی جس کے بطن سے شالح نے جنم لیا۔یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی رسول یا وکیل کے ہیں۔شالح کی شادی آپؑ کی زندگی میں ہوئی۔مگر تفصیلات بتانے سے تاریخ گریزاں ہے۔صرف اتنا ذکر ملتا ہے کہ شالح نے غزوہ نامی عورت سے نکاح کیا۔

ہود علیہ السلام کی عمر 464 برس بتائی جاتی ہے، مگر مسلمان مورخین اس سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔

ہود علیہ السلام کے مزار کے متعلق بھی اختلاف ہے، مگر زیادہ وزن حضرت علیؓ کے قول میں ہے۔ان کے مطابق حضرت ہودؑ کی قبر حضرموت کے قریب کثیبِ احمر یعنی سرخ ٹیلہ پر ہے۔ان کے سرہانے جھاؤ کا درخت ہے۔

قارئین! یہ اس قوم کی داستانِ عبرت ہے جو اپنے آپ کو مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً یعنی کون ہے ہم سے زیادہ طاقت والا کہا کرتے تھے اور اس کے مخاطب اہلِ مکہ ہیں جو اس عبرت ناک تاریخ سے واقف تھے۔جن تک ایسی داستانیں سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہیں اور پھر یہ ان ہی کے علاقے یعنی ملک عرب کی تاریخ تھی۔

Marfat.com

اب مکرر وہی پیغام ایک نبیؐ سنار ہے تھے۔قومِ عاد کی طرح ان کی قوم بھی ان کی مخالفت پر تلی ہوئی تھی۔جانتے ہوئے بھی اس نبی کی مخالفت کرر ہے تھے۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ جب سورہ حم السجدہ عتبہ کے سامنے تلاوت ہوئی تو وہ حواس باختہ ہو گیا تھا۔اس کے اعضا مضمحل ہو گئے تھے۔مجبوراً اسے کہنا پڑا کہ یہ کلام نہ شعر ہے، نہ جادو اور نہ کہانت۔

بہرحال عنوان کے دوسرے حصے قومِ ثمود کو دیکھتے ہیں جن کی تاریخ مشرکینِ مکہ کے سامنے وحی کی جارہی ہے۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

قوم ثمود
(حضرت صالح علیہ السلام کی قوم)

قوم عاد کی تباہی کو صدیاں گزر گئیں۔ ہود علیہ السلام اپنے چار ہزار ساتھیوں کے ہمراہ زندگی کے آخری ایام عبادت و ریاضت میں گزار کر فوت ہو گئے۔ ان کی اور ان کے اُمتیوں کی نسل پھلی پھولی جنھوں نے یثرب اور شام کے درمیان حکومتیں قائم کیں۔ جن کے مشہور شہر حجر اور یمامہ تھے۔ آج کل اس علاقہ کو فج الناقہ کہا جاتا ہے۔

یہ قوم عادِ ثانیہ کے نام سے مشہور ہوئی جس کو کلامِ مجید میں قوم ثمود کے نام سے بھی یاد کیا گیا۔

عادِ اولیٰ کے بعد یہ دنیا کی دوسری قوم تھی جسے قدیم تہذیب کی بانی کہا جاسکتا ہے، عرب کے مشہور مورخ مسعودی لکھتے ہیں۔

"جو شخص حجاز سے ملک شام کو آتا ہے، اس کی راہ میں اس قوم کے کھنڈرات ملتے ہیں۔ بعض اہل تحقیق نے ان کی برباد بستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک مصری سیاح کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہوا جسے شاہی محل کہا جاتا تھا۔ جس کے کئی کمرے تھے۔ اس محل کے ساتھ ایک طرف بہت بڑا حوض ہے جو پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

ثمود فنِ تعمیر میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ یہ آثار ان کے فنِ تعمیر کا عمدہ ثبوت ہیں۔ قوم عاد کی طرح انھوں نے بھی پہاڑوں کو اپنا مسکن بنایا اسی وجہ سے انھیں عادِ ثانی کہا جاتا ہے۔ قوم عاد بڑے بڑے ستونوں والی کئی کئی منزلہ عمارتیں بنانے میں طاق تھی۔ یہ قوم پہاڑ کاٹ کر عمارتیں بنانے کی ماہر تھی۔

ہود علیہ السلام کی تعلیمات صدیاں گزریں۔ ختم ہو گئیں۔ ایک خدا کی عبادت کی بجائے قوم نے بتوں کو عبادت کا ذریعہ بنایا۔ قوم عاد اور قوم نوحؑ کے بت پوجے جانے لگے۔ ہر طرف ظلم اور گمراہی نے ڈیرے جما لیے۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ انسانیت درندوں سے بدتر زندگی گزار

رہی تھی۔ ظالم اور جابر کے سر پر سرداری کی دستار بجتی تھی۔ زندگی ظلم و جہالت سے عبارت تھی۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے نزول رحمت کیا اور قومِ ثمود کی رہنمائی کے لیے حضرت صالح علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ منصب رسالت ملنے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام قوم کو توحید الہیہ کی طرف بلانے لگے۔ بتوں کی پوجا اور ظلم وستم سے منع کرنے لگے۔ کفر و جہالت سے نکلنے کی تعلیم دینے لگے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم سے فرمایا:

اے میری قوم ایک خدا کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ یہ خدا نہیں ہیں جن کی تم پوجا کرتے ہو۔ خدا وہ ہے جس نے یہ کائنات بنائی۔ ہمیں پیدا کیا اس لیے اسے ہی یاد کرو۔ اسی ہی کی عبادت کرو۔ قومِ عاد کے بعد تم ان کے جانشیں ہو اور زمین پر تمھیں یوں بسایا کہ پہاڑ کاٹ کر تعمیرات کرتے ہو۔ میدانوں میں عمارتیں بناتے ہو۔ یہ سب اللہ کا احسان ہے۔ اس کی نعمتوں کا شکر کرو۔ آپس میں دشمن نہ بنو۔

میں تمھارے درمیان اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ صرف ایک خدا کی عبادت کرو۔ اسی سے ڈرو۔ اس کے سوا کسی کو معبود نہ بناؤ، ورنہ خسارے میں رہو گے۔ وہ خدا سچا ہے۔ یہ مورتیاں اور بت جھوٹے ہیں جن کی تم پوجا کرتے ہو۔

یہ سننا تھا کہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگ باتیں بنانے لگے۔ بڑی بڑی بحثیں ہونے لگی۔ صالح علیہ السلام کو برا بھلا کہا جانے لگا۔ آپ سے قوم کو خطرہ محسوس ہونے لگا، مگر آپؑ خدا کی نعمتیں گنوا کر اللہ کی طرف بلاتے رہے۔

قوم حیران تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے، ہم میں سے، ہم جیسا ہماری طرح کھانے پینے والا، ہماری طرح چلنے پھرنے اور اُٹھنے بیٹھنے والا اللہ کا فرستادہ یا نبی کیسے ہوسکتا ہے، وہ کہتے یہ کیسے ممکن ہے ایک غریب آدمی نبی بن جائے۔ اگر یہی ہونا تھا تو ہم میں سے کوئی امیر آدمی ہوتا جس پر خدا کی پہلے ہی بے بہا نعمتیں ہیں۔

اور کبھی وہ مسلمانوں سے سوال کرتے کہ صالح واقعی اللہ کا رسول ہے۔ مسلمان جواب دیتے "بے شک ہم تو اس پر ایمان رکھتے ہیں" وہ متکبرین غصے سے کہتے:

"بلاشبہ ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔"

قوم اور صالح علیہ السلام میں مکالمہ بازی ہوتی رہی۔ چند غریب غربا کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ قوم نے اب کہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ آوازے کسنے لگے۔ وہ آپ کو حقیر جانتے تھے۔ اسی لیے تو کسی سردار نے کہا کہ خدا کو صرف تو نظر آیا تھا، اس کام کے لیے اور کسی میں یہ خوبی نہ تھی۔ اگر

تیرے کہنے پر نہ چلیں تو کیا ہوگا آگ میں پھینک دئیے جائیں گے۔ کیا یہ سب نصیحتیں تجھ پر اُترنا تھیں۔

ایک اور بولا۔ یہ جھوٹا ہے۔ کوئی اس کی بات پر کان نہ دھرے۔ الغرض جو کسی دل میں آتا، بکتا چلا گیا۔ (نعوذ باللہ)

حضرت صالح علیہ السلام کی خبریں بادشاہ یا سردار جندع کو بھی پہنچتی رہتی تھیں۔ اس نے اللہ کے نبی کو تنگ کرنے کے لیے ایک ترکیب سوچی کہ صالحؑ کو عاجز کر دیا جائے۔ اس سے مافوق الفطرت نشانی مانگی جائے جو وہ نہیں دکھا سکے گا یہ سوچ کر وہ لوگ وفد بن کر اللہ کے نبیؑ کے پاس جا کر کہنے لگے۔

اے صالح (علیہ السلام) ہم تیری حرکتوں سے تنگ آ گئے ہیں۔

اگر تمھارا تعلق ہماری قوم سے نہ ہوتا تو یقین کرو اب تک تمھارا کام تمام کر چکے ہوتے۔ آج آخری بار تجھ سے بات کرنے آئے ہیں۔ اگر تو سچا ہے تو کوئی ثبوت دے یا نشانی دکھا تا کہ ہم تجھ پر ایمان لے آئیں۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا: ''کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمھیں نشانی دکھاؤں اور تم پھر بھی انکار کرتے رہو۔''

کہنے لگے: نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ثبوت دیکھنے کے بعد ہمیں یقین آ جائے گا۔

وہ تو مذاق کر رہے تھے صرف مذاق۔ ان کو یقین تھا کہ صالحؑ ایسا نہیں کر سکے گا۔ اس لیے جب صالح علیہ السلام نے پوچھا کہ کس کس قسم کی نشانی دکھاؤں۔ وہ مذاق کے سے انداز میں کہنے لگے۔

تو ایسا کرو یہ جو پہاڑ ہے ناں اس میں سے اونٹنی پیدا کرو جو گابھن ہو اور فوراً بچہ دے دے۔ اس بچے کے بال سرخ ہونے چاہیں تا کہ ہم اونٹنی کا دودھ پیا کریں اور خوش خوش رہا کریں۔

وہ بڑے خوش تھے۔ اپنی نظر میں انھوں نے اللہ کے نبی کو جھٹلا دیا تھا یعنی نہ یہ ہوگا، نہ وہ ہوگا۔

حضرت صالحؑ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ انتہائی انہماک سے اپنے رب سے رجوع کیا اور اللہ نے اپنے نبی کو شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔ دعا قبول کر لی۔

چند ثانیے بعد پہاڑ کی طرف سے ایک زوردار آواز آئی سب سردار گھبرا کر ادھر دیکھنے لگے۔ پہاڑ کا ایک حصہ شق ہو گیا۔ اس میں سے ایک اونٹنی نمودار ہو گئی جو گابھن تھی۔ سب لوگ متحیر تھے۔

چند ثانیے بعد اونٹنی نے ایک بچے کو جنم دیا جس کے بال سرخ تھے۔

یہ سارا منظر ان کی سوچوں کے بالکل برعکس تھا۔

زندہ جاوید معجزہ دیکھ کر ایک سردار ایمان لے آیا۔ دوسرے ابھی کشمکش میں مبتلا تھے کہ ایک کاہن، جس کا نام رباب بتایا جاتا ہے، نے سختی سے منع کر دیا۔ کہنے لگا یہ تم کیا کر رہے ہو۔ مت ایمان لاؤ۔ یہ تو ایک کھلا جادو ہے جو ہماری آنکھوں پر کیا گیا اور پھر ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ سچ ہے جنھیں ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں۔

ان کے مقدر میں تباہی لکھی جا چکی تھی۔ کیسے ہدایت یاب ہوتے اور پھر حضرت صالح علیہ السلام کو جادوگر کہنے لگے۔ دلیل یہ دیتے کہ یہ سراسر خلاف عقل ہے۔ اس لیے یہ آنکھوں کا دھوکا ہے بس اور کچھ نہیں۔

اونٹنی اپنے بچے کے ساتھ چرتی چراتی ایک چشمے پر جا پہنچی۔ پانی پینے لگی اور دیکھتے دیکھتے سارے چشمے کا پانی پی گئی۔

یہ منظر اور بھی چونکا دینے والا تھا۔ کاہن نے یہ حیران کن منظر دیکھا تو کہنے لگا۔

دیکھا میں کہتا تھا نا کہ یہ کھلا جادو ہے، ورنہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جانور پورے چشمے کا پانی خشک کر دے۔ یہ تو ہمیں اپنے آباؤ اجداد کے دین سے بہکانے کا بہانہ ہے۔

اونٹنی پانی پی کر چرنے کے لیے پہاڑوں میں نکل گئی۔ حاضرین سب کچھ دیکھ کر صالح علیہ السلام سے کوئی بات کیے بغیر خاموشی سے چل دیے یاد رہے اس ساری آبادی کے لیے یہ واحد چشمہ تھا جو اونٹنی نے خشک کر دیا۔

اگلے دن علی الصبح اکٹھے ہو کر حضرت صالح علیہ السلام کے پاس آئے۔ شکایت کرنے لگے کہ کل جو تو نے اونٹنی بنائی ہے وہ چشمہ خشک کر گئی۔ ہم کل سے پیاسے بیٹھے ہیں۔ اس لیے ہم تیری اونٹنی اور اس کے بچے کو باندھ دیں گے۔

بات پوری طرح سن لینے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا: "اے میری قوم کے لوگو یہ اونٹنی ایک واضح دلیل اور نشان ہے جو تمھاری فرمائش پر خدا نے پیدا کیا۔ یہ خدا کے نام پر تمھارے لیے چھوڑی گئی ہے۔ اس لیے اسے نقصان مت پہنچانا، ورنہ خدا کے عذاب میں جکڑ لیے جاؤ گے۔ کہنے لگے، مگر صالح علیہ السلام ہم کیا کریں۔ ہمارے مویشی اور بال بچے پیاسے مر جائیں گے۔

اللہ کے نبی نے حکم دیا کہ ایک دن تم چشمے سے اپنی ضرورت کا پانی لے لینا اور ایک دن اونٹنی

Marfat.com

کے لیے چھوڑ دینا، مگر اس کی باری پر اسے ہرگز ہرگز تنگ نہ کرنا اور نہ اسے نقصان پہنچانے کا سوچنا۔ کیونکہ جب تک یہ اونٹنی تمھارے درمیان موجود ہے، اس وقت تک خدا کا عذاب تم سے دور رہے گا۔

اس کے بعد اسی معمول کے مطابق کئی سال گزر گئے۔ ایک دن قوم ثمود چشمے کا پانی استعمال کرتی اور ایک دن اونٹنی اور یہ اونٹنی اس کے بدلے پوری قوم کو دودھ سے سیراب کرتی۔

یہ معجزہ کافروں کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا تھا۔ زبانیں اقرار کرنے سے گریزاں تھیں، مگر دل ڈرے ہوئے تھے۔

مشرکین بظاہر نہ تو صالحؑ اور ان کے صحابہ سے زیادہ الجھتے اور نہ زیادہ تنگ کرتے، مگر اللہ کے نبی کو انھوں نے ساحرِ اعظم مشہور کر دیا۔ (نعوذ باللہ)

اونٹنی کو دیکھ کر ان کے مویشی بدک جاتے۔ اوپر سے ایک روز پانی نہ ملنے کی وجہ سے قوم کو اور بھی غصہ آتا۔ آہستہ آہستہ کشیدگی بڑھنے لگی اور منکرین اونٹنی کو مار دینے کی دھمکیاں دینے لگے۔

ان سب معاملات سے واقف ہونے کے باوجود اللہ کے نبی انھیں ہمدردانہ سمجھاتے کہ اے لوگو تم بھلائی سے جلد چھٹکارا پانے کے خواہاں کیوں ہو۔ اللہ سے اپنی بخشش کے بدلے برائی کیوں طلب کرتے ہو۔ خدا سے ڈرو۔ ممکن ہے خدا تم پر رحم کر دے۔ ایک دن ایک کافر نے متکبرانہ کہا: ''ہم نے تیرے وجود کو منحوس پایا۔ جس دن سے تو نے ہمارے مذہب کے خلاف باتیں شروع کی ہیں، اس دن سے قوم پر مصائب آرہے ہیں۔''

حضرت صالح انھیں ترحمانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے، مگر وہ اپنی ہٹ پر قائم رہے۔

ایک دن آپ نے انھیں واضح کر دیا کہ دیکھو لوگو! میں بار بار بتا چکا ہوں کہ اگر اس اونٹنی کو نقصان پہنچایا گیا تو خدا کی طرف سے ایسا عذاب نازل ہو گا جو تمھاری برداشت سے باہر ہو گا۔

پھر کیا ہوا ایک دن قیدار نامی شخص نے اپنی تلوار سے حملہ کر کے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اونٹنی نیچے گری تو قیدار نے اس کی گردن پر وار کیا۔ اونٹنی دم توڑ گئی۔ اس کا بچہ اس پہاڑ کی طرف بھاگ گیا جس سے اونٹنی پیدا ہوئی تھی۔

جب حضرت صالح علیہ السلام کو خبر ہوئی تو وہ قوم سے مخاطب ہوئے: ''آخر تم نے وہی کیا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اب تم تین دن اپنے گھروں میں گزار لو۔ یہ سچا وعدہ ہے جو پورا ہو گا۔ وہ ڈر کر عذاب کی نشانیاں پوچھنے لگے تو حضرت صالح علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

Marfat.com

عذاب کے پہلے دن سب کے چہرے زرد پڑ جائیں گے۔ دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ ہو جائیں گے۔ بعد ازاں مزید عذاب نازل ہوگا جو بادشا جندع سمیت ساری قوم کے لیے ہوگا اور بڑے ہیکل کا کاہن بھی اس عذاب کا مستحق ہوگا جس نے مجھے ساحرِ اعظم کہہ کر میرا مذاق اڑایا۔ اس عذاب سے صرف وہی بچ سکیں گے جو خدائے واحد پر ایمان لا چکے ہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ ایک رات ایک ہیبت ناک چیخ ایک خوفناک چنگھاڑ نے پوری وادی القریٰ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پوری قوم اس حالت میں مرگئی جس حالت میں بیٹھی تھی۔ جہاں کوئی جس حالت میں تھا، اسی حالت میں مرگیا۔

قرآن نے اس آواز کو کسی مقام پر صیحہ یعنی چنگھاڑ، کسی جگہ ''صاعقہ'' بجلی کی کڑک، کہیں ''رجفہ'' زلزلہ والی شے اور کہیں ''طاغیہ'' ہیبت ناک کا نام دیا ہے۔

حضرت صالحؑ اور اس کی جماعت صحابہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی امان میں لے لیا۔ عذاب والی رات سب کچھ ملیا میٹ ہوگیا۔ بڑے بڑے محل، ہیکل، عالی شان بنگلے جو پہاڑوں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ سب کچھ نیست و نابود ہوگیا۔ وہ عالی شان شہر حجر جو چار دن پہلے اپنی تہذیبی عظمت کے ساتھ پر رونق تھا، آج کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اللہ کے نبی اپنی جماعت کو لے کر فلسطین کے ایک مقام رملہ کی طرف نکل گئے۔ وہاں کچھ دیر قیام کے بعد مکہ جا کر مقیم ہو گئے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے دوسواسی (280) برس کی عمر میں مکہ میں وفات پائی ان کی تربت مبارک کعبہ سے غربی جانب حرم شریف میں واقع ہے۔

اور یوں عاد و ثمود کی قومیں اللہ کے نبیوں کی مخالفت میں موردِ عذاب ہوئیں۔ انکا تکبر و غرور اور طاقت و عظمت کا نشہ چند لمحوں میں غرق کر دیا گیا۔

قرآن نے ان اقوام کو نصیحت اور عبرت کے لیے پیش کیا۔ تاکہ انسانیت کی آئندہ نسلیں ان مغضوب اقوام سے نصیحت حاصل کریں۔

قرآن کی نو سورتوں میں قوم ثمود کا ذکر موجود ہے۔ اس قوم کی راہنمائی کے لیے بھیجے جانے والے نبی حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید کی تین سورتوں کی آٹھ آیات میں آیا ہے۔

قارئین قرآن کے سب سے پہلے مخاطب قریش مکہ تھے۔ جو عرب کی قدیم تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے۔ اب انھیں اقوامِ کہنہ کے حالات کی طرف اشارہ کر کے بتایا جارہا تھا کہ تم سے پہلے بھی تم جیسے ہی ہٹ دھرم سرداروں کی طرف اللہ کے نبی اللہ کا پیغام لے کر آتے رہے وہ بھی

Marfat.com

نبیوں کو بالکل تمھاری ہی طرح تنگ کرتے رہے اب تم بھی اپنے انجام کا اندازہ لگالو اگر راہ ہدایت کی بجائے گمراہی پر چل نکلو گے تو تمھارا انجام بھی مختلف نہ ہوگا۔

ہماری بحث "مکہ کی سرد جنگ میں سیاسی حوالے سے چل رہی تھیں۔ آیئے موضوع کے تسلسل کی طرف چلتے ہیں۔"

———(((اللہ اکبر)))———

عتبہ نے جب یہ آیت فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ "یعنی ان سے کہہ دو کہ میں نے تم کو اسی طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈرایا ہے، جیسا عاد اور ثمود پر "نازل ہوا" سنی تو بے اختیار حضور ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

جب لوگوں نے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ تم جانتے ہو کہ محمد ﷺ کے منہ سے نکلی ہوئی بات جھوٹی نہیں ہوتی۔ اس لیے میں نے عذاب سے ڈر کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

یہ بات بذات خود اس سچائی کی دلیل ہے جو تمام کو اڑ توڑ کر مشرکین کے دلوں میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ اسلامی تحریک کی بہت بڑی سرد فتح تھی۔ یہ زبردستی مخالفین کے اندر کی شخصیتوں کو اپنے حصار میں لے چکی تھی۔

ذرا غور کیجئے کہ جاتے تو تھے سیاسی ترغیب اور لالچ دینے کے لیے، سیاست کی بساط پر محمد ﷺ کی شکست کی چالیں چلنے کے لیے، طمع اور لالچ کے جال میں پھانسنے کے لیے، الٹا خود قرآن کی سچائی کے حصار میں پھنس جاتے۔

اس سب کچھ کے باوجود وہ لوگ رکے نہیں۔ اپنی مذموم حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ واضح ناکامی اور شکست کو تسلیم نہیں کیا۔

• کرتے بھی کیسے؟ شکست کو تو ان کے بڑوں نے نسل در نسل انتقام کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اتنی آسانی سے کیسے مان جاتے کہ محمد ﷺ کا دین سچا اور ان کے باپ دادا کا صدیوں پرانا دین اور ساری روایات سب جھوٹے ہیں۔

———(((اللہ اکبر)))———

دارالندوہ میں آج پھر زبانیں خاموش اور سوچیں جوان تھیں۔ حسین و جمیل تدبر و تفکر جام شباب منہ سے لگائے مخالفت کے نشے میں بدمست تھا۔ نظروں کو خیرہ کر دینے والے لالچ کے حسین اور پرفریب سبز باغ اہل مجلس کے تصور میں ابھر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں کو خیرہ کر دینے والے منصوبے ان کے اذہان فاسدہ سے ترتیب پا رہے تھے۔ دفعتاً خاموش پانی پر تیرتی

Marfat.com

لہریں اٹھیں، محفل میں ارتعاش پیدا ہوا۔

کسی نے کہا ایک اور حجت پوری کر لی جائے۔ انھوں نے فیصلے پر پہنچ کر حضور ﷺ کو پیغام بھیجا۔

آپ ﷺ تو موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ تبلیغ کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ چنانچہ بلاوا آتے ہی دوڑے چلے گئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس[6] سے مروی ہے کہ مشرکین نے تجویز رکھی کہ ہم آپ کو مالدار آدمی بنا دیتے ہیں جس عورت پر ہاتھ رکھیں، اسے آپ کے نکاح میں دے دیتے ہیں بس ایک ہماری بات مان لیں۔ ہمارے معبودوں کی برائی بیان نہ کریں۔

اگر یہ تجویز منظور نہیں تو ہم یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کرلیں اور ایک سال ہم تمھارے خدا کی عبادت کرلیا کریں گے۔

بہت خوفناک اور حسین جال تھا۔ بڑا ہی پُرفریب سیاسی داؤ تھا جو مشرکین نے اب کے بار کھیلا تھا۔

سرد جنگ کے ماہرین کے نزدیک یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ انسان کی نفسیاتی اور جبلی کمزوریوں سے کھیل کر جو کام کئی لاکھ فوج اور بے پناہ وسائل کو جھونک کر انجام دیا جاتا ہے، ترغیب اور لالچ سے وہی کام بہت تھوڑے وسائل اور بغیر کسی جانی قربانی سے چند افراد انجام دے لیتے ہیں۔ تحریکِ اسلامی کی ساری جدوجہد ساری تدریسی اور تنظیمی محنت کو سبوتاژ (Sabotaj) کرنے کے لیے یہ بہت بڑا داؤ کھیلا گیا۔

ذرا غور کیجیے ایک دفعہ بتوں کے آگے جھک جانے سے ان کے جھوٹے نہ ہونے کی دلیل بن جائے۔ تحریک کے بنیادی اور اہم مقصد لا الہ الا اللہ کی خود بخود نفی ہو جائے گی جب بنیاد ہی متزلزل ہو گئی۔ بنیادی فکر ہی اس لالچ یا ترغیب کا شکار ہو گئی تو سیاست کی بازی الٹ جائے گی۔

کل کس نے دیکھی ہے۔ سال بعد کیا ہوتا ہے تنظیمی اور تحریکی عمر میں سال تو نام ہے کال کا۔ کیونکہ انقلابی تحریکوں کی بنیاد صرف اور صرف آج ہی پر رکھی جاتی ہے۔ کل منصوبہ بندی کی حد تک تو شامل ہو سکتا ہے، لیکن بنیادی مقاصد کے قریب سے بھی کل کا گزر نہیں ہوتا۔

انقلابیوں کا سب کچھ آج ہی ہوتا ہے جو انھیں کل تک ڈٹے رہنے کا حوصلہ اور عزم فراہم کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر کل تو ان کے ثمرات کی بازیابی کا نام ہے۔ یہ تو ایک سال کی بات تھی۔ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔

مشرکین مکہ کو شاید اس بات کا اِدراک نہیں تھا کہ اُن کا اس انقلابی ﷺ سے واسطہ پڑا ہے جس نے اپنی تحریک کو زمان و مکان اور وقت کی حدوں سے باہر تک لے کے جانا ہے۔ جس نے قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی کو اس تحریک کی جامعیت اور حلاوت آفرین اثرات کے حصار میں لینا ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا کہ انسانیت کی حدِ ادراک سے بھی آگے دوسری دنیا یعنی آخرت کے ثمرات سے بہرہ ور فرمانا ہے۔

اُن کے ساتھ یہ سودے بازی کہ ایک سال تم بتوں کی عبادت کر لو پھر ایک سال ہم خدا کی عبادت کر لیں گے۔ دیوانے کا خواب نہیں تو اور کیا ہے۔ اے مشرکینِ مکہ تم ایک سال کی بات کر رہے ہو، یہاں ایک لحہ بھی ایک صدی سے زیادہ قیمتی ہے۔

آپؐ نے اس سیاسی بساط پر جب مشرکین کی چال کا جواب دیا تو مشرکین کے تصورات کی عمارت دھڑام سے نیچے آ گری۔ بڑا مختصر اور دوٹوک جواب دیا......

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ○[7]

مفہوم:۔ کہہ دو کہ اے نادانو! میں اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتا۔

یہ ہوئی نا دوٹوک بات۔ سنتے ہی تمام سردارانِ قریش جلے بھنے، اپنا سا منہ لے کر اٹھ گئے، مگر تھکے نہیں پھر کوئی اور زیادہ حسین اور دلفریب لالچ لے کر کرسی اور میز پر آ بیٹھے۔

توحید کے اس عمل کو روکنے کے لیے مکہ کے بازیگروں نے کئی اور اکھاڑے لگائے۔ سیاست کے کئی اور تصوراتی محل تعمیر کیے جو قرآنی دلائل اور حضور ﷺ کی طوفانی سیاسی بصیرت کی نذر ہو گئے۔ کئی دلیلی حلوے پکے جو کبھی کھانے کے لیے پلیٹ میں نہ ڈالے جا سکے۔ مذاکرات کی میزوں پر کئی معتبر زبانیں تھرکیں جو آیاتِ قرآنی کی تاب نہ لا کر دہن کے حلقوں میں مقید ہو گئیں، مگر ہاری نہیں۔

یہ تو ان کے فکر و شعور کی شکست تھی۔ ان کے عہدوں، ان کی خودساختہ سرداریوں اور دو گز کی میلی پگڑیوں کی جنگ تھی۔ ان کی جھوٹی رسموں اور خودساختہ بڑائیوں کے وقار کا مسئلہ تھا۔ ان کی جھوٹی عزت اور فرضی رُعب کی درگت تھی وہ بھی ایک ایسے انسان کے ہاتھوں جو یتیم ولا وارث مفلسی اور غربت میں پلنے والا، یہ سب کچھ اس کے ہاتھوں ممکن تھا۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں یہ تصور ہی ان کو تڑپا کے رکھ دیتا۔ وہ تڑپ کر اٹھتے اور کوئی نئی تجویز، کوئی نیا منصوبہ گھڑ کے محمد ﷺ سے مذاکرہ کرتے۔

———(((اللہ اکبر)))———

Marfat.com

محمد ﷺ کے مشن، ان کی سیادت، ان کی اخلاقیات، ان کی عظمت اور سیاسی بصیرت سے نجات کے تصور نے ایک اور انگڑائی لی۔ دارالندوہ کا ایک اور اجلاس منعقد ہوا۔ ایک اور محفل جمی۔ حضور ﷺ سے دوٹوک بات کرنے کا ایک اور فیصلہ ہوا۔ ایک اور مذاکراتی وفد مقرر ہوا۔

بڑے [8] بن ٹھن کے حضور ﷺ کے پاس گئے۔ کہنے لگے اے محمدؐ اگر تم ہمارے معبودوں کو چوم لو تو ہم تمھارے خدا کی عبادت کریں گے۔

ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اسود [9] بن مطلب اور اُمیہ بن خلف اور کُھل کُھلا کے بولے۔ کہنے لگے محمدؐ آؤ ہم تمھارے رب کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے ربوں کی عبادت کرو۔ ہم اپنے سارے کاموں میں تمھیں شریک کرتے ہیں اور تم ہمارے سارے کاموں میں شریک ہو جاؤ۔ اگر وہ چیز جو تم لے کر آئے ہو، بہتر ہوئی تو ہم تمھارے کاموں میں شریک ہو جائیں گے اور اس سے اپنا حصہ پا لیں گے۔ اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے، بہتر ہوئی تو ہمارے ساتھ شریک ہو کر تم اس سے اپنا حصہ پالو گے۔

سچ اور جھوٹ کی جنگ میں بعض مرحلے ایسے بھی آ جاتے ہیں کہ لاکھوں مصلحت پسندیوں کے باوجود بعض اوقات اہلِ حق کو انتہائی فیصلے کرنے پڑتے ہیں، حالانکہ عام حالات میں سچ کو اپنی سچائی کے لیے جھوٹ کو راہِ راست پر لانے کے لیے مصلحت کوشی سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔

اب بہت ہو چکی تھی، مشرکین اپنی کرنے سے کسی صورت باز نہیں آ رہے تھے، حضور ﷺ نے اپنے خالقِ ارض و سما سے راہنمائی ضروری سمجھی۔ فرمایا میں سوچ کر بتاؤں گا۔

مکہ کے یہ سیانے مطمئن سے ہو کر اُٹھ کر چلے گئے۔ یقیناً اس احساس کے ساتھ گئے ہوں گے کہ ان کی کوششیں رنگ لا رہی ہیں، ان کی سیانف کام دکھا رہی ہے۔

مگر قارئین اس ساری جنگ کے اس سارے عرصے میں مشرکین کے صرف یہ سیاسی حربے ہی نہ تھے۔ یہ تو میرے موضوع کی مجبوری ہے کہ واقعات کو وقت کے تعین سے ماورا ایک عنوان کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے، ایک عنوان کے تحت ترتیب دے رہا ہوں، ورنہ اس عرصہ میں حضورؐ کے خلاف بدتمیزی، دہشت گردی، گالی گلوچ اور جو مار دھاڑ ہو رہی تھیں۔ اس کے تحریکی کارکنوں پر جو ظلم ڈھائے جا رہے تھے، انھیں دیکھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھ جیسا کمزور آدمی تو چیخ چیخ اٹھتا ہے۔ وہ تمام واقعات جو اس دورانیہ میں وقوع پذیر ہوتے رہے انشاء اللہ اس تصنیف کے اپنے اپنے موضوع میں بیان کیے جائیں گے۔

بہر حال! اب کے بار شاید ذات خداوندی نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ یہ روز روز کی بات چیت

Marfat.com

ختم کردی جائے۔ بہت ہو چکی۔ لاحاصل بحث کرنے آجاتے ہیں۔ خدا کا نبی کیسے ان کے بتوں کی عبادت کرتا۔ اسی شرک کو ختم کرنے کے لیے تو انھیں مبعوث کیا گیا۔ منصبِ رسالت کا بنیادی مقصد ہی یہی تھا کہ خدا کے سوا تمام معبودوں کی عبادت کو ترک کر دیا جائے۔

خدا کی طرف سے وحی کی صورت میں راہنمائی ملی۔

قُلْ يَاأَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ، لَا اَعْبُدُ مَاتَعْبُدُوْنَ۔ وَلَآاَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآاَعْبُدُ۔ وَلَآ اَنَا عَابِدٌمَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآاَعْبُدُ۔لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ٥

مفہوم:۔ "کہہ دو[10] کہ اے کافرو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین۔"

"سورہ الکافرون"

یہ سیاسی بازیگر حضور ﷺ کو نادان سمجھ کر سیاسی دانے پھینکتے، مگر حضورؐ کی سیاسی بصیرت اور خداوند تعالیٰ کی وحی کی شکل میں راہنمائی نے ان کی جھوٹی سیاست کی بازی کی بساط الٹا کے رکھ دی۔

یہ لوگ اپنی ان کارروائیوں کی ناکامی پر تلملا اٹھے۔ ان کو اپنی دانائیاں، اپنی سیانفیں، اپنی عقلمندیاں اپنی حکمتِ عملیاں خس و خاشاک کی طرح بہتی نظر آنے لگیں تو وہ خاندانی میدان میں تحریکِ اسلامی کو روکنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خاندانی لحاظ سے قبائلی تناظر میں حضورؐ کو اکیلا کر دینے کی ترکیبیں کرنے لگے۔

آیئے سرد جنگ کے اگلے باب یعنی خاندانی محاذ پر ان کارروائیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

———(((الحمد للہ)))———

حواشی:

1- حاشیہ:۔ سیرت سرورِ عالم میں مولانا مودودی نے طبقات ابن سعد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مکہ میں اسلام کے مخالفین کے تین طبقات تھے۔

(1) ایک طبقہ سردارانِ قریش کا تھا جو دارالندوہ کی مشینری کے کل پرزے تھے۔ جن میں ابوجہل، ابولہب، اسود بن یغوث بنی زہرہ سے۔

Marfat.com

(2) حضور کا ماموں زاد بھائی حارث بن قیس بن عدی بنی سہم میں سے

(3) ولید بن مغیرہ، اُمید بن خلف اور اُبی خلف بنی جمح سے

(4) ابو قیس بن فاکہ بنی مخزوم سے

(5) عاص بن وائل (عمر بن العاص کا باپ) نضر بن حارث بنی عبدالدار میں سے

(6) منبہ بن حجاج بنی سہم سے

(7) زبیر بن اُبی اُمید۔ بنی مخزوم سے اور صائب بن صیفی بنی مخزوم میں سے

(8) اسود بن اسد، عاص بن سعید بن عاص عقبہ بن ابی معیط، حکم بن العاص بنی اُمید میں سے دوسرا طبقہ ان لوگوں کا تھا جو اسلامی تحریک کے دشمن تھے، مگر اتنے شدید نہ تھے جتنے مذکورہ بالا لوگ ان میں عتبہ، شیبہ بن ربیعہ دونوں بھائی اور ابوسفیان وغیرہ آتے ہیں۔

تیسرا طبقہ۔ عوام الناس کا تھا جو غیر جانبدار سے ہو کر یہ سارا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جن کی دلچسپیاں اپنی زندگی کے لوازمات ضروریات تک محدود تھیں۔

2- سیرت سرور عالم جلد دوم صفحہ سیرت النبی جلد اول۔ سیرت ابنِ ہشام اول

3- مولانا مودودی نے یہ واقعات اس سے بھی زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں۔

4- تفہیم القرآن، تفسیر ابنِ کثیر، تفسیر مظہری، تفسیر عثمانی، انوار القرآن دیکھیے تفسیر سورہ حم السجدہ

5- سیرت سرور عالم جلد دوم صفحہ 518

6- سیرت سرور عالم از مولانا مودودی جلد دوم صفحہ 518 تا 520، سیرت ابن ہشام جلد اول سیرت النبی جلد دوم

7- سورہ الزمر آیت نمبر 64۔ تفہیم القرآن، انوار القرآن، تفسیر عثمانی تفسیر مظہری

8- سیرت سرور عالم جلد دوم صفحہ 520 ابنِ عباس سے روایت ہے۔

9- یہ سعد بن مینا کی روایت ہے۔

10- سورہ الکافروں..... تفہیم القرآن، انوار القرآن، تفسیرِ مظہری، تفسیرِ عثمانی، سیرت سرور عالم جلد دوم صفحہ 520۔

Marfat.com

باب:6

خاندانی محاذ

سرد جنگ کا خاندانی محاذ

پورے عرب میں ان کی سیادت، سیاست، اور علم وادب کو کوئی اس طرح ناکام بنادے گا یہ تو انھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ تو پوری دنیا کو علم وادب کے معاملہ میں عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔ ان کی ادب فہمی کے مقابلہ میں واقعی پوری دنیا ہیچ تھی۔ ان کی تو خواتین بھی صاحبِ دیوان تھی۔ ان کو آسانی سے قائل کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی تھا۔

سرد جنگ میں ایک تدبیر سٹاکنگ (Staking) کہلاتی ہے جس کے تحت ایک کام کے لیے مختلف زاویوں پر غور وخوض کر کے کئی کئی حربے یا آپریشن تیار کیے جاتے ہیں تاکہ ایک کے فیل ہو جانے کی صورت میں دوسرا اور دوسرے کے فیل ہو جانے کی صورت میں تیسرا اور پھر چوتھا پانچواں۔ سب حربے اپلائی کرنے پڑیں تو اپلائی کیے جائیں تاکہ متعلقہ آپریشن میں کسی طرح بھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ ناکامی تو سرد جنگ میں شکستِ فاش کا نام ہے۔

گو مشرکینِ مکہ آج کی سرد جنگ کے تدبر سے واقف نہ تھے، لیکن تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ میں اسلام کے خلاف جو تدبیریں استعمال کی گئیں، ان تدبیروں کے مقابلہ میں موجودہ سرد جنگ کا تدبر (Tacticts) کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

بہرحال......سیاسی اور مذاکراتی کوششوں میں ناکامی پر مشرکین بیٹھے نہیں، بلکہ اور زیادہ مضبوط منصوبہ بندی کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اب کے بار انھوں نے خاندانی محاذ پر دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ پنچایتی اثر ورسوخ استعمال کرنا شروع کیا۔ اس کا مقصد تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے کنبہ یا خاندان کے ذریعے دباؤ ڈالا جائے۔ اس طرح ایک طرف تو ان کے تحریکی کام کی توجہ اس طرف بٹ جائے گی اور تنظیمی

Marfat.com

مصروفیات میں کمی آ جائے گی۔ تحریکی کام کی رفتار خود بخود کم ہو جائے گی۔ دوسری طرف محمد ﷺ پر خاندانی دباؤ بڑھے گا۔ وہ اپنے خاندان کی یہ بات نہ مانیں تو اس کا کم از کم یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ ان کا خاندان ان سے متنفر ہو جائے گا۔ یوں محمد ﷺ معاشرے میں اکیلے رہ جائیں گے۔ عرب میں کسی شخص کا اپنے خاندان کی سرپرستی سے نکل جانا ایسے ہی تھا جیسے جلاوطن کر دیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اس معاملہ میں ابھی تک غیر جانبدار تھا، ماسوائے آپ ؐ کے چچا ابولہب کے۔ مشرکین نے انتہائی غور و فکر کے بعد انھیں بھی اس معاملہ میں گھسیٹ لیا ان پر دباؤ بڑھانے کے لیے معززینِ مکہ پر مشتمل وفود تشکیل دیئے گئے جن کا مقصد اس کیس کو اکابرین بنی مطلب کے سامنے رکھنا تھا اور ان کو محمد ؐ کے بجائے اپنا ساتھ دینے پر مجبور کرنا تھا اور یوں بغیر کسی سرپرستی کے اس تحریک کو آگے بڑھنے سے روکنا تھا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ابو طالب کے پاس ایک[1] آٹھ رکنی وفد بھیجا گیا۔ یہ آٹھوں افراد قریش کے انتہائی معزز اور بااثر قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے، بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ان کے بغیر کوئی پنچائت جچتی ہی نہ تھی۔

وہ لوگ ابو طالب سے یوں مخاطب ہوئے۔ اے ابو طالب! تمھارے بھتیجے نے ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہا۔ ہمارے دین کو جھوٹا کہا۔ ہمیں احمق اور بیوقوف قرار دیا۔ ہمارے باپ دادا کو گمراہ گردانا۔ اب یا تو اسے اس کام سے روکیں یا ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جائیں کیونکہ آپ بھی تو محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین کے خلاف ہیں اور اس سے ہم خود ہی نمٹ لیں گے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ معزز ترین لوگوں میں سے تھے۔ ابو طالب نے انھیں کوئی جواب دیئے بغیر بس نرم نرم باتیں کر کے ٹال دیا۔

دوسرے لفظوں میں یہ خاندانی محاذ پر ان کی پہلی ناکامی تھی۔ ابو طالب نے انتہائی فراست سے کام لیتے ہوئے ہاں یا ناں کوئی بھی جواب نہ دیا۔ یعنی سانپ بھی مار لیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے دی کے مصداق ان کی باتیں بھی غور سے سن لیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کی بھی مخالفت نہ کی۔ بس باتوں باتوں میں ٹرخا دیا۔

———(((اللہ اکبر)))———

دارالندوہ میں اس واقعہ کی رپورٹ پیش کی گئی تو پوری اسمبلی سٹپٹا اُٹھی کہ ابو طالب کا جواب بتاؤ...... کیا بتاتے، کوئی جواب ملتا تو بتاتے، تب ان کو احساس ہوا کہ ہم تو ناکام لوٹے۔ ہمیں تو بس

Marfat.com

باتوں باتوں میں ٹرخا دیا گیا...... اس احساسِ ناکامی نے تمام ایوان پر سکوت طاری کیا ہوا تھا۔

یاد رہے اُن دنوں حرم شریف میں دارالندوہ کا اجلاس صبح و شام ہوتا۔ بس ایک ہی بل پر بحث مباحثہ کے بعد منصوبہ بندی ہوتی کہ......

تحریکِ اسلامی کے اس توحیدی ورسالتی عمل کو کیسے روکا جائے روز بروز یہ عمل زور پکڑتا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے اس انقلابی تحریک کے اثرات تیز ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے ہی مشرکین کی مخالفت میں تیزی آتی جا رہی تھی۔

اب کے وہ ایک نئے عزم اور ارادے سے ایک نیا اور زیادہ موثر وفد تشکیل دے کر ابو طالب کے گھر آئے۔ یونہی خالی ہاتھ جانے کے لیے نہیں، کچھ لے دے کے ولولۂ تازہ کے ساتھ آئے تھے۔

کہنے لگے[2] اے ابو طالب آپ ہمارے درمیان سن رسیدہ بزرگ ہیں اور قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی کہا تھا کہ محمد ﷺ کی حمایت سے باز آ جائیں، مگر آپ باز نہیں آئے۔ ہم سے باپ دادا کی بُرائی اور اپنے معبودوں پر تنقید اور اپنی عقلوں کی توہین برداشت نہیں ہوتی۔ آپ یا تو محمد ﷺ کو روکیں، ورنہ ہمارا تمھارا اس وقت تک مقابلہ ہوگا جب تک کہ ہم دونوں میں سے ایک فریق ہلاک نہ ہو جائے۔

ابو طالب واقعی مکہ کے بزرگ تھے جو دین قبول نہ کرنے کے باوجود آخری وقت تک حضور ﷺ کی حفاظت پر ڈٹے رہے۔ انھوں نے بھی اسی دشت کی سیاحی میں عمر گزاری تھی۔ انھوں نے دھوپ میں بیٹھ کر تو بال سفید نہیں کیے تھے۔ ان کے چہروں کو بھانپ کر اپنے بڑے بیٹے عقیلؓ کو بلایا کہ محمد ﷺ کو بلاؤ۔ وہ آپ کو بلا لائے۔

شفیق چچا نے کہا بیٹے یہ آپؐ (بنی عم) کے چچے تائے یا بھائی ہیں انھیں شکایت ہے کہ ان کی مخالفت چھوڑ دو۔

آپؐ نے سورج کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگ اس سورج کو دیکھ رہے ہو۔ سب یک زبان بولے۔ ہاں دیکھ رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا جس طرح یہ سورج آپ لوگوں کے کہنے پر اپنے شعلے روک دینے پر قادر نہیں، اسی طرح میں بھی اپنا کام چھوڑ دینے پر قادر نہیں۔

اتنا فرما کر آپؐ چلے گئے۔ آپؐ کے جانے کے بعد ابو طالب نے کہا میرے بھتیجےؐ نے آج تک جھوٹ نہیں بولا، لہٰذا آپ لوگ تشریف لے جائیں۔

Marfat.com

یہ تھے جھوٹے بتوں کے جھوٹے پجاری۔ ادھر تو ایک عظیم مقصد تھا جس کے تحت پوری انسانیت کو دونوں جہانوں میں کامیابی سے سرفراز کرنا تھا جبکہ مشرکین کے ہاں صرف سر پر رکھی پگڑیوں کی رکھوالی تھی۔ جھوٹی انا اور خود ساختہ چودھر کی حفاظت تھی۔ قرآن ان کے اس مقصد کو کچھ یوں عیاں کرتا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝

اور وہ کہتے ہیں کہ قرآن کو اگر اترنا تھا تو ان شہروں میں کسی رئیسِ اعظم پر اترتا: (سورہ زخرف آیت نمبر 3)

یہ تھا ان کا منشور۔ وہ پریشان صرف اس لیے تھے کہ یہ منصب رسالت جس کے لیے محمد ﷺ دن رات ایک کیے ہوئے ہیں، ان کی یتیمی اور مفلسی کو کیسے زیبا ہے۔ یہ تو رئیسِ مکہ ولید بن ربیعہ یا رئیسِ طائف ابو مسعود ثقفی کے لیے ہونا چاہیے تھا۔

یہ تھا ان کا جھوٹی شان و شوکت کا منشور۔

اب غریب اور مفلس انھیں دستاریں اتارتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اپنی جعلی پگڑیوں کو بچانے کے لیے وہ اتنا تڑپ رہے تھے۔

ابو طالب کا حالیہ جواب سن کر وہ مبہوت سے ہو گئے۔ اس مسلسل ناکامی پر ان کے دلوں میں جھانک کر کوئی نہیں دیکھ رہا تھا کہ کیا گزر رہی تھی۔ وہ کلپ رہے تھے کلپ۔

سرد جنگ میں اس طرح کے محاذوں پر ناکامی کے اثرات بعض اوقات بڑی دلچسپ صورتحال اختیار کر لیتے ہیں۔ دباؤ بڑھانے کی ایسی کوششوں کی ابتدا کرنے والے اس خوش فہمی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہیں کہ پہل کی وجہ سے بہر حال ان کی بات زیادہ موثر ہو گی۔ چونکہ اکثریت بھی ان کے ساتھ ہے اور پہل بھی وہی کر رہے ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ''مخالف کو چار شانوں چت نہ کر دیں۔

کامیابی کی اسی خوش فہمی میں وہ ممکنہ مخالفت کا جواب (کاونٹر Counter) تیار نہیں کرتے، بس اکثریت اور پہل کو بنیاد بنا کر اپنی پوری طاقت یا پورا زور اپنی غیر مدلل بات کو منوانے پر لگا دیتے ہیں۔ وہ مدافعت کرنے والے کی مدافعانہ صلاحیت اور اس کے دلائل پر توجہ نہیں دیتے۔

اور یوں مدافعت کرنے والا اگر سچا، بردبار اور حلیم ہو تو پورے انہاک سے بات سننے کے بعد بحث مباحثہ میں اُلجھے بغیر مختصر، معقول، مگر مدلل جواب ٹکا دیتا ہے فریقِ اول کی تمام سیانفیں، بھاری اکثریت اور اکثریتی دباؤ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

Marfat.com

اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے خلاف جو الفاظ اس کے غلط رویوں کی نشاندہی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، سچے نہ ہونے کی وجہ سے مخالف کی تشہیر کا عنوان بن جاتے ہیں اور عام ناظرین قارئین حاضرین اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

تحریک اسلامی کے خلاف برتا جانے والا ہر گر حضور ﷺ کے لیے سودمند ثابت ہو رہا تھا۔ مشرکین اپنی سوچ میں تحریکِ اسلامی پر دباؤ بڑھا کر اُسے خاندان سے الگ تھلگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ابو طالب کے زیرِ اثر بنی مطلب کو ان نئی کارروائیوں کا پتا چلتا تو وہ ذہنی طور پر کسی پیش آمدہ خطرے کے لیے سوچنے پر مجبور ہو جاتے اور یوں وہ حضور ﷺ سے مخالفت کے باوجود لاشعوری طور پر ان کے قریب آ رہے تھے۔ آئندہ واقعات میں میری ان باتوں کی کھل کر تصدیق ہو جائے گی۔

---(((اللہ اکبر)))---

یہ کل بگئے کلپ رہے تھے۔ مکہ کے گورو اپنی ڈھکوسلائی گورکھی کے بے تکے بھاشن الاپنے کے لیے آج پھر دارالندوہ میں براجمان تھے۔ فضول سوچوں اور بے تکی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔

حالیہ ناکامی بہت بڑا گھاؤ تھی گھاؤ۔ دماغ منتشر، مگر آتشگیر تھے آتشگیر۔ تحریک اسلامی میں روز بروز کے اضافے نے انھیں ہلا کے رکھ دیا۔ اوپر سے حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہ کے قبولِ اسلام نے ان کی سوچوں میں زہر بھر دی تھی زہر۔

اس بار بھی بڑی لے دے کے بعد ابو طالب پر وفد کی شکل میں حملہ آور ہونے کا فیصلہ ہوا۔ جارحانہ دھمکیوں سے بنی مطلب کو مرعوب کرنے کی تجویز سوچی گئی۔ ابو طالب کو صرف ایک خوفناک انجام سے باخبر کرنا تھا بس......

یہ آگ بگولا وفد ابو طالب کے ہاں آ براجمان ہوا۔ نہ آؤ دیکھا، نہ تاؤ۔ آتے ہی کہنے لگے۔ اگر محمدؐ نے ہماری مخالفت اور اپنی دعوت نہ چھوڑی تو ہم کوئی سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہوں گے۔

اس بار بار کے دباؤ نے ابو طالب کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے حضور ﷺ کو بلوا کر کہا بھتیجے[3] میرے اور اپنے لیے جینے کی کچھ گنجائش باقی رہنے دو۔ اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے نہ میں اٹھا سکوں اور نہ آپ اُٹھا سکو۔ بہتر ہے اپنی قوم سے ناگوار باتیں کہنا چھوڑ دو۔

چچا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر جواب دیا۔ چچا جان! اگر سورج میرے دائیں ہاتھ اور چاند

Marfat.com

بائیں ہاتھ پر رکھ دیا جائے تو بھی میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ مجھے کامیاب فرمادے یا میں اس راہ میں ہلاک ہو جاؤں......

یہ فرما کر آپؐ رنجیدگی سے رو دیے اور چلنے لگے تو ابو طالب کو بھتیجے کی یتیمی کا خیال آیا کہ میری اس بات کا کیسا گہرا اثر ہوا ہے۔ انھوں نے روک کر کہا اپنا کام جاری رکھو جو کرنا چاہو کرو خدا کی قسم میں کسی ڈر سے آپؐ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔

دارالندوہ کی ریشہ دوانیاں دم توڑ رہی تھیں۔ دارالارقم کی تحریک بامِ عُروج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس ناکامی نے مشرکین کو بوکھلا کے رکھ دیا۔ وہ مخالفت میں سارے کے سارے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ ادھر مشرکین کی کوئی بھی چلتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ادھر حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ بھی اسلام کے حصار میں آ چکے تھے۔

ابو جہل تو سٹپٹا کر سر پیٹنے لگا۔ باؤلا ہو گیا تھا باؤلا۔ مشرکین میں اعلان کرنے لگا۔ تم سب نے دیکھ لیا محمدؐ ہماری مخالفت سے باز نہیں آیا۔ اب میں کل ہی خدا کی قسم کل ہی، نماز کے وقت جب وہ سجدہ میں جائے گا، ایک بھاری پتھر سے اس کا سر کچل دوں گا (نعوذ باللہ) پھر بنی عبد مناف جو چاہیں کرلیں۔

اگلے روز نماز کے وقت اُمرائے قریش کے علاوہ کئی اُچکے اوباش نوجوان بھی یہ تماشہ دیکھنے کے لیے حرم شریف میں جمع ہو گئے۔

حضورﷺ حسب عادت نماز پڑھنے لگے۔ جب آپؐ سجدہ ریز ہوئے تو ابو جہل پتھر لے کر آگے بڑھا آپؐ کے قریب آ کر یکایک واپس پلٹ آیا۔ تماش بینوں نے دیکھا کہ پتھر اس کے ہاتھ سے گر چکا ہے۔ اس کا رنگ فق ہے وہ گھبرا کر نیچے بیٹھ گیا۔

احباب دوڑ کر اس کے قریب گئے اور پوچھا ابوالحکم [4] یہ تمھیں کیا ہو گیا۔ اس نے جواب دیا تم دیکھ رہے تھے، میں وہی کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا جس کی میں نے قسم کھائی تھی، مگر جب میں آگے بڑھا تو میرے سامنے ایک زبردست اونٹ آ گیا تھا جو میں نے کم از کم اتنے بڑے سر ایسی گردن اور کچلیوں والا کبھی نہیں دیکھا۔ وہ مجھے چباڈالنے کے لیے آگے بڑھا۔

اس کی تصدیق حضورﷺ نے بعد میں اس طرح کی کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے۔

یہ ایک اور بہت بڑا طمانچہ تھا۔ جس نے غیر محسوس انداز میں اللہ کی حاکمیت کا اعلان کر دیا۔ مشرکین کو یہ باور کروایا کہ تمھاری طاقت اللہ کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔ تم کون ہوتے ہو کسی کو مارنے اور زندہ رکھنے والے تمھاری حیثیت ہی کیا ہے جو اس تحریک کو دبالو گے۔

Marfat.com

یقیناً اس واقعے سے بھی کئی دیکھنے والوں نے نصیحت حاصل کر لی ہوگی یہ دیکھ کر کئی غیر جانبدار تماشائی حصار دین میں آ گئے ہوں گے۔

مگر جس کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا، وہ نہیں مانا، اس میں بھی قانونِ فطرت ہی کار فرما ہے۔ خدا کی حکمت عیاں ہے۔ وہ جسے پسند نہیں کرتا، ہدایت نہیں دیتا۔ جسے چاہتا ہے بغیر طلب کے بھی ہدایت یاب کرتا ہے۔

آیئے ذرا مضمون کا تنوع اور تسلسل توڑ کر حضرت حمزہ کے قبول اسلام پر توجہ صرف کریں تا کہ حقیقت واضح ہو سکے کہ مشرکین کی بے جا مداخلت کی وجہ سے اسلامی تحریک کو کیا فوائد حاصل ہو رہے تھے۔

(((الحمد للہ)))

Marfat.com

حضرت حمزہؓ کا اسلام میں داخلہ کیسے ہوا

''اے ابو عمارہ[5] کاش تم اس وقت یہاں[6] موجود ہوتے جب ابوجہل تمھارے بھتیجے کے ساتھ انتہائی گھٹیا سلوک کر رہا تھا۔''

بچپن ہی سے آپؓ کو تیغ زنی، پہلوانی اور تیر اندازی کا شوق تھا۔ جوانی میں قدم رکھتے ہی مکہ کے بہادروں کی صف میں شمار کیے جانے لگے، لیکن مکہ کے چودھریوں کے عام معمول کے مطابق سیاست اور چودھرے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سیر اور شکار ان کا شغل تھا۔ اس کے سوا کسی سے دلچسپی نہ تھی۔ سورج نکلتے ہی تیر کمان اٹھاتے اور شکار کو نکل جاتے۔ شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں طواف کعبہ کرتے، وہاں موجود شرفا سے سلام دعا کرتے، گھر چلے جاتے۔ کبھی کبھی کسی کے پاس دو چار منٹ بیٹھ بھی جاتے۔

آج حضرت حمزہ حسب معمول تیر کمان اٹھائے شکار سے واپس آرہے تھے۔ راستے میں عبداللہ بن جدعان کی لونڈی نے انھیں یہ الفاظ کہے تھے۔

حضرت حمزہؓ حضورؐ سے صرف تین سال بڑے تھے۔ انھوں نے بھی ابولہب کی لونڈی ثوبیہ کا دودھ پیا تھا، اس لحاظ سے وہ آپؐ کے رضاعی بھائی بھی تھے اور چچا بھی۔ حضرت آمنہؓ حضورؐ کی والدہ اور حضرت حمزہ کی والدہ چچازاد بہنیں تھیں۔ اس نسبت سے حضور ﷺ کے خالہ زاد بھائی بھی تھے۔

سن 6 نبوی میں ایک دن حضور ﷺ دار ارقم سے واپسی پر کوہ صفا کے قریب سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ابوجہل سے ملاقات ہوگئی جو عدی بن حمرا اور ابن الاصدا کے ساتھ آ رہا تھا۔ مشرکین کے معمول کے مطابق وہ نبی رحمت کو دیکھتے ہی بھڑک اٹھا۔ طعن و تشنیع اور گالی گلوچ کرنے لگا۔

رحمت عالم ﷺ نہایت صبر و تحمل سے سن کر چل دیے۔ وہ زور زور سے واہی تباہی بکتا چلا گیا۔

Marfat.com

کوہ صفا کے قریب عبداللہ بن جدعان کی لونڈی کا مکان تھا۔ جو یہ سارا ماجرا دیکھ رہی تھی۔
تھوڑی دیر بعد حضرت حمزہؓ کا شکار سے واپسی پر وہاں سے گزر ہوا تو اس نے انھیں روک کر کہا۔
اے ابوعمارہ[7] کاش تم اس وقت یہاں موجود ہوتے جب ابوجہل تمھارے بھتیجے کے ساتھ انتہائی گھٹیا سلوک کر رہا تھا۔

حضرت حمزہؓ کو بھتیجے کے دین سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مگر ان سے محبت اپنی معراج پر تھی۔ یہ الفاظ سنتا تھے کہ آپے سے باہر ہوگئے۔ سیدھے حرم میں پہنچے۔

ابوجہل دارالندوہ میں بڑی بڑی چھوڑ رہا تھا۔ دفعتاً حمزہؓ کی کمان اس زور سے اس کے سر پر لگی کہ خون پھوٹ پڑا۔ ساتھ ہی جوشِ غضب میں بولے تو محمد ﷺ کو گالیاں دیتا ہے۔ سن میں بھی اسی دین پر ہوں اگر ہمت ہے تو مجھے بھی گالیاں دے کر دیکھ۔

حرم میں بنی مخزوم کے کچھ اور آدمی بھی موجود تھے۔ ابوجہل کا پھٹا ہوا سر دیکھ کر حملہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ابوجہل نے یہ کہہ کر انھیں روکا کہ میں نے اس کے بھتیجے کو برا بھلا کہا جو اسے اتنا غصہ آیا۔ بعدازاں ایک مخزومی نے پوچھا۔

حمزہ کیا تم بھی صابی[8] ہو گئے ہو۔

حضرت حمزہؓ نے بڑی بے باکی سے جواب دیا ہاں میرا اور محمد ﷺ کا دین ایک ہی ہے۔ کوئی مجھے اس سے باز رکھ سکتا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم سچے ہو تو مجھے روک کر دیکھو!!!

ابوجہل کو یہ ڈر تھا کہ اگر بنی ہاشم اور بنی مخزوم میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھی تو اس کو بجھانا ناممکن ہوگا، اس لیے اس نے مخزومیوں کو حمزہؓ پر ہاتھ اٹھانے سے روک دیا۔

—(((اللہ اکبر)))—

یہ واقعہ مشرکین کے دلوں میں کانٹے کی طرح پیوست ہوگیا۔ ان کی مخالفت کے نتائج الٹ برآمد ہو رہے تھے۔ آج کی مخالفت نے ایک اور بہادر کو اسلام کا حامی بنا کر کھڑا کر دیا۔ بصورت دیگر شاید کئی سال حضرت حمزہؓ کو اسلام حصار میں لانے کے لیے صرف ہو جاتے۔ مشرکین کی بے تکی مخالفت سے کئی سالوں کا فاصلہ چند منٹوں میں طے ہو گیا۔

حضرت حمزہؓ کے اسلام قبول کرنے کا اعلان جذباتی فیصلہ تھا۔ آپ دارِ ارقم پہنچے تو بھتیجے سے کہا "میں نے تمھارا بدلہ چکا دیا۔"

رحمت عالمؐ نے فرمایا "چچا میں ان باتوں سے خوش نہیں ہوتا۔ خوشی کی بات تو تب ہوتی جب آپ غیر اللہ کو چھوڑ کر دینِ حق قبول کر لیتے۔"

یہ ایک باقاعدہ دعوت تھی۔ گھر واپس آگئے۔ پوری رات شش و پنج میں گزر گئی۔ صبح اٹھ کر حضورﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ ذہنی پریشانی کا حال سنایا تو آپؐ نے انتہائی بلیغ پیرائے میں دعوت دی۔ جس میں خوف خدا سے لے کر جنت دوزخ تک کا بیان تھا۔ اب یہ سب کچھ سن کر کوزۂ دل آب حق سے لبریز ہوگیا۔ پکار اٹھے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰه الا اللّٰه واشهدُ اَنَّ محمدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ہی لائق عبادت ہے اور محمدؐ اللہ کے بندے اور رسولؐ ہیں۔

حضرت حمزہؓ کا قبولِ دین ایک شخصیت کا قبول دین نہیں، بلکہ ایک عہد اور ایک تاریخ کا قبول اسلام تھا۔ اس شخصیت نے اسلامی تاریخ میں جو رنگ بھرا یا ان کی وجہ سے اسلام کو جو تقویت ملی۔ آیئے اس کا سطحی سا جائزہ ہو جائے۔

13 نبوی کو حضرت حمزہؓ بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت سعد بن خثیمہ کے ساتھ قیام فرمایا۔ اسلام میں سب سے پہلے علم آپ کو دیا گیا۔

اب چونکہ مدینہ میں مسلمان قدرے سکون محسوس کر رہے تھے۔ ایک طرح کی اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی۔ ضروری تھا مشرکین، جنھوں نے مسلمانوں کو اذیت پہنچانے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، کے خلاف مزاحمتی کارروائیاں کی جائیں۔

اسی غرض سے 1 ھ ہجری میں 30 سواروں کا ایک دستہ حضرت حمزہؓ کی قیادت میں روانہ کیا گیا۔ جس کے ذمہ ابوجہل کی قیادت میں ملک شام سے مکہ واپس آنے والے 300 آدمیوں پر مشتمل قافلے کو اپنا وجود باور کرانا تھا، لیکن مجدی بن عمر کی مداخلت سے بیچ بچاؤ ہوگیا اور حضرت حمزہؓ واپس مدینہ آگئے۔

2 ہجری میں سرور عالمؐ ستر جانثاروں کے ساتھ غزوہ ابواٗ کے لیے تشریف لے گئے، اس میں اسلامی سپاہ کا علم حضرت حمزہؓ کو دیا گیا، اس میں بھی قافلہ قریش مسلمانوں کی آمد سے پہلے نکل گیا۔ سو بنوضمرہ سے ایک دوستانہ معاہدہ کر کے حضورؐ واپس تشریف لے آئے۔

اسی سال غزوہ ذوالعشیرہ پیش آیا اس میں بھی مسلم افواج کی علمبرداری کا سہرا حضرت حمزہؓ کے سر لگا۔ یہاں بھی جنگ کی نوبت نہ آئی کیونکہ قافلۂ قریش چند دن پہلے یہاں سے کوچ کر گیا۔ یہاں بنومدلج سے دوستانہ معاہدہ ہوا اور 150 صحابہ کے ساتھ حضورﷺ واپس آگئے۔

اسی سال رمضان 2 ہجری کو غزوہ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ جس نے اسلامی تاریخ کا ایک عظیم الشان باب کھولا۔ حضرت حمزہؓ نے 313 مجاہدینِ بدر کے ساتھ دنیا کی ایک بے مثال تاریخ رقم

Marfat.com

کی۔

عام لڑائی کی شروعات سے پہلے مشرکین کے سالار عتبہ اور شیبہ بن ربیعہ دونوں بھائی اور ولید بن عتبہ تلواریں لشکاتے ہوئے مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دینے کے لیے آئے۔ ان کے مقابلہ کے لیے، عوفؓ، معاذؓ اور معوذ بن عفرأ تینوں بھائی نکلے۔ مشرک بہادروں کو جب علم ہوا کہ ان کے مقابل تینوں جوان انصاری ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہماری قوم کے لوگوں یعنی مہاجرین میں سے ہمارے مقابلے کے لیے بھیجو۔ اس پر حضور علیہ السلام نے حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہ بن حارث کو مقابلے کے لیے بھیجا۔ تینوں جانثارانِ رسول حکم ملتے ہی میدان میں کود پڑے۔ حضرت حمزہؓ کا مقابلہ شیبہ بن ربیعہ سے۔ حضرت علیؓ کا ولید بن عتبہ سے اور حضرت عبیدہ کا مقابلہ عُتبہ بن ربیعہ سے ہوا۔ حضرت حمزہؓ اور علیؓ نے تو پہلے ہی وار میں ولید کو جہنم واصل کیا۔ حضرت عبیدہؓ اور عتبہ دیر تک لڑتے رہے۔ حضرت عبیدہؓ شدید زخمی ہو گئے۔ حضرت حمزہ اور حضرت علیؓ نے یہ صورتحال دیکھ کر ایک ہی وار میں عتبہ کا کام تمام کر دیا۔

اپنے بڑوں کی ہلاکت دیکھ کر طعیمہ بن عدی جوشِ انتقام میں آگے بڑھا۔ حضرت حمزہؓ نے ایک ہی وار میں اس کو بھی زندگی سے بے نیاز کر دیا۔

اب مشتعل مشرکین نے ہلا بول دیا۔ تعداد میں مسلمان تین کے مقابلہ میں ایک سے بھی کم تھے، لیکن صحابہٴ رسولؐ نے شجاعت اور بہادری کے وہ کارنامے رقم کیے جن سے تحریک اسلامی کا رخ بدل گیا۔

حضرت حمزہؓ کی پگڑی پر شتر مرغ کی کلغی تھی اور دونوں ہاتھوں میں تلواریں۔ دونوں تلواریں چلانے والے کی بہادری اور جوان ہمتی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ بس جدھر رخ ہو جاتا صفیں درہم برہم ہو جاتیں۔ بیشمار منکرین ان کی دونوں تلواروں کا لقمہ بنے۔ سب سے اہم ابوجہل کے خاندان بنی مخزوم کا جنگجو اسود بن عبدالاسد تھا جسے حوض میں جا کر مارا گیا۔

ستر (70) مشرکین کی لاشیں اپنی شکست خوردگی پر خاموش نوحہ خواں تھیں۔ ستر کے قریب قیدی ندامت سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ جنھیں بعد میں فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔

شوال 2 ہجری میں غزوہ بنی قنیقاع پیش آیا۔ علمبرداری اس میں بھی حضرت حمزہؓ کو عطا ہوئی جس کا آپؓ نے پورا پورا حق ادا کیا۔

سن 3 ہجری میں غزوہ احد برپا ہوا۔ تین ہزار کے مقابلہ میں 700 سات سو جانثارانِ رسول تھے۔ عقبی درہ، جس سے مشرکین کی آمد متوقع تھی، رحمتِ عالمؐ کے سالار حضرت حمزہ مقرر ہوئے۔

Marfat.com

مشرکین کی عورتوں نے رجزیہ شعر پڑھ کر جوش دلایا۔ قریشی علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ للکارتے ہوئے نکلا جس کو حضرت علیؓ نے آلیا۔ اس کے بعد عثمان بن ابی طلحہ آیا۔ جس پر حضرت حمزہؓ نے سر سے کمر تک تلوار اتار دی۔

اس جنگ میں حضرت حمزہؓ کچھ عجیب شان سے لڑ رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں پکڑی تلواریں چلاتے جاتے اور کہتے جاتے۔ میں اللہ کے رسول کا شیر ہوں۔ مکہ کے مشرک سباع بن عبدالعزیٰ کو دیکھا تو کہنے لگے اے عورتوں کا ختنہ کرنے والی اُمِ انمار کے بچے تو بھی خدا کے رسول سے لڑنے آیا ہے۔ یہ کہتے کہتے ایسا ہاتھ مارا کہ وہ کٹ کر گر پڑا۔

جبیر بن مطعم کا حبشی غلام وحشی حضرت حمزہؓ کی تلاش میں تھا چونکہ اسے ہند نے حمزہ کی لاش کے بدلے انعام کا وعدہ کیا تھا اور جبیر بن مطعم نے اپنے چچا طیعمہ بن عدی کا انتقام لینے کے لیے بھی یہی ٹاسک دیا تھا۔

وہ چٹان کی اوٹ میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ حضرت حمزہؓ جونہی اس کی زد میں آئے۔ اس نے نیزہ پھینکا جو حضرت حمزہ کی ناف پر لگا اور پار ہو گیا۔ آپؓ اپنے رب کے ہاں جا بسے۔ اس شہادت پر مشرکین کو اس قدر خوشی ہوئی کہ ان کی عورتوں نے خوشی کے ترانے گائے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے آپؓ کے کان ناک کاٹ کر ہار بنا کر گلے میں ڈالا اور کلیجہ نکال کر چبایا۔ نگلا نہ جا سکا تو تھوک دیا۔ پھر ایک چٹان پر کھڑے ہو کر شعر پڑھے کہ آج ہم نے غزوہ بدر کا بدلہ لے لیا۔ اے وحشی تو نے میرا سینہ ٹھنڈا کر دیا۔ میں تیری عمر بھر شکر گزار رہوں گی۔

حضورؐ کو جب خبر ہوئی تو دعا کی۔ الٰہی حمزہ کے جسم کے کسی حصہ کو جہنم میں داخل نہ ہونے دینا۔

آپ کو سید الشہداء کا خطاب دیا۔ اس جنگ میں ستر مسلمان شہید ہوئے۔ ان کا جسد خاکی بڑا دلدوز منظر پیش کر رہے تھے۔ مشرکین نے ان کی لاشوں کے اعضا کاٹ لیے تھے۔ حضورؐ نے اپنے چچا کی لاش کو دیکھا تو دل بھر آیا۔ زبان مبارک سے یہ دعا نکلی کہ ''اللہ آپ پر رحمت نازل فرمائے جہاں تک مجھے معلوم ہے تم قرابت داروں کا سب سے زیادہ خیال رکھنے والے تھے۔''

حضرت صفیہؓ رسول اللہؐ کی پھوپھی، حضرت حمزہؓ کی بہن، حضرت زبیرؓ کی والدہ جنگ کا حال معلوم کرنے آئیں تو آپؐ نے حضرت حمزہؓ کی لاش دیکھنے سے منع فرما دیا۔ اس نے جواب دیا میں کہا کہ اس نے اپنے بھائی کی شہادت کا ماجرا سن لیا ہے، لیکن اللہ کی راہ میں یہ کوئی اتنی بڑی قربانی نہیں۔ یہ سن کر آپؐ نے لاش دیکھنے کی اجازت دے دی۔

Marfat.com

آج ایک بہن کا عزم دیکھیے کہہ رہی ہے۔ یہ اللہ کی راہ میں کوئی بڑی قربانی نہیں۔ یہ وہ بھائی ہے جو مکہ میں کبھی متنازعہ نہیں رہا۔ جسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس کی بہادری پر پورا مکہ عش عش کرتا ہے۔ آج اُسی ہزاروں بلکہ لاکھوں میں ایک شہید بھائی کی لاش اس کی بہن کے سامنے پڑی ہے۔ وہ بھائی جس کی طرف کوئی دشمن آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آج اس کی لاش دو ٹکڑے ناک اور کان کٹے ہوئے اپنی بہن کو اپنی بہادری کی صفائی پیش کر رہی ہے۔ اپنی بے مثال جانثاری کا ثبوت دے رہی ہے۔

اور......اور بہن کا حوصلہ دیکھئے بھائی کو دیکھے جا رہی ہیں اور آنکھیں سیل رواں کی طرح بہہ رہی ہیں۔ آنسو ہیں کہ بہتے ہی جا رہے ہیں، مگر زبان سے کوئی بین نہیں، کوئی چیخ نہیں، کوئی ہوک نہیں، بس صرف انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر بیٹے کو بلایا۔ زبیرؓ یہ دو چادریں ہیں۔ ان سے میرے بھائی کا جسم ڈھانپ دینا۔ ان میں ماموں کو کفنا دینا۔

بھانجے کا ایثار دیکھئے قریب ہی ایک اور شہید کی لاش ہے بھانجے نے اپنی ماں کا تحفہ، جو اس کے بھائی کے لیے تھا، اس میں سے ایک چادر اس انصاری شہید کو دے دی۔

اب ایک چادر میں سید الشہداء کا سر ڈھانپا جاتا ہے تو پاؤں ننگے ہو جاتے ہیں پاؤں ڈھانپے جاتے ہیں تو سر ننگا ہو جاتا ہے۔ آخر رسالت مآبؐ نے فرمایا چہرہ اور سر چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ جنازہ تیار ہوا تو صحابہ اکرام دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ حضورؐ نے پوچھا: کیوں رو رہے ہو۔ عرض کیا: یا رسول اللہ! آج ہم اس قابل بھی نہیں کہ آپ کے چچا کا جسم ڈھانک دیں۔

آپؐ نے فرمایا: عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب مسلمان ایسے علاقوں پر قابض ہوں گے جہاں ہر طرح سے خوشحالی ہوگی اور وہاں سے اپنے اہل وعیال کو مدینہ سے آنے کے لیے لکھا کریں گے۔

سب سے پہلے حضرت حمزہؓ کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی۔ اس کے بعد ایک ایک جنازہ حضرت حمزہ کے جنازے کے ساتھ رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی رہی اور یوں حضرت حمزہؓ کی نمازِ جنازہ ستر دفعہ پڑھی گئی۔

یاد رہے اس فضیلت میں کوئی اور امتی شریک نہیں۔

اور حضرت حمزہؓ کو ان کے بھانجے عبداللہ بن جحش کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفنا دیا گیا۔

Marfat.com

اس کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ خلافت 40 ھ ہجری میں جب احد کی طرف نہر نکالنے کے لیے کھدائی کی گئی تو ایک جگہ سے شہدا کی لاشیں برآمد ہوئیں جو بالکل تروتازہ تھیں۔ اتفاق سے کھدائی کے دوران حضرت حمزہؓ کے پاؤں میں بیلچہ لگ گیا تو ان کے پاؤں سے لہو کے چھینٹے اس طرح اڑے جیسے زندہ آدمی کو زخم لگنے کے بعد اڑتے ہیں۔

آیئے اپنے موضوع کی طرف، اسلام کی اتنی قدآور شخصیت نے صرف مشرکین کی مخالفت کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ ان کی وجہ سے اسلام کو بے شمار فوائد پہنچے۔ بہت سے واقعات ہیں جو محض طوالت کے خوف سے صفحہ قرطاس پر لانے سے قاصر رہا۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تحریک کی اتنی شدید مخالفت نہ کی جاتی تو شاید آج دنیا میں اسلامی دنیا کا نقشہ مختلف ہوتا۔

مخالفت کی شدت نے اسلام کو دو قسم کے فوائد پہنچائے۔ ایک جز وقتی اور دوسرے کل وقتی، جز وقت فوائد وہ تھے جن کی وجہ سے نئی تحریکی نشر و اشاعت کے ذرائع اپنائے بغیر فائدہ پہنچ رہا تھا۔ یعنی مخالفین خود واقعات کو توڑ نے مروڑنے کے چکر میں اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے کہ سننے والا خواہ مخواہ تذبذب میں مبتلا ہو جاتا اور جب حقائق کا پردہ چاک ہوتا تو وہ خود بخود اسلام قبول کر کے میدان عمل میں کود پڑھتا یا بعض اوقات کسی مسلمان کے ساتھ زیادتی یا ناروا سلوک دیکھتا تو انسان کی فطری کمزوری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس مظلوم کا ساتھ دینے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا اور تحریک اسلامی کے کارکنوں کے قریب ہونے کا موقع ملتا تو سچائی دل کے بند کواڑ کھول کر خود بخود دل میں داخل ہو جاتی۔

کل وقتی فوائد وہ تھے جو ایک شخص کے مسلمان جانے کے بعد تحریکِ اسلامی کو ملتے یا حاصل ہوتے جیسا کہ حضرت حمزہؓ کے اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان کی شہادت تک جو تقویت ملی اور ان کی شہادت سے لیکر آج جو فوائد اس اُمت کا ہر فرد ان کی شخصیت ان کے حالات کو جان کر حاصل کر رہا ہے۔

یہ کل وقتی فوائد و اثرات تو ایسے ہیں جو قیامت تک جاری و ساری رہیں گے۔

———(((اللہ اکبر)))———

مشرکین تلملا اُٹھے تھے۔ ہر طرف ناکامی ان کا منہ چڑا رہی تھی کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر دباؤ بے معنی ثابت ہو چکا۔ دارالندوہ کی ریشہ دوانیاں دارِ ارقم کے مقابلہ میں دم توڑ

رہی تھیں۔

ہاں ہاں وہ جاہل اور بدو تھے اپنی کہنہ جہالت کے معاملہ میں، لیکن اسلام کے معاملہ میں وہ بڑی پڑھی لکھی مخالفت کر رہے تھے یعنی ہر لحاظ سے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان جیسے جدید اور نئے حربے تو شاید موجودہ دنیا کی کسی سرد جنگ (Cold War) میں نظر نہیں آتے۔ ایسے لگتا ہے کہ نبوت کے 13 سالہ مکی دور میں انھوں نے کوئی اور کام کیا ہی نہیں ماسوائے اسلام کی مخالفت کے۔ بعثت سے لے کر فتح مکہ تک ان کی زندگی صرف اور صرف محمد ﷺ کی مخالفت کے تابع نظر آتی ہے۔

حضرت حمزہؓ کے قبول اسلام نے تمام مشرکین کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ طبیعتوں میں تختی اور ترشی کا میلان ختم کر دیا تھا۔ تشدد سختی اور دھمکی کی لہر وقتی طور پر ختم ہو چکی تھی۔

انتہائی تدبر اور غور و فکر کے بعد ایک بار پھر ابو طالب سے معاملہ طے کرنے کا سوچا گیا۔ یہ مان نہ مان میں تیرا مہمان والی بات تھی۔ وہ لوگ ابو طالب کے ہاں آ دھمکے۔ بھائی کیا حال ہے طبیعت ٹھیک ہے۔ جی ہاں بالکل ٹھیک آؤ کیسے آنا ہوا۔ ابو طالب نے پوچھا تو کہنے لگے، بس ایسے ہی سلام کرنے کے لیے۔ اچھا اچھا بیٹھ جاؤ۔ ابو طالب نے کہا۔

ادھر ادھر کی دو چار مارنے کے بعد کہنے لگے، اے بھائی[10] ہم ایک تجویز لے کر آئے ہیں۔ آپ اپنے بھتیجے سے کہو وہ ہمارے معبودوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے۔ ہم اس کے معبود کی مخالفت چھوڑ دیتے ہیں۔ ابو طالب نے حضورؐ کو بلا کر کہا بیٹے! یہ معززین مکہ ہیں۔ انھوں نے انصاف کی بات کہی ہے۔ اسے مان لو۔

واہ رے واہ یہ کوئی جائیداد زمین مکان کا جھگڑا تھا۔ یہ تو اہل مکہ، بلکہ اہل دنیا اس سے بھی آگے قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی کا مسئلہ تھا۔ کیسے مان لیا جاتا۔ کیسے لے دے کے اس مسئلے کو ختم کر دیا جاتا۔ یہ تو دنیا و آخرت میں انسانیت کی فلاح کا مسئلہ تھا۔ حضورؐ اسے چھوڑنے پر قادر نہیں تھے۔ انھوں نے انصاف کی بات کہی تھی تو آپ بھی تو ان کو انھیں کی بھلائی کی طرف بلاتے تھے۔

انتہائی فکر کرنے کے بعد آپؐ نے جواب دیا۔ چچا جان کیا میں انھیں اس کلمے کی طرف نہ بلاؤں جس پر عمل کر کے یہ عرب و عجم کے مالک بن جائیں۔ ابو جہل سٹپٹا اٹھا۔ یہ تو بڑی منافع کی بات ہے۔

Marfat.com

فرمایا: کہولا الہ الا اللہ کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

وہ یہ سنتے ہی اُٹھ کر چلے گئے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں۔ جواب بڑا معقول اور متاثر کن تھا، مگر ان کی قسمت میں ہدایت نہیں تھی۔ سو اپنی خفت مٹانے کے لیے جھوٹ بولنے لگے۔ اپنے آپ کو فریب دینے لگے۔ لوگوں سے جان چھڑانے کے لیے جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے لگے۔ جس کی وضاحت فرقانِ حمید نے اس طرح فرمائی۔

اِصبِرُوا عَلیٰٓ اٰلِهَتِکُمۡ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ یُّرَادُ ۝

مفہوم:۔ اس بات یعنی کلمے سے تو کوئی اور ہی شے مراد ہے۔ ''ص'' آیت نمبر 6

ان کو نہ ماننا تھا نہ مانے۔ اسلام کی مخالفت ان کا خاصہ تھی اور ناکامی ان کا مقدر۔ سو وہ مخالفت کرتے رہے، ناکام ہوتے رہے۔ مخالفت کرتے رہے، ناکام اور نامراد ہوتے چلے گئے۔

———(((اللہ اکبر)))———

یہ بیل کسی طرح منڈھے چڑھتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہی فکر لیے ایوانِ ندوہ میں مشرکین بیٹھے تھے۔ کیا کیا جائے، کس طرح روکا جائے۔ کوئی حل نہیں مل رہا۔ ایک بار پھر صرف ایک بار اور ابو طالب کو آزمانے کا فیصلہ ہوا۔

اب تو ایک عجیب و غریب سودا طے کرنے کے لیے آئے تھے۔ ابو طالب [11] کے ہاتھ میں ایک نوجوان عمارہ بن ولید کا ہاتھ دے کر کہنے لگے، جیسا کہ ابو طالب آپ جانتے ہیں عمارہ بن ولید ایک خوبصورت اور شہرت یافتہ نوجوان ہے، اسے اپنا بیٹا بنا۔ اس کے بدلے میں محمد ﷺ ہمیں دے دو جس نے ہمارے آباؤ اجداد کے دین کو بُرا کہا۔ ہمیں بیوقوف و احمق قرار دیا۔ ہم میں پھوٹ ڈالی۔ ہم تمہیں بیٹے کے بدلے نوجوان اور خوبصورت بیٹا دیکر محمدؐ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ قارئین غیر جانبداری سے غور فرمائیے کہ کتنا بے تکا سودا تھا اور اس بیٹے کا جس کی پیدائش پر ابولہب نے کہا تھا ''محمد جیسا پورے عرب میں کسی ماں نے جنا ہی نہیں۔'' یہ سودا اس بزرگ سے کیا جا رہا ہے جس نے محمدؐ کو زندگی بھر محبت و پیار دیا۔ جوانی تک کبھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ کبھی اس کے بغیر کھانا نہیں کھایا۔ بھتیجا تھا، مگر بیٹوں سے مقدم اور عزیز رکھا۔ ابو طالب تو سنتے ہی سیخ پا ہو کر بولے

''واللہ تم نے بدترین سودا سوچا ہے، مجھے اپنا بیٹا دیکر کہتے ہو کہ اسے پالوں پوسوں اور میرا پلا پوسا بیٹا مانگتے ہو کہ تم اسے قتل کر دو۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''

Marfat.com

بڑے ہی عجیب لوگ تھے پتا نہیں انسانوں کی کس قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔ جواب سن کر مطعم بن عدی کہنے لگا کہ خدا کی قسم قوم نے تم سے انصاف کی بات کر کے تمھیں مشکل سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔

(یادر ہے یہ ہاشم کے بھائی نوفل کی اولاد میں سے تھے)

واہ رے انصاف۔ اگر انصاف یہی ہے تو پھر انصاف کیا ہوگا۔ ابو طالب نے اسے جواب دیا: ''خدا کی قسم انھوں نے میرے ساتھ کوئی انصاف نہیں کیا۔ ہاں تم نے میری بجائے ان کا ساتھ ضرور دیا۔''

قارئین!! یہ تھی وہ خاندانی اور سیاسی جنگ جو کئی سالوں تک بغیر کسی توقف کے جاری رہی۔ صرف یہی نہیں ساتھ ہی ساتھ غلاموں اور موالی کے ساتھ بے پناہ ظلم بھی کیا جاتا رہا۔ مناسب موضوع میں وہ واقعات آئیں گے۔ یہاں چونکہ ہمارا مقصد، خاندانی محاذ پر جو دباؤ ڈالے گئے، اس کا جائزہ لینا تھا۔ اس لیے باقی تمام واقعات جو تشدد یا ثقافت یا معیشت و معاشرت کے زمرے میں آتے تھے، وہ یہاں نہیں لکھے۔

بہر حال اب ابو طالب پر واضح ہو چکا تھا کہ مشرکین محمد ﷺ کے قتل سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ انھیں مزید ڈھیل نقصان دہ ہوگی۔ انھوں نے بنو ہاشم کو جمع کر کے محمد ﷺ کی حمایت پر آمادہ کیا۔

پھر ایک دن اچانک ابو طالب حضورؐ کے گھر تشریف لائے[12]۔ آپ گھر پر موجود نہ تھے۔ انھیں شک ہوا کہ آپؐ کو قتل کر دیا گیا۔ انھوں نے فوراً خاندان کے تمام نوجوانوں کو بلایا اور ایک ایک خنجر کپڑوں کے اندر چھپانے کا حکم دے کر کہا۔ میرے پیچھے حرم میں آؤ۔ وہاں ابو جہل مجلس لگا کے بیٹھا ہے۔ یقیناً اس نے ہی محمدؐ کو قتل کیا ہوگا۔ اشارہ پاتے ہی اس پر ٹوٹ پڑنا اور خیال رکھنا کہ کوئی بھی آدمی زندہ بچ کر نکلنے نہ پائے۔

راستے میں حضرت زید بن ثابت مل گئے۔ انھوں نے بتایا کہ حضورؐ دارارقم میں تشریف فرما ہیں۔ وہیں سے ابو طالب بنی ہاشم کے نوجوانوں کے ساتھ دارالارقم گئے۔ وہاں سے محمدؐ کو ساتھ لے کر واپس حرم شریف میں آئے۔

مشرکین کے پاس جا کر اپنے جوانوں سے کہا انھیں خنجر ننگے کر کے دکھاؤ اور پھر مشرکین کو آج کے شک کا واقعہ سنایا اور انھیں سخت تنبیہ کی کہ:

Marfat.com

''خدا کی قسم اگر تم لوگوں نے محمدؐ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا یاد رکھو میں سب کے مرجانے تک لڑوں گا۔

یہ ایک طرح کا الٹی میٹم تھا جو ابو طالب نے مشرکین کو دیا۔اس کے باوجود وہ سمجھے نہیں۔اپنی ہٹ پر ڈٹے رہے۔سازشوں،مخالفتوں کے منصوبے اپلائی کرتے رہے۔

ان واقعات کے علاوہ مشرکین نے وہ وہ کارروائیاں کیں جن کا تصور ہی انسان کو ہلا کے رکھ دیتا ہے۔نبی امی ﷺ کی تینوں بیٹیوں کو طلاق دلوانے کی کوششیں شروع کر دیں جن میں سے دو کو طلاق دلوانے میں کامیاب ہو گئے۔

آیئے تاریخ کے اس دل فگار ورق پر بھی نظریں جھکا کے دیکھیں۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

دختران رسول ﷺ کو طلاق دلوانے کی کوششیں

مشرکین عرب کا خیال تھا کہ اہل مکہ نسلی اور لسانی اعتبار سے ایک قوم ہیں۔ اگر ہم رسول امی کو نسلی اور خاندانی لحاظ سے تنہا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پورے عرب میں محمد ﷺ اور اس کے پیروکاروں کی مخالفت ہو گی اور اس کی برپا کی ہوئی تحریک بغیر کسی قبائلی یا خاندانی سرپرستی کے خود بخود دم توڑ دے گی۔ اس طرح جنگ لڑنے کے بغیر ہی مقاصد کا حصول ممکن ہو جائے گا۔

سو انھوں نے اس مقصد کے حصول میں بارہا اقدام اُٹھائے۔ ہر بار ناکامی نے ان کے قدم چومے۔ وہ شرمندہ تو ضرور ہوئے، مگر ہارے نہیں۔ اس لیے وہ انتہائی گھٹیا داؤ کھیلنے لگے۔ انتہائی نیچ اور کمینی کوششوں پر اُتر آئے۔

آپؐ کے سگے چچا ابولہب بن عبدالمطلب مخالفین کے گروہ کے قائدین میں سے تھے۔ آپؐ کے ہمسائے اور کُروم تھے۔ نبیؐ کی دو بیٹیاں اُمِ کلثومؓ اور رقیہؓ ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عُتیبہ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک تھیں۔ اپنا ہونے کے باوجود یہ گھر مخالفت میں بہت آگے نکل گیا۔ ہر نئی تکلیف اس گھر سے ایجاد کی جاتی۔

آپؐ کی چچی اُمِ جمیل مکہ میں ہجو گوئی کی استاد مانی جاتی تھی۔ اس کی تمام ادبی فکر حضورؐ کے خلاف شعر کہنے تک محدود ہو چکی تھی۔ اب اس نے بہانے بہانے سے دونوں بہوؤں کو ستانا شروع کر دیا چونکہ دونوں عصمت مآب سرورِ عالم کی صاحبزادیاں تھیں۔

ایک دن رسولِ رحمتؐ اپنی وفا شعار[13] بیوی کے ساتھ گھر کے صحن میں بیٹھے تبلیغی و تحریکی کام پر بات چیت کر رہے تھے۔ دونوں صاحبزادیاں کلثومؓ اور رقیہؓ روتی ہوئی گھر میں داخل ہوئیں۔

سیدہ خدیجہؓ نے اُٹھ کر بیٹیوں کو گلے لگایا اور رونے کی وجہ پوچھی۔ عصمت مآب دختران رسول ﷺ نے جواب دیا۔ ہماری ساس اُمِ جمیل نے ہمیں اپنے بیٹوں سے طلاق دلوا دی۔ سیدہ خدیجہؓ نے استفسار کیا کہ اس کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی۔

انھوں نے جواب دیا، وہ لوگ کہتے ہیں کہ ابولہب جیسے معزز آدمی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس

کی بہوئیں ایسے شخص کی بیٹیاں ہوں جس سے تمام اشرافِ مکہ نفرت کرتے ہیں۔

سیدہ خدیجہؓ جواں سال بیٹوں کے اُجڑے سہاگ دیکھ کر واویلا کرنے لگیں تو نبیِ رحمتؐ نے سختی سے صبر کرنے کی تلقین فرمائی۔

اب ذرا ایک باپ کی حیثیت سے سوچیں کسی بھی بانیِ تحریک کے لیے یہی وار اعصاب شل کر دینے کے لیے کافی نہیں۔ یہ حملہ انقلابی شخصیت کے تمام پروگرام کو تہس نہس کر کے نہیں رکھ دیتا؟ کارکنان میں بددلی اور مایوسی نہیں پھیلا دیتا؟

نفسیاتی جنگ کے ماہرین بخوبی جانتے ہیں کہ کسی بھی قائد کے خلاف اس طرح کی اعصاب شکن کارروائی کر کے بانیِ تحریک کے خیالات کو منتشر اور تحریکی فریم ورک کو درہم برہم کر دیا جاتا ہے۔ یوں جب کسی بانیِ تحریک کی سوچ، فکر ذاتی اور نجی زندگی تک محدود ہو جائے تو تحریک خود بخود سرد پڑ جاتی ہے۔ ایسی اعصاب شکن کارروائیاں تحریک کے تیزی سے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کو روکنے کے لیے کی جاتی ہیں۔

آج مجھے افسوس ہوتا ہے جب اسلامی تاریخ و سیرت کے بھولے بھالے مورخ مشرکینِ مکہ کو ان پڑھ اور بدو کہتے ہیں۔ یہ سوچ کتنی سادہ ہے کہ اتنے تیز طرار مخالفین کو ناخواندہ اور جاہل سمجھا جائے۔ حالات و وقائع نگاری کی کسوٹی صرف یہی رنگ آمیزی کرتی ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے نبیِ اُمّی کے خلاف وہ وہ تدابیر اختیار کی گئیں جنھیں موجودہ دنیا کا کوئی ماہر سے ماہر جرنیل بھی شاید اختیار نہ کر سکے۔

ہاں یہ بات ماننے والی ہے کہ مشرکین اسلام دشمنی میں ضرور بدو اور اکھڑ تھے۔ اتنی شدید مخالفت اور جدید تکنیک دنیا کی کسی انقلابی تحریک کے خلاف نظر نہیں آتی۔

یہ الگ بات کہ رسولِ کائناتؐ نے ہر مخالفت کو حسنِ تدبر اور صبر و تحمل سے اپنے لیے فائدہ مند بنا لیا۔ نجی یا ذاتی پن کو کبھی قریب نہیں پھٹکنے دیا سو آج ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ زندگی اور مشن کے نازک ترین مرحلوں پر بھی ناکام نہیں ہوئے۔

خاندانی اور نجی زندگی کی تباہی کا سامنا کرنا بظاہر بڑا ہی کٹھن مرحلہ تھا۔

ابولہب چونکہ سگا چچا تھا۔ اپنے یتیم بھتیجے کی مدد نہیں کر سکتا تھا تو کم از کم اتنے بڑے ظلم کی بھی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنا تھا۔ اپنوں کے لگائے گئے زخم کچھ زیادہ ہی گھائل کرتے ہیں۔ صبر اور شکر کے ساتھ یہ وار بھی برداشت کر لیا۔

مخالفین کو جس ردِعمل کی توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ وہ تو بنو ہاشم کو خون میں لت پت دیکھ

Marfat.com

رہے تھے، مگر آپؐ کی فراست اس مرحلے پر بھی مخالفین کا منہ چڑا رہی تھی۔

بعدازاں سورہ لہب میں اللہ تعالیٰ نے اس خبیث چچا کی خوب خبر لی جس کی تفصیلات ہم ثقافتی باب میں عرض کریں گے۔

———(((اللہ اکبر)))———

حضور ﷺ کی تیسری بیٹی زینبؓ تھیں۔ سیدہ زینبؓ ابو عاص بن ربیع کے نکاح میں تھیں۔ عاص ہالہ بنت خویلد کا بیٹا تھا جو سیدہ خدیجہؓ کی سگی بہن تھی۔ اس لحاظ سے عاص بن ربیع حضرت خدیجہؓ کے سگے بھانجے تھے۔

مشرکین کا ایک وفد اس کے پاس گیا کہ [14] وہ سیدہ زینبؓ کو طلاق دے دے۔ اس کے بدلے قریش کی جس لڑکی پر ہاتھ رکھے، اس کے نکاح میں دے دی جائے گی۔

ابو العاص اگرچہ سیدہ خدیجہؓ کے بہت قریب تھا۔ ان کا بھانجا اور بڑا داماد تھا۔ آپؓ اسے بیٹوں کی طرح پیار کرتی تھیں۔ سیدہ زینبؓ تو والدہ محترمہ کے ساتھ ہی حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکی تھیں جبکہ ان کا خاوند ابو العاص ابھی تک مشرکانہ دین پر قائم تھا۔

یاد رہے ان دنوں ابھی مشرک و مسلمان کے نکاح کی ممانعت نہیں آئی تھی۔ ویسے بھی آپؐ کی یہ تینوں بیٹیاں آپؐ کے منصب رسالت پر سرفراز ہونے سے پہلے بیاہی جا چکی تھیں۔

دشمنان دین تو اپنی سی کر گزرے تھے۔ پہلے دو دخترانِ رسول کو طلاق دلوا کر ان کے سینے ٹھنڈے نہیں ہوئے۔ دلوں کی بھڑاس نہیں نکلی، اب بڑی بیٹی سیدہ زینبؓ کو طلاق دلوانے کے درپے ہو گئے۔

مگر میں شکر گزار ہوں حضرت ابو العاصؓ کا جس نے طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مشرکین کو دو ٹوک جواب دیا۔ ''خدا کی قسم سیدہ زینبؓ ایک بہترین بیوی ہے میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔''

اگرچہ اسلام دشمنی میں وہ بھی ان کا ہمنوا تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی نیکی تھی۔ اسلامی تحریک پر، بہت بڑا احسان تھا۔ شاید اس کی اس نیکی کی وجہ ہی سے اللہ تعالیٰ نے اسے چند سال بعد ہدایت سے سرفراز فرما دیا۔

یہ کتنی بھونڈی گھٹیا اور کمینی کارروائیاں تھیں۔ کتنی نیچ اور ذلیل حرکتیں تھیں جو بانیٔ اسلامؐ کے خلاف عمل میں لائی جا رہی تھیں۔ کتنا زبردست خاندانی دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ کیسے کیسے نفسیاتی اور نجی حملے کیے جا رہے تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس کے مقابلہ میں کوئی جارحانہ قدم اٹھایا جاتا۔

Marfat.com

یہ نہیں کہ رسول اللہ کوئی جارحانہ قدم اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ ادھر تو صرف ہاتھ اُٹھانے کی دیر تھی کہ خدا کا غضب وقہر مشرکین تو کیا پورے عرب کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا۔

آفرین ہے ہر چیز پر قادر ہونے کے باوجود نبی رحمتؐ نے کبھی انتقام لینا تو دور کی بات ہے اس لیول پر جا کر کبھی سوچا تک بھی نہیں۔ ہر دکھ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔ کبھی اپنی ذات یا نجی مفاد کو مقاصد پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

ان پر ہزاروں لاکھوں درود و سلام۔

——(((اللہ اکبر)))——

سگے چچا ابولہب کے خاندان نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ ابولہب کی بیوی اُم جمیل نوکروں سے خاردار جھاڑیاں اکٹھا کرواتی اور رسول اللہؐ کے دروازے میں پھینک دیتی۔ اللہ کے نبیؐ یا اس کے اہل خانہ میں سے کوئی گھر سے باہر قدم رکھتا تو ان کانٹوں میں اُلجھ جاتا۔

وہ بی جمالو قریش کی دوسری عورتوں[15] کے ساتھ مل کر تمسخر اڑاتی اور ہاتھ نچا نچا کر باتیں بناتی۔ شہر کے اوباش لڑکوں کو بلا کر اس بے جمالو نے پتھر مار مار کر آپؐ کے گھر کی کھڑکیاں توڑ دیں جو مجبوراً آپؐ کو بند کرنا پڑیں۔

اسی دلگر کا بیٹا عتبہ جو کہ حضورؐ کا سابقہ داماد تھا۔ اس نے ایک دن راستے میں اچانک ملنے پر حضور ﷺ کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اللہ کے نبیؐ انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ سنتے رہے۔ بدتمیزی کی حدیں پھلانگتے ہوئے عتبہ نے حضورؐ کے منہ پر تھوکنے کی جسارت کی۔ وہ تھوک عتبہ کے اپنے چہرے پر آ گری۔

انسانی فطرت تو کچھ اور ہی تقاضا کر رہی تھی، مگر اللہ کے نبیؐ نے صرف اتنا کہا: اے میرے خدا اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کر دے، حالانکہ رحمتِ عالمؐ نے اجتماعی یا انفرادی بدعا سے پرہیز ہی کیا، لیکن یہ ناہنجار اپنا تھا جو یہ لفظ منہ سے نکل گئے۔

انھیں دنوں عتبہ اپنے والد ابولہب کے ساتھ شام کے سفر پر نکلا۔ ابولہب کو پورا یقین تھا کہ محمد ﷺ کی زبان سے نکلا ہوا لفظ کھارے نہیں جا سکتا۔

مکہ کی سرد جنگ میں رسالت مآبؐ کی یہی بہت بڑی کامیابی تھی کہ مخالفین کی شخصیتیں تضاد کا شکار ہو گئیں۔ وہ اندر سے سچائی کو مانتے تھے، مگر جھوٹی انا اور لہولعب کی وجہ سے مخالفت پر اڑے ہوئے تھے۔

راستے میں پڑاؤ کیا جاتا تو اہلِ قافلہ دیکھتے کہ رات کو درندے آتے ہیں۔ صورتحال کو

Marfat.com

بھانپتے ہوئے ابولہب نے اہلِ قافلہ سے درخواست کی میرے بیٹے کی حفاظت کی جائے۔ مجھے محمدؐ کی بددعا کا ڈر ہے۔ سفر کی اگلی رات پڑاؤ کیا گیا تو اہل قافلہ نے اپنے تمام اونٹ عتبہ کے گرد بٹھا کر درمیان میں اس کا بستر لگا دیا۔

ان دنوں یہ خیال عام تھا جہاں اونٹ موجود ہوں، وہاں جنگلی درندہ حملہ نہیں کرتا۔

اسی رات ایک شیر آیا۔ اونٹوں میں سے گزر کر عتبہ کو چیر پھاڑ دیا اور کچھ حصے کھا کر واپس چلا گیا۔ کل تک دُخترانِ رسول کو طلاق دلوانے والا قاسمؓ اور عبداللہ بن محمدؐ کی وفات پر خوشیاں منانے والا آج اپنے بیٹے کو بے گور و کفن چھوڑ کر گدھے کی طرح سر پر سینگ رکھ کے اپنی جان کے خوف سے بھاگ گیا۔

خانے میں ذرہ برابر بھی عقل ہوتی تو اس زندہ و جاوید معجزہ سے عبرت پکڑتا اور سیدھا رسول اللہؐ کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لیتا۔ اس نے حضورؐ کو "ابتر" جڑ کٹا کہا تھا۔ جس کے جواب میں قرآن نے پیش گوئی کی تھی کہ "تمھارے دشمن ہی جڑ کٹے رہیں گے۔" یہ اس پیش گوئی کا پہلا اشارہ تھا عقلمندوں کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ زبردست تازیانہ گدھے کو سدھارنے کے لیے بھی کافی ہوتا ہے، مگر حیف صد حیف! کہ یہ لوگ اپنی کمینگی سے باز نہ آئے۔

جمیلہ بیگم یہ خبر سن کر اور بھی دو آتشہ ہو گئی۔ دونوں میاں بیوی اسلام دشمنی میں بہت آگے نکل گئے۔ کمینگی کی تمام حدیں عبور کر گئے۔ دن رات، ہر جگہ، ہر وقت، ہر محفل میں اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے رسالت مآبؐ کے خلاف ہجو گوئی میں مصروف رہتے۔

——(((الہٰہ الکہیم)))——

بہت ہو چکی۔ اب مزید سنتے رہنا تحریک کے لیے خودکشی کے مترادف تھا۔ رسولِ رحمتؐ تو ابھی صبر کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، مگر ذاتِ خداوندی نے سورہ لہب کی صورت میں خود جواب دیا۔ ان کے کرداروں کی ایسی فصیح و بلیغ تصویر کشی کی کہ قیامت تک ان کی مکروہ تصویریں قرآن کے آئینے میں محفوظ کر دیں۔

اس سورہ پر ادبی لحاظ سے غور کریں تو ایسے لگتا ہے کہ لفظی نسبت سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ ابولہب کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا۔ اس کا چہرہ انتہائی سرخ و سپید، بلکہ شعلہ نما سرخی مائل تھا۔

عربی میں لہب شعلے کو کہتے ہیں۔ اس لیے لوگ اسے ابولہب یعنی شعلہ بار چہرے والا یا شعلے والا کے نام سے پکارنے لگے۔ وہ مکہ کے ان پانچ امراء میں شامل تھا جن کے پاس سونے چاندی کے ذخائر تھے۔ اس کا مکہ میں نہایت خوبصورت دو منزلہ بنگلہ تھا۔ متعدد نوکر چاکر خدمت کے لیے

Marfat.com

ہر وقت حاضر رہتے۔

اس کی بیوی مکہ کے ایک سردار ابوسفیان کی سگی بہن تھی۔ خاندانی اثر ورسوخ اور شوہر کے مال کی وجہ سے بڑا اتراتی تھی۔ دونوں میاں بیوی نہایت گھٹیا فطرت کے مالک تھے۔ غرور، تکبر، ہوس، حسد، زر پرستی فتنہ پردازی اور غیبت خوری ان کا خاصہ تھا۔ دونوں میں پرلے درجے کا اوچھا پن تھا۔

ابولہب ریشمی فرغل پہن کر مکہ کی گلیوں بازاروں میں اترا اترا کر چلتا۔ غرور اتنا تھا کہ اپنے آپ کو عرب کا قیصر وکسریٰ خیال کرتا۔ پرلے درجے کا بزدل، مگر جذباتی تھا۔ کبھی کسی لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔ ہاں لڑائی کرانے میں دونوں میاں بیوی بڑے طاق تھے۔

لوگوں کو ان کی یہ حرکتیں ایک آنکھ نہ بھاتیں تھیں۔ پیٹھ پیچھے اکثر لوگ انھیں بُرا بھلا کہتے۔ اس پر کعبہ سے سونے کا ہرن چرانے کا الزام بھی لگا۔ پرلے درجے کا کنجوس مکھی چوس تھا۔

بڑے میاں تو بڑے میاں بڑے میاں کی جورو حکم کی گولی، بیگم صاحبہ لگائی بجھائی کرنے کی بڑی ماہر تھی۔ مکہ کی عورتوں کے اکثر جھگڑوں میں اسی کا ہاتھ ہوتا۔

یہ وہ شخص ہے جو حضورؐ کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہے۔ اعلانِ نبوت پر سب سے پہلے اسی نے زبان کھولی اور زندگی کے آخری سانس تک دین کی مخالفت کرتا رہا۔ حضورؐ کا ہمسایہ تھا، مگر رسولِ رحمتؐ نے اسے سب سے بُرا ہمسایہ قرار دیا۔ بانیِ اسلام کو جو جو تکالیف اس گھر نے پہنچائیں، تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

بالآخر اللہ وحدہٗ لاشریک کی ذات نے اس خاندان کی سورہ لہب کے ذریعہ وہ گوشمالی کی کہ پورا مکہ عش عش کر اٹھا۔ آیئے سورہ لہب سے سکونِ دل کا سامان کر کے دیکھیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ٥

مفہوم:۔ ابولہب ہلاک ہو گیا اس کے ہاتھ کٹ گئے۔

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ٥

مفہوم:۔ اس کا کمایا ہوا مال بھی اس کے کام نہ آسکا۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ٥

مفہوم:۔ عنقریب وہ شعلے مارتی آگ میں پھینکا جائے گا۔

وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ٥

مفہوم:۔ اس کی بیوی تو لکڑہارن ہے۔

Marfat.com

فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝

مفہوم: اس کے گلے میں مونج کا رسہ ہوگا۔

———(((اللہ اکبر)))———

قارئین یہ قرآن کی واحد سورۃ ہے جو کسی شخص یا خاندان کی ہجو پر مشتمل ہے۔ دراصل ابولہب کا تکیہ کلام تھا فلاں ہلاک ہوگیا۔ جا ہلاک ہو۔ یا ہلاک ہو جاؤ۔ یہ تکبر اور نخوت کا نشان تھا۔

کوہِ صفا پر جب اعلان نبوتؐ فرمایا گیا تو سب سے پہلے ابولہب ہی چیخا ''محمدؐ تم ہلاک ہو جاؤ (نعوذ باللہ) کیا تم نے اسی لیے بلایا تھا۔'' سورۃ لہب کی پہلی آیت اس کے تکیہ کلام کی طرف ایک طرح کی نسبت بھی ہے۔ صرف یہی نہیں یہ اس کی تباہی بربادی کی طرف ایک سچی پیش گوئی بھی ہے۔ پھر واضح کر دیا گیا کہ اسے جس مال و دولت یا سونے چاندی پر فخر ہے، وہ اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔

یہ پیش گوئی ایک کھلی حقیقت بن کر سامنے آ گئی اسلام کی[16] مخالفت کے چند سال بعد سن 2 ہجری میں جب غزوہ بدر شروع ہوا تو ابولہب ایسی ناکامی سے دوچار ہوا جو انتہائی عبرتناک تھی۔ اسلام کی مخالفت کرنے والے اس کے اکثر و بیشتر ساتھی مارے گئے۔ شکست فاش کی خبر نے اسے اتنا پریشان کیا کہ سات دن سے زیادہ زندگی کا بوجھ نہ سہار سکا۔

اسے ایسی موذی بیماری لاحق ہوئی جسے عدسہ Malignant pustule کہا جاتا ہے۔ یہ طاعون سے ملتی جلتی ہے۔ تاریخ میں اس کی کافی وبا رہی۔ یہ چھوت کی بیماری تھی۔ اس کے گھر والوں نے اسے چھوڑ دیا۔ موت کے بعد بھی تین دن تک کوئی قریب نہ پھٹکا۔ جب لوگوں نے اس کی اولاد کو مطعون کیا تو انھوں نے حبشیوں کو مزدوری دے کر لاش اُٹھوائی۔ ان مزدوروں نے ایک گڑھا کھودا اور لکڑیوں کی مدد سے بغیر کفن دفن کے لاش دھکیل کر گڑھے میں گرا دی۔ اوپر پتھر اور مٹی ڈال دی۔

یوں یہ بات سچ ثابت ہوگئی ابولہب ہلاک ہوگیا اور اس کے مال و زر سے اسے کفن دفن تک نہ مل سکا۔ اس کی دولت اس کے کسی کام نہ آئی۔ دوسرا اس نے جس اسلام کی مخالفت میں دن رات ایک کیا ہوا تھا، اس کی اولاد تک اس کے مشن کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوگئی۔ اس کی بیٹی درہؓ خود مدینے پہنچی اور اسلام لائی۔ اس کے بیٹے عتبہ اور مُعتبؓ نے فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کر لیا۔

اگلی آیت وہ شعلے مارتی ہوئی آگ میں پھینکا جائے گا میں بھی اس کے شعلہ بار سرخ و سپید چہرے سے نسبت دی گئی ہے۔ اسے شعلہ بار چہرے پر ناز تھا۔ ابولہب اس کی کنیت بھی تھی۔ اسی

Marfat.com

رعایت ومناسبت سے اسے شعلے مارتی ہوئی آگ میں دھکیلا جائے گا۔

اہل مکہ بڑے سخن شناس تھے۔انھوں نے اس ادبی رعایت ومناسبت سے بڑا لطف اُٹھایا ہو گا۔اس سورۃ میں دونوں میاں بیوی کے لیے جو چھبن رکھی گئی ہے یقیناً ان واقعات کے پیش نظر رکھی گئی ہے جس سے اللہ کے رسول مسلسل درد محسوس کرتے رہے۔

بی بی ہے جمالو کی تو سپیشل خبر لی گئی۔وہ لگائی بجھائی کی ماہر تھی۔بڑے ہاتھ نچا نچا کر پکے اور کرارے لہجے میں گھروڑ گھروڑ کر باتیں کرتی تھی۔

لکڑہارن کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ کانٹے دار [17] لکڑیاں اکٹھی کروا کے حضورؐ کے راستے میں پھینکتی تھی۔

اس کے گلے کے قیمتی ہار سے یوں رعایت ونسب پیدا کی گئی کہ اس کے گلے میں مونج کا رسہ ہو گا۔

یہ اتنی منہ پھٹ اور زبان دراز تھی کوئی اس کے منہ نہیں لگتا تھا۔جس کے پیچھے پڑتی، بس چھکے چھڑا دیتی۔بات کرتی تو بار بار اپنے گلے کے ہار کو چھیڑتی۔بڑے دماغ سے کڑوی ترشی بولتی جاتی، کسی کی نہ سنتی۔قریش کی تمام عورتوں کو اس کے اوچھے پن سے بڑی الرجی تھی۔وہ دل ہی دل میں اس سے جلتی اور پیٹھ پیچھے خوب مذاق اڑاتیں۔

کئی دلوں میں اس کی ہجو گوئی کے کانٹے چبھے ہوئے تھے۔اس کے زہریلے الفاظ زہر بجھے تیروں کی طرح پیوست تھے، مگر معاشرتی زیر و بم کے ہاتھوں مجبور تھے۔کوئی جواب نہ دے سکے۔ سورہ لہب کو سنتے ہی وہ اس بی بی جمالو کو ہے ہے جمالو واہ واہ جمالو کہتے ہوں گے اس سورہ کو سنتے ہی خوشیوں سے ان کا دامن بھر گیا ہوگا۔وہ سمجھے ہونگے کہ ان کا انتقام لے لیا گیا۔

جہاں باقی لوگ خوش ہو رہے تھے۔وہاں ابولہب اور اس کے خاندان نے ہاہاکار مچا رکھی تھی، باوجود اس کے کہ باقی لوگ بھی ابولہب کی طرح دین کے مخالف تھے، لیکن یہ نیا اندازِ خطاب و بیان دیکھ کر عش عش کر اُٹھے۔کوئی کہتا ہوگا واہ محمد ﷺ واہ تیرے کیا کہنے۔آپؐ ہمارے باپ دادا کے دین کے مخالف ہی سہی، مگر تمھاری باتیں بڑی زبردست ہوتی ہیں۔واہ بھئی واہ مزہ آ گیا۔سننے کا مول پورا ہو گیا۔

ایک کہتا ہوگا۔دیکھا اپنے ہی بھتیجےؐ کے ہاتھوں کتنا خجل ہو رہا ہے تو یقیناً دوسرا کہتا ہوگا بھتیجےؐ کے ساتھ اس نے کونسی نیکی کی ہے۔بہرحال یہ سب کچھ دینِ اسلام سے دشمنی کی وجہ سے تھا۔

مزے کی بات ہے لوگ ابولہب اور اس کی بیوی کی طرف سے کی جانے والی اذیت رسانی

کو واجبی یا ان کا خاندانی معاملہ سمجھتے تھے۔ اب جبکہ دونوں میاں بیوی کا سب کچھ پھول کے رکھ دیا گیا تو بھی لوگوں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، بلکہ کئی سیانوں نے اپنے نوجوانوں کو اس لیے کوئی قدم اُٹھانے سے منع کر دیا کہ جو کچھ ابولہب کر تا رہا ہے، اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا۔

مرد تو ایک طرف خواتین کی محفلوں میں حبل من مسد نے خوب رس گھولا، ابوجہل کا یہ پروپیگنڈہ کہ حجابت سقایت رفادت اور نبوت سب کچھ بنوہاشم کے پاس چلا جائے تو باقی قبائل کے پاس کیا رہ جاتا ہے، اس کے برعکس سورہ لہب نے ابولہب کی گوشمالی کر کے یہ بات ثابت کر دی کہ یہاں مسئلہ قبائلی یا خاندانی مفادات کا نہیں، یہاں تو انسانیت کی نجات کا مسئلہ درپیش ہے۔

سرد جنگ کے حوالے سے یہ بہت سی اُلجھنوں کا حل تھا۔ مکہ جیسے معاشرے میں کسی بڑی شخصیت کو اتنی کھری سنانے کی کوئی جرأت نہیں کرتا۔ مظلومیت اور مخالفت کے جھرمٹ میں گھر کر اتنی جرأت کرنا نفسیاتی جرأتوں کو اُبھارنے کے مترادف ہوتا ہے۔

عام لوگ جو تحریک کے ہم خیال تو ہوتے ہیں، مگر خاندانی دباؤ، خوف یا ڈر کی وجہ سے گومگو کی حالت میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اس قسم کے موقعوں پر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیا واقعی بانی تحریک کو کسی طاقتور اور زبردست کی حمایت حاصل ہے۔ کس کی شہہ پر یہ شخص اتنی جرأت کا مظاہرہ کر رہا ہے، یوں وہ لوگ جو بے یقینی کی حالت میں پڑے ہوتے ہیں، یکدم فیصلے پر پہنچ کر تحریک کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔

اور تحریکی کارکن جن کے اعصاب طوالتِ جہد کی وجہ سے دباؤ محسوس کر رہے ہوتے ہیں، ایک بار پھر تازہ دم اور جوان جذبوں کے ساتھ تحریک سے منسلک ہو جاتے ہیں۔

—(((الحمد للہ)))—

حواشی:

1- اس وفد میں (1) ابوجہل، (2) ابوسفیان (3) عاص بن وائل (4) نبیہ بن حجاج (5) منبہ بن حجاج (6) اسود بن مطلب (7) عاص بن ہشام (8) ولید بن مغیرہ۔ سیرت سرور عالم جلد دوم صفحہ 512 انوار القرآن جلد دوم صفحہ 599 زمانہ نزول سورہ "ص"۔ سیرت ابنِ ہشام جلد اول اور سیرت النبی جلد اول طبری البدایہ والنہائیہ۔

2- سیرت سرور عالم جلد دوم صفحہ 522 بروایت امام بخاری ابنِ ہشام طبری بیہقی اور بلاذری میں یہ تھوڑے سے اضافہ کے ساتھ نقل ہوا ہے۔

Marfat.com

-3 سیرت سرورعالم جلد دوم بحوالہ ابن ہشام جلد دوم طبری بیہقی اور بلاذری۔

-4 یہ ابوجہل کی کنیت تھی۔

-5 ابوعمارہ حضرت حمزہؓ کی کنیت تھی۔

-6 سیرت النبی اول صفحہ 141-142 ابنِ ہشام جلد اول۔

-7 ابوعمارہ حضرت حمزہ کی کنیت تھی۔

-8 مشرکین اپنے باپ دادا کے دین سے پھر جانے والے کو "صابی" کہتے تھے۔

-9 اصابہ: حافظ ابن حجر عسقلانی۔

-10 سیرت سرورعالم جلد دوم، ابن ہشام جلد دوم تاریخ طبری وغیرہ۔

-11 سیرت سرورعالم جلد دوم، ابن ہشام جلد اول اس کے علاوہ تاریخ طبری، ابنِ سعد اور ابن کثیر نے بھی اس واقعہ کو تفصیلاً لکھا ہے۔

-12 سیرت ابن ہشام جلد اول، سیرت سرورعالمؐ جلد دوم۔

-13 سیرت ابنِ ہشام جلد اول، سیرت النبی جلد اول، سرورعالم جلد دوم

-14 سیرت سرورعالم جلد دوم صفحہ 527 بحوالہ بلاذری۔ انساب الاشراف

-15 سرورعالم جلد دوم ابنِ ہشام جلد اول۔

-16 سیرت سرورعالم جلد دوم

-17 ابن ہشام جلد اول

Marfat.com

حصہ دوم

Marfat.com

باب:7

ثقافتی محاذ

عرب کلمہ طیبہ کے حصار میں

انقلاب برپا کرنے کا بنیادی اصول ہی یہی ہے کہ تحریک کے منشور اور اس کی بانی شخصیت کا لگاتار چرچا کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کسی مختصر اور سحر آگیں نعرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مختصر اور سحر آگیں نعرہ جو ہر خاص و عام کی زبان پر ورد بن کر تحریکی نشر و اشاعت کا کام دے سکے۔ جو الفاظ میں مختصر اور انداز بیان میں آسان ہو۔

مکہ میں برپا ہونے والی تحریک اسلامی کا مقصد و نصب العین خدا کی واحدانیت کو زندہ کرنا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو منوانا تھا۔ محمد ﷺ کی شخصیت اور کردار کے تو سبھی واقف تھے، رسالت والی بات قدرے نئی اور انوکھی تھی۔ خدا کی واحدانیت کا تصور بھی قریب قریب گم ہو چکا تھا۔

اللہ اور رسول دونوں مکہ کی سوسائٹی میں انوکھی باتیں تھیں۔ تحریکی تقسیم میں ایک "مقصد" اور دوسرا "کردار" تھا۔ ایک نصب العین اور دوسرا شخصیت۔ ایک منشور اور دوسرا منصب تھا۔

مکہ جیسی بے راہ رو معاشرت میں توحید و رسالت بالکل نئی بات تھی۔ اس نئی چیز کو پیش کرنے کے لیے کسی پیش لفظ یا کسی نعرے کی ضرورت تھی۔ ایسا نعرہ جو توحید و رسالت دونوں کا مظہر ہو۔ جو منشور اور شخصیت کا عکاس ہو۔ جس کی ابتداء ہی فرسودہ اور باطن نظریات کی نفی سے ہو۔ جس میں حلاوت آگینی کا سرایت کر جانے والا تاثر ہو۔ جو عوام الناس کے کرب و مسائل کی علامت بن سکے۔ ایک عام آدمی سنتے ہی محسوس کرے، گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔ جو تحریک کے لیے نشان یا سمبل بن سکے۔

Marfat.com

حضور ﷺ نے انقلاب کے عملی پہلوؤں کی تکمیل کے لیے ایک انتہائی حلاوت آگیں اور سحر آفریں پیش لفظ یا نعرہ پیش کیا جو ایک نعرہ بھی ہے اور ایک کلمہ بھی۔ تحریک کا منشور بھی ہے اور شخصیت کا مظہر بھی۔ توحید کا پرچار بھی ہے اور رسالت کا تعارف بھی، کلمہ طیب ایک عظیم الشان تحریکی و تنظیمی نعرہ بھی ہے اور توحید و رسالت کا اقرار بھی۔

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

مفہوم: اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ یعنی اللہ سے سب کچھ ہونے کا یقین اور مخلوق سے کچھ نہ ہونے کا یقین محمد رسول اللہ کی اتباع اور ان کے طریقوں میں دونوں جہانوں کی کامیابی کا یقین۔

جو لوگ پیدائش سے اس کلمے سے مانوس ہیں، ان کے لیے اس نعرے کی تاثیر اور اس میں موجود توحید کی تبلیغ، رسالت کا تعارف، نصب العین اور شخصیت کا امتزاج اس کی عوامیت کا بھرپور تاثر اور انقلاب آفرینی کا اندازہ کرنا قدرے مشکل ہے۔

مگر جب یہ نعرہ پہلی بار مشرکینِ مکہ کے سامنے بلند کیا گیا، ان کے رگ و ریشے میں دوڑتا شرک و بدعت سے بالیدہ خون بھڑک اُٹھا۔ اسے سنتے ہی پورا مکہ چیخ اُٹھا۔ پوری سرزمینِ مکہ شعلہ بار ہوگئی۔ شرک، گمراہی، جہالت اور جھوٹی نخوتوں کے بت گرنے لگے۔

آج تک ان کی بدعتوں اور گناہ کشیدہ معاشرت کے خلاف بلند ہونے والا کوئی نعرہ ایجاد ہوا ہی نہیں تھا۔ کسی نے اس سے پہلے اس قسم کی آواز سنی ہی نہ تھی۔ یہ بالکل نئے الفاظ تھے۔ یکسر اجنبی تنقید تھی۔ بالکل نیا اسلوب اور اندازِ بیان تھا۔

ساری کی ساری عقلمندیاں، ساری کی ساری سرداریاں، دانشیں، اس نعرے کے نئے آہنگ کی وسعتوں میں کھو گئیں۔ جھوٹی نخوتوں اور جھوٹے وقار کے بڑے بڑے مہادیو بڑے بڑے ہر ہر مہادیو، بڑے بڑے پورن بھگت، بڑے بڑے تاج محل اور لال قلعے اس نعرے کی تاب نہ لا سکے۔

لات و عزیٰ کا دین دم توڑنے لگا۔ ابولہبوں اور ابوجہلوں کی کمزور شخصیتیں اللہ اور محمدؐ کے بھنور میں پھنس کر ڈوبنے لگیں۔ سکوں کوش اور سہل مزاج اور بے عملے اور بے فکرے اس تجویز سے پریشان نظر آنے لگے۔ اس کی قبولیت سے گریز پا ہوئے۔ ماحول اور ثقافت کے ماہرین اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

Marfat.com

الختصراس کلمے میں ایک انقلابی تحریک کو ہوا دیکر کامیابی تک پہنچانے کی تمام خوبیاں اور عوامل موجود ہیں۔

———(((اللہ اکبر)))———

آج جبکہ پروپیگنڈہ باقاعدہ عسکری علم (Miltiry Science) میں بدل چکا ہے۔اس علم کی روشنی میں اس کلمے کا فنی اور عقلی جائزہ لیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ آج سے چودہ صدیاں پہلے ریگزار عرب کی بھکی بھکی دنیا میں پرورش پانے والے ایک یتیم ولاوارث اور امّی یعنی ان پڑھ نبیؑ نے کلمہ طیب جیسا دلچسپ سادہ پرتاثیر اور جذباتی نعرہ کیسے پیش کردیا۔ یہ نعرہ بذات خود رسولِ امّی ﷺ کا زندہ وجاوید معجزہ ہے۔اس میں ساری کی ساری تحریکی سچائی اور حقانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔اس میں نبی کی غیر جانبداری یعنی تحریکی کام کرنے کی مجبوری بھی موجود ہے اور خدا کے برتر حکم کے لیے رسول عربی کی تابع فرمانی بھی۔ یہ صرف نعرہ ہی نہیں، نشرواشاعت کا آسان اسلوب بھی ہے اور تحریکی شیڈول بھی۔ یہ تحریک کا منشور ودیباچہ بھی ہے۔تربیتی لحاظ سے اپنے کارکنان کو باقی معاشرے سے ممتاز کرنے والا میڈیا بھی۔

اسے سنتے ہی پورا مکہ حواس کھو کر مخالفت پر اتر آیا، مگر اس کے صوتی اثرات کے سامنے کسی کی ایک نہ چلی۔تمام مخالفین بس پیچ وتاب ہی کھاتے رہے۔زندگی بھر مشرکین اس کلمے کے خلاف بے ڈھنگی اور ناکام منصوبہ بندی کرتے رہے، مگر اس کی دلکشی اور سحر آفرینی کا توڑ نہ لاسکے۔

آیئے اس کلمے کے صوتی اور معنوی اثرات کا جائزہ ہو جائے۔اس کلمے میں لفظوں کی کل تعداد سات ہے۔ہر لفظ ترتیب وترکیب اور معنوی لحاظ سے اپنی جگہ اہم ہے۔

1- پہلے ہی لفظ میں بغیر کسی تمہیدی الجھن کے ہر چیز کی صاف صاف نفی ہو جاتی ہے۔لفظ "لا" کا حرف الف ارتعاش سا پیدا کر کے آواز کے ردم کو لمبا کر دیتا ہے۔بولنے والے کا سانس رک سا جاتا ہے۔ایسے لگتا ہے انسان کو کسی چیز نے پکڑ لیا ہے۔انسان کی قوت اختیار لاشعوری طور پر بے وزن اور بے معنی سی ہونے لگتی ہے، لیکن جب تحریکی اور تنظیمی میدان میں یہ لفظ بطور نعرہ بلند کیا جاتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے انسان کی نخوت، غرور حسب ونسب، چودھر، خاندانی اعزار معاشرتی برتری اس شدت کی نفی میں گم ہو گیا ہے۔تمام موجودات فنا فی اللہ ہو گئے ہیں۔انسان کی دنیا جیسے پیدائش سے پہلے تنہا اور ہر چیز سے بے واسطہ تھی، ویسے ہی محدود اور تیرہ وتار ہو گئی ہے۔

2-اس کلمے کا دوسرا لفظ "الہ" ہے جس کے لفظی معنی معبود کے ہیں۔پہلے ہر چیز کی نفی تھی، مگر

Marfat.com

ابہام سا موجود تھا۔اب انسان کی مکرم ومحترم ہستیاں جن کو اس نے معبود بنایا ہوا ہے، ان سب کی تنسیخ ہے۔الف کے نیچے زیر اور لام کے اوپر کھڑی زبر نے لفظ کے ردم اور سانس دونوں کو کھینچ لیا ہے اور ہا کے اوپر زبر نے کسی زبردست کا تجس سا ابھار دیا ہے معبودوں کی نفی کے ساتھ ساتھ کسی ایک کی تلاش کا تاثر سا پیدا ہو جاتا ہے اور اس لفظ پر پہنچ کر انسان لاشعوری طور پر بے نیاز سا ہو جاتا ہے۔سینکڑوں ہزاروں خداؤں۔ان کی آڑ میں سروں پر بندھی جھوٹی انا اور اونچ نیچ کی مظہر پگڑیوں سے بے خوفی کا تاثر ابھرتا ہے۔

3۔اس کلمے کا تیسرا لفظ ''الا'' ہے جس کے معنی ''سوا'' یا سوائے یا ''ماسوا'' کے ہیں۔اب پیچھے والی مجمل اور مبہم سی کیفیت ختم ہو رہی ہے۔نفی ہو جانے کے بعد لام پر موجود شد اور زبر نے کسی شدت کو جنم دیا۔ایسے محسوس ہوتا ہے، نہیں کوئی نہیں، مگر ہے۔پتا نہیں کون ہے۔بھرپور تجس اور انتظار کا تاثر۔ہاں انتظار کرو، پردہ اٹھنے والا ہے۔پردہ اٹھ گیا تو سب کچھ سامنے آجائے گا۔پہلے مایوسی، کم مائیگی اور بے نیازی کے احساس نے جنم لیا تھا۔اب وہی مایوسی کسی امید کا پیش خیمہ نظر آرہی ہے۔الا یعنی ماسوا اعصاب پر سوار ہو کر تصورات میں لے جاتا ہے۔کون ہے، کوئی ہے والی کیفیت شدید ہوتی جاتی ہے تو......

4۔اللہ کا لفظ انسان کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتا ہے۔نفی، انکار، مایوسی، انتظار سب کچھ ختم۔ایک عظیم المرتبت ہستی کا وجود انسانی اعتقاد و نظریہ کو صرف ایک نقطے ''اللہ'' پر مرکوز کر دیتا ہے۔ایک نئی تحریک کو جنم دیتا ہے ماحول سے یکسر مختلف ہستی کو متعارف کرواتا ہے۔

5۔پانچواں لفظ ''محمدؐ'' تو جانا پہچانا ہے فضا حسب معمول ہو جاتی ہے۔پہلے والا لفظ تو اجنبی اور نامانوس تھا، مگر محمدؐ کو سارے کہنے سننے والے جانتے ہیں۔اجنبیت ختم اور دل میں خفیف سے احساس اپنائیت نے جنم لیا۔پہلے والی ہستی تو ان دیکھی اور ماوراء عقل ہے۔مگر محمدؐ تو انھیں میں سے، اسی شہر کے رہنے والے، انھیں کی طرح چلنے پھرنے والے اور حرکات و سکنات کرنے والے ہیں۔

6۔رسول:۔ چھٹا لفظ رسول۔محمدؐ کے منصبِ رسالت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔تعارف کے بعد تحریکی اور تنظیمی منصب کا مرحلہ ہے اب محمد رسولؐ کہنے والے کا ذہن خود بخود اللہ کے رسول کے کام کی طرف مڑ جاتا ہے۔

7۔اس نعرے کا ساتواں لفظ ''اللہ'' ہے کلمے میں موجود چوتھا لفظ اللہ تو خالقِ حقیقی کی معبودیت کے اظہار کے لیے تھا۔یہ آخری لفظ اللہ چونکہ لفظ رسول کے بعد آیا ہے اس لیے یہ

رسالت کے کام کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی محمدؐ کی رسالت کا کام اللہ کے احکامات کی روشنی میں ہوگا۔ اللہ کا حکم محمدؐ کی تحریک ہوگی اور محمدؐ کی اطاعت اللہ کے حکم کی بجا آوری ہوگی۔

———(((اللہ اکبر)))———

یوں اس کلمے نے معاشرے میں رائج تمام کے تمام نظام کو باطل قرار دے دیا۔ مشرکینِ مکہ جو لات منات اور عزیٰ کو اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس ملحدانہ تصور کو ختم کر کے بتایا گیا کہ اللہ سے اگر کسی کا رابطہ ہوسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ کی ذات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عظیم منصب رسالت پر سرفراز کیا ہے۔

اس طرح یہ کلمہ تاثیر و اثرات کے لحاظ سے یکتا اور منفرد ہے۔ پورے کا پورا نظام دعوت و فکر اس میں سما گیا ہے۔

قارئین اگر کلمے کے پہلے لفظ "لا"[1] سے چوتھے لفظ اللہ تک اور کلمے کے چوتھے لفظ اللہ سے آخری لفظ اللہ تک خط کھینچیں تو ایک قوس سی بن جاتی ہے گویا جب پورا کلمہ ادا کیا جائے تو ادا کرنے والا اس کے حصار میں آ جاتا ہے اگر وہ ہدایت طلب ہے تو ایک لطیف احساسِ تمکنت اور سکون محسوس کرتا ہے۔ اگر شقی القلب ہے تو اس کے حصار میں آتے ہی "طائرِ دام" کی طرح تڑپنے پھڑکنے لگتا ہے۔

اس میں موجود نشریاتی و اشاعتی تکنیک بھی ہے اور معنی آفرینی اور اثر آفرینی بھی۔ یہ نصب العین کا امین بھی ہے اور تحریک کا مظہر بھی۔ یہ مخالفوں کے باطل نظریات کی نفی بھی کرتا ہے اور کارکنوں کے لیے کامیابی کی نوید بھی سناتا ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اکثر نعرے ایسے ہوتے ہیں جو تاثیر اور اثرات کے لحاظ سے کسی خاص قوم، کسی خاص وقت یا کسی خاص خطہ زمین تک محدود رہتے ہیں۔ ان کے برعکس یہ کلمہ ماحول، قوم اور زمان و مکان کی قیود سے بالا ہے۔

صدیوں بعد آج بھی اس کی تکرار لذت آگیں اور تاثر فرحت بخش ہے۔ اب ذرا مکہ کے معاشرتی حالات کو مدنظر رکھ کر اندازہ لگائیے کہ جہاں سرے سے کوئی قاعدہ قانون موجود ہی نہ تھا جہاں بات بات پر تکرار اور پھر نسل در نسل انتقامی جنگ و جدل روزمرہ کا معمول تھا۔ جہاں انسان کی برتری کا معیار بداخلاقی، کساد بازاری اور معاشرتی ناہمواری تھا۔ جہاں انسانوں کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا۔ جہاں سب سے بڑے ظالم کے سر ہی سرداری کی دستار سجتی تھی۔

Marfat.com

جہاں غرور، انتقام پسندی، خاندانی تعصب زناکاری، شراب نوشی، عورتوں کا ننگا پھرنا یا کرنا، عزت و وقار کا زینہ اول تھا۔ جہاں اپنی جھوٹی انا کے لیے تیسرے درجے کے شہریوں کا خون بہانا باعث فخر تھا۔

وہاں یکدم صدیوں سے چلنے والے نظامِ زندگی کو غلط قرار دینا، مذہب کو جھوٹا کہنا، غریب و امیر، آقا و مولیٰ کی تفریق سے پاک نظام زندگی کا نعرہ لگانا کتنا کٹھن کام تھا۔ خاص کر سب کی دستاریں چھین کر سرداری کے لیے بڑی بے باکی سے محمد رسول اللہ کا پرچار کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ یہ پورے کے پورے معاشرے سے مخالفت مول لینے کے مترادف تھا۔ یہ بڑے حوصلے اور جرات کی بات تھی۔

الفاظ کی لغوی اور معنوی تاثیر کے ماہرین اس سے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کلمہ طیب جیسے نعروں سے دعوتِ حق کی ابتدا لالچی واعظموں، مصلحت کوش ملاوں، تنہائی پسند زاہدوں اور لوٹے سیاستدانوں کا کام نہیں تھا۔

یہ تو صرف ان عاشقوں صادقوں اور عالی ظرف دیوانوں کا کام تھا جن کی نظر عصرِ حاضر کی چمک کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔ جن کا مقصد صرف اور صرف حصولِ رضائے الٰہی ہے۔ جنھیں موت زندگی کا حسین و جمیل انعام نظر آتی ہے۔

اور جب حرم کعبہ کی دیواروں سے لا الہ الا اللہ کی حلاوت آگیں آواز ایک تسلسل سے ٹکرانے لگی تو عوام الناس جو ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ محمدؐ کے پاس کون سی ایسی طاقت ہے جو انھیں لات و منات اور عزیٰ کے غضب سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اسے نہ سرداروں کا خوف یہ سب کچھ کہنے سے روک رہا ہے اور نہ خاندان کی مخالفت۔ کیا واقعی محمدؐ کا خدا بلند و برتر ہے۔ کیا واقعی محمدؐ رسول اللہ ہیں۔ گویا وہ تجسس اور فکر میں کھو جاتے۔

کسی بھی انقلابی تحریک کا یہ پہلا زینہ ہے کہ وہ لوگوں میں جلد از جلد تجسس بیدار کر کے ان کے سوئے ضمیر کو جھنجوڑ دے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب ریڈیو، ٹی وی، ویڈیو، ویوگراف ٹیپ ریکارڈر کیمرہ اور سلائیڈ پروجیکٹر پرنٹ میڈیا یا الیکٹرانک میڈیا کا تصور بھی موجود نہ تھا۔

جب انٹرنیٹ کمپیوٹر سیٹلائٹ اور ڈش انٹینا جیسے ذرائع نشر و اشاعت موجود نہ تھے۔

یہ اس علاقہ کی تاریخ ہے جہاں سخنوری کی محفلیں عکاظ[2] مجنہ، صنعا، بصریٰ حجر کے میلے ہی

ذریعہ ابلاغ اور نشر و اشاعت تھے۔

جس دور میں موجودہ سرد جنگ (Cold War) یا پروپیگنڈا (Propaganda War) کا تصور ہی موجود نہ تھا۔

نشر و اشاعت اور پبلسٹی کے ماہرین سے پوچھیں کہ پروپیگنڈا انسانی نفسیات اور کمزوریوں سے کھیل کر کیسے فوائد حاصل کرتا ہے۔

سو اس کلمہ کے خلاف جھوٹ کی مہم لے کر تمام عرب اُٹھ کھڑے ہوئے اس کے اثرات کو پھیلنے سے پہلے روکنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔

مذکورہ بالا جملے میرے تصوراتی یا خیالی الفاظ نہیں۔ اس کی کئی مثالیں قرآن کے اسلوب میں اب بھی محفوظ ہیں جس میں نبیؐ کی 23 سالہ نبویؐ زندگی کے ایک ایک لمحے کا اجمالی موجود ہے۔ مضمون کے آئندہ واقعات میری بات کا ثبوت پیش کر دیں گے۔

—(((الحمد للہ)))—

Marfat.com

بے پر کے جھوٹ (Disinformation)

کلمے کے صوتی اثرات کو روکنے کے لیے مخالفین نے ایک طرف تو کمزوروں اور غلاموں پر تشدد شروع کر دیا جسے دہشت گردی کے باب میں بیان کیا جائے گا، دوسری طرف جھوٹ کی مہم Disinformation شروع کر دی۔

موجودہ پروپیگنڈا سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ (Primacy) یعنی خبر کو مختلف معنی میں بیان کرتے اور (Recency) قرآنی آیات کو سنتے اور غلط ترجمے کر کے لوگوں کو بتاتے یا سنتے ہی گالیاں دینا شروع کر دیتے۔ یا سننے کی بجائے شور مچانا شروع کر دیتے تاکہ لوگ حقائق سے باخبر نہ ہونے پائیں۔

اس کلمے نے مشرکین کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اوپر سے اللہ تعالیٰ کے مدلل اور پُر اثر کلام نے گل افشانی شروع کر دی تو وہ سٹھیا کر اس کے خلاف متحد ہو گئے۔ انھوں نے دعوتِ عام کے اثرات کو روکنے کے لیے جھوٹ یعنی ڈس انفارمیشن (Disinformation) شروع کر دی تاکہ سننے والوں کے کانوں تک دعوتِ اسلامی کی آواز پہنچنے سے پہلے اتنا متنفر کر دیا جائے کہ لوگ دور بھاگنا شروع ہو جائیں۔

پھر تو جس کے منہ میں جو آیا کہتا چلا گیا۔ کسی نے ساحر کہا، کسی نے کاہن۔ کوئی کہتا جادو کیا ہوا اور کوئی مجنون، الغرض کوئی ایک بات نہ تھی۔ جتنے منہ اُتنی باتیں۔ یہ پروپیگنڈہ کسی ایک جگہ نہیں، کسی ایک وقت نہیں، بلکہ ہر جگہ ہر وقت کیا جانے لگا۔

صرف یہی نہیں آیاتِ قرآنی کو سنتے اور اس کی غلط تاویلیں کر کے لوگوں کو بتاتے غلط معنی پہنا کر ادب ناشناس لوگوں کو تحریک سے بدظن کرتے۔

ابوجہل، ابولہب، عتبہ، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اور نضر بن حارث اس مہم کے روح و رواں تھے۔

ویسے بھی اسلام جو نظریات پیش کر رہا تھا، وہ دیکھے یا محسوس نہیں کیے جا سکتے تھے۔ خدا،

Marfat.com

فرشتے، آخرت، جنت و دوزخ اور جزا اور سزا وغیرہ بظاہر عقل سے ماوراعقائد تھے۔ان کے رسوم ورواج اور تہذیب وثقافت بھی اس کے مخالف تھے۔اس لیے عام لوگوں کو بدظن کر لینا ایک آسان نفسیاتی کام تھا۔

مکہ کے یہ بازی گران کاموں میں طاق تو تھے، مگر جھوٹ آخر جھوٹ ہوتا ہے۔ایک جھوٹ کے لیے سینکڑوں جھوٹ بول کر بھی اسے سچ کے لباس سے آراستہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

مخالفین کے اس طرزِ عمل نے حضور ﷺ کا کام آسان کر دیا۔مخالفوں کا بہت زیادہ واویلا اسلام کی نشرواشاعت کا ذریعہ بن گیا۔اس جھوٹی مہم نے اسلام کی بڑی تیزی سے تشہیر کی۔

———(((اللہ اکبر)))———

انھیں دنوں سورہ واقعہ مشرکین کے سامنے پیش کی گئی جس میں عقیدۂ توحید و آخرت، انسانوں کو اعمال کے لحاظ سے جزاوسزا اور انسانوں کی تقسیم تین درجوں میں کر دی گئی۔

السابقون الاولون۔

اصحاب الیمین۔

اصحاب الشمال۔

قرآن کی حقانیت اور آخرت میں مشرکین کی سزا[3] اور غذا کو بڑا کھل کر بیان کیا اور غذا سے متعلقہ آیات نے تو ان کا بھرکس نکال دیا۔ملاحظہ ہو۔

مفہوم:۔" پھر اے جھٹلانے والو تم شجرِ زقوم کی غذا کھاؤ گے اور اوپر سے تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح اُبلتا ہوا پانی پیؤ گے روزِ جزا میں یہ کافروں کی ضیافت ہو گی۔

سورہ واقعہ آیت 51 تا 56

یہ منکروں کے جھوٹ کا جواب تھا۔سرد انداز میں انھوں نے جو ڈس انفارمیشن پھیلائی تھی اس پر ایک طرح کی سب ورژن تھی۔اس سے پہلے کافر و مشرک اور گناہگار کی اصطلاحیں عام ہو چکی تھیں۔اب سابقون، اولون، اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کی اصطلاحوں کے ساتھ عذاب کی خبر نے سب کو خوف زدہ کر دیا تھا اور ان کے جھوٹ کا بھرم (Subveret) کھول دیا۔ سننے والے خوف زدہ ہو گئے۔

ایک نئے لفظ شجرِ زقوم سے وہ اجنبی تھے۔شجر تو کسی درخت کو کہا جائے گا، مگر زقوم کیا بلا ہے۔ آج تک کسی نے دیکھا نہ سنا۔

پورے علاقے میں تجسس کی لہر دوڑ گئی۔ سرد جنگ میں تجسس بیدار کرنا ہی اصل کامیابی ہے۔ یہ انسانی نفسیات ٹٹولنے کے مترادف ہے۔

اب ہر کوئی ایک دوسرے سے پوچھتا پھر رہا تھا۔ زقوم کیا ہے کسی پھل یا کسی زہر کا نام ہے اس کی تشریح کرنے والا کوئی نہ تھا۔

سخنوری کے بڑے بڑے ماہر سر جوڑ کر بیٹھے کسی کے کچھ پلے نہ پڑا، بالآخر سب کی نظریں استادِ ادب وفن ابوجہل پر مرتکز ہوگئیں۔ کچھ لوگ گھر گئے، کسی نے گلی، کسی نے بازار میں، کسی نے صحنِ حرم میں، حتیٰ کہ ہر لحہ ہر جگہ ہر کوئی یہی سوال دہرائے چلا گیا۔

اس کی جانے بلا زقوم کس جن بھوت کا نام ہے۔ اسے اپنی ادبی وفنی دانشوری زقوم کے بہاؤ میں بہتی نظر آ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس شخص کو کوس رہا تھا جو نت نئے فقرے اور اصطلاحیں گھڑ کر اسے دق کر رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر لفظوں کے ماخذی قلابے ملا کر کچھ معنی خیزی کرنے کی کوشش کرتا، مگر تنگ آ کر خاموش و پریشان اُٹھ جاتا۔ آخر یہ کسی چیز کا تو نام ہے نا۔ وہ شدت سے اسی سوچ میں ہلکان ہو رہا تھا۔

آج صحن کعبہ تک جاتے جاتے پتا نہیں کتنے آدمیوں کو جھڑک بھی چکا تھا، لیکن بدقسمتی سے وہاں بھی زقوم زقوم ہی کی تکرار تھی۔

آخر سوچ سوچ کر بچنے کا یہی طریقہ سوجھا کہ کوئی معنوی ترجیح اپنی طرف سے پیش کر دو۔ یہاں کونسا کسی کو پتا ہے کہ زقوم کس چیز کا نام ہے۔ سیانا تھا لوگوں کی کم علمی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بولا:

"تم جانتے ہو محمد جس چیز سے ڈرا رہے ہیں، وہ کیا چیز ہے۔" پورے مجمع نے یک زبان ہو کر کہا: "نہیں ہم بالکل نہیں جانتے۔" کہنے لگا: "بھائی یہ تو انتہائی شیریں اور مزیدار کھجور کی ایک بہت نایاب قسم ہے۔ اگر مجھے مل جائے تو مٹھی بھر لوں اور خوب مزے مزے سے کھاؤں۔"

کچھ منچلے جھوٹے مداح، فضول واہ واہ کرنے والے سرگوشیاں کرنے لگے۔ دیکھا ہم نے کہا تھا ناں یہ عقدہ استادِ سخن وادب ابوالحکم ہی کھولیں۔

(یاد رہے ابوالحکم ابوجہل کی کنیت تھی)

اندھوں میں کانا راجہ اور راج پاٹھ چوپٹ، مداح سرائی سنتے ہی فخر سے کہنے لگا: "پتا نہیں محمدؐ اس قدر لذیذ پھل سے لوگوں کو کیوں ڈراتے پھر رہے ہیں۔"

یہ ڈس انفارمیشن تھی۔ اپنی طرف سے اس نے وحی الٰہی کو غلط مفہوم دے کر بھرپور طریقہ سے

Marfat.com

سب ورٹ (Subveret) کردیا تھا۔ پروپیگنڈہ کی بہترین تکنیک (Primacy) ہے۔اس نے خبر کو توڑ مروڑ کر اور Recency یعنی خبر کا توڑ کر کے دکھانا، استعمال کی تھی۔

صبح تک یہ نئی ترجیح پورے علاقے میں پھیل چکی تھی۔کوئی مسلمان کسی گلی یا راستے میں کسی مشرک سے مل جاتا تو اسے روک کر کہا جاتا لاؤ زقوم ہم ابھی تمھارے سامنے کھا جائیں گے۔

کاٹ تو واقعی زبردست تھی۔زقوم کی اصلی حالت جو خدائے بزرگ وبرتر نے بتائی تھی، اس جھوٹ کے لبادے میں چھپ سی گئی تھی۔مکہ والوں کے لیے کھجور کے ذائقے میں بڑی اپنائیت تھی چونکہ کھجور اور اونٹنی کا دودھ ان کی قومی خوراک تھی۔اس لحاظ سے یہ نفسیاتی حملہ تھا۔جو نئے مسلمانوں کے اعصاب پر سوار ہو سکتا تھا۔

ہر بانی انقلاب کی ان تمام کارروائیوں پر گہری نظر ہوتی ہے جو کارکنوں کے دل ودماغ پر اثر انداز ہو کر حوصلے پست وفاداری تبدیل کرسکتی ہیں۔اس لیے اس کا فوری تدارک ضروری ہو جاتا ہے۔پروپیگنڈا کی تکنیک میں اسے کاؤنٹر سب ورژن (Counter Subversion) کہا جاتا ہے۔

اگر جوابی حملہ میں تاخیر سے کام لیا جائے تو تحریک جتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ تیزی سے رول بیک ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

اس لیے اگلے ہی روز ابوجہل کی طرف سے پھیلائی جانے والی افواہ کی تردید ایک مفصل تردیدی نوٹ نے کردی جو کچھ یوں تھا۔

مفہوم:۔شجرِ زقوم گناہ گاروں کی خوراک ہے۔یہ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کھولتا ہوا ہوگا اور کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیٹ میں اُبلے گا۔

سورہ الدخان آیت 43 تا 46۔

یہ سنتے ہی صحن کعبہ میں موجود لوگوں پر سناٹا چھا گیا۔حضورؐ نے قرآن کا مذاق اڑانے والوں سے مزید کہا۔

"جاؤ ابوجہل سے کہو غم[4] نہ کھائے۔اس کی زقوم سے دوزخ میں خوب تواضع کی جائے گی۔"

———(((اللہ اکبر)))———

جواب بڑا صاف صاف تھا اوپر سے سورۃ الدخاں کے مزیدار اسلوب میں لپٹا ہوا۔ایسے اسلوب کا قدردان مکہ والوں سے بہتر کہاں ملتا۔شام ہونے تک یہ طرح مکہ میں وبا کی طرح پھیل

Marfat.com

چکی تھی

اب ہر محفل، ہر چوک، ہر گلی، ہر دکان، پر جہاں دو آدمی اکٹھے ہوئے، زقوم کی آسمانی تشریح موضوع بحث بن گئی۔ چند گھنٹے پہلے ابوجہل کے بہکانے پر زقوم کھانے کی خواہش رکھنے والے اپنے آپ کو کوس رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ محمدؐ کی فہم و فراست کی تعریفیں شروع ہو جاتیں دیکھا محمدؐ کی آواز میں کتنا درد و سوز تھا۔ لفظ کتنی سچائی سے ٹپک رہے تھے۔ ابوجہل کی غلط تنقید اور خود ساختہ تنقیح کو اس نے کس حسنِ ادا سے رد کیا۔ یقیناً اسی قسم کی باتیں ہوتی رہی ہوں گی۔

ادھر ابوجہل صبح اُٹھتے ہی اُبلی کھجوروں کی ثرید پی بیٹھا، اس کے پیٹ میں اتنی گڑبڑ ہوئی کہ تبخیر اور درد سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ پیٹ میں آریاں چلنے لگیں۔ طوعاً و کرہاً اسی حالت میں دارالندوہ کی شام کی نشست میں بیٹھنے کے لیے گھر سے نکلنے لگا تو بیگم صاحبہ نے سنا کی تین چار پتیاں تھماتے ہوئے کہا: ''چبا کر کھا جاؤ، معدہ ٹھیک ہو جائے گا'' وہ سَنا کی پتیاں چباتا اور تھوکتا ہوا حرم میں جا بیٹھا۔

وہاں لوگوں نے زقوم کی نئی حالت خوب نمک مرچ لگا کر بتائی۔ پیٹ کی خرابی کی وجہ سے حواس پہلے ہی تتر بتر تھے۔ زقوم کے اصل معنی سنتے ہی اوسان کھو بیٹھا۔ سٹھیا گیا۔ حضورؐ کو گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ بس بکتا ہی چلا گیا اور لوگ مارے خوف یا وضعداری کے سنتے رہے۔

گالیاں دینا بھی پروپیگنڈا کی ایک تکنیک ہے یہ الزام تراشی کے زمرے میں آتا ہے اس سے مخالف کی شہرت خراب ہوتی ہے اور کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ یوں متوسط لوگ کمزوروں کے قریب جانے سے ڈرتے ہیں۔

گالیاں دیتے دیتے حلق میں کھجلی اور پھر زبردست کھانسی شروع ہو گئی۔ کھجوروں کی ثرید اور سنا کی پتیوں نے جوش مارا۔ اوپر سے زقوم ہائی پوٹینسی ہائی پریشر ڈوز اس کی اپنی برائی اس پر ظالم ہو رہی تھی۔ پیٹ تندور کی طرح بھُوک اٹھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے واقعی پیٹ میں پگلہ اور کھولتا ہوا تانبا قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا ہے۔

پھر ہائے ہائے ہاہا کار کرتا پیٹ پکڑ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ حاضرین نے پکڑ کر سیدھا لٹایا اور پیٹ سہلایا۔ کچھ افاقہ ہوا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا یہ سب کچھ سنا کی پتیوں اور کھجوروں کی ثرید کی وجہ سے ہوا۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ اس کے علاوہ اور کیا کہتا۔

اسی محفل میں کوئی بذلہ سنج خوش مزاج بیٹھا تھا۔ جو اس سارے بکھیڑے میں غیر جانبدار تھا۔ اس کی حسِ مزاح پھڑکی۔ کہنے لگا۔ مجھے ایسے لگتا ہے ابوالحکم کے ہاتھ زقوم کی کافی کھجوریں آ گئیں

Marfat.com

جو ہم سے چھپا کر ساری کی ساری کھا گیا۔

اہل بزم بھی سخن شناس تھے۔اس نئی طرح پر قہقہوں سے خوب داد دی۔بعدازاں یہ نئی طرح بھی جنگل کی آگ کی طرح پورے مکہ میں پھیل گئی۔جب بھی کوئی کسی سے زقوم سے متعلق پوچھتا تو وہ جواب دیتا، اس کو ابوالحکم ہی بہتر جانتا ہے۔اس نے چھپ کر خوب مزے مزے سے کھائی ہیں۔ابوجہل کے انتہائی قریبی دوست جب کبھی مذاق سے دل بہلاوا کرنا چاہتے تو بڑے پیار سے پوچھتے:''ہاں بھئی ابوالحکم ذرا بتاؤ تو سہی، زقوم کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔'' وہ چڑ کر روٹھ جاتا یا گالیاں دینا شروع کر دیتا۔کہنے والے خوب محظوظ ہوتے اور قہقہوں سے مزید داد دیتے چلے جاتے۔

اس نے جس انداز میں عقیدۂ آخرت کا مذاق اڑایا تھا۔بالکل اسی کے سے انداز میں قرآن نے لفظ زقوم کو اس کی چڑ بنا دیا اور پھر یہ لفظ اس کی سیاہ کار شخصیت سے ایسے چپکا کہ تاریخ میں سے اگر اس لفظ کو حذف کر دیا جائے تو اس بیچارے کی سیاہ کار شخصیت خالی خالی سی ہو جاتی ہے۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے مذمم (نعوذ باللہ)

ابوجہل کی سخنوری کا سارا بھرم کھل چکا تھا۔اس کی جھوٹی اور خودساختہ شخصی چودھراہٹ روبہ زوال تھی۔اسے اندر کے تضاد نے توڑ پھوڑ دیا تھا۔محمد ﷺ کی شخصیت ہی نہیں بلکہ نام بھی کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔وہ ہروقت اسی کے متعلق سوچتا رہتا کہ

محمد ﷺ کتنے عجیب وغریب آدمی ہیں جو کسی وقت بھی بیٹھنے نہیں دیتے۔کوئی دال گلنے نہیں دیتے۔کوئی بات بننے نہیں دیتے۔ہفتوں مہینوں کی منصوبہ بندی چند لفظوں میں توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔

وہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے بس نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے متعلق سوچتا رہتا۔

آپ کی طرف سے پیش کی جانے والی ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ زہر بجھے تیروں کی طرح اس کے دل میں پیوست ہوتے۔رستے ہوئے ناسور زخم بنتے جا رہے تھے۔وہ ان زخموں کا کوئی مداوا کوئی علاج چاہتا تھا۔

بدقسمتی سے کسی نہ کسی جگہ، کسی نہ کسی محفل میں کوئی نہ کوئی شخص نئی آیت بتا کر یا محمد ﷺ کا نام لے کر اس کے رستے ہوئے زخموں پر نمک پاشی کر دیتا۔یہ حوالہ اور یہ نام سنتے ہی وہ تڑپ تڑپ جاتا۔حواس کھو بیٹھتا۔واہی تباہی بکنا شروع کر دیتا۔سنانے والے پر گالیوں کی بھرمار کر دیتا۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ کوئی بھی انقلابی تحریک انسانی نفسیات سے کھیلے بغیر کامرانی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے مخالفین تحریکی مخالفت کے خبط میں ہوش و ہواس کھو بیٹھے تھے۔عقل سے پیدل ہو چکے تھے۔

حضور ﷺ جو بات حرم شریف میں صرف ایک دفعہ سناتے، مشرکین حسد اور بغض میں وہی بات دوسروں تک خود ہی پہنچا دیتے۔اس طرح ہر نئی بات بھرپور مخالفت کی وجہ سے خود بخود مشتہر ہو جاتی۔حضور ﷺ کے کوئی خاص اہتمام کرنے سے پہلے ہی وہ بات نشرواشاعت کے تمام مراحل طے کر جاتی۔

Marfat.com

اور ہاں اگر انقلابی سیرت و کردار میں یکتا ہو تو تحریک خواہ مخواہ مخالفین کے اعصاب پر سوار ہو کر ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کر دیتی ہے۔ اسلامی تحریک کے تمام مخالفین اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ بے شک محمدؐ صادق اور امین ہیں، لیکن وہ جو کام کہہ رہے ہیں اسے ہم ماننے کے لیے تیار نہیں۔ نفسیاتی لحاظ سے وہ تضاد نفسی یعنی دوغلا پن کے شکار ہو گئے۔ ان کے پاس محمدؐ کو جھٹلانے کا کوئی معقول جواز نہ تھا۔ اسی لیے تو وہ ذہنی، فکری، اور اعصابی توڑ پھوڑ کا شکار تھے۔

اب ذرا موجودہ دور میں سی آئی اے، کے جی بی، موساد اور را کی سرد جنگ میں منصوبہ بندی کو بغور دیکھیے کہ ان کے پیچھے بیٹھے جرنیلوں نے اپنے مخالفین کے خلاف کیسی کیسی سلسلہ وار منصوبہ بندی کر رکھی ہے جو اس صدی کے کئی عشروں سے جاری ہے۔ ایک جگہ فیل ہوئے تو فوراً دوسرا آپریشن اپلائی کر دیا۔

سرد جنگ کے اس تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے کئی کئی منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ جنھیں سٹالنگ (Stalling) کہا جاتا ہے۔

اس حوالہ سے میں عربوں کو جاہل اور بدو کہنے میں متردد ہوں۔ ویسے بھی عرب اپنے آپ کو مہذب ترین سمجھتے اور اپنے مقابلہ میں باقی تمام دنیا کو عجمی، کو نگے یعنی غیر مہذب کہتے تھے۔ وہ اپنے دور کے ماہر مہذب اور ادب فہم تھے۔ ہاں اسلام کے معاملہ میں ان کی اپروچ بدوی تھی۔

میں اسلام کے خلاف ان کی مخالفانہ اپروچ دیکھتا ہوں تو وہ مجھے موجودہ دور کے ماہر ترین جرنیلوں اور سیاستدانوں سے آگے نظر آتے ہیں۔ یہ تو سارا نبیؐ امّی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، صداقت اور فراست کا کمال تھا کہ اتنے ذہین چاتر اور شاطر مخالفین پر قابو پایا۔ انھوں نے اسلام کے خلاف ایسے ایسے جاندار منصوبے ترتیب دیئے کہ اگر حضور ﷺ کے علاوہ کوئی بھی دوسرا شخص ہوتا تو شاید دو چار مہینوں سے زیادہ نہ ٹکتا۔

———(((اللہ اکبر)))———

مجلسِ ندوہ اپنی نئی منصوبہ بندی میں مستغرق تھی۔ سر جھکے ہوئے، مگر سوچیں اڑی ہوئی تھیں۔ کسی نے بات ہی بات میں دو چار دفعہ محمد ﷺ کہہ دیا۔ ابوجہل جو پہلے ہی تپا ہوا تھا۔ پچھلے زخم ابھی مندمل نہ ہوئے تھے کہ کسی نے نمک چھڑک دیا۔ چیخ اٹھا کیا محمدؐ محمدؐ لگا رکھی ہے۔ وہ محمدؐ نہیں مذمم (نعوذ باللہ) ہے اسے محمدؐ نہیں مذمم کہا کرو۔

محمدؐ یعنی جس کی تعریف کی جائے اور مذمم جس کی مذمت کی جائے، جھٹلا دیا جائے۔ تیس مار خاں صاحب نے بہت بڑا تیر مارا تھا۔ دیکھیے یہ لفظ محمدؐ کے ہم وزن لفظ ہے۔ محمدؐ میں بھی چار الفاظ

کا استعمال اور مذمم میں بھی چار الفاظ کا استعمال ہے، لیکن معنی میں دونوں الفاظ متضاد تھے۔ لگتا ہے اس میں ابوجہل نے تضاد لفظی سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہوگی۔ چونکہ دونوں الفاظ میں روانی ایک جیسی ہے۔

محمدؐ کے ہم وزن لفظ ایجاد کر کے اس نے مذمم کو زبانوں پر رواں کر دیا تھا۔

سو یہ لفظ ابوجہل کی زبان سے نکلتے ہی پورے شہر میں پھیل گیا۔ مخالفین کا ہر بالغ و عاقل، مرد و زن مذمم کہہ کر خوب دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ اس لفظ نے تحریک اسلامی کے ہر کارکن کو زچ کر دیا۔ راہ چلتے جہاں کہیں کوئی انقلابی مل جاتا، اسے روکنے کے لیے کہا جاتا: اے مذمم کے ماننے والے ذرا یہ تو بتا کہ آپ کا مذمم کیسا ہے۔ (نعوذ باللہ) ساتھ ہی اسے بدزبانی اور گالیوں سے نوازا جاتا۔

ان تیس مار خانوں کا خیال تھا کہ انھوں نے بہت گہرا اور نشانے پر تیر مارا ہے۔ بداخلاقی کر کے اس نے مخالفت کا حق ادا کر دیا ہے۔ حریفانہ میدان میں بہت بڑی فتح حاصل کر لی ہے۔

ان بیوقوفوں کو کون سمجھائے کہ چاند پر تھوکنے کی کوشش سے چاند میلا نہیں ہوتا۔ کاغذی تیروں سے کسی کو گھائل نہیں کیا جا سکتا۔ اس نئے لفظ کے ایجاد ہو جانے سے محمدؐ سرورِ کونین کی شہرت خراب نہیں ہو سکتی۔ اس نئی حرکت سے رحمتِ عالمؐ کے سیرت و کردار میں فرق نہیں آ سکتا۔

میں قربان حضور ﷺ کی سیرت و کردار اور اعلیٰ ظرفی پر۔ جب آپؐ کے سامنے عرض کیا گیا کہ مشرکین نے آپؐ کے نام کو اس طرح بدل دیا ہے۔ آپؐ نے غصہ یا کراہت محسوس کرنے کی بجائے بڑی خندہ پیشانی اور فراست کا مظاہرہ کیا اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا:

"دیکھو میرے خدا نے مجھے مخالفین کی گالیوں سے کس طرح بچا لیا ہے۔ وہ تو کسی مذمم کو گالیاں دیتے پھر رہے ہیں جبکہ میں تو محمد ﷺ ہوں۔"

مخالفین کے ناگوار اوچھے اور گھٹیا پروپیگنڈہ کے مقابلہ میں کتنا خوشگوار پاک و صاف، فصیح و بلیغ اور مدلل جواب تھا۔ اس میں برائی کی برائی سے مارنے کی روایت غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ گالی کی کاٹ گالی سے ہو۔ یہ تو محض گھٹیا اور پست ظرف لوگوں کا شیوہ ہے۔

کیا کہنے بڑے لوگ ہمیشہ بڑے ظرف کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا ظرف نہ کسی کا تھا اور نہ ہوگا۔ چنانچہ ہم آج بھی دیکھ سکتے ہیں کہ حضور کی دوستی تو دوستی تھی، دشمنی دوستی سے بھی زیادہ پاک و شفاف تھی۔

فتح مکہ کے وقت انھیں مخالفوں سے آپ کا حسنِ سلوک، حاتم طائی کی بیٹی کا احترام،

Marfat.com

غزوات میں جنگی قیدیوں سے حسنِ سلوک، آپ کی پاک شفاف دشمنی اور انسانیت دوستی اور بلند ظرفی کی عام سی مثالیں ہیں۔

بہر حال یہ دشمن کی طرف سے Primacy کا استعمال تھا۔ یعنی آپ کے نام کے ہم وزن لفظ گھڑ کے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ ایک طرح سے سیاہ پروپیگنڈہ کے زمرے میں بھی آتا ہے۔ اس سے تحریک میں ابہام اور شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

حضور ﷺ نے کاؤنٹر اسپونا ج (Counter Espionag) بے مزاحمتی تدبیر کا (Passive Measur) مثبت انداز استعمال کر کے مخالف پروپیگنڈہ سب ورٹ (Subvert) غیر مؤثر کر دیا۔

——(((الحمد للہ)))——

Marfat.com

جب افواہوں کو پر لگے (Disinformation)

جب مخالفین کی ایک نہ چلی تو وہ ذاتیات پر اتر آئے۔قرآن کے استدلال اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بے پر کی اڑانے لگے۔قرآن کے استدلال اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ بیان کے متعلق افواہوں کی ڈھول اڑانے لگے۔

کسی سے کہتے آسیب زدہ ہیں۔کسی سے کہتے مجنوں[5] ہیں۔کبھی شاعر کبھی ساحر اور کبھی کاہن کہتے۔الغرض کوئی ایک افواہ نہ تھی؛ بس جس کے منہ میں جو آیا کہتا چلا گیا۔

ابلیس کی مجلس میں اکابرینِ مکہ مخالفانہ فکر میں غرق تھے نضر بن حارث زبان دراز ہوا:

اے عزیزانِ مکہ تم جس طرح محمد ﷺ کا مقابلہ کر رہے ہو۔یوں ان سے مقابلہ ممکن نہیں۔ ذرا سوچئے جب وہ نوعمر تھا تو تم میں سے سب سے زیادہ خوش اطوار سب سے زیادہ سچا اور سب سے اچھا اور امین تھا۔اب جبکہ سفیدی اس کے بالوں کو چھونے لگی ہے، وہ تمھارے پاس وہ چیز لایا ہے جس پر تم نے اسے ساحر، کاہن، شاعر کہنا شروع کر دیا ہے۔اس طرح کام نہیں چلے گا۔

بخدا وہ ساحر نہیں ہے، ہم ساحروں کی جھاڑ پھونک سے واقف ہیں۔بخدا وہ کاہن نہیں، ہم نے کاہنوں کی تک بندیاں سنی ہیں۔ہمیں ان کی گول مول باتوں کا بخوبی علم ہے۔بخدا وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ہم شعر کی تمام اصنافِ سخن سے خوب واقف ہیں۔ان کا کلام کسی صنفِ شعر کے زمرے میں نہیں آتا۔بخدا وہ دیوانہ بھی نہیں ہیں۔جو جنونیوں کی حالت ہوتی ہے یا وہ جیسی بے تکی بڑیں ہانکتے ہیں، ان سے ہم اچھی طرح باخبر ہیں۔

اے اہلِ قریش کچھ اور سوچو۔تمھارا جس چیز سے مقابلہ ہے، وہ ان افواہوں سے بہت بڑی ہے۔ایسی جھوٹ موٹ باتوں سے تم اسے شکست نہیں دے سکتے۔

مخالفین کا وہ منشور تھا جسے وہ خود غلط اور جھوٹ قرار دے رہے تھے ان کے مندرجہ بالا الفاظ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کو اپنے جھوٹ اور افواہوں کے بے ہنگم پن سے خود بھی

Marfat.com

کہہ آنے لگی تھی، عوام الناس کا ان باتوں پر یقین کرنا تو دور کی بات ہے۔

حضورؐ کی زندگی تمام عوام الناس کے سامنے کھلی کتاب تھی۔ جن لوگوں کو بھڑکانے کے یہ سرتھی ورغلانا چاہتے تھے وہ خود بھی رسول اللہ کی زندگی کے ایک ایک لمحے سے بخوبی واقف تھے۔ نواح مکہ میں کون ایسا تھا جو آپؐ کے اخلاق، کردار اور افعال سے واقف نہ تھا۔ ایسی افواہیں عام لوگوں پر کیا اثر دکھاتیں۔ یہ تو خاک سے زیادہ جھاڑنے والی بات تھی۔ نضر بن حارث کے یہ الفاظ بذات خود ان کی افواہوں، بے ترتیب جھوٹوں اور بے تکی مخالفت کی حقیقت کھولتے کرتے ہیں۔

بہرحال قرآن تو ساتھ ہی ساتھ ان کی ہر بات کا جواب دیتا رہا۔ آپؐ کا کردار سب سے پہلا جواب تھا جس کی تصدیق کے لیے ہر ہر موقع پر قرآن اترتا رہا۔ آیئے ذرا قرآنی تصدیق پر بھی معمولی بالکل معمولی ہی نظر ڈال لی جائے۔

سورہ مومنون میں یوں مخاطب کیا گیا۔

مفہوم:۔ "کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔"[5]

اور ایک دوسری جگہ یوں جواب دیا گیا۔

مفہوم: "اے نبیؐ تم اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہو۔"

مخالفین کا ہدف صرف نبی ﷺ کی ہی ذات نہ تھی، بلکہ ہر وہ شخص جو اسلام لا چکا تھا یا اسلام لانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ وہ امیر تھا یا غریب، غلام تھا یا مولا، عرب تھا یا عجم، چھوٹا تھا یا بڑا، مرد تھا یا عورت سب کے سب ان کی سیاہ فہرست (Elank list) پر بلیک لسٹ میں تھے۔ قرآن نے اس عمل کی جوابی کارروائی ان الفاظ میں کی۔

مفہوم: "مجرم لوگ اہل ایمان کا مذاق اڑاتے، جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے اور جب اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے اور جب انھیں دیکھتے تو کہتے یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں، حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔"[8]

سورہ المطففین:۔ 29 تا 33

مزے لیتے ہوئے پلٹنے کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اپنے گھر کو جاتے تو سمجھتے کہ آج تو مزہ آ گیا ہے اہل ایمان کی بے عزتی کرنے کا، تحقیر کرنے کا، ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ دیکھا کتنا ذلیل کیا ہے۔ بڑے بنے پھرتے ہیں مسلمان، ہمارے آبائی دین میں کیڑے نکالنے والے۔

Marfat.com

بولتے نہ آج پھر، بولے کیوں نہیں وغیرہ وغیرہ اور یہی فتح مندانہ انداز لیے ہوئے ہنستے کھیلتے گھروں کو لوٹ جاتے۔

دوسرا اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صبح ہوتے ہی ہر مخلوق گھروں سے نکل آتی ہے اور دانہ دُنکا چک کر یا لوازمات دنیا سے اُلجھ سلجھ کر شام کو گھر لوٹتی ہے۔ان لوگوں کا چونکہ سب سے بڑا کام ہی دین کی مخالفت تھا۔سو وہ صبح گھر سے نکلتے ہی اس میں لگ جاتے۔اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ان دنوں دارالندوہ کے اجلاس دو وقت یعنی صبح و شام ہونے لگے تھے۔ بہر حال مدعا یہی معلوم ہوتا ہے کہ صبح سے شام تک اہل ایمان کو تنگ کرنے کے بعد جب گھروں کو پلٹتے تو بڑے خوش و خرم پلٹتے کہ آج انھوں نے مسلمانوں کو تنگ کرنے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

———(((اللہ اکبر)))———

دیکھیں قرآن نے گرد کو کیسے صاف کیا۔مخالفین کے ایک ایک عمل کو اُدھیڑ کے رکھ دیا۔یقیناً جب مخالفین نے ان قرآنی آیات کو سنا ہوگا تو اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہونگے اور جان نثارانِ حق تمام تکلیفوں مشکلوں اور زیادتیوں کو بھول کر ایک نئے عزم، نئے ولولے اور نئے جذبے سے تحریک کے ساتھ وابستہ ہوگئے ہونگے۔

دوسرے لفظوں میں پورے مکہ میں صرف ایک قرآن تھا جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کردیتا اور مخالفت سے اٹی فضا چند لمحوں کے لیے ہی سہی صاف تو ہوجاتی تھی

اور یوں ان کے جذبے جوان اور امیدیں تازہ ہوجاتیں۔وہ اسی کٹھن منزل پر نبی علیہ السلام کے شانہ بشانہ کھڑے ہوجاتے۔حضور ﷺ بھی اپنوں اور بیگانوں سے بیگانے ہوکر ان کی تنظیم و تربیت پر کھڑے ہوجاتے۔

دراصل مشرکین کا مقصد لوگوں کو اسلام سے کسی نہ کسی طرح دور رکھنا تھا۔ان کے اندر والا سچائی کو جانتا اور مانتا تھا۔اس لیے وہ افواہیں پھیلا رہے تھے تاکہ کوئی آپؐ کے قریب ہی نہ جائے۔اگر کوئی قریب چلا گیا تو جس سچائی کو وہ جھٹلا نہیں سکے۔ان کے اندر والا انکار نہیں کر سکا۔عام آدمی تو خواہ مخواہ اس میں پھنس جائے گا،خاص طور پر وہ لوگ جن کی نہ کوئی سیاست نہ امارت، نہ زمین نہ جائیداد، نہ دوست نہ دشمن۔اسے تو سچائی کو مانتے ہوئے دیر نہیں لگے گی۔یہ افواہیں وہ اسی مقصد کے تحت ہی پھیلا رہے تھے۔

حضور ﷺ کو کبھی شاعر، کبھی ساحر، کبھی کاہن اور کبھی دیوانہ کہتے۔ افواہوں کی یہ بے ترتیبی بھی ان کی اندرونی توڑ پھوڑ کا ثبوت ہے اور اوپر قرآن کا استدلالیہ انداز ان کی تردید کرتا ذرا دیکھیے:

مفہوم: "[9] اے نبی تم نصیحت کیے جاؤ تم اللہ کے فضل سے نہ کاہن ہو نہ دیوانے۔"

سورہ الطور آیت نمبر 29۔

اور دوسری جگہ مشرکین کی افواہوں کا یوں جواب دیا:

"ہم نے ان کو شعر نہیں سکھایا اور نہ ہی ان کے [10] کرنے کا یہ کام ہے۔"

سورہ یٰسین آیت 69۔

پھر مزید وضاحت کی گئی کہ

"تم دیکھتے نہیں ہو کہ شعراء کے پیچھے تو بہکے بہکے لوگ چلتے [11] ہیں۔ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔"

سورہ شعراء 224 تا 225

مشرکین کی طرف سے بے پر کی اڑائی جانے والی افواہوں کی اور بھی درجنوں قرآنی دلیلیں ہیں، مگر مضمون کی طوالت کا خوف سد راہ ہے اور میں اپنے دور کے قارئین کے متعلق بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بھی میرے ہی دور کے میرے ہی نظامِ تعلیم کے پروردہ ہیں۔ میرا یہ نظامِ تعلیم تو آپ سب جانتے ہیں، پوپ ملٹن کی جنتِ گم گشتہ Paradise Lost کی تلاش میں پاکستانی طالب علم کا جذبہ، فکر، صلاحیت، پاکستانیت، مسلمانیت اور نظریہ سب کچھ کھو دیتا ہے۔ وہ فارغ التحصیل ہوتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ شیکسپیئر کے کسی کردار کا حصہ بن چکا ہے۔ وہ ڈرامائی انداز میں سپر مین بنتے بنتے جیل میں پڑا ہے۔ کسی ڈریکولا کی نقل کرتے ہوئے سو بچوں کا قاتل بن کر کسی آسان ترین موت کا متلاشی ہے۔ یا پھر اس نظامِ تعلیم کے صدقے ہر چیز کو لات مار کر ہیروئین یا ولن کے ہاتھوں مر رہا ہے۔

اپنے قاری کی مشکلات کے ہاتھوں مجبور ہوں، ورنہ دل تو چاہتا ہے کہ پورے قرآن کو سیرت میں سمو دوں۔ خدا کرے قارئین کے متعلق میرا یہ اندازہ غلط فہمی ثابت تو اگلی کوشش میں پورے کا پورا قرآن سنانے کی کوشش کروں "آمین"۔

بہر حال:۔ مشرکین کی یہ کارروائیاں نہ ختم ہونے والی تھیں۔ نبوت کے پہلے دن سے فتح

Marfat.com

مکہ تک یہ کام اپنی پوری شدت سے جاری رہا۔ یونہی گھڑیاں دنوں میں۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ نہ مخالفین اپنی مخالفتوں سے باز آئے اور نہ ہی مقتدین اسلام نے اپنی راہ بدلی۔

مخالفین انتہائی تدبر و فکر کے بعد نئی منصوبہ بندی کرتے، یہ عملدر آمد کے ابتدائی دنوں سے آگے نہ بڑھتی۔

یہ قرآن کا اعجاز تھا کہ بانیِ انقلابؐ کے مضبوط کردار کی تاثیر کوئی وار کوئی حملہ کوئی تجربہ کارگر نہیں ہو رہا تھا۔

(((الحمد للہ)))

Marfat.com

جب حج پر چلا جھوٹ

آج پھر ابلیس کی شوریٰ کا اجلاس ولید بن مغیرہ کے گھر جاری تھا۔حج کے دن تھے۔زائرین کی آمد آمد تھی۔فکر لاحق تھی کہ اب کیا ہوگا؟ کیا بنے گا؟ پیغامِ توحید و رسالت حاجیوں تک پہنچ جانے کا سیدھا سیدھا مطلب ہے کہ پورا عرب صابی بن گیا یعنی اپنے باپ دادا کے دین سے پھر گیا۔اس دعوت کو حاجیوں تک پہنچنے سے روکنا یا اس کے اثرات زائل کرنا آج کے اجلاس کا ایجنڈا تھا۔

اس مسئلے کی حساسیت اور خفیہ پن کے پیش نظر یہ اجلاس اسمبلی ہال یعنی حرم کی بجائے ولید[12] بن مغیرہ کے گھر منعقد کیا گیا۔

شکست خوردگی اور ناکامی چہروں پر نمایاں تھی۔گردنیں مسلسل اعصاب شکنی کے عمل سے خم تھیں۔سر جڑے ہوئے اور زبانیں خاموش۔محفل پر ہو کا عالم طاری اور جسم ایسے کہ چھوؤ تو جان نہیں، بلاؤ تو آواز نہیں، مارو تو نا اوٗ، نا آہ، نا اُچھ۔خاموشی ایسی طویل خاموشی جیسے کسی عالمگیر محاذ کی منصوبہ بندی درپیش ہے۔کسی اجتماعی قومی تحفظ کے احساس نے دبوچ لیا ہے۔

آخر میزبان نے یہ طویل سکوت توڑا۔ولید بن مغیرہ کی زبان دراز ہوئی اور یوں پتھر سرکانے لگی۔

حاضرین آ ؤ محمدؐ کے مقابلہ میں کوئی ایک بات طے کرلیں تاکہ کل یہ نہ ہو ایک کچھ کہے اور دوسرا کچھ کہتا پھرے۔

اجلاس میں حرکت پیدا ہوئی۔اجلاس میں موجود تمام ممبران حسب توفیق اور استطاعت تجویزیں بکھیرنے لگے۔

اس اجلاس کا صدر (Leader of the House) بھی ولیدہ بن مغیرہ ہی تھا۔ہر ایک تجویز سنی جاتی اس پر جرح ہوتی اور ردّ وقد ہوتی اور دوبارہ غور کے لیے واپس بھیج دی جاتی۔

کسی نے تجویز دی، میری صلاح ہے ہم لوگوں کو بتائیں گے محمدؐ کاہن ہیں۔لیڈر آف دی

Marfat.com

ہاؤس نے اعتراض لگایا کہ نہیں ہم نے کاہن دیکھے ہیں۔ محمدؐ کے ہاں نہ کاہنوں کا سا رمزیہ کلام ہے اور نہ قافیہ آرائی۔

کسی اور نے کہا کہ ہم آسیب زدہ بتائیں گے۔ ولید نے جواب دیا، نہیں ہم آسیب کو جانتے ہیں۔ محمدؐ کے حلق میں نہ گھٹن ہے اور نہ پریشان خیالی۔

کوئی اور بولا ہم اسے شاعر مشہور کریں گے۔ ولید معترض ہوا ہم تمام اصناف سخن سے بخوبی واقف ہیں۔ محمدؐ کا کلام شعر نہیں ہے اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق نہیں ہوتا۔

کوئی اور مچلا ہم اس کے ساحر ہونے کو ہوا دیں گے۔ ولید نے اس کو بھی رد کرتے ہوئے جواب دیا۔ ہم جادوگروں کو جانتے ہیں۔ وہ اپنے جادو کے لیے جو طریقے اختیار کرتے ہیں، ہمیں ان کا بخوبی علم ہے۔ محمدؐ میں ایسی کوئی بات نہیں۔

الغرض ریت کا پودا، کرن کرن تھی شاخ، شاخ شاخ پر پنچھی، پات پات کی بولی۔ کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ کہا۔ بھانت بھانت کی بولی ان بولی ہو چکی تو سب نے یکبارو یک زبان کہا: اے ابوالحکم تم ہی بتاؤ کیا کہا جائے۔

اجہلوں کی اس مجلس کا باپ ابوجہل سر چڑھ کے بولا اے[13] اے ولید تمھاری قوم اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوگی جب تک تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی بات نہ کہو" ولید نے کہا ٹھہرو ٹھہرو مجھے سوچ لینے دو۔

اور ولید اپنی زبانِ بے لگام سے کچھ یوں خشت زنی کرنے لگا۔ "خدا کی قسم محمدؐ کی باتیں بڑی شیریں اور وزن دار ہیں۔ اس کے کلام میں بڑی تاثیر اور پھیلاؤ ہے اس لیے تمھاری تمام باتیں لوگ ناروا الزام سمجھیں گے۔ ہاں ایک بات کارگر ہو سکتی ہے کہ تم سب اس بات کا چرچا کرو کہ:

"محمدؐ کا کلام جادو کا کلام ہے اس کو سننے والا ماں باپ، بہن بھائیوں، بیوی بچوں، رشتہ داروں، قبیلے اور خاندان سے کٹ جاتا ہے۔ واہ بھئی واہ کیا گتھی سلجھائی ہے۔ کمال کر دیا ہے کمال۔ یہ ہیں صندوقوں میں ڈال کر باراتوں کے ساتھ لے جانے والے لوگ۔ واہ بابا جی واہ۔ اتنا بڑا سن اور اتنی دماغ پاشی۔ یہ بات ہمارے کسی کے ذہن میں آنے والی نہ تھی۔ عقل کی کیا مجال کہ عمر کے تجربے کو پائے۔ ابلیس کے چیلوں نے خوب کھل کھلا کے داد دی ہوگی۔ جبھی تو سارے کے سارے اس تجویز پر متفق ہو گئے۔

———(((اللہ اکبر)))———

Marfat.com

یہ تجویز تو واقعی نقش بر آب تھی کوئی پتھر پہ لکیر تھوڑی تھی جو وہ کامیاب ہوتے۔ گو وہ اپنی سی کر گزرے، مگر اُلٹا یہ اسلام کی تشہیر و اشاعت کا سبب بن گئی۔

اس بات پر سب متفق ہو گئے تو مختلف ٹولیاں ترتیب دی گئیں۔ یہ ٹولیاں مکہ میں داخل ہونے والے ہر راستے۔ ہر گلی اور ہر چوک میں کھڑی کر دی گئیں تاکہ حج کے لیے آنے والے ہر آدمی کو روک کر تجویز شدہ داستانِ غم اور تجویز شدہ موہوم کہانی سنا کر خوفزدہ کر دیا جائے۔ یوں آنے والوں میں ایک خوف سرایت کر جائے گا۔

سوچا گیا کہ اپنے بہن بھائیوں، والدین، رشتہ داروں اور خویش قبیلہ سے کٹ جانے کا ڈر اور خوف حاجیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دے گا۔

یہ براؤن پروپیگنڈا کے زمرے میں آتا ہے۔ اس خبر میں لوگوں کی فطری کمزوری سے کھیلا گیا تھا اور وہ بھی غیر محسوس انداز میں۔ چونکہ انسان اپنے فائدے کی بات غور سے سنتا اور اس پر جلد عمل کرتا ہے۔ ایسی خبروں میں ہمدردی کا پہلو نمایاں ہوتا۔ پھر اس میں کوئی تنقید بھی نہیں، کسی کو مطعون نہیں کیا گیا۔ کسی کی کردار کشی نہیں کی گئی۔ کسی کو گالی نہیں دی گئی جس سے ابہام پیدا ہو کہ بتانے والا ذات پرستی یا خود پسندی میں گرفتار ہے۔ کہنے والا صرف ہمدردانہ طور پر بات سنا رہا ہے کہ ادھر نہ جانا۔ ادھر جانے میں تمھیں خطرہ ہے بس......

اپنی نظر میں قریشِ مکہ نے دعوتِ اسلام کے اثرات کو روکنے کا مکمل سدِ باب کر لیا تھا۔ آنے والوں میں بیشتر لوگ حضور ﷺ کی ذات و صفات سے ناواقف تھے۔ بھرپور پروپیگنڈا کی وجہ سے نام محمد کی بے بہا تشہیر ہو گئی۔ ہر آنے والے کو کم از کم اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ اس شہر میں کوئی محمد ﷺ نام کا آدمی رہتا ہے اور اس کے پاس اس قسم کا کلام ہے۔ اس کے اس قسم کے اثرات ہیں۔

اس بے جا مخالفت سے ہر حاجی بھرپور تجسس میں مبتلا ہو گیا کہ یہ شخص کیسا ہے؟ کون ہے؟ اس کے کلام میں کیا ہے؟ جس کے سننے سے ہر آدمی روک رہا ہے۔ اس قسم کا تجسس بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ تحریکیں اس پر بڑے مالی اور مادی وسائل خرچ کر دیتی ہیں جو مخالفین نے مخالفت کی وجہ سے پیدا کر دیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود حاجی کیمپوں میں تشریف لے گئے۔ ایک ایک شخص سے ملے۔ انھیں قرآن کے حلاوت آگیں اسلوب سے نوازا۔ لوگوں کو دعوتِ حق کی طرف بلایا۔ انسانی تکبر و نخوت اور حماقت کو ریزہ ریزہ کر دینے والی قرآنی آیات سنائیں۔

Marfat.com

آپ کا سگا چچا ابولہب[14] جہاں جہاں آپؐ جاتے پیچھے پیچھے چلتا جاتا اور لوگوں سے کہتا یہ جھوٹا ہے (نعوذ باللہ) صابی ہے یعنی باپ دادا کے دین سے پھر گیا ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آنا۔ ابن ماجہ کے بقول آپؐ کو پتھر مارتا جاتا اور مذکورہ بالا الفاظ کہتا جاتا۔

بعض دفعہ آپ پتھروں سے لہولہان ہو جاتے تو لوگ واقعی دیوانہ پن کا گمان کرنے لگتے

اس

سارے شہر میں صرف ایک ہی ذات تھی جو بار بار آپ کو حوصلہ دیتی اور آپؐ پھر ایک نئے عزم اور حوصلے سے اپنے کام میں لگ جاتے پھر جب سختیاں جان کو آتیں تو پھر کوئی نئی وحی کوئی نئی قرآنی آیت حوصلہ بڑھا جاتی۔ ڈھارس بندھا جاتی۔

مفہوم:۔ ''کیا انھوں نے کبھی سوچا نہیں کہ وہ تو صاف صاف[15] خبر دینے والا ہے۔''

سورہ اعراف 189

مفہوم:۔ ''اے نبیؐ[16] تم نصیحت کیے جاؤ اپنے رب کے فضل سے نہ تو تم دیوانے اور نہ کاہن''

سورہ طور آیت 29

مخالفین کی یہ مہم صرف یہیں تک محدود نہیں، بلکہ ریگزار عرب میں منعقد ہونے والے تمام ثقافتی میلوں اور تجارتی مظاہروں تک پھیل گئی جو اس دور میں عرب میں منعقد ہوتے تھے۔ جن کو عکاظ، مجاز، مجنہ، صنعا، بُصریٰ وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ میلے اور مظاہرے پورا سال مختلف جگہوں اور مختلف وقتوں میں منعقد ہوتے رہتے تھے۔ یوں مخالفین کی مخالفت بھی ہر جگہ پھیلتی گئی۔ یہ ایک دفعہ نہیں، بلکہ ہجرت تک ہر حج کے موقع پر نظر آتی ہے۔

قریش تو یہ سمجھتے تھے۔ ہم نے دعوتِ اسلامی کے اثرات کو پھیلنے سے روک دیا ہے، لیکن خدا کی ذات نے اس عمل کو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بنا دیا۔ کئی اکابر صحابہ تک آپ کا اسم گرامی صرف مخالفین کے ذریعے سے پہنچا۔ عام حالات میں اسلام کا تعارف پورے عرب میں پھیلانے کے لیے کئی سال اور بہت زیادہ سفری اور اشاعتی وسائل درکار تھے جو اللہ نے مخالفین کے ذریعے محض چند سالوں میں عرب کے طول و عرض میں پہنچا دیا۔

عام لوگ شاید بدگمان ہوئے ہوں، مگر بہت سے دانشمند اور باشعور لوگوں نے صرف اس مخالفت کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ جن میں چند ایک کے نام یہ ہیں:

حضرت طفیلؓ بن عمر دوسیؓ۔

Marfat.com

حضرت ابوذر غفاریؓ۔
عمر بن عبسہ سلمیؓ۔
ضماد الازدیؓ۔
ابوموسیٰ اشعریؓ۔
معیقیب بن ابی فاطمہ الدوسیؓ۔
جعال بن سراقہؓ۔
عبداللہ اور عبدالرحمن کنانیؓ۔
بریدہ بن الحصیبؓ۔

تفصیلات بتانے کے لیے ان میں سے چند ایک کے حالات بھی لکھنے کی جسارت کرتے ہیں۔

حضرت طفیل بن عمر دوسی رضی اللہ عنہ

اس وقت کفر و اسلام کی کشمکش زوروں پر تھی۔ سرداران مکہ اسلام کے خلاف ہر کارروائی، ہر حربہ روبہ عمل لا رہے تھے جب تہامہ کے رہنے والے قبیلہ دوس کے سردار طفیل بن عمر دوسی رضی اللہ عنہ مکہ میں حج یا زیارت کعبہ کے لیے تشریف لائے۔

مکہ میں داخل ہونے والے تمام راستوں پر مشرکین کی ٹولیاں حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈا کر رہی تھیں۔ ہر آنے والے کو روک کر دعوت اسلامی سے بدظن کرنے کے لیے لمبے چوڑے لیکچر دیئے جا رہے تھے۔ آواز حق کے خلاف ہر وہ بات کہی جا رہی تھی جس سے اسلام کے خلاف نفرت پھیل سکتی ہو۔ ادھر مخالفین ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ ادھر رسول اللہ ایک ایک فرد سے مل کر حق کی ترغیب دے رہے تھے۔

حضرت طفیل بن عمر دوسی رضی اللہ عنہ قبیلہ دوس کے سردار تھے۔ ان کا قبیلہ تہامہ کے علاقے میں مقیم تھا۔ حضرت طفیل رضی اللہ عنہ عرب جتھے میں چوٹی کے سرداروں میں سے تھے۔ بڑے وضع دار اور سخی تھے۔ ان کی مہمان نوازی عرب کے طول و عرض میں مشہور تھی۔ کہتے ہیں ان کے چولہوں پر ہر وقت دیگیں چڑھی رہتی تھیں۔ ان کے دروازے ہر کس و ناکس اور مسافر و اجنبی کے لیے کھلے رہتے۔ امان مانگنے والوں کو امان دیتے پناہ طلب کرنے والوں کو پناہ میں لے لیتے۔ ان خوبیوں کے علاوہ بہت اچھے ادیب، سخنور، نازک خیال، شاعری اور انداز و بیان پر نظر رکھنے والے بہترین

نقاد تھے۔

مکہ پہنچ کر وہ کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی [17] انھیں ادھر کھینچ رہا ہے کہ دیکھنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہتھے نہ چڑھ جانا، کوئی ادھر سے کہتا ہے، دیکھو یہاں ایک جادو اثر کلام رکھنے والا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اس سے بچ کے رہنا۔ الغرض مشرکین نے خوب کان بھرے۔

ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ تو بس زیارت کعبہ کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ اگر انھیں تازہ ترین حالات سے ذرہ بھر بھی واقفیت ہوتی تو یقیناً اس سے نمٹنے کے لیے تیاری کر کے آتے۔

مشرکین کے کہنے سننے پر انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں جائیں گے، نہ اس سے کلام کریں گے اور نہ ہی اس کی کوئی بات سنیں گے۔ مشرکین سے عجیب و غریب کہانیاں سننے کے بعد وہ سوئے حرم چلے تا کہ وہاں پر رکھے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو کر تعظیم وتوقیر کر سکیں۔

اس نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کہیں کانوں میں نہ پڑ جائے۔

حرم شریف میں داخل ہو کر وہ کیا دیکھتے ہیں؟ ایک شخص کعبہ کیساتھ کھڑا نماز پڑھ رہا ہے۔ اس کا طریقۂ تمام عرب کی مروجہ عبادات سے مختلف ہے۔ ان کی یہ رکوع وسجود والی نماز دیکھنے والے مہمان کو پسند آجاتی ہے۔ لاشعوری طور پر وہ موصوف صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوتا چلا گیا۔ اس حد تک قریب چلا گیا کہ نمازی کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اسے بخوبی سنائی دینے لگے۔ نیرنگیِ فطرت دیکھیے۔ کانوں میں روئی ٹھونس کر اسی کلام سے بچنے کا ارادہ لے کر آنے والا دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ سرگوشی کے انداز میں اپنے آپ کو کوستا ہے کہ

اے طفیل تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے تم ایک عقلمند اور سخن شناس ہو۔ اچھے برے کلام سے بخوبی واقف ہو۔ آخر اس کلام کے سننے میں کیا مضائقہ ہے۔ اگر کلام نفیس ہوا تو آمنا۔ اگر برا ہوا تو چھوڑ دینا۔

سوچوں کے یہی تانے بانے بنتے وہ وہیں بیٹھ گئے۔ یہ نمازی وہی محمد ﷺ تھے جن سے آنیوالوں کو ڈرایا جا رہا تھا۔ حضورؐ نے نماز ختم کی اور چل دیئے۔ طفیل بن عمر دوسی رضی اللہ عنہ بھی اٹھے اور ان کے پیچھے چل دیئے۔ حضورؐ اپنے گھر میں داخل ہو گئے تو یہ بھی ان کے پیچھے ان کے گھر میں داخل ہو گئے اور آپؐ سے یوں عرض کیا:

Marfat.com

"اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی قوم نے آپؐ سے متعلق عجیب وغریب قسم کی باتیں سنائیں۔ طرح طرح کے خوف دلائے۔ میں بھی یہاں تک ڈر گیا کہ مصمم ارادہ کرلیا کہ آپ کی بات نہیں سنوں گا۔ اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تا کہ آواز بھی کان میں نہ پڑے، لیکن یہ اللہ کی مرضی تھی جس نے مجھے آپؐ کے قریب کر دیا اور میں وہ شیریں حلاوت آگیں اور سمندر سے بھی گہرا کلام سن بیٹھا جو آپ نماز میں پڑھ رہے تھے۔ اب مجھے اپنا دین بتائیں۔

حضور علیہ السلام نے اسے سورہ اخلاص اور سورہ فلق سنائیں اور دین کی دعوت دی۔ سورہ اخلاص کو دیکھ لو کلام کتنا مختصر، مگر مدلل اور جامع ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ہ

کہو اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی سے جنا گیا نہ اس سے کوئی جنا گیا۔

اس مختصر کلام کی جامعیت دیکھ لیں۔ فصیح و بلیغ بھی ہے اور سلیس و آسان بھی۔ اثر آفرین بھی ہے اور دعوت کا پرچار بھی۔ دین حق کا منشور بھی لیے ہوئے اور توحید کا استدلال بھی۔

حضرت طفیل بن عمرو دوسی سخنور بھی تھے اور سخن شناس بھی۔ سنتے ہی بول اٹھے خدا کی قسم میں نے اس سے اچھا کلام اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ فوراً ہی اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد انّ محمداً عبدہ و رسولہ کہہ کر بیعتِ رسول میں چلے گئے۔

———(((اللہ اکبر)))———

حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ چند دن مکہ میں رہے۔ حسب استطاعت اسلام قرآن اور دین سیکھا۔ اس سے اگلی کہانی ان کی اپنی زبانی سنتے ہیں۔

فرماتے ہیں جانے سے پہلے میں نے عرض کیا یارسول اللہ میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں۔ میرا قبیلہ میری مانتا ہے۔ واپس جا کر خدا کا پیغام قبیلے کو سنانا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسی نشانی عطا کیجئے جو اس سچائی میں مددگار ہو۔

رسول اللہؐ نے دعا فرمائی اللھم اجعل لہ ایۃ یا خداوندا طفیلؓ کو کوئی نشانی عطا فرما"۔

فرماتے ہیں میں سوئے وطن چل پڑا، یہاں تک کہ اپنے قبیلے کی آبادیوں کے قریب پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میری دونوں آنکھوں کے درمیان ایک روشنی پیدا ہوگئی۔ مجھے ڈر پیدا ہوا کہ لوگ دیکھ کر یہ سمجھیں گے یہ صابی ہوگیا ہے۔ اسے دیوتاؤں نے سزا دی ہے۔ اس لیے میں نے دعا کی: یا اللہ اسے کسی اور جگہ منتقل فرما دے۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ یہ نشانی میرے قبیلے نے میری لاٹھی کے سرے پر دیکھی۔

Marfat.com

جب میں گھر پہنچا تو سب سے پہلے میرے بوڑھے والد میرے قریب آئے۔ میں نے کہا:
”ابا جان! پرے ہٹ جایئے۔ نہ آپ میرے باپ، نہ میں آپ کا بیٹا رہا۔“
”بیٹے یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ ہاں ابا جان میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ ”میں تمھارے دین کو چھوڑ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہو چکا ہوں۔“

”بیٹے تمھارا دین میرا دین“ اور یوں انھوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد میری بیوی میرے پاس آئی میں نے اسے بھی دوٹوک کہا مجھ سے دور چلی جا نہ تو میری بیوی نہ میں تیرا خاوند اب میرا تمھارا کوئی رشتہ ناتا نہیں۔ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان یہ کیوں؟ اس نے حیران کن انداز میں پوچھا۔ میں نے کہا میں نے اسلام کی پیروی اختیار کر لی ہے۔

وہ بولی۔ سر تاج جو دین آپ کا ہے، وہی دین میرا بھی ہے۔ پھر اس نے استفسار کیا کہ میں اگر تیرے دین میں آ جاؤں تو میرے بچوں کو ذوشریٰ سے تو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ بعد ازاں وہ بھی حصارِ دین میں آ گئی۔

پھر ابو ہریرہؓ کو میں نے اسلام کی دعوت دی انھوں نے کسی تذبذب کے بغیر فوراً قبول کر لی۔

اور پھر میں ابو ہریرہ کو لے کر خدمتِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوا تو انھوں نے دریافت کیا۔

طفیل تمھارے قبیلے کا کیا حال ہے۔ میں نے عرض کیا ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تمام لوگ کفر و الحاد میں مبتلا ہیں۔

یہ سن کر آپؐ نے وضو فرمایا اور دعا کی:

اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا۔ اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا۔ اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا۔

اے اللہ دوس کو ہدایت دے۔ یہ دعا مکرر تین دفعہ فرمائی۔

اس کے بعد مجھے حکم ہوا اپنے قبیلے میں جاؤ۔ ان کے سامنے نرمی سے اسلام کی دعوت پیش کرو۔

پھر میں غزوۂ خندق تک اپنے قبیلے میں رہ کر اسلام کی تبلیغ کرتا رہا اور فتح خیبر کے بعد جب میں حاضرِ خدمت ہوا تو میرے ساتھ قبیلہ دوس کے اسی (80) گھرانے مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔

رسول اللہؐ ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ باقی مسلمانوں کے ساتھ ہمیں بھی خیبر کے مالِ غنیمت میں شامل کر لیا گیا۔

Marfat.com

ہم نے عرض کیا اے اللہ کے نبی ہم لوگوں کو ہر جنگ میں میمنہ پر مقرر فرمایئے اور ہمارا شعار ''مبرور'' مقرر فرمایئے۔

بعدازاں فتح مکہ تک میں صحبت نبوتؐ سے فیض یاب ہوتا رہا۔ فتح مکہ کے بعد میں نے ذوالکفین کے بت کو جلانے کی خواہش ظاہر کی۔ بارگاہ نبوت سے اجازت مل گئی۔ میں نے اپنے قبیلے کے ساتھ اس کو آگ لگا کر بھسم کر دیا۔ یوں قبیلہ دوس کے باقی ماندہ مشرکانہ آثار بھی راکھ ہو گئے اور باقی ماندہ افرادِ قبیلہ بھی مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

جب بارگاہِ نبوتؐ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے تو طفیل بن عمرو دوسی اپنے قبیلہ کے ساتھ مسیلمہ کذاب کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کا بیٹا عمر بن طفیلؓ تھا، معرکہ یمامہ میں ان کا ایک ہاتھ کٹ گیا اور وہ اسی طرح مدینہ آ گئے پھر جنگِ یرموک میں کٹے ہوئے ہاتھ سے شریک ہوئے۔ بڑی بے جگری سے لڑے اور شہید ہو گئے۔ اللہ ان پر رحمتیں نازل فرمائے یہ شہید ابنِ شہید ہوئے۔

قارئین: یہ تھا مشرکین کی مخالفتوں کا ثمر، ان کے جھوٹ اور بے جا الزامات کا اثر، صرف ایک آدمی کی وجہ سے اسی سے زاید گھرانوں نے اسلام قبول کیا اور دونوں باپ بیٹا تحریک اسلامی سے ایسے وابستہ ہوئے کہ شہادت سے سرفراز ہوئے بغیر نہ بن پڑی۔

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَرَضُوْا عَنْهُ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

مکہ کی مخالفانہ دھول سے اڑتی افواہیں بہت جلد ہی بنی غفار تک جا پہنچیں یہ قبیلہ وادی ودان میں آباد تھا۔ یہ وادی یثرب کی شامی سرحد پر واقع تھی۔ یہ علاقہ اہل یثرب یعنی مکہ اور مدینہ وغیرہ جانے کے لیے ایک طرح بغلی دروازہ (Gate Way) تھا۔ مکہ کی شامی تجارت اسی راستے ہوتی تھی۔ ان کا ذریعہ معاش لگان محصول یا بخششیں اور عطیات پر تھا۔

بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آ کر اس قبیلہ نے عشروں پہلے راہزنی اور ڈکیتی شروع کر دی۔ ان کی ایسی مجرمانہ دھاک بیٹھی کہ پورا یثرب ان سے ڈرتا تھا اور اس قبیلے سے تعلق کو باعثِ شرف سمجھا جاتا۔

اس کے سردار جندب بن جنادہؓ کافی [18] لیاقتوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ بڑے بہادر اور شجاع ہونے کے ساتھ ساتھ دانشمند، حلیم، دوراندیش اور صائب الرائے بھی تھے۔ یہ فطری

Marfat.com

عمل ہے کہ باصلاحیت لوگ ظلم اور جرم کی اندھیر نگری میں زیادہ دیر گزر بسر نہیں کر سکتے۔

اس لیے وہ کافی عرصے سے خاندانی کاموں ڈکیتی اور راہزنی وغیرہ سے تائب ہو چکے تھے۔

وہ عرب میں کسی نجات دہندہ کے متلاشی تھے کہ حضورؐ کے خلاف افواہیں پورے تواتر سے پہنچنے لگیں۔ وہ تو پہلے ہی کسی روشنی کے متلاشی تھے۔

انھوں نے اپنے بھائی انیس کو مکہ بھیجا کہ پتا کر کے آؤ کہ مکہ میں جس کے خلاف افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں، کیا وہ سچ ہے؟ انیس مکہ پہنچے آپؐ کے خلاف افواہوں کی تصدیق کی۔ وہ آپؐ سے ملے اور واپس آ گئے۔

جندب بن جنادہؓ بڑی شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ انیس نے آ کر بتایا کہ میں ایسے شخص سے مل کر آیا ہوں جو اخلاق کی دعوت دیتے ہیں اور ان کا کلام بڑا حلاوت آ گیں اور اثر آفرین ہے یہ کلام شعر و شاعری سے بلند و بالا ہے۔

جندب بن جنادہؓ جسے تاریخ نے ابوذرؓ کی کنیت سے یاد کیا۔ اپنے بھائی انیس سے پوچھتے ہیں۔ لوگ انھیں کیا کہتے ہیں۔

انیس نے بتایا لوگ کاہن، ساحر اور شاعر کہتے ہیں۔

ابوذر بولے بخدا مجھے تمھاری باتوں سے تسلی نہیں ہوئی اس لیے میں خود مکہ جا کر حالات معلوم کروں گا۔ کیا تم میری غیر موجودگی میں میرے اہل و عیال کی کفالت کرو گے۔

انیس نے جواب دیا ٹھیک ہے میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں، لیکن اہلِ مکہ سے احتیاط برتیے گا۔

حضرت ابوذر غفاری زادِ راہ لے کر حرم ہوئے۔ مکہ پہنچ کر وہ اندر سے ڈر رہے تھے کہ مبادہ کسی مخالف کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں۔ سو وہ رات کو حرم ہی میں لیٹ گئے۔ حضرت علیؓ نے دیکھا تو مسافر سمجھ کر گھر لے گئے۔ رات وہاں گزری اور صبح حرم میں آ گئے۔ مارے ڈر کے، نہ کسی سے سوال کیا، نہ کچھ پوچھا۔ شام آئی تو پھر حضرت علیؓ اجنبی مسافر جان کر ساتھ لے گئے۔ اسی طرح یہ رات بھی گزر گئی۔ صبح پھر حرم میں آ گئے۔ آج شام کو پھر حضرت علیؓ مسافر سمجھ کر گھر لے گئے، لیکن آج مکہ آنے کا سبب پوچھا تو ابوذرؓ نے کہا:

"پہلے وعدہ کرو کہ مجھے میرے مطلوب سے ملا دو گے"۔ حضرت علیؓ نے وعدہ کیا تو آپؓ نے مدعا بیان کیا کہ دور دراز سے اس شخص کے متعلق سن کر آ رہا ہوں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔

یہ سنتے ہی حضرت علیؓ کا چہرہ چمک اٹھا۔ وہ یوں گویا ہوئے۔ واقعی وہ اللہ کے رسول ہیں۔

Marfat.com

دیکھو کل صبح میں چلوں تو میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ اگر میں خطرہ محسوس کروں گا تو یوں کھڑا ہو جاؤں گا جیسے پانی ڈال رہا ہوں اور تم سیدھے گزر جانا۔ میں پھر آ ملوں گا، حتیٰ کہ جہاں میں داخل ہوں وہاں تم بھی ہو جانا۔

اگلے دن حضرت علیؓ کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور السلام علیکم یا رسول اللہ کہا۔ حضورؐ نے وعلیکم السلام کہہ کر مصافحہ کیا۔

اس لحاظ سے یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے السلام علیکم کہا۔ بعد ازاں ہر مسلمان کے لیے ایک دوسرے کو ملنے پر سلام کہنا لازم ہو گیا۔

اللہ کے نبیؐ نے اسے کلمہ حق سنایا۔ قرآن کی دعوت دی اور یہ سنتے ہی مسلمان ہو گئے۔

—(((اللہ اکبر)))—

چند دن اور تعلیم و تعلم سے جڑے رہنے کے بعد گھر کا عزم کیا تو حضورؐ نے فرمایا مشرکینِ مکہ سے اس کا اظہار نہ کرنا، لیکن اس جلیل القدر صحابی نے اپنی توہین سمجھا کہ وہ اہلِ مکہ سے ڈر کر اعلانِ اسلام نہ کرے۔

جانے سے پہلے مسجدِ حرام میں گئے، مشرکین کے درمیان کھڑے ہو کر اعلان کیا: ''اے قومِ قریش میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ہی معبودِ کل ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔''

یہ سنتے ہی اہلِ مجلس آپؓ پر ٹوٹ پڑے۔ حضورؐ کے چچا عباس جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، انھوں نے بیچ بچاؤ کرواتے ہوئے کہا: برا ہو تم قبیلہ بنی غفار کے اس آدمی کو مار رہے ہو جو کل تمھارے تجارتی راستے بند کر سکتا ہے۔

حضور ﷺ نے اس حالت میں دیکھا تو فرمایا: ''کیا میں نے اس بات سے منع نہیں کیا تھا؟'' ابوذر نے عرض کیا: ''یہ میرا ارمان تھا جو پورا ہوا'' حضورؐ نے حکم دیا کہ ''اپنے قبیلے میں جاؤ۔ انھیں راہِ ہدایت کی دعوت دو۔ ممکن ہے تمھارے ذریعہ ان کی ہدایت تمھارے لیے ثواب کا باعث بن جائے اور جب سن لو کہ میں غالب آ گیا ہوں تب میرے پاس آ جانا۔''

انھوں نے واپس جا کر اپنے بھائی انیس اور اپنی والدہ کو مسلمان کیا پھر تینوں نے مل کر اپنے قبیلے کو اسلام کی طرف بلایا۔ قبیلہ بنی غفار کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ باقی لوگوں نے وعدہ کیا کہ جب نبی مدینے آئیں گے، ہم وہاں جا کر اسلام قبول کر لیں گے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں حاضر ہو کر ان لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

حضرت ابوذر نے وصالِ رسالت مآب سے دس سال بعد 20 ہجری میں داعیِ اجل کو لبیک

Marfat.com

کہا۔ان کے متعلق رسول اللہؐ نے فرمایا تھا:

"زمین کی پشت پر اور آسمان کے زیرِ سایہ کوئی شخص ابوذرؓ سے زیادہ سچا نہیں۔"

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَرَضِی عَنْہُ

عمرو بن ابو سلمیؓ

یہ صحابی بھی مشرکین کے مخالفانہ پروپیگنڈا کی وجہ سے مسلمان ہوئے اور اسلام کے لیے سرمایہ افتخار بنے۔ان کے پورے حالات و واقعات طوالت کے خوف سے نہیں لکھے، وگرنہ ان کے محاسنِ واطوار اور جرات وشجاعت کے بیشمار کارنامے ہیں۔

بہرحال ان کا قبول حق بھی مشرکین کے منہ پر بہت بڑی چپیڑ تھی۔عام حالات میں اسلام کا پیغام ان تک شاید بہت دیر سے پہنچتا، لیکن شدید مخالفت میں پھیلائی جانے والی افواہوں نے ان کو بہت جلد باخبر کر دیا جبھی تو جستجو کرتے کرتے مکہ پہنچے۔تین دن چھپ چھپ کر تصدیق کے مراحل طے کرتے رہے۔تصدیق ہوگئی تو فوراً مسلمان ہو گئے۔

اس لیے یہ بات بلاتامل کہی جا سکتی ہے کہ مخالفین کی شدید مخالفت نے ہمیشہ اسلام کو فوائد سے ہمکنار کیا۔

حضرت ضماد ازدی کا قبول اسلام

یہ واقعہ بھی بڑا عجیب وغریب اور حیران کن اور موضوع کے لیے عین دلیل ہے۔

آپ کا نام ضماد[19] بن ثعلبہ تھا۔قبیلہ ازد کی شاخ ازدِ اشنوءہ سے تعلق رکھتے تھے۔اپنے دور کے بہترین ماہر طب وجراحت اور عاملِ جنون وآسیب تھے سینکڑوں افراد ان کے ہاتھوں شفایاب ہو چکے تھے بس جس پر ہاتھ رکھتے،اللہ کے فضل سے تندرست ہو جاتا۔

جن دنوں مشرکین مکہ نے اسلام کی ثقافتی یلغار یعنی قرآن کے متعلق جھوٹی مہم چلائی ہوئی تھی انھی دنوں ضمادؓ مکہ تشریف لائے۔

مکہ کی کسی ٹولی نے شہر کے باہر ہی روک کر حضورؐ کے خلاف واہی تباہی بکنا شروع کر دی۔ عجیب وغریب قسم کی کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ایک غیر معمولی اور اجنبی شخص کے خلاف اتنی تندوتیز زبانیں نوآموز میں تجسس بیدار کرنے کے لیے کافی تھیں۔

حضرت ضماد شہر میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ شہر کے چند اوباش ان پر اینٹیں

برساتے اور مجنون مجنوں کہتے جاتے ہیں۔

ضمادؓ بھی سمجھے کہ آپؐ واقعی مجنوں ہیں۔ وہ مسیحا تھے۔ علاج کر سکتے تھے۔ سوچا کیوں نہ کوشش کر کے دیکھی جائے۔ شاید اللہ میرے ہاتھوں شفا دے دے۔

چنانچہ حضورؐ کے پاس گئے اور عرض کیا۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کا علاج کر سکتا ہوں۔

سرد جنگ میں عموماً اس قسم کی کارروائیاں بانی انقلاب کی شخصیت کو کمتر دکھانے کے لیے کی جاتی ہیں تاکہ عام لوگ اس کو عام آدمی اور اس کی مخالفت کو بچوں اور اوباشوں کی کھیل سمجھ کر توجہ نہ دیں۔

نہ کوئی غیر معمولی شخص سمجھے اور نہ کوئی قریب جائے اور نہ ہی اثرات قبول کرے۔ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ غیر معمولی لوگوں سے ملنا باعث فخر سمجھتا ہے۔ اس قسم کی ملاقات اس کی زندگی کا تاریخی واقعہ قرار پاتی ہے۔ مشرکین بھی شاید اس قسم کی کارروائیوں میں بچوں اور کھلنڈروں کو اسی مقصد کے تحت استعمال کرتے تھے تاکہ کسی کو سرداروں کی مخالفانہ مہم کا علم ہی نہ ہونے پائے۔

پہلی نظر میں تو ضماد ازدی نے بھی آپ کو عام آدمی سے زیادہ اہمیت نہیں دی، آپ کو مجنون ہی خیال کیا۔ جبھی تو آپ سے کہا:

"اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کا علاج کر سکتا ہوں۔"

جواب میں سبحان اللہ رسول اللہؐ نے کیسا مدلل جواب دیا:

کلمہ شہادت ادا کیا، خدا کی حمد و ثناء بیان فرمائی۔ اس کے بعد چند حلاوت آگیں قرانی الفاظ ادا کیے اور بس۔

اور پھر جو ہوا، اس نے پورے مکہ میں ہلچل مچا دی ہوگی۔ ضمادؓ نے وہی بیان تین بار سننے کی فرمائش کی۔ حضورؐ نے پہلا بیان تین بار سنا دیا۔ اس تین بار سننے میں بھی ایک حکمت پوشیدہ ہے۔ چونکہ ضمادؓ آپ کو آسیبی اور جنونی خیال کر رہے تھے۔ وہ معالج کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ سچائی تو پہلے بیان پر ہی کھل کے سامنے آ گئی، مگر اب تصدیق کر رہے تھے کہ کہیں آسیب زدوں یا مجنونوں کی سی جھول تو نہیں۔ آج کل ماہرین نفسیات کچھ اسی طرح علاج کرتے ہیں۔

آپ تیسری بار لفظ بہ لفظ تصدیق کر لینے کے بعد پکار اٹھے۔ میں نے کاہنوں کو سنا۔ شاعروں کو سنا، ساحروں کو سنا، مگر آج تک ایسا اعلیٰ و ارفع کلام نہیں سنا۔ یہ تو سمندر کی تہہ تک پہنچتا ہے اور پھر اپنی

Marfat.com

اور اپنی قوم کی طرف سے اسلام قبول کرلیا یعنی ان کا قبول اسلام پورے قبیلہ ازد کا قبول اسلام تھا۔

(((اللہ اکبر)))

یقیناً اس واقعہ نے پورے مکہ کو تھرا کے رکھ دیا ہوگا۔

اس کے علاوہ [20]حضرت عمر بن غنبسہ نے عکاظ کے بازار میں اسلام قبول کیا۔ یہ بنی سلیم میں سے تھے۔ عکاظ میں اسلام قبول کرنے کا مطلب یہی ہے کہ وہاں بھی مخالفین کی مخالفانہ کارروائیاں زوروں پر تھیں اور حضور بھی دعوت حق لے کر وہاں جاتے تھے۔

یاد رہے یہ ایک تجارتی نمائشی میلے کا نام ہے۔ اس قسم کے کئی میلے عرب میں منعقد ہوتے تھے جن میں صنعت و تجارت کے علاوہ اس دور کے فنون لطیفہ اور فنون حرب و ضرب کے مظاہرے بھی کیے جاتے تھے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری

حضرت ابو موسیٰ اشعری [21]یمن سے مکہ آئے تو حضورؐ سے متاثر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ واپس جا کر اپنے بھائیوں ابو بردہ اور ابو رھم کو مسلمان کیا۔ پھر تینوں بھائیوں نے پچاس آدمی اور مسلمان بنائے۔

حضرت معیقیب بن فاطمہ الدوسی

حضرت معیقیب [22]بن فاطمہ الدوسی نے بھی مکہ ہی میں اسلام قبول کیا۔ یہ بھی حضرت طفیل بن عمر دوسی کے قبیلہ میں سے تھے۔

حضرت جعالؓ بن سراقہ

حضرت جعال [23]بن سراقہ نے بھی یونہی مکہ آ کر اسلام قبول کیا۔ یہ قبیلہ بنی ضمرہ کے چشم و چراغ تھے۔

عبداللہ اور عبدالرحمٰن کنانی

عبداللہ اور عبدالرحمٰن [24]کنانی دونوں بھائی تھے۔ لھیب کے بیٹے تھے۔ کنانہ کے رہنے والے تھے۔ مکہ آئے تو مشرکین نے گھیر لیا۔ ان سے جان چھڑا کر حضور انور سے حرم شریف میں

Marfat.com

ملے، متاثر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔

بریدہ بن الحصیبؓ

حضرت بریدہ[25] بن حصیبؓ بنی خزاعہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ جب آپ مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے جا رہے تھے، راستے میں ایک مقام غمیم پر اپنے خاندان کے اسی (80) گھرانوں کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ یقیناً پہلی دفعہ راستے چلتے ہوئے ملنے پر ایک ساتھ اسی گھرانوں کا مسلمان ہو جانا کافی مشکل سا مسئلہ ہے۔

یقیناً یا تو پہلے درس توحید سے خود متاثر ہو چکے ہوں گے اور اپنے پورے قبیلہ کو قائل کر لیا ہو گا یا پھر مخالفین کی مخالفت نے خود بخود ثابت کر دیا ہو گا کہ جس کی مخالفت کی جا رہی ہے، وہ سچا ہے اور جو مخالفت کر رہے ہیں، وہ جھوٹے ہیں۔

بہر حال یہ جو کچھ بھی تھا یہ سچ ہے کہ مخالفین آپؐ کو بدنام کرنے کے لیے آپؐ سے پورے عرب کو بدظن کرنے کے لیے اپنی سی کر گزر رہے تھے، لیکن خدا نے اسی مخالفت کو ذریعہ سعادت بنا دیا۔ اسی وجہ سے آپؐ پورے عرب میں مشہور و معروف ہو گئے۔

اسی مخالفانہ روش نے تحریک اسلامی کو نشر و اشاعت کی بام عروج پر لا کھڑا کیا۔

ہر سننے والے کے اندر سے ایک بے پناہ تجسس ابھرا کہ جس کی اتنی مخالفت کی جا رہی ہے، جس کا اتنا نام لیا جا رہا ہے، اس سے مل کر تو دیکھا جائے، اسے مل لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ سچ اور جھوٹ کا نتارہ تو ہو جائے گا۔

اور یوں لوگ آپؐ کے قریب آتے رہے، فیوض نبوتؐ سے سیراب ہوتے رہے۔ مخالفین کی آگ ٹھنڈی ہونے کی بجائے اور بھڑکتی رہی۔

اور میں داد دینا چاہتا ہوں صاحب سیرت سرور عالم کو کہ انھوں نے اس موضوع پر کیا خوب لکھا ہے سورہ الم نشرح میں کیا خوب انداز پیش کیا ہے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کی کیا خوب تفسیر فرمائی ہے۔

لکھتے ہیں کہ یہی بات ہے جس کے متعلق سورۃ الم نشرح میں اللہ نے فرمایا ہے کہ مفہوم: آپؐ اس جھوٹے پروپیگنڈہ سے دل شکستہ کیوں ہوتے ہو۔ ہم نے تو آپ کے دشمنوں کے ذریعہ ہی آپ کا آوازہ بلند کر دیا۔

—(((الحمد للہ)))—

Marfat.com

مخالفین نے ابتر کہا تو (نعوذ باللہ)

یہ بھورا (Brown) پروپیگنڈہ تھا جس میں کسی فطری محرومی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے یعنی الفاظ کی معنوی تاثیر میں ردوبدل کر کے غلط توجیہ پیش کی جاتی ہے جس میں کسی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے عوام الناس کے ذہنوں میں انتشار پیدا کیا جاتا ہے۔

مکہ میں اس طرح کی کارروائیاں زوروں پر تھیں چاہیے تو یہ تھا کہ جواب میں جارحانہ اقدامات عمل میں لائے جاتے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات انتقامی سوچ اور فکر سے بالا تھی۔ بڑی خندہ پیشانی سے ہر دکھ برداشت کیا۔

ادھر اپنوں کے لگائے ہوئے زخم ابھی بھرے بھی نہ تھے یعنی ابولہب نے آپؐ کی دو بیٹیوں [26] رقیہ اور ام کلثوم کو طلاق دلوادی تھی جسے خاندانی محاذ پر تفصیلاً بیان کیا جا چکا ہے۔

ادھر خدا کی حکمتوں پر قربان کہ آپؐ کے ہاں دو بیٹے قاسمؓ اور عبداللہ پیدا ہوئے، دونوں شیر خوارگی ہی میں فوت ہو گئے۔

دوسرے بیٹے عبداللہؓ [27] کا انتقال ہوا تو میت ابھی گھر میں پڑی تھی، سگے چچا ابولہب جس کا گھر دیوار کی آڑ میں تھا۔ خونی رشتہ، جسے کل بھی اور آج بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ جھوٹے منہ ہی سہی، بھتیجے کے گھر جا کر ہمدردی کے دو چار الفاظ ضرور بولے جاتے، مگر...... مگر...... وہ...... تو جد مار قسم کے انسانوں کی قبیل سے تھا۔ یہ موت اس کے لیے ہلال عید بن گئی۔

پورے شہر میں دوڑ دوڑ کر یہ خوش خبری سنانے لگا کہ: (نعوذ باللہ)

بتر محمد اللیلہ آج رات محمد کی جڑ کٹ گئی وہ لاولد ہو گئے۔ (نعوذ باللہ)

پوری پوری رات سوچ سوچ کر عاص بن وائل سہمی نے لفظ ابتر گھڑا جس کے معنی جڑ کٹا یا ایسا جس کی نسل نہ ہو (نعوذ باللہ)۔ اس لفظ کا ایجاد ہونا تھا کہ صبح تک حضورؐ کے نام کے ساتھ ابتر کی تشہیر ہو چکی تھی۔ اس نئی اصطلاح کو مخالفین نے خوب ہوا دی۔ خوب چرچا کیا۔

ابوجہل...... عاص بن وائل...... امیہ بن خلف...... ابولہب...... ولید...... عتبہ...... شیبہ اور

Marfat.com

باقی سرداران قریش ہر جگہ، ہر محفل میں بس ابتر کی تشہیر کرتے چلے گئے۔اس ناگوار لفظ کی ناگواری پھیلاتے چلے گئے۔

اس لفظ کی دوہری کاٹ تھی۔ایک تو رسول اللہؐ بیٹوں کے غم میں نڈھال تھے، یہ بدنامی سنتے تو غم دوچند ہو جاتا۔

دوسرے اس پروپیگنڈا سے عام لوگوں میں یہ تاثر پھیل رہا تھا کہ دیکھو جو اپنی اولاد کے لیے کچھ نہیں کر پایا، وہ دوسروں کے لیے کیا کرے گا۔جو اپنے خدا سے اولادِ نرینہ نہیں بچا سکا، وہ دنیا و آخرت میں اُمّت کیسے بچائے گا۔یہ تو خود لاولد ہو گئے۔ان کا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔ان سے کیا امید کی جا سکتی ہے، کیا توقع وابستہ کی جا سکتی ہے۔(نعوذ باللہ)

چنانچہ مشرکین نے یہ لفظ خوب اچھالا۔وہ کہتے۔بتر محمد منا محمدؐ ہم سے کٹ گئے۔عاص بن وائل فرداً فرداً کہتا رہے یہ بے نسلے ہیں۔ان کا کوئی نام لیوا نہیں۔یہ مٹ جانے والا نام ہے اور ان سے بہت جلد تمھارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔(نعوذ باللہ)

یوں لفظ ابتر کا اتنا پروپیگنڈہ ہوا کہ ہر خاص و عام کی زبان پر چڑھ گیا، کارکنان حق کے سر چڑھ کر بولنے لگا۔حق کے ماننے والوں کا ابتر ابتر کہہ کر مذاق اڑایا جاتا۔کئی تو اس حد تک کہہ جاتے، یہ بڑے احمق لوگ ہیں جنھوں نے ایک لاولد، جڑ کٹے کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر رکھا ہے۔اس لفظ نے صحیح معنوں میں مسلمانوں کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔(نعوذ باللہ)

بھورے (Brown) پروپیگنڈا کے حوالہ سے یہ بڑا موثر نعرہ تھا۔اس کا مفہوم بڑی کامیابی سے تاثر پھیلا رہا تھا۔اس کی عینک سے دیکھنے والوں کو واضح نظر آ رہا تھا کہ اسلام کا کوئی مستقبل نہیں۔تو ہم پرست لوگ مسلمانوں کے قریب جانے سے ڈرتے تھے کہ کہیں ہم بھی محمدؐ کی طرح ابتر نہ ہو جائیں۔(نعوذ باللہ)

———(((اللہ اکبر)))———

یہ بڑے گھناؤنے لوگ تھے۔بڑے رذیل خیالات کے پروردہ تھے۔اس طرح کے پروپیگنڈا کی طوالت تحریکوں، تنظیموں یا قوموں کے خلاف زہرِ قاتل بن جاتی ہے۔اب کے جواب ضروری تھا۔مزید طوالت یا انتظار انقلاب کے اثرات پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔

پروپیگنڈا یا پبلسٹی کی تکنیک کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ایسے آسان اور رواں نعروں کے خلاف کوئی تردیدی تقریر یا مفصل بیان کارگر نہیں ہوتے۔اس کی کاٹ کسی آسان سلیس اور رواں نعرے سے ہی ممکن ہو سکتی ہے۔کوئی ایسا لفظ ہی اس کے اثرات زائل کر سکتا ہے

Marfat.com

جو وزن اور حجم میں اس کے برابر ہو اور معنی آفرینی اور اثر انگیزی میں اس سے بلند و برتر ہو۔ اس کا مفہوم اتنا جامع ہو کہ مخالف لفظ اس کی گرد میں گم ہو جائے۔ مخالف تحریک پر مسلسل چوٹ کرتا رہے اور مقابل کی ناگواری کے مقابلہ میں خوشگوار اور لطیف دھڑکنیں تیز کر دے اور عام معنی کے بجائے تجسس اور جستجو کے جذبے خود بخود زندہ ہو جائیں۔

لفظ ابتر کے مقابلہ میں بھی کسی ایسے ہی فصیح و بلیغ اور جامع نعرے کی ضرورت تھی جو آخر کار اللہ تعالیٰ نے وحی میں بیان فرما ہی دیا۔

اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝

مفہوم: بے شک ہم نے تمھیں کوثر عطا کیا۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝

مفہوم: تم اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی دیا کرو۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝

مفہوم: بے شک تمھارا دشمن ہی لاولد یا جڑ کٹا رہے گا۔

سورہ الکوثر۔

تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں کوثر کے لغوی معنی رحمتوں، بھلائیوں نعمتوں اور کثرتِ فیض کے ہیں۔

یہ سورۃ جب مشرکین کے سامنے تلاوت ہوئی تو وہ مبہوت رہ گئے۔ اس کے ادبی حسن اور معنی آفرینی پر مخالفین کے دل بھی اچھل پڑے۔ اس کی فصاحت اور بلاغت پر وہ بھی لوٹ پوٹ ہو گئے۔

اہل عرب ادب شناس و ادب گر تھے۔ اپنی علمی و ادبی دانشوری کے مقابل پوری دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے۔ اسی لیے باقی دنیا کو عجمی یعنی گونگے کہتے تھے۔

مگر لفظ کوثر ان کے ادراک سے باہر تھا، سننے والے بس سوچتے ہی رہ گئے۔ لفظ کوثر کے بھرپور تجسس میں پھنس پھنس گئے۔ ہر کوئی معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھنے لگا، کوثر کسے کہتے ہیں کس چیز کا نام ہے۔

کل تک لفظ ابتر مسلمانوں کی چڑ بنا ہوا تھا۔ آج لفظ کوثر ادیبوں اور دانشوروں کے لیے مخمصہ۔ کل تک جو زبانیں ابتر ابتر سے مسلمانوں کو چھیڑ رہی تھیں، آج ان پر لفظ کوثر تجسس اور تلاش کے اثر سے تیر رہا تھا۔

Marfat.com

ماہرین سخن وادب لفظ کوثر کے پر تجسس حصار میں پھنس گئے۔ان سے گلیوں، بازاروں اور محفلوں میں پوچھا جارہا تھا کوثر کیا ہے۔

استادان سخن وادب ذرا بتایئے تو سہی کوثر کس چیز کا نام ہے۔ ہر محفل ہر مجمع میں یہی تکرار کہ کوثر کیا ہے۔ ہر خاص وعام کی سوچ اور فکر بس لفظ کوثر کے تابع ہو کے رہ گئی، مگر کوئی معنی، کوئی جواب ندارد۔

(((اللہ اکبر)))

سرد جنگ کے ثقافتی محاذ پر پہلی کامیابی یہ گنی جاتی ہے کہ مقابل پروپیگنڈا سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کا کوئی ایسا ذریعہ تلاش کیا جائے، کوئی ایسا لفظ یا نعرہ استعمال کیا جائے کہ لوگ خود بخود مقابل پروپیگنڈا کو بھول جائیں۔

اس دور کے ماہرینِ پبلسٹی اپنی مصنوعات کا نام تجویز کرتے وقت مقابل مصنوعات کے ناموں کا بغور جائزہ لیتے ہیں تاکہ تجارتی منڈی میں مخالف مصنوعات کا مقابلہ یا کاٹ بس اپنے نام سے ہی کر دیا جائے۔ اس لیے کوئی ایسا آسان، عام فہم اور تہذیب وثقافت یا تاریخی ورثوں سے وابستہ نام رکھا جائے۔ بس ان کی پیداوار (Production) کا نام آسانی سے زبانوں پر تھرکنے لگے۔ لوگ ان کی چیز خریدیں نہ خریدیں، مگر نام ان کا ہی زبان پر آسکے۔ مقابل نام تو بس لوگ بھول جائیں۔

ذرا غور کیجئے لفظ ابتر اور کوثر کے حروف تعداد میں چار چار ہیں، دونوں کے دو دو جزو ہیں "اب"، "تر" اور "کو"، "ثر" وزن اور حجم بھی دونوں کا ایک ہے اور قافیہ اور ردیف بھی ایک ہے۔ سب سے بڑی ادبی نفاست دیکھئے کہ دونوں کے اعراب تقریباً ایک جیسے ہیں۔

پبلسٹی یا پروپیگنڈا کے اصول کے مطابق لفظ کوثر بظاہر تو لفظ ابتر کے مقابلے کا لفظ ہے، مگر سوال یہ ابھرتا ہے کہ لفظ کوثر نے لفظ ابتر کی کاٹ کیسے کی، لفظ کوثر نے لفظ ابتر زبانوں سے صاف کیسے کیا۔ آیئے اس کا بھی جائزہ ہو جائے۔

سرد جنگ میں عموماً وہی لفظ نعرہ بنتا ہے جو پروپیگنڈے کے پہلے اصول یعنی تجسس کو ابھار سکے، پر پورا اترے۔ اگر تجسس نہ ابھر سکا تو نعرے کی تشہیر یا پبلسٹی نہیں ہوگی۔

پروپیگنڈا کا دوسرا اصول یہ ہے کہ تجسس برقرار رکھنا۔ اگر نعرہ معنی خیز رواں، سلیس اور گہرا نہیں تو تجسس برقرار نہیں رہے گا۔

ابتر ایک ایسا لفظ تھا جو عام مستعمل تھا جسے معنی ومفہوم کے لحاظ سے پہلے بھی لوگ جانتے

Marfat.com

تھے۔اس میں سوگواری، ناگواری اور پریشانی ہے، یہ بیچے پن کا اظہار کرتا ہے۔خود تو معنی میں کٹا ہوا ہے، لیکن جس شخصیت کے ساتھ لگ جائے، وہ بھی کٹی ہوئی تصور کی جاتی ہے۔

یہاں بھی یہ اپنے منفی مطالب و معنی میں استعمال ہوا۔اس میں ادبی حسن ہے، نہ فصاحت و بلاغت۔یہ کہنے اور سننے والے دونوں میں مایوسی کا تاثر پیدا کرتا ہے اور یہ انسان کی نفسیاتی فطری کمزوری ہے کہ وہ زیادہ دیر مایوسی کے ساتھ نہیں گزار سکتا، خواہ مایوسی ایک واشگاف حقیقت بن کر ہی سامنے نہ کھڑی ہو۔

انسان تو فطرتاً امید کا خوگر اور خوش فہمی کا پروردہ ہے۔خیالاتی سبز باغوں کا متلاشی ہے اس لیے جس جس لفظ یا جس نعرے میں مایوسی اور ناگواری ہو اس کی فطرت تجسس کے فطری جذبے ابھرنے ہی نہیں دیتی اور وقتی اثر ہو بھی جائے تو تسلسل قائم نہیں رہتا۔اگر تجسس ابھرنے کا تسلسل قائم نہ رہ سکے تو اس لفظ یا نعرے کی پبلسٹی یا چرچا نہیں ہو پاتا۔

جب تک کوئی لفظ یا نعرہ اصطلاحی اور خفیہ معنی میں لپٹا ہوا نہ ہو، اس وقت تک وہ پرتاثیر ہو ہی نہیں سکتا۔ان خفیہ یا اصطلاحی معنی کی زمین اتنی وسیع اور زرخیز ہو کہ ہر نئے معنی سامنے آنے کے بعد فطری تجسس تقاضا کرے، کہیں چلمن کے پیچھے ابھی اور بھی کچھ ہے۔اس کو مزید ٹٹولنے اور تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور اسی پردے کے پیچھے کچھ ہونے لفظ کوثر میں بھرپور تجسس پیدا کر دیا۔

———(((الله اکبر)))———

ہر زبان پر سوال ابھرا اور اس سوال کے حل نے ایک طوالت اختیار کر لی۔یوں تجسس ابھرا اور تسلسل قائم ہوا۔مخالفین نے اس کے معنی تلاش کرتے کرتے اتنی تشہیر اور اشاعت کر دی کہ یہ لفظ کوثر پروپیگنڈا کی تمام منازل طے کر گیا۔

مشرکین غیر ارادی طور پر اپنی ایجاد لفظ ابتر بھول کر پوری سیادت، پوری دانشوری، پوری ادبیت اور سخنوری سے لفظ کوثر کے حصار میں پھنستے چلے گئے۔

تجسس اور تسلسل کے بعد پروپیگنڈا کا تیسرا مرحلہ تشریح اور وضاحت کا ہوتا ہے۔اس مرحلہ پر وہی لفظ بھرپور وفا کرتا ہے جو نظریاتی تحریکی یا ملکی نصب العین اور تحریک کی بانی شخصیت پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہوا پوری طرح وضاحت کرتا ہو۔پروپیگنڈا کے اس اصول پر پورا اترنے والا نعرہ بانی تحریک اور نصب العین کے لیے نشان بن جاتا ہے۔

لفظ کوثر کے متعلق صاحبان تفسیر نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے مطابق کوثر کے معنی خیرِ کثیر اور فیضانِ نعمت وغیرہ کے ہیں۔اس خیر کثیر میں موت اور بعد الموت اٹھانے جانے کا عقدہ کھلتا ہے

Marfat.com

اور عقیدہ توحید راسخ ہوتا ہے۔ جسے یہ نعمت دینے کا اعلان کیا جارہا ہے، وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جس کلام کو ذریعہ بنایا گیا ہے، وہ کلام الٰہی ہے اور جس کے ذریعہ یہ کلام وحی کیا جا رہا ہے، وہ اللہ کا فرشتہ ہے۔

اس طرح لفظ کوثر میں نصب العین اور شخصیت کا امتزاج ہے۔ خیر کثیر میں اللہ، اس کا دین، اس کا رسولؐ، اس کا کلام، اس کے فرشتے اور عقیدہ آخرت وغیرہ سبھی کچھ پنہاں ہے۔

اس کی تشریح اور وضاحت ہوتی ہے کہ یہ ایک وسیع وعریض [28] حوض ہے جنت سے آنے والی نہروں کا منہ یہاں کھلتا ہے۔ آخرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حوض کوثر کے ساقی ہوں گے۔ جو لوگ اس دنیا میں سنت نبویؐ کی اتباع کریں گے، آخرت میں آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے ہاتھوں ان مطیع امتیوں کو پانی پلائیں گے۔

اب ذرا دیکھئے لفظ ابتر یعنی دم کٹا کتنا ناگوار اور مایوس کن لفظ ہے۔ اس کے مقابلہ میں بے آب وگیاہ صحرائے عرب میں لفظ کوثر کے ساتھ ٹھنڈے اور میٹھے اور نہروں کے ذریعہ وافر پانی کا تصور کتنا فرحت بخش ہے۔

صحرائی تپش اور پانی کی قلت میں پلنے والا انسان تصورات میں سبزہ زاروں، سرسبز و شاداب وادیوں اور نہری ساحلوں پر کھڑے ٹھنڈی چھاؤں والے درختوں اور اس پانی سے سیراب ہونے والے انواع واقسام کے باغات میں پہنچ جاتا ہے۔

اس لیے لفظ کوثر میں خوش فہمی اور تجسس بھی ہے اور امیدوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بھی۔ نہروں کا وافر پانی خوش آئند مستقبل کے ساتھ ساتھ خوشحالی کے احساسات کو لوریاں دینے لگتا ہے۔

مخالفین جب اس کے معنوی اور لغوی تجسس میں ڈوب کر اصحابِ رسولؐ سے کوثر کی تشریح طلب کرتے تو خود بخود عقائدِ باطلہ مٹتے جاتے اور عقائد اسلام زندہ ہوتے چلے جاتے۔

اور آخر میں حسین وجمیل احساسات پیدا کرنے کے بعد مخالفین پر زور دار کلہاڑا زنی کر دی کہ اے ابتر ابتر کہنے والو یاد رکھو تم ہی ابتر رہو گے۔ سورہ کوثر کی آخری آیت۔

بے شک تمہارا دشمن ہی دم کٹا ہے۔

کہہ کر تمام مخالفین کو بے نام ونشان کر دیا۔ کیونکہ وہ صاحب خیر کثیر نہیں۔ پھر واقعی آپ کے دشمنوں کی دم کٹ گئی۔ وہ بے نسلے ہو گئے۔

آج ابولہب، ابوجہل، عتبہ، شیبہ، ولید کا کوئی نام لیوا نہیں، جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان

Marfat.com

کے ماننے والوں پر دنیا کے کونے کونے میں روزانہ لاکھوں کروڑوں افراد درود و سلام بھیج رہے ہیں۔

———(((اللہ اکبر)))———

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ ٥ [29]

لاؤ تمھارے پاس ہے کوئی دلیل اس جیسی۔

تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ حرم شریف کی دیواروں پر اعلیٰ وارفع کلام ٹانک دیا جاتا اور جب تک اس کے مقابل کوئی کلام سامنے نہ آ جاتا اس وقت تک وہی کلام معلق رہتا۔ گویا یہ ایک طرح کا چیلنج تھا کہ اگر کوئی اس کا مقابلہ کر سکتا ہے تو کرے۔

اس معاملہ میں ابوجہل کا حکم یا فیصلہ قطعی ہوتا۔ ابوجہل ہی جانچ پڑتال کرتا وہ پہلا کلام مٹاتا اور نیا کلام لکھواتا تھا۔

سورۃ کوثر نازل ہوئی تو مسلمانوں نے اسے کعبہ کی دیواروں پر لکھ دیا۔ بعض روایات کے مطابق حضرت عمر نے اسے کعبہ کی دیواروں پر لکھا اور نیچے هَاتُو اَبُرْهَانُكُمْ لکھ دیا، یعنی لے آؤ اگر کوئی دلیل تمھارے پاس ہے تو۔

یہ چیلنج پڑھ کر جو بھی لفظ جوڑنے کی ہمت رکھتا تھا، دو چار لفظ جوڑے اور لیے چلا آ رہا ہے...... کیوں ہے ناں سورہ کوثر کا جواب؟۔

فصحائے قریش مخالف ضرور تھے، مگر ادب شناسی بھی ان پر ختم تھی۔ وہ آرام سے اس نئے کلام کی تردید کر دیتے کہ نہیں یہ کوثر سے لگا نہیں کھاتا۔ اس نئے کلام کی شہرت مکہ سے باہر قبائلِ عرب تک بھی پہنچ گئی۔ حج کے موقع پر باہر سے آنے والے خطیبوں، نقیبوں، ادیبوں اور شاعروں نے بھی خوب زور آزمائی کی، مگر سورہ کوثر کے حسن و جمال کے سامنے کسی کی ایک نہ چل سکی۔

آخر ابوجہل نے تنگ آ کر اس کے آگے لکھ دیا:

مَاهٰذَآ قَوْلُ الْبَشَرْ ٥

مفہوم: یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔

وہ لوگ بڑے ظالم تھے۔ دیکھ لیں وہ ابھی ابھی قرآن کی حقانیت مان رہا ہے، یہاں سے باہر نکلے گا تو صاف مکر جائے گا۔ کتنے تضاد کا شکار تھے وہ لوگ۔

بہرحال سورۃ کوثر کا یہ چیلنج بھی بہت بڑی تشہیر کا ذریعہ بن گیا۔ اتنی بڑی سچائی پر کئی مرمٹے ہونگے۔ حج کے لیے آنے والے جہاں جہاں سے گزرے، جہاں جہاں ٹھہرے، سورۃ کوثر کی

Marfat.com

شکل میں اللہ، اس کا رسول، عقیدہ آخرت اور کلام الٰہی کے سچا ہونے کی بحثیں چھیڑتے اور چھوڑتے گئے۔

یوں سورہ کوثر نے مخالف پروپیگنڈا ابتر کا کچومر نکال کے رکھ دیا اور دور دور تک اشاعتِ اسلام کے مواقع آسان کر دیئے۔

یقیناً سورہ کوثر مخالفین کے منہ پر بہت بڑا آسمانی طمانچہ تھی۔ ہوش کے ناخن لیتے تو پرانی روش چھوڑ کر حصارِ دین میں داخل ہونے کی سعادت پا لیتے یا کم از کم رسولِ عربیؐ اور کارکنان انقلابِ اسلامی کے خلاف گھٹیا حرکت سے باز آ جاتے۔ مگر ہائے ری بدنصیبی! یہ لوگ تو کسی اور ہی قبیل کے انسان تھے۔

فترۃ وحی پر ایک اور اشکال ان کے ہاتھ آ گیا اور وہ اسے اچھالنے لگے۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

اور جب وحی رکی تو (فترۃ وحی)

ابلیس کی مجلس شوریٰ کی ہر پالیسی ناکام ہورہی تھی۔ دارالندوہ میں بننے والا ہر منصوبہ فیل ہو رہا تھا، لیکن وہ انتہائی سخت تھے انھیں نہ تو شرم محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی جھوٹی تشہیر سے باز آ رہے تھے۔

ان تازہ تازہ ناکامیوں کے ازالہ کے لیے ایک بار پھر حرم شریف میں مجلس آرا تھے۔ جلوس بنائے بھانت بھانت کی بولی بول رہے تھے طرح طرح کی چھوڑ رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ فرشتہ ورشتہ کوئی نہیں آتا بس خود ہی فقرے جوڑ کر لے آتے ہیں۔ بس دل سے جوڑے ہوئے فقرے سنا دیئے جاتے ہیں۔

کوئی کہتا ویسے ایک بات ماننی پڑے گی، اگرچہ یہ فقرے دل سے ہی جوڑے ہوتے ہیں۔ ہوتے بڑے مزیدار ہیں۔ ایسا کلام [30] اس سے پہلے کبھی نہ سنا۔ اس سے پہلے اس قسم کا کلام کبھی کسی شاعر، مقرر، خطیب یا ادیب نے پیش نہیں کیا۔

کوئی اور کھلنڈرا اچھل اچھل پڑتا۔ ہاں ہاں یہ سب کچھ سچ ہے، مگر لگتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضے میں کوئی جن ہے جو اسے سکھاتا پڑھاتا ہے۔

کوئی کہتا دیکھو بھئی سوچنے کی بات ہے، وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو کیوں سکھا پڑھا جاتا ہے؟ کسی اور کو کیوں نہیں۔

کوئی اور لقمہ دیتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صحرا میں کسی سے سحر سیکھ لیا ہے جن کی مدد سے کلام جوڑ کر سنانے والوں پر سحر پھونک دیتا ہے اور سننے والے اس سحر کی وجہ سے مسحور ہو جاتے ہیں۔

کوئی سمجھداری سے بولتا کہ یار تم بھی بڑی عجیب وغریب فطرت رکھتے ہو۔ کبھی کچھ کہتے ہو اور کبھی کچھ۔ اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ محمد سحر جانتے ہیں تو یقیناً وہ جنات کی فوج لے کر تمام مکہ کے وارث و بادشاہ بن بیٹھتے۔ انھوں نے یہ تو کیا نہیں۔ ہاں البتہ تم لوگوں سے دشمنی ضرور مول

Marfat.com

لے لی۔ پورے مجمع پر ایسی ردوقدح ناگوار گزرتی اور وہ سارے بلبلا اٹھتے کہ ہاں ہاں تم بھی ضرور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں میں آ گئے ہو۔

اور وہ جواب دیتا نہیں نہیں جلدی نہ کرو۔ میں تو صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور سخنوری کا اعتراف کر رہا ہوں۔ رہی یہ بات کہ یہ کلام خدائی ہے یا نہیں۔ میں ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر پایا۔ اس لیے نہ اس کلام کو جھٹلاتا ہوں اور نہ ہی تصدیق کرتا ہوں۔

انسانی شخصیت میں سچ اور جھوٹ کے درمیان مدھم سا خط کھینچ کر تجسس پیدا کرنا اور تجسس کے تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور کرنا ہی سرد جنگ میں کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔

درج بالا واقعہ اس کی ادنیٰ سی مثال ہے، وگرنہ سیرت حدیث اور تاریخِ اسلامی کی کتب بھری پڑی ہیں۔ موضوع کی خواہ مخواہ طوالت کے ڈر سے رقم کرنے سے قاصر و عاجز ہوں۔

بہر کیف حرم میں لوگ باہم اسی قسم کی گفتگو میں الجھ رہے تھے کہ رسولِ خدا بھی مسجد میں داخل ہوئے۔ کعبے کا طواف کیا اور خلافِ معمول ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ لوگ منتظر تھے، نئی آیات سنائی جائیں گی۔

کچھ لوگ تو صرف مخالفانہ تنقید کی وجہ سے کلامِ الٰہی سننے کا انتظار کرتے اور کچھ لوگ محض اعلیٰ کلام سے دلچسپی اور حلاوت آگینی کی وجہ سے منتظر رہتے۔

نیرنگیِ فطرتِ الٰہی دیکھیے کہ عین اس وقت جب حق و باطل کے درمیان جنگ زوروں پر تھی۔ عین اس وقت وحی کا سلسلہ کچھ وقت کے لیے رک گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مخالفین کے نت نئے سوالوں، نت نئے منصوبوں کے جواب میں بلا ناغہ وحی جاری رہتی تا کہ نبیؐ اور اصحابِ نبیؐ کی حوصلہ افزائی اور مخالفین کی مسلسل حوصلہ شکنی جاری رہتی۔

اس کو تاریخ میں "فترۃِ وحی"[31] کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس کی مدت میں اختلاف ہے۔ کسی نے پندرہ، کسی نے بیس، کسی نے پچیس اور کسی نے چالیس دن لکھا ہے۔ یہ عرصہ جتنا بھی تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بڑا مشکل اور کٹھن تھا۔

———(((اللہ اکبر)))———

ادھر مشرکین نے جب دیکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں آتے ہیں اور خلافِ معمول نئی وحی سنائے بغیر چلے جاتے ہیں تو ان کے ذہن پھٹ پڑے، منہ کھل گئے، زبانیں کتر کتر کرنے لگیں۔

Marfat.com

کوئی کہتا چلو اچھا ہوا ان کے رب نے انھیں چھوڑ دیا، (نعوذ باللہ) کسی نے منہ کھولا۔ ابھی جوش میں ابلے تھے، اب ٹھنڈے ہو گئے۔ کسی کی زبان تھرکی۔ یہ تو آسیب زدگی میں بولتے تھے، آسیب اتر گیا تو ہوش آ گئی۔ (نعوذ باللہ) کوئی کہنے لگا یہ بھی کوئی چلنے والی بات تھی۔ چند فقرے جوڑے تھے، سنا بیٹھے۔ اب اور کچھ ہو تو سنائیں۔ (نعوذ باللہ) کسی نے یوں زبان کھولی۔ جنابؐ کو ہیرو بننے کا شوق تھا سر کی پڑی تو شوق اتر گیا۔ (نعوذ باللہ)

الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایک حلقۂ ذہن اور ہزار زبانیں۔ پھر کوئی ایک بات نہ تھی جس کے منہ میں جو آتا، کہہ دیتا پھر تو وہ اپنے آپ میں نہ رہے، نیچ حرکات اور ذاتیات پر اتر آئے۔

جہاں کہیں کوئی اہلِ ایمان ملتا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے۔ مطعون کرتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم[32] کے رب نے انھیں چھوڑ دیا۔" ان کا رب ان سے ناراض ہو گیا۔ (نعوذ باللہ)

ادھر حضورؐ کے سگے چچا اور پڑوسی[33] کا خاندان عیدیں منا رہا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی ان کی خوشیاں دوچند بلکہ چار چند ہو گئیں۔ اُمِ جمیلہ آپؐ کی سگی چچی پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ کاجل اور دنداسہ سک کر کے مٹک مٹک رہی تھی۔ اُدھر گئی، اِدھر آئی۔ اِدھر آئی اُدھر گئی دوڑے پھرتی تھی کہ اری! کچھ سنا۔ نی! کچھ سنا۔ اری یہ کچھ ہو گیا تمھیں پتا تک نہیں۔

ایک دن حضورؐ گھر سے نکل رہے تھے۔ اسی ادھیڑ بن میں کہ شاید میرے رب نے مجھے مخالفین کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ اتنے میں اس بی جمالو سے ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ ہے جمالو واہ واہ جمالو کر اٹھی۔ اری دیکھو تو سہی ہمارے بھتیجے کا کیا حال ہو گیا پھر اندر کا پھپھولا باہر پھینکتے ہوئے مخاطب ہوئی۔

ایسے لگتا ہے جیسے تمھارے شیطان نے تمھیں چھوڑ دیا ہے۔ (نعوذ باللہ)

رحمت اللعالمین کے تحمل اور برداشت پر قربان جائیں۔ آپ گنی ان سنی کر کے آگے بڑھ گئے تو یہ چنڈالنیں خوب قہقہے مار مار ہنستی رہیں۔

حضورؐ کو ان مخالفتوں پر کوئی پروا نہ تھی، افسوس تو صرف وحی کے رک جانے کا تھا۔ مخالفتوں سے بھرے اس ہجوم میں اگر بھروسا تھا تو صرف خدا پر تھا۔ آپؐ اللہ کے لیے تو قریش مکہ کیا پوری دنیا سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتے تھے۔

اب جب کئی دنوں سے کوئی پیغام نہ آیا تو دل میں طرح طرح کے اندیشوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ مبادا کوئی ایسی لغزش سرزد تو نہیں ہو گئی جو خدا کی ذات ناراض ہو گئی۔ آپؐ سوچ سوچ کر گھبرا[34] جاتے کہ جس کی خاطر دشمنیاں مول لیں (نعوذ باللہ) اس نے مخالفوں کے نرغے

میں تنہا چھوڑ دیا۔

لیکن حقیقت وہم و گمان سے مختلف تھی۔ اس میں بھی اللہ کی حکمتیں پوشیدہ تھیں۔ وحی الٰہی بھی اللہ کے ذاتی جلوؤں کے قریب کی چیز ہے اور انسان کے لیے ماوراء الفطرت چیز ہے۔

جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم کوہ طور پر خدائی جلوے کی ایک جھلک کی تاب نہ لا سکی۔ ممکن ہے اسی طرح کی بشری کمزوریاں آپؐ میں بھی موجود ہوں۔

(نعوذ باللہ...... خاکم بدہن خاکم بدہن یہاں یہ گمان نہ کیا جائے کہ حضورؐ کو بحیثیت انسان بنو اسرائیل کے برابر لانے کی کوشش کی گئی ہے یہ تو ایک مثالیہ انداز یا جملہ ہے، وگرنہ آپؐ کی ذات تو خدا کی عظمت کے بعد عظمت والا مقام رکھتی ہے۔)

لگاتار وحی کے بوجھ سے ممکن تھا حضورؐ کے اعصاب پر منفی اثرات رونما ہوتے یا جسم اور شخصیت میں کچھ کمزوریاں وقوع پذیر ہونے لگتیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سکون اور آرام دینے کی حکمت سے وحی کا سلسلہ چند دنوں کے لیے بند کر دیا۔

شاید مندرجہ بالا جملوں سے کچھ حضرات شکوک و شبہات کا شکار ہو جائیں کیونکہ ہمارے موجودہ پاکستانی نظام تعلیم کے پروردہ نوجوان اسلام کے معاملہ میں کم علمی اور کم فہمی کا شکار ہیں۔ اس شک کو دبانے کی غرض سے چند روایات کا مفہوم لکھنے کی جسارت کروں گا۔ ان روایات سے خود بخود ثابت ہو جائے گا کہ وحی کا کتنا بوجھ حضورؐ پر پڑتا تھا۔

حضرت زید بن ثابت[35] سے مروی ہے کہ "ایک دفعہ آپؐ پر وحی اس حالت میں نازل ہوئی کہ حضورؐ کا بازو حضرت زیدؓ کے زانوں پر تھا۔ حضرت زید فرماتے ہیں کہ جب وحی نازل ہوئی تو میرے زانوں پر اتنا بوجھ پڑا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے میرا زانوں ٹوٹ جائے گا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ[36] فرماتی ہیں "اگر سخت سردی میں بھی آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگتا۔"

ایک اور روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے[37] منقول ہے کہ جب کبھی "اونٹنی پر سواری کی حالت میں وحی نازل ہوتی تو اتنا بوجھ پڑتا کہ اونٹنی بوجھ کی وجہ سے اپنا سینہ زمین پر ٹیک کر بیٹھ جاتی اور اس وقت تک نہ اٹھ سکتی جب تک وحی کا سلسلہ ختم نہ ہو جاتا۔"

ان چند روایتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وحی کیوں روکی گئی۔

———(((اللہ اکبر)))———

مگر مشرکین نے اسے بھی خوب اچھالا۔ مخالفانہ ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ پورے

Marfat.com

صحرائے عرب میں خوب پروپیگنڈا کیا۔ تفصیلات پیچھے درج ہو چکیں۔ آیئے ذرا نفس موضوع کی طرف......

حسب معمول دارالندوہ کا اجلاس جاری تھا، شیطان کی شوریٰ بیٹھی تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیش کیا جانے والا کلام، ان کی شخصیت، ان کی دعوت اور فترۃ وحی یعنی وحی کا رکنا موضوع بحث تھا۔

آپؐ گھر سے کعبہ کی طرف جا رہے تھے۔ آج آپؐ کے چہرے پر مسرت اور خوشی کے اثرات محسوس کیے جا سکتے تھے۔ حرم میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر لوگوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ یہ آپ کی شخصیت کا اعجاز تھا۔

پھر چند بدقسمت آوازے کسنے لگے اور چند ایک نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا، کچھ وقار و رعب سے بھری شخصیت دیکھ کر بس دیکھتے ہی رہ گئے، کچھ آپؐ کے دیکھنے والے چہرے پر نظر پڑتے ہی سمجھ گئے اور ان سمجھنے والوں کے چہرے بھی طمانیت سے چمک اٹھے۔

آپؐ نے سب سے پہلے حرم کعبہ کا طواف کیا اور پھر مجمع کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ لوگوں پر عمومی نظر ڈالنے کے بعد نئے نازل شدہ کلام کی تلاوت شروع کر دی:

وَالضُّحٰی ۝ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۝ آیت 1-2

مفہوم: قسم ہے دن (روز روشن) کی اور رات کی جب وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے۔

سبحان اللہ..... قرآن کا اسلوب ہی ایسا ہے۔ مخالفین کے پروپیگنڈا پر کس خوبصورت اور مدلل انداز میں ضرب کاری لگ رہی ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ اے مخالفت کرنے والو۔ دن کے بعد رات کا آ جانا اس وجہ سے تو نہیں کہ دن کو خدا اپنے بندوں سے خوش ہوتا ہے اور رات کو ناراض ہو جاتا ہے۔ قسم ہے دن اور رات کی، یہ تو صرف کسی حکمت کے تحت پیدا کیے گئے ہیں اور پھر رات کا سکون سے طاری ہو جانا بھی واضح اشارہ ہے، انسانی اعصابی کمزوریوں کی طرف۔ اگر صرف دن ہی ہوتا تو شاید بے سکونی کے ہاتھوں انسان مر جاتا۔ رات تو اللہ نے تاریکی کے ساتھ صرف اس لیے طاری کی ہے کہ انسان آرام کرنے کے بعد تازہ دم ہو جائے۔

اسی طرح کبھی کبھی وحی کا رک جانا بھی مصلحت کا تقاضا ہے۔ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب نے اسے چھوڑ دیا ہے۔

کیسا مدلل اور فصیح و بلیغ استدلال ہے۔ اتنے دنوں کے بعد ان آیات کو جب نبی ﷺ نے

تلاوت کیا ہوگا تو لوگ جھوم جھوم اٹھے ہوں گے۔ اس کی فصاحت وبلاغت پر مر مر چلے ہوں گے۔ سنانے والے اور سننے والے خوب سمجھ رہے تھے کہ مخاطب کون ہے، خطیب کون ہے اور کلام کس کا ہے۔ ایک بار تو حاضرین وناظرین سب سن ہو گئے ہوں گے۔ وہ والضحیٰ واللیل کے ردم میں پھنس گئے ہوں گے۔

مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰیo آیت۔3

مفہوم: ''اے نبی تمھارے رب نے ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔''

مشرکین نے مسلمانوں کی ناک میں دم کر رکھا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ حضور خود بھی سوچتے تھے کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جو وحی رک گئی۔

اس میں تمام مخالفتوں کا جواب بھی ہے اور آپؑ کے درد کا درماں بھی۔ اس میں توحید کا وہ درس بھی ہے جسے مشرکین ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ دیکھئے تمھارا رب یا تمھارے رب کہہ کر معبودانِ باطلہ کی نفی اور تذلیل کی جا رہی ہے۔ سننے والے سخنور تھے۔ ان اشاروں کو خوب سمجھ رہے تھے۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُولٰیo آیت۔4

مفہوم: ''یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہوگا۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی تحریک بال و پر بھی نہیں نکال پائی تھی۔ مٹھی بھر جانثار ہی پیدا ہوئے تھے اور ان کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ ان کا جینا حرام کر دیا گیا تھا۔ بانیٔ انقلابؑ سمیت تمام کارکن طرح طرح کی اذیتوں کا شکار تھے۔ ہزار قسم کی مشکلات سے دوچار تھے۔

یہ خوشخبری تمام کارکنوں کے لیے ایک سبز باغ تھا جسے زندہ حقیقت میں تبدیل ہو جانا تھا۔ اس وقت تو کوئی ذی شعور سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ چند صاحبان آئندہ چند سالوں میں پورے عرب پر غالب آ جائیں گے۔

یہ خدا کا ان سے وعدہ تھا جو چند سال بعد پورا ہو گیا اور واقعی ہی بعد کا دور پہلے دور سے بہت بہتر نکلا، مگر مخالفین کو اسی بات کا یقین نہیں آیا جسے خدا نے پورا کر دیا اور آخرت میں مسلمانوں کو کامیاب قرار دے کر پورا کر دے گا۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰیo آیت۔5

Marfat.com

مفہوم: ''عنقریب تمھارا رب تمھیں اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔''

اگر چہ ابھی کچھ دیر ہے، کوشش جاری رکھو، ہمت نہ ہارو۔ خدا نے ہر کام کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے مقررہ وقت پر ہر کام ہو جاتا ہے۔ مقررہ وقت پر ہونے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

یعنی خدا تمام مخالفوں کو دیکھ رہا ہے وہ خود ان سے نمٹ لے گا۔ تمھارے غموں اور مشکلات کو بھی وہ دیکھ رہا ہے اس کے صلے میں وہ اتنا دے گا جس کا آج کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مخالفین جو کرتے ہیں، کرنے دو۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔

پھر یہ وعدہ یوں پورا ہوا کہ تھوڑے عرصے بعد اسلامی تحریک عرب کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ قبائلی عصبیتیں دم توڑ گئیں۔ ساڑھے بارہ لاکھ مربع میل پر محیط رقبہ اسلامی قلمرو میں آ گیا۔

اسلام کی سرحدیں جنوب کے ساحلوں سے لے کر شمال میں روم کی شامی اور ایران کی عراقی سرحدوں تک پھیل گئیں۔ مشرق میں بحر احمر اور مغرب میں خلیج فارس تک کے علاقے اسلامی سرحدوں نے اپنے اندر سمیٹ لیے۔ اسلامی سلطنت کا یہ نقشہ تو حضورؐ نے خود اپنے ہاتھوں 23 سال کے مختصر عرصہ میں متشکل کر دیا۔

بعد ازاں خلفائے راشدین نے اس نقشے کو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے جنگلوں تک پھیلا دیا۔ پھر ان سے جو طاقت ٹکرائی پاش پاش ہو گئی۔

یہ سب کچھ تو اللہ نے اپنے رسول اور ان کے ماننے والوں کو ان کی زندگیوں میں دے دیا اور آخرت میں جو کچھ وہ دینے والا ہے، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ سورہ والضحیٰ کی پہلی چند آیات ہیں جو پیش کی گئیں۔ آئیں عنوان سے پھر رشتہ جوڑتے ہیں۔

———(((الملہ اکشین)))———

پبلسٹی اور پروپیگنڈا کے اصول وضوابط سے موازنہ کریں تو لامحالہ اس عرصہ میں اسلامی تحریک پر بُرے اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ فترۃ وحی کے زمانہ میں اسلامی تحریک وقتی طور پر ہی سہی، ایک دفعہ سرد خانے میں جا پڑی تھی۔ بانی تحریک اور ان کے کارکنان کے خلاف افواہوں سے مایوسی پھیلانے کا یہ بہترین موقع تھا۔ مشرکین نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ واقعی انھوں نے بہترین نتائج پیدا کر لیے تھے۔

Marfat.com

رسولِ خداؐ خود بھی پریشان تھے کہ شاید ان کے رب نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ باقی کارکنوں کا اندازہ لگائیے، ان پر کیا گزر رہی ہوگی...... کس قسم کے اوہام اور مایوسیوں نے لپیٹ لیا ہوگا۔

اب تحریک کے لیے سودمند یہی تھا کہ تمام افواہوں اور مایوسیوں کی دھول بٹھادی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے صبح و شام کی قسمیں کھا کر فترۃ وحی کی حکمت واضح کر دی اور پھڑتے رہنے والوں کی کامیابی کی بشارت دے دی کہ کل ان کا ہی ہوگا اور وہی کل کو جنم دینے والے ہوں گے۔ مستقبل ان کی دہلیز سے جنم لے گا اور وہی مستقبل کی راہیں متعین کرنے والے ہونگے۔

یہ سب کچھ سن کر مخالفین کے دل پر کیا گزر رہی تھیں۔ حامیانِ حق کے دل مسرت اور شادمانی کے کس سمندر میں غوطہ زن ہوں گے۔ کتنے سننے والوں کا مستقبل تاریک ہو چکا ہوگا اور کتنے نئے عزم، نئے حوصلے کے ساتھ اپنے حسین و جمیل مستقبل سے وابستہ ہو چکے ہوں گے۔ یہ آیات جو پیش کر رہے تھے اور جو سن رہے تھے، سبھی خوب سمجھ رہے تھے۔

بلاشبہ یہ وعدہ کہ عنقریب تمھارا رب اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے، حرف بہ حرف پورا ہو گیا۔ بلاشبہ خدا کے کاموں میں دیر ہے، اندھیر نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زندگی میں اسلام جنوب کے ساحلوں سے لے کر شمال میں روم و ایران کی شامی اور عراقی سرحدوں تک پھیل گیا۔ ادھر مشرق میں خلیج فارس اور مغرب میں بحرِ احمر تک کے علاقے اسلامی قلمرو میں آ گئے۔

ریگزارِ عرب نے اس سے بڑا تغیر (Revolution) اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ انسانی تاریخ کا پہلا موقع تھا کہ ساڑھے بارہ لاکھ مربع میل پر بسنے والے ایک تہذیب ایک مذہب ایک عقیدے میں پرو دیئے گئے۔ شاید اس سے قبل اتنے وسیع پیمانے پر کسی کلمے یا نعرے کی اتنی بڑی مخالفت بھی نہیں ملتی۔

23 سال کے مختصر عرصہ میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے حلاوت آنگیں نعرے نے اتنا عظیم انقلاب برپا کر دیا کہ اس کے ماننے والوں کے دل ناقابل تسخیر قلعے بن گئے۔ ان کے ایمان اور حوصلے بے جوڑ حصارِ آہن ثابت ہونے لگے اور پھر ان سے جو بھی طاقت ٹکرائی، پاش پاش ہوگئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایشیا یورپ افریقہ برصغیر جزیرہ سسلی اور اٹلی تک کی تہذیبیں اس سیلابِ عظیم کے معمولی تھپیڑوں کی تاب نہ لا سکیں۔ اس تحریک کے حسین و دلفریب اثرات نے قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی کو اپنے اثرات میں لپیٹ لیا۔

Marfat.com

یہ تو تھا وہ وعدہ جو عنقریب یعنی اسی دنیا میں بہت کچھ دینے کا تھا اور شمع رسالت مآب ﷺ کے پروانوں کو جو کچھ آخرت میں ملنے والا ہے۔ اس کا تصور کرنا بھی انسانی سوچ اور فکر سے بالا ہے۔

یقیناً اس نوید کی سچائی اور حقانیت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رگ و پے میں حلاوت گھول دی ہوگی۔ یقیناً سننے والے بس سنتے ہی رہ گئے ہوں گے۔

بعدازاں وہ آیات تلاوت ہوئیں جن کا انداز اور اسلوب و زبان کے لحاظ سے تو وہی تھیں، مگر مفاہیم کا رخ بدل گیا۔ اس نئے انداز پر اعتراض ہونے لگے۔ آپ نے ان کو جواب فرمایا۔ اس مکالمے کو ہم نئے عنوان سے عرض کرتے ہیں۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

ایک اور اشقلا ہاتھ آ گیا

آپ اگلی آیات تلاوت فرما رہے تھے، سامعین سن رہے تھے۔ کچھ تسکین دل کے لیے اور کچھ نئی حجت نکالنے کی غرض سے۔ پھر وہ آیات تلاوت فرمائیں جن سے معمولی کی تنقید سامنے آئی، مگر اس سے اگلی آیات میں تنقید کا مدلل جواب دے دیا گیا۔ آیئے ذرا موضوع کی طرف۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْماً فَاٰوٰى ۝

مفہوم: ''ہم نے تم کو یتیم پایا تو اپنی حفاظت میں لے لیا۔''

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝

مفہوم: ''بے راہ پایا تو ہدایت کی راہ پر لگا دیا''

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝

مفہوم: ''مفلس پایا تو مالدار بنا دیا''

میدانِ جنگ میں وہی فوج کامیاب و کامران ٹھہرتی ہے جو مشکل ترین حالات میں بھی اگلے مورچوں پر ڈٹی رہے۔ جس آرمی کی تربیت میں قوتِ برداشت انتہائی حد تک ترقی (Promote) نہیں کر جاتی، وہ بہت جلد یا تو ہمت ہار جاتی ہے یا صبر و برداشت کا مادہ کم ہونے کی وجہ سے بہت جلد مشتعل ہو کر اپنی پوزیشن واضح کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں اس کا آگے بڑھتا ہوا ہر قدم اکثر اوقات کسی حکمت عملی سے پیچھے اُٹھنے والے قدم سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ ماہر مدِ مقابل نہ صرف ایسے مواقع پیدا کر لیتا ہے، بلکہ اگر کبھی خود بخود اس طرح کے مواقع پیدا ہو جائیں تو بہترین نتائج برآمد کر لیتا ہے۔

بالکل یہی حال سرد جنگ میں لفظوں اور جملوں کی پہلی صف (فرسٹ لائن) سے لیا جاتا ہے۔

کافی دنوں کے بعد وحی نازل ہوئی تھی، سو آج بڑے بڑے ادیب، بڑے بڑے سخنور، بڑے بڑے لفظوں کے پارکھ اور ماہر تازہ ترین آیات سن رہے تھے۔

Marfat.com

ان کا وتیرہ تھا کہ تلاوت شروع ہوتے ہی شور[38] مچانا شروع کر دیتے، آج خلاف معمول انہماک سے سن رہے تھے کہ کوئی تنقید یا تنقیع ہاتھ آ جائے۔ حجت کیلئے کوئی موقع ملے تو شور مچائیں۔

اور سورۃ کا یہ انداز کہ تم ایسے تھے، ہم نے تمھیں ایسا بنا دیا۔ اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ واقعی کوئی اور ہی مخاطب ہے۔ یہ اسلوب، یہ انداز بھی تو ایک حجت ہی تھا۔ ان کی ایسی افواہوں کا جواب تھا جن میں وہ کہتے تھے کہ محمدؐ اپنی طرف سے جملے بنا لیتے ہیں۔ جتنے گھڑے تھے ختم ہو گئے فرشتہ ورشتہ کوئی نہیں آتا وغیرہ۔

جب یہ آیات گونجیں کہ تم یتیم تھے تمھیں پالا۔ تم راہ سے تھے، تم کو راہ دکھلائی۔ تم غریب تھے، تو تمھیں مال دیا۔ اس میں ایک طرح کا احسان جتلایا جا رہا تھا اور یہی اشقلا ان کے ہاتھ لگا تو کوئی بے صبرا برداشت کھو بیٹھا۔ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر پورے زور سے چیخنے لگا۔

اے محمدؐ کتنا کم ظرف ہے تیرا خدا جو اپنے احسان جتلا رہا ہے۔ بلند ظرف محسنوں کا یہ شیوہ نہیں کہ کسی سے خوش ہو کر کسی کی مدد کریں، کسی پر احسان کریں یا کسی کو انعام دیں تو بعد میں جتلاتے پھریں۔ (نعوذ باللہ)

اعتراض بڑا جچا تلا اور موقع کے عین مطابق تھا۔ لوگ کچھ زیادہ ہی بذلہ سنج تھے۔ سننے والوں کی رگِ مخالفت پھڑک اُٹھی۔ چاروں طرف سے قہقہوں کی داد ملنے لگی۔ پھٹی ہوئی زبانیں شور وغل مچانے لگیں۔

ہاں بتاؤ ابوالقاسم[39] ہاں ہاں بتاؤ ابوعبداللہ[40] ہے ناں تمھارا خدا اتنا ہی کم ظرف۔ (نعوذ باللہ) مخالفوں کے ہاتھ توہینِ رسالت کا نیا اشقلا آ گیا۔ وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

چند ایک نے اعتراض جمانے والے بانکے پلے کو کندھوں پر اُٹھا لیا اور گھوم گھوم کر کورس کی شکل میں نعرہ لگانے لگے۔ ہاں جواب دو ابنِ عبداللہ! ہاں ہاں بتاؤ ابوالقاسم!"

وہاں پر موجود مسلمان یا درپردہ مسلمانوں کی حمایت کرنے والے بڑی بے چینی سے آپؐ کے نئے ارشاد، نئے جواب اور نئی آیات کا انتظار کر رہے تھے۔

رسولِ خداؐ بڑی خاموشی اور بلند ظرفی سے اعتراض سنتے رہے۔ مخالفین کی حرکات خوش دلی سے دیکھتے رہے۔ جواب دینے سے پہلے حرم کی طرف منہ کیا اور اپنے رب کے حضور سجدے میں گر گئے۔ اس عمل پر تمام مجمع خاموش ہو گیا۔ ایسا سنجیدہ سکوت طاری ہوا جیسے چھوؤ تو کسی میں جان

نہیں۔ جیسے پورے مجمع کو کسی سانپ نے سونگھ لیا ہے......بس خاموشی اور معنی خیز حیرانی سے اس سجدے والے عمل کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

لفظوں کی سرد جنگ میں یہ بہت بڑا نفسیاتی حملہ ہے۔ مخالفین کو اپنی حالیہ کامیابی مخدوش نظر آنے لگی۔ اچانک یہ سجدہ کیسا سجدہ ہے؟ کہیں یہ سجدۂ شکر تو نہیں؟ اگر یہ سجدۂ شکر ہے تو کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہمارے اعتراض کا جواب موجود ہے۔ کیا ہمارا اعتراض اتنا ہی بے وزن تھا؟ اس کا جواب موجود ہے تو وہ کیا ہو سکتا ہے۔ اسی قسم کے کتنے خیال وسوسے اور اندیشے تھے جو مبہوت ذہنوں کے گرد اپنا حصار بناتے چلے گئے۔ ذہن شش و پنج کے تلاطم میں غوطے کھانے لگے۔

خیالات منتشر کر کے کسی ایک نقطے پر مرکوز کر دینا سرد جنگ میں بہت بڑی کامیابی سے عبارت ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

جس طرح باقاعدہ جنگ میں دشمن کا مواصلاتی (Communication) نظام درہم کرنے کیلئے کوئی کامیاب آپریشن کر لیا جائے تو مخالف فوجی گروپوں کو منتشر کر کے آسانی سے شکست و ریخت سے دوچار کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہائیر ہیڈکوارٹرز دماغ ہوتے ہیں اور چھوٹے گروپ جسم، جسم اور دماغ کے مربوط عمل کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ باقاعدہ جنگ میں یہ کارروائی قدرے طویل ہوتی ہے۔ جبکہ لفظی ثقافتی سرد جنگ میں بعض اوقات اس قسم کی تدبیر کیلئے چند لمحوں سے زیادہ وقت میسر نہیں آتا۔

آج بظاہر مخالفین فتح کے آخری زینے پر تھے۔ اس ہلڑبازی کو وہ بزعم خود بہت بڑا کارنامہ خیال کر رہے تھے۔ مدمقابل کی بھلائی اسی میں نظر آ رہی تھی کہ وہ گھٹنے ٹیک دے یا خاموشی سے ہار مان کر نکل جائے۔

مگر رسول اللہؐ کے یہ شایان شان نہیں تھا۔ آپؐ نے بھاگنے کی بجائے اچانک سجدہ شکر ادا کر کے مخالفین کو حیران و پریشان کر دیا۔ ان کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ ان کے دماغ سے جسم کا رابطہ کاٹ دیا۔ وہ شور و غوغا کرتے کرتے اچانک ساکت و جامد ہو گئے۔ ان کا اصل مقاصد سے مواصلاتی رابطہ ٹوٹ گیا۔

اس ایک سجدے نے وہ کام کیا کہ بس زبان و بیان وضاحت سے عاری ہے۔ اپنے رب

Marfat.com

کے حضور متشکرانہ انداز سے جھکنا اس بات کا اعلان تھا کہ اے عقل کے اندھو ہر چیز کی باگ ڈور میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔تم اس کی آیات کیا جھٹلاؤ گے جو اپنی ہی باتوں کے حصار میں پھنس پھنس جاتے ہو۔ یہ سجدۂ شکر ایک اعلان بھی تھا کہ وہی علیم وخبیر ہے۔اسے تمھاری ان حرکتوں کا پہلے سے علم تھا جو اس نے اگلی آیات میں وضاحت فرمادی۔ یہ سجدہ ایک دعوت بھی تھا کہ وہی اللہ رکوع وسجود کے لائق ہے۔عبادت اور اطاعت کا حق اسی کے لیے ہے۔یہ زندگی اور اس کی خوشیاں جو فترۃِ وحی کے بعد آج مومنین کو حاصل ہیں، وہ اسی کی عطا ہیں۔اس کے قبضۂ قدرت سے کچھ بعید نہیں اور میرا متشکرانہ جھکنا اسی حیّ اور قیوم کے لیے ہے۔سجدے کا اصل مقصد تو یہی تھا، مگر نفسیاتی اعتبار سے اس سجدے نے مشرکین کو حواس باختہ کر دیا۔

مشرکین کی منتشر خیال دماغی زمین کی نئی پلاٹ بندی ہونے لگی۔حضور مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے روبہ استدلال ہوئے۔فرمایا:

''خدا کا شکر ہے کہ تمھارا یہ اعتراض میری صداقت پر گواہ ہے کہ قرآن اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قسم کا اعتراض کرو گے، مگر اللہ تعالیٰ ان سب باتوں کو خوب جاننے والا ہے۔''اس لئے اس نے اگلی آیات میں اس اعتراض کا جواب رکھ دیا۔

مبہوت زبانیں دراہوئیں۔ہاں بتاؤ تو سہی کیسا ہے وہ جواب جو آپ کے رب نے پہلے بیان کر دیا ہے۔پھر آپؐ نے فاتحانہ انداز میں سورہ والضحیٰ کا یہ حصہ تلاوت فرمایا۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝

مفہوم:۔''اے نبی یتیم کو مت دھتکارو''

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝

مفہوم:''اور سائل کو مت جھڑکو''

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

مفہوم:اور اپنے رب کی نعمتوں کا ذکر کرو۔

لوگ سخن شناس تھے۔مطلب بھی واضح تھا کہ اللہ نے سورۃ کے شروع میں اپنے احسانات نہیں جتلائے، بلکہ یتیمی اور مفلسی کی یاد دلانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ بھی یتیموں، مسکینوں اور سائلوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔یتیمی اور مسکینی کو وہ خوب جانتے ہیں جس طرح آپؐ

Marfat.com

کو اللہ نے محفوظ و مامون رکھا اور نبوت جیسی نعمتوں سے سرفراز کیا۔ وہ اپنے رب کی ان نعمتوں کا شکر کے ساتھ ذکر کرتے رہیں اور یہ صرف اسی طرح ہے کہ آپ بھی یتیموں مفلسوں ناداروں اور سائلوں سے رحمت کا معاملہ کریں۔

مخالفین یہ جواب سنتے ہی نیوی[41] ہو کر کھسک گئے۔ سچ ہے برائی جتنی ظالم ہو گی، سچائی کی جڑیں اتنی ہی گہری ہونگی۔ سچائی اتنی تیزی سے پھیلتی ہے، جتنی شدت سے اس کی مخالفت ہوتی ہے۔

اس واقعہ نے بھی لوگوں پر مشرکین کی کم عقلی، جھوٹ اور دروغ گوئی اور حضورؐ کی سچائی اور حقانیت کا راز کھول دیا اور کئی ایک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حلقہ اسلام میں داخل ہونے کی سعادت پا گئے۔

اللہ ان کے درجات اور بلند کرے (آمین)

—(((الحمد للہ)))—

Marfat.com

مسلمانوں کی تنظیمِ نو

اس بات کی ضرورت پہلے دن سے محسوس کی جا رہی تھی کہ اگر واقعی معاشرے میں انقلاب برپا کرنا ہے تو بنیادی تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت، اخلاق و عادات، نشست و برخاست کی تنظیمِ نو کرنا ہوگی۔ ہر شعبۂ زندگی میں وسیع تر انقلاب لانا ہوگا۔

ان مقاصد کے حصول کیلئے اپنی تنظیم اور کارکنان کو دوسری تمام معاشرت سے ممتاز کرنا ضروری تھا اور پھر جماعتی تحریک کیلئے تنظیم کا نام اس کے شعار، جھنڈے، نعرے، لباس (Uniform) تعارفی نشان، ملاپ اور پہچان کے اشارے (Code Word)(Pass Word) اور دیگر اجزا کو تنظیم نو کے حوالے سے ترتیب دینے کی ضرورت تھی۔ ان سب میں اس چیز کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری تھا کہ ہر جز مقصد نصب العین اور بانی شخصیت کی پہچان اور تحریکی نشر و اشاعت کا ذریعہ بن سکے۔ ہر مخالفانہ معاشرتی پہلو کے ساتھ فرق اور ممتاز کر دے۔ ساتھ ہی ساتھ تحریکی اسلوب کی حلاوت آگینی اور اثر آفرینی کے اس مجموعی تاثر کو بھی برقرار رکھے جو عوام الناس میں قدرتی طور پر تجسس اور جستجو برقرار رکھ سکے۔

کلمہ طیبہ جیسے فلک آفرین نعرے نے پہلے ہی دن یہ احساس دلوں میں جاگزین کر دیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیش کیا جانے والا نعرہ محض عبادت کیلئے الاپا جانیوالا بھجن نہیں۔ یہ تو پہلے سے موجود معاشرت کیلئے تازیانہ ہے جو پورے معاشرتی نظام پر ضرب کاری لگا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کلمہ پورے کے پورے معاشی، سیاسی، تعلیمی، تنظیمی اور حکومتی ڈھانچے کو غلط قرار دے رہا ہے۔

اس کے زبان پر آتے ہی وفاداری اور اطاعت کی سمت کعبہ کا رخ اختیار کر لیتی ہے اور جو لوگ کعبہ کے خدا پر ایمان لے آتے ہیں، ان کے شغل، ان کی ہمدردیاں، دلچسپیاں، ان کی چال ڈھال، ان کا رہن سہن، ان کے ذوق، ان کی گفتگو ان کا سب کچھ مشرکانہ تہذیب و ثقافت سے مختلف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب ضروری تھا کہ ان کی تحریکی، جماعتی تنظیم بندی بھی مشرکوں سے الگ

Marfat.com

کردی جائے تاکہ اہلِ ایمان اوران کے مخالفین ایک نظر میں پہچانے جاسکیں۔

اس تحریکی تنظیم نو کیلئے قرآن نے سب سے پہلے "رحمٰن" کا لفظ پیش کیا جسے حضورؐ کی زبان سے اہلِ مکہ نے پہلی بار سنا تھا۔ یہ خدا کا اسم صفت ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ذات نہ ماننے والوں پر بھی کتنی مہربانیاں اور عنایات کر رہی ہے۔

اس کے مقابلے میں "شیطان" اوراس کا کردار پیش کیا اور فیصلہ لوگوں پر چھوڑ دیا کہ رحمٰن اور شیطان کا موازنہ کر کے اپنی راہیں متعین کرلیں۔

یوں شیطان کے سراپا میں مشرکین اپنے آپ کو دیکھنے لگے۔ اس لیے انھوں نے "رحمٰن" کو ماننے سے صاف انکار کردیا۔

صلح حدیبیہ کے وقت آپؐ نے صلح نامہ کے سرورق پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا تو قریش [42] کے نمائندے نے کہا بسم اللھم لکھا جائے ہم رحمٰن کو نہیں جانتے نعوذ باللہ۔

مخالفین نے لفظ رحمٰن کے غلط معنی بنانے کی شاید اس لیے کوشش نہیں کی کہ یہ لفظ نیا ضرور تھا مگر معنوی اعتبار سے عام فہم تھا۔ اس کے مفاہیم تک عام آدمی کی رسائی تھی۔ اس لیے انھوں نے دوسری راہ اختیار کی۔ یہ افواہ پھیلادی کہ رحمٰن اس شخص [43] کا نام ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا پڑھاتا ہے، مگراسے سچ ثابت کرنے سے قاصر رہے۔

یہ افواہ بھی سچ ثابت نہ ہوسکی قرآن نے ایسی افواہوں کی کچھ یوں تاریخ رقم کی۔

مفہوم:۔ "ہمیں معلوم [44] ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ کو کوئی شخص سکھاتا پڑھاتا ہے، حالانکہ ان کا جس کی طرف اشارہ ہے وہ تو خالص عجمی ہے اور یہ تو خالص عربی زبان ہے۔"

ذرا سوچئے کہ سکھانا پڑھانا تو علم وزبان کے ماہروں کا کام ہے۔ سخن وادب کے استادوں کا کام ہے۔ کیسی واضح اور عام فہم دلیل پیش کی گئی ہے کہ جو آدمی خود کسی زبان سے واقف نہیں وہ خالص اس زبان میں جسے وہ جانتا تک نہیں کیسے فصیح وبلیغ اسلوب پڑھا سکھا سکتا ہے۔ قریشِ مکہ کیلئے یہ بھی بہت بڑا آسمانی طمانچہ تھا، مگر وہ تو عادی ہو چکے تھے۔

رحمٰن کے اثرات نظریاتی لحاظ سے راسخ کرنے کیلئے مسلمانوں کو بتایا گیا کہ وہ اپنا ہر کام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کریں اور ہر کام کے خاتمے پر الحمد اللہ پڑھیں۔

پھر کارکنوں کو بالکل نئی اور الگ تھلگ اصطلاحوں سے مزین کردیا گیا۔ یہ نئی اصطلاحیں ان میں اتنی سرایت کرگئیں کہ سبحان اللہ کیا کہنے انھوں نے اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

———(((الحکمۃ الحکیم)))———

Marfat.com

وہ اپنا ہر کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور ختم کرنے کیلئے الحمد للہ ضرور کہتے۔ یعنی اللہ کے نام شروع اور اللہ کے نام پر ختم۔ یوں ان کا ہر کام توحید کے حصار میں ہوتا۔

تحسین وتعریف کیلئے ماشاء اللہ اور تعجب وحیرانی کیلئے سبحان اللہ کہا جاتا۔

نفرت وحقارت کیلئے نعوذ باللہ اور وعدہ وارادہ کیلئے انشاء اللہ معمول بن گئے۔

کسی فرد کسی جماعت یا کسی دعوت پر شکریہ کیلئے جزاک اللہ کے الفاظ ان کا شعار بنا دیے گئے اور یوں تمام مسلمان رہن سہن اور نشست و برخاست کے لحاظ سے دوسری تمام معاشرت سے علیحدہ ہو گئے۔

ان کے گروپ یا تنظیم کیلئے مومن و مسلم اور ان کے مقابل کیلئے مشرک وکافر کی اصطلاحیں رائج ہوئیں۔

دین محمدؐ کیلئے لفظ اسلام اور مخالف مذہب کیلئے کفر وجہالت کے الفاظ مخصوص ہوئے۔

مسلمانوں کی تحریکی جدوجہد کو "حق" اور ان کے خلاف کی جانے والی تمام کارروائیوں کو باطل کا نام دیا گیا۔

اچانک تحریکی بھائی سے ملنے پر السلام علیکم اور اس کے جواب کیلئے وعلیکم السلام جیسے کوڈ بتائے گئے۔

قارئین آج ہم جیسے کلبوں، فائیو سٹار ہوٹلوں میں بیٹھ کر سر (Sir) پلیز (Please) اور تھینک یو (Thank You) وغیرہ سے مانوس لوگ ان لفظوں کی تاثیر کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم میں وہ تحریکی جذبہ اور شعور ہی باقی نہیں، اس لیے ہمارے نزدیک یہ مقدس الفاظ بے جان مذہبی رسوم وعلائم بن کر رہ گئے ہیں، مگر اس وقت ان کلموں نے جہاں عرب کو دو مذہبوں دو تہذیبوں اور دو قوموں میں بانٹ دیا تھا۔ وہاں ایک طرف یہ آوازیں مخالفین پر سکتہ طاری کر دیتی تھیں اور دوسری طرف حق پرستوں کو جذباتی انداز میں اپنے مقاصدِ زندگی سے وابستہ کر دیتی تھیں۔

ہر لمحہ ہر گھڑی سفر میں حضر میں، قیام وانصرام میں، کھیتی باڑی اور تجارت میں، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہ احساس تازہ رہتا تھا کہ اللہ ہی مقصودِ حیات ہے۔ چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، کام آرام سب اسی رب العالمین کی عطا ہے اور اسی کیلئے ہے۔

اسی قسم کی اصطلاحوں نے حق پرستوں اور باطل پرستوں کو دو علیحدہ گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ تقسیم بھی کچھ عربوں کے اپنے ہی انداز میں کی گئی۔ ان کی پرانی رسموں اور روایتوں کے مطابق ہی کی گئی۔

Marfat.com

مولانا مودودیؒ تفہیم القرآن میں سورہ واقعہ کی تفسیر کرتے ہوئے ایک جگہ پر حق و باطل کی سرد جنگ کو دائیں اور بائیں بازو کی قوتیں قرار دیتے ہوئے بحث کرتے ہیں۔

''اہل عرب سیدھے یعنی دائیں ہاتھ کو قوت و رفعت اور عزت کا نشان سمجھتے تھے۔ جس کا احترام مقصود ہوتا اسے محفل میں سیدھے ہاتھ بٹھاتے، کسی کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے تو کہتے ''فلان منی بالیمین یعنی وہ تو میرے سیدھے ہاتھ کی طرف ہے۔ وہ شمال یعنی بائیں کو شوم یعنی فالِ بد سمجھتے تھے۔ اہلِ عرب کے ہاں بایاں ہاتھ کمزوری اور ذلت کا نشان تھا۔ پرندہ دائیں سے بائیں کی طرف اڑ جاتا تو اسے بُرا شگون خیال کرتے۔ کم تر آدمی کو بائیں ہاتھ بٹھاتے۔ کسی کو کہنا ہوتا کہ میرے ہاں فلاں کی کوئی عزت نہیں تو کہتے۔ فلان منی با الشمال یعنی وہ تو میرے بائیں طرف ہے۔''

—(((اللہ اکبر)))—

عرب کٹر روایت پرست اور توہم پرست تھے۔ ان کا علم، ادب، مذہب، معاشرت اور سیاست بہت کچھ توہم پرستی تھا جسے ان کی روایت پرستی نے سینہ بہ سینہ حافظوں میں محفوظ رکھا ہوا تھا۔ مولانا مودودیؒ کے مذکورہ بالا الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ لسانِ قرآن کے نزول سے پہلے دائیں اور بائیں کے درجات تو موجود تھے، لیکن قرآن نے نئے نعرے، نئی اصطلاحیں، نئے اشارے (Signals) دے کر عرب کو دو سیاسی اور تحریکی گروپوں میں تقسیم کر دیا۔

تحریکی نشر و اشاعت میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ الفاظ کو عام مروجہ معنی کے بجائے کسی مخصوص تنظیم کے عملی اور تحریکی مقاصد کے زیور سے آراستہ کر دیا جائے۔

یہی الفاظ مقتدر اور ظالم لوگوں کے خلاف استعمال کرنا قرآنی زباندانی کا بہت بڑا کارنامہ اور حامیان اسلام کی بہت بڑی جرأت ایمانی تھی۔ اس اصطلاحی اسلوب کی جدت لوگوں کو چونکا دیتی تھی۔ ان کے ذہنوں کو وسیع تر تحریکی مقاصد میں کھو دیتی تھی اور یوں تمام سننے والے یا تو بے باک ہو جاتے یا پھر مبہوت و مرعوب ہو کر رہ جاتے تھے۔

دائیں بازو کی اصطلاح جیسے جیسے تحریک پھیلتی گئی اس کے کارکنوں کیلئے مخصوص ہوتی گئی۔ دائیاں بازو اسلامی تنظیم و تحریک کیلئے مخصوص ہوتا چلا گیا۔

بعد ازاں حضورؐ نے دائیں بازو کو وہ جگہ دی جس کی مثال کسی مذہب کسی قوم کسی تہذیب میں موجود نہیں۔ اب دایاں بازو اصطلاحی حالت سے نکل کر تہذیبی شکل اختیار کر گیا تو قرآن نے بھی مسلمانوں کو اصحاب الیمین اور فردوسی ذوق و شوق کے طلبگاروں کیلئے اصحاب المیمنہ کے الفاظ

Marfat.com

استعمال کر دیے۔

سواب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر کام میں پہل کیلئے دایاں نمایاں ہو گیا۔ سلام کیلئے دایاں ہاتھ جواب اور مصافحہ کیلئے دایاں ہاتھ۔ کھانا شروع کرنے کیلئے دایاں، پانی کیلئے دایاں، جوتا پاؤں میں پہننے کیلئے دایاں پاؤں، مسجد میں داخلہ کیلئے دایاں پاؤں۔ الغرض ہر کام شروع کرنے کیلئے دائیں کو فوقیت ملی۔

مکہ کی سرد جنگ میں مومن و کافر، مسلم و مشرک رحمٰن و شیطان کی اصطلاحیں رائج ہو چکی تھیں۔ اب مشرکین دائیں اور بائیں کی تنظیم نو دیکھ کر تلملا اٹھے۔ تحریکی نشر و اشاعت کے حوالے سے یہ مسلمانوں کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

مخالفین حواس باختہ ہو کر تشدد گالی گلوچ، معاشی اقتصادی اور سیاسی ناکہ بندیوں پر اُتر آئے۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

مشرکین پر قرآن کے ثقافتی اثرات

نضر بن حارث تڑپ رہا تھا۔اسے کسی پل آرام نہ تھا۔قرآن کی دل آویزی اس کے رگ و ریشے میں بیری کے کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔وہ کوئی حل تلاش کرنے میں سرگرداں تھا۔ایسا حل جو وحی کا تدارک ہو۔ایسا حل جو کلامِ الٰہی کا توڑ ہو۔بس یہی درد تھا۔ہائے ری بدقسمتی اس کا درماں نہ تھا۔مداوا نہ تھا۔

آخر وہ ایک دن اپنے ہی گھر میں دارالندوہ کا اجلاس طلب کرتا ہے۔اپنا دلِ ستم ظریف یوں کھول کے رکھ دیتا ہے۔

اے اکابرین قریش تم جس طرح[45] محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر رہے ہو،اس طرح تو کام نہ چلے گا۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے سامنے پل کر جوان ہوئے،وہ اس سے پہلے تم میں سب سے زیادہ خوش اطوار،سب سے زیادہ سچا اور امین تھا۔اب اس نے ایک کلام پیش کیا تو تم کہتے ہو یہ ساحر ہے،مجنوں ہے،کذاب ہے،شاعر ہے۔(نعوذ باللہ) وہ یہ سب کچھ نہیں ہیں اے سردارانِ قریش! بخدا کچھ اور سوچو۔جس چیز سے تمھارا مقابلہ ہے،وہ اس سے بہت بڑی ہے۔اس طرح اسے شکست دینا ممکن نہیں۔

اور پھر کہنے لگا کیوں نہ رُستم اور اسفندیار کے قصے پھیلائے جائیں۔یہ قرآن سے زیادہ عجیب ہیں۔لوگ اس میں دلچسپی لیں گے اور خود بخود تحریکِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ بل اکثریت رائے سے پاس ہوا اور اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی ہو گیا۔

بعدازاں نضر بن حارث نے ایران سے رستم اور اسفند یار کی مافوق الفطرت فوک داستانیں درآمد کیں اور ان کے ترجمے لوگوں کو سنانے شروع کر دیئے۔

جب دال گلتی نظر نہ آئی تو خوبصورت[46] گانے بجانے والی لونڈیاں خریدیں۔ان کے ذریعے یہ قصے گوائے گئے۔اس سے بھی قرآن کا توڑ نہ کیا جا سکا تو بلا واسطہ اپنی خوبصورت

Marfat.com

لونڈیاں مسلمانوں کے پیچھے لگا دیں جو انھیں کھلا پلا کر گانا سناتیں اور بہلاتی پھسلاتی تھیں۔

اس کو سرد جنگ میں میٹھا زہر کہا جاتا ہے۔ ثقافتی محاذ پر اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں۔ موجودہ دور میں ''را''، ''موساد'' اور ''کے جی بی'' اس طرح کے حربے استعمال کرتی ہیں۔

لیکن یہ کھلی بے غیرتی بھی مشرکین مکہ کے کسی کام نہ آسکی۔ آج ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو مشرکین کی اس تدبیر کا شکار ہوا ہو۔

---(((اللہ اکبر)))---

مخالفین جس کلام سے لوگوں کو دور رکھنا چاہتے، ان کے اندر کا انسان اسے سننے کیلئے تڑپتا رہتا تھا۔ ان کے دل ونگاہ اس کلام کے حصار میں پھنس چکے تھے۔

دراصل یہی خوف تھا جس نے شدید احساس پیدا کر دیا کہ جس طرح بھی ہو سکے قرآن کی آواز لوگوں تک نہ پہنچ سکے۔ جس طرح بھی ممکن ہو قرآن کے اثرات کو پھیلنے سے روکا جائے۔ اسے سنانے والے کی آواز کو خاموش کر دیا جائے یا کم از کم لوگوں کو اتنا متنفر کر دیا جائے کہ ان میں قرآن سننے کی خواہش ہی نہ رہے۔

لیکن یہ ان کا دوغلہ پن تھا۔ ان کی شخصیتوں کا دوہرا معیار تھا۔ یہ ان کی ذہنی توڑ پھوڑ کا عکاس تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو قرآن سننے سے نہ روک سکے دوسروں کو روکنے میں کیسے کامیاب ہوتے۔ وہ جو خود ایک دوسرے سے چھپ کر قرآن سننے پر مجبور تھے، وہ دوسروں کو کیسے منع کرتے۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ ابوجہل[47] سونے کی کوشش میں چارپائی توڑ رہا تھا۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر الٹ پلٹ کر سونے کی کوشش کر رہا تھا، مگر کمبخت نیند تھی کہ آتی ہی نہ تھی۔ اس کے اندر کا انسان قرآن سننے کیلئے مجبور کر رہا تھا۔ کچھ یہی حالت ابوسفیان اور اخنس بن شریک کی تھی۔

ان دنوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ رات کی نماز میں اکثر تلاوت فرمایا کرتے تھے اور مشتاقان قرآن پورے انہماک اور دلجمعی سے سنا کرتے۔

اس رات ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریک الگ الگ چپکے سے، چھپتے چھپاتے، حرم کے ایک کونے میں آبیٹھے۔ رات کا وقت تھا۔ کوئی انھیں پہچان نہ سکا۔

اللہ اللہ کلام خدا اور رسولِ خدا کی زبان۔ سبحان اللہ کیا تاثیر ہوگی۔ کیا سماں ہوگا۔ تلاوت کرنے والے تھے کہ پڑھتے ہی چلے گئے اور سننے والے تھے کہ سنتے ہی چلے گئے۔

لمحہ دو لمحے نہیں، گھڑی دو گھڑی نہیں، پوری رات، جی ہاں پوری کی پوری رات بیت گئی

Marfat.com

نمودِ سحر کے ساتھ یہ سلسلہ بند ہوا۔

قرآن سننے سنانے والے اپنی راہ چلے۔ سب سے آخر میں ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریک نکلے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے پر نظر پڑتے ہی پہچان گئے۔ تھوڑے سے جھجکے، شرمائے اور ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ اگر لوگوں نے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے اور تینوں نے عہد کیا کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔

لیکن وہ اپنا عہد نبھا نہ سکے۔ اگلے دن پھر ایسا ہی ہوا۔ اگلے دن پھر عہد کیا جو پورا نہ کر سکے۔ تیسرے روز جب پھر وہی کچھ ہوا جس کے نہ کرنے کا عہد کرتے رہے تو اخنس بن شریک لاٹھی ٹیکتا ہوا ابوسفیان کے پاس گیا۔ کہنے لگا اے ابوحنظلہ ذرا ٹھیک بتانا کہ جو کچھ تم نے سنا ہے، اس کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے۔

ابوسفیان بولا اے ابوثعلبہ اللہ کی قسم میں نے وہ باتیں سنی ہیں جن میں سے چند ایک کی مراد کو سمجھتا ہوں اور چند باتیں ایسی بھی ہیں جن کے معنی و مراد میں نہیں سمجھتا۔

اخنس بن شریک دوبارہ بولا: "میرا بھی یہی حال ہے" بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ اخنس نے کہا "میں تو اسے حق سمجھتا ہوں۔"[48]

پھر وہ دونوں ابوجہل کے پاس گئے۔ اس سے پوچھا اے ابوالحکم جو کچھ تو نے سنا، اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

ابوجہل نے جواب دیا، خیال کیا ہے؟ ہم میں اور بنی عبدمناف میں مقابلہ تھا کہ عزت و شرف میں بڑا کون ہے؟ سو انھوں نے بار اٹھائے، ہم نے بھی اٹھائے۔ انھوں نے مال خرچ کیے، ہم نے بھی خرچ کیے، یہاں تک کہ ہم دونوں برابر ہو گئے۔ وہ کہنے لگے ہم میں سے ایک نبیؐ ہے جو صاحبِ وحی ہے، مگر ہم یہ کہاں سے پائیں۔ خدا کی قسم ہم اسے نہیں مانتے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے۔

ذرا غور کیجیے مکہ کے سرداروں کا یوں چھپ کر قرآن سننا کوئی معمولی واقعہ نہیں، ثقافتی لحاظ سے یہ ان کی بہت بڑی شکست تھی۔ اندر سے وہ اسلام کی سچائی کو مان چکے تھے، مگر جھوٹی انا اور خودساختہ چودھرکی وجہ سے مخالفت کر رہے تھے۔ کیا اس قسم کے مخالف تحریکِ اسلامی کی مخالفت میں کامیاب ہو سکتے تھے کیا اس قسم کے متضاد ذہن قرآن کو جھٹلا سکتے تھے نہیں ہرگز نہیں راتوں میں چھپ چھپ کر قرآن سننے والوں کو اتنی مخالفت جچتی ہی نہ تھی۔

پھر بھی وہ اپنے کام سے نہ رکے اور نہ جھجکے۔ جب کوئی بات نہ بن پڑی تو کہنے لگے یہ تو

Marfat.com

پرانے دقیانوسی قصے ہیں۔ پرانی گھسی پٹی داستانیں ہیں۔ بہت ہی فرسودہ قسم کی کہانیاں ہیں جو اس ترقی یافتہ دور میں چلنے کی نہیں۔ بس اگلے وقتوں کی چیزیں ہیں۔ چھوڑو پرے پھینک دو۔

قرآن نے ایسے رویوں پر یوں گل افشانی کی:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۝ [49]

مفہوم: ''اور جب ان سے کوئی پوچھتا ہے کہ تمھارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے۔''

قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

مفہوم:۔ ''تو کہتے ہیں اجی وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں''

اس طرح بھی پوری نہ پڑتی تو اہل ایمان کا مذاق اڑاتے۔ ان کو جا بجا تنگ کرتے۔ ان پر انگلیاں اٹھاتے۔ لچے اور اوباش لڑکے ان کے پیچھے لگا دیتے۔ کمزوروں پر ظلم کرنا شروع کر دیتے۔ موالی اور غلاموں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیتے تاکہ لوگ دین سے پھر جائیں۔ قرآن نے ان حرکتوں پر یوں تنبیہ کی ہے۔

''کرتے رہو جو کچھ تم چاہو تمھاری حرکتیں اللہ تعالیٰ خوب دیکھ رہا ہے۔''

سورہ حم السجدہ آیۃ۔4

دوسری جگہ مخالفین کو یوں احساس دلایا کہ:

مفہوم ''مجرم لوگ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھوں آنکھوں میں اشارے کرتے اور اپنے گھروں کو خوب مزے لیتے ہوئے جاتے۔ جب انھیں یعنی مسلمانوں کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ بہکے ہوئے ہیں، حالانکہ ان پر کسی کو نگران مقرر نہیں کیا گیا تھا۔''

المطففین آیات 29 تا 33۔

قرآن میں مخالفوں کے ردعمل میں نازل ہونے والی آیتیں بے شمار ہیں۔ جنھیں سرد جنگ کے حوالہ سے پرکھا جائے تو انتہائی شیریں اور اثر آفریں ثقافتی اسلوب لئے ہوئے ہیں۔ موضوع کافی طویل ہو چلا ہے اور سرد جنگ کے بہت سے محاذ باقی ہیں۔ ڈر ہے اسی طرح پر بحث جاری رہی تو شاید باقی محاذ تشنہ رہ نہ جائیں۔ اس لیے اختصار سے دوستی نبھاتے ہوئے اخلاقی محاذ کی سیر کو نکلتے ہیں۔

———(((الحمد للہ)))———

حواشی:

1- اس تاثر کو سیارہ ڈائجسٹ رسول نمبر میں ابھارا گیا ہے۔ اس کے لیے ہم سیارہ کے ممنون و

Marfat.com

مشکور ہیں۔

2- ابنِ ہشام جلد اول، سیرت النبی جلد اول، سرورِ عالم جلد دوم، تاریخ طبری وغیرہ۔

3- تفہیم القرآن، انوار القرآن، تفسیرِ عثمانی۔

4- سیارہ ڈائجسٹ سیرت نمبر میں اس واقعہ کی خوب تصویر کشی کی گئی ہے۔

5- ابنِ ہشام جلد اول، سیرت النبی جلد اول، سرورِ عالم جلد دوم۔

6- سورہ مومنوں آیت نمبر 70، تفہیم القرآن۔

7- سورہ القلم آیت: 2 تا 4۔

8- سورہ المطففین آیات: 29 تا 33۔

9- سورہ الطور آیت نمبر: 29۔ دیکھیے: تفسیر عثمانی یا تفہیم القرآن یا تفسیر ابنِ کثیر یا انوار القرآن۔

10- سورہ یٰسین آیت نمبر: 69۔

11- سورہ شعراء آیت نمبر: 224-225۔

12- ابنِ ہشام جلد اول، سیرت النبی جلد اول، سرورِ عالم جلد دوم۔

13- یہ اضافہ سرورِ عالم میں ابنِ جریر کے حوالے سے نوٹ کیا گیا ہے۔

14- ابنِ ہشام جلد اول۔

15- سورہ اعراف آیت: 189۔

16- سورہ طور آیت: 29۔

17- سیرت سرورِ عالم، جلد دوم، ابن اسحاق اور ابن سعد، سیر الصحابہ، زندگیاں صحابہ کی۔

18- سرورِ عالم۔ جلد دوم، سیر الصحابہ، ابن ہشام جلد اول، زندگیاں صحابہ کی۔

19- سیرت سرورِ عالم جلد دوم بحوالہ مسلم نسائی بیہقی اور ابنِ سعد، ابنِ ہشام جلد اول، سیرت الانبیاء جلد دوم، سیرت النبی جلد اول۔

20- سرورِ عالم۔ جلد دوم۔

21- ایضاً۔

22- ایضاً۔

23- ایضاً۔

24- ایضاً۔

Marfat.com

25- ایضاً۔
26- تاریخ اسلام۔سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
27- ابن ہشام، جلد اول، سرور عالم، جلد دوم۔
28- انوار القرآن، تفسیر ابن کثیر، تفہیم القرآن، تفسیر عثمانی، تفسیر مظہری۔
29- ابن ہشام، جلد اول۔
30- کلام کی تصدیق پر اس قسم کے کئی جملے ابن ہشام، جلد اول، تاریخ طبری، سرور عالم، سیرت النبیؐ رحمت اللعالمین میں ابوجہل، ولیدہ بن مغیرہ، نضر بن حارث کے بیانوں میں درج ہیں۔
31- سیرت النبی، جلد اول، سرور عالم، جلد دوم، ابن ہشام، جلد اول۔ رحمت اللعالمین، جلد اول، طبرانی، ابن جرید، سعید بن منصور، ابن مردودیہ وغیرہم سے نقل ہیں۔
32- سرور عالم، جلد دوم روایت جندب بن عبداللہ بجلی۔
33- عوفی۔ابن جرید بروایت ابن عباسؓ۔
34- ابن ہشام، جلد اول۔سرور عالم، جلد دوم۔سیرت النبی، جلد اول۔
35- بخاری شریف، ترمذی شریف۔
36- بخاری مسلم، ترمذی مالک، نسائی۔
37- مسند احمد، حاکم، ابن جرید۔
38- سیرت النبی جلد اول، ابنِ ہشام جلد اول۔
39-40- آپؐ کے بیٹوں کے نام تھے انھیں ناموں کو کنیت کر کے پکارا گیا۔
41- نیویں نیویں ہو کر کھسکنا پنجابی محاورہ جس کے معنی خاموشی سے چلے جانا کے ہیں۔
42- ابنِ ہشام، تاریخ اسلام، تاریخ طبری، تاریخ ابنِ خلدون۔
43- ابنِ ہشام جلد اول۔
44- سورہ نحل آیت 103۔
45- ابنِ ہشام جلد اول۔بروایت محمد بن اسحاق۔
46- سرور عالم۔جلد دوم بحوالہ اسباب النزول اور نقل واحدی کی کلبی اور مُقاتل سے ہے۔
47- ابنِ ہشام جلد اول سرور عالم جلد دوم۔
48- سرور عالم جلد دوم بحوالہ اصابہ حافظ ابن حجر۔
49- سورہ النحل آیت 24۔

Marfat.com

باب:8

اخلاقی محاذ

نبوت کے اخلاقی مظاہرے

قرآن کا ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ، ایک ایک آیت مشرکین پر برس رہی تھی۔ یہ قرآنی طمانچے تھے جو ان کی افواہوں اور غلط ترجیحوں کے جواب میں پڑ رہے تھے۔ مکہ کے گرد و نواح میں کوئی ذی روح ایسا نہیں ہوگا جس نے کھسیانی بلیوں کو کھمبے نوچتے نہ دیکھا ہوگا۔

اگر عقل مند ہوتے تو اتنے واضح دلائل دیکھ کر ہوش کے ناخن لیتے۔ دینی ہوش و شعور کے معاملہ میں یہ لوگ عقل سے پیدل تھے۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ انگور کھٹے ہیں، جھوٹی انا کے انگور توڑنے کی سر توڑ کوششوں میں لگے رہے۔

وہ احساسِ شکست خوردگی سے شعلہ جوالہ بن چکے تھے۔ اب کے تو خطرناک ارادے لئے بیٹھے تھے۔ دارالندوہ کے فرعون فرعونیت کی سوچ رہے تھے کہ اب اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہاں آ جائیں تو ان کی تکہ بوٹی کر دی جائے۔ (نعوذ باللہ)

سوئے اتفاق ان باتوں کی بھنک [1] حضرت فاطمہؓ کے کانوں میں پڑ گئی۔ وہ سنتے ہی گھر دوڑی چلی آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ عرض کیا۔ آپؐ نے تسلی دیتے ہوئے پانی مانگا وضو کیا اور:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی تک

آپ صحن کعبہ میں داخل ہوئے۔ حاضرین کی نظروں سے نظریں دوچار ہوئیں۔ بس کیا تھا۔ سب کچھ بدل گیا۔ ابھی ابھی قتل کے مشورے کرنے والے نظریں بھی ملانے سے گریزاں تھے۔

Marfat.com

یہ رعب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تھا کہ سروں پر بہادری کی جھوٹی دستاریں رکھے ہوئے (نعوذ باللہ) ایک لمحہ پہلے قتلِ نبی کیلئے بڑیں ہانک رہے تھے۔ جب مجسم رحمتِ عالم کو روبرو پایا تو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکے۔

یہ عقل مند تھے، ایسے عقلمند کہ ہر چیز کو وسائل اور اسباب کی کسوٹی پر پرکھنے والے، لیکن اس مسبب الاسباب کو پرکھنے سے قاصر رہے جس نے صرف لفظ ''کن'' سے کائنات ارضی کے پورے کے پورے نظاموں کو تشکیل دے دیا۔ وہ پھر کن کہہ کر ملیا میٹ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ جو صرف رب المسلمین یا رب المومنین ہی نہیں، بلکہ رب العالمین ہے۔ جو نہ صرف ماننے والوں پر، بلکہ منکروں اور مشرکوں پر بھی ہزاروں لاکھوں نعمتیں لٹا رہا ہے۔

کسی بھی نظامِ فکر و عمل کے بانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود مجسمہِ عمل ہو۔ وہ جس نظام یا تحریک کی دعوت دے رہا ہے، اس کی اپنی شخصیت عین اس دعوت کے مطابق ہو۔ اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ اس کی شخصیت و کردار میں کہیں بھی جھول دکھائی نہ دے۔ اس میں قوت برداشت، حلم اور بردباری انتہا حد تک موجود ہو۔ وہ مخالفانہ پروپیگنڈا برداشت کر کے ہمدردی اور صلح جوئی کے انداز میں دعوت کا تسلسل جاری و قائم رکھ سکے۔

اگر وہ واقعی انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے تو اخلاق و کردار، لب و لہجہ، زبان و کلام اور فکر و عمل کی یکسانیت رکھتا ہو۔ اس کی انقلابی دعوت ان چیزوں سے پختگی اور سیرابی حاصل کرے۔ اس کی سچائی اور اعلیٰ ظرفی سے تحریک کے رعب و دبدبہ میں اضافہ ہوتا کہ تحریکی کارکن اپنی محبوب شخصیت کے یکساں قول و فعل کے زیر سایہ قابل فخر انداز میں تحریکی فریم ورک پر عمل پیرا رہ سکیں۔

سرد جنگوں کے نفسیاتی موڑ پر، یہ امر مسلمہ ہے، اگر بانیٔ انقلاب کی شخصیت دوہری اور تضادات کا شکار ہوگی تو لامحالہ کارکن نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ نفسیاتی الجھنیں اعصاب پر سوار ہو کر انھیں تحریکی منشور پر عمل پیرا ہونے سے روک دیں گی۔

اگر مخالف پروپیگنڈہ معمولی تگ و دو سے جھپتی تضادات واضح کر دے گا تو حقائق کھل کر سامنے آ جائیں گے اور کارکنوں میں بددلی اور سراسیمگی پھیلے گی جس سے تحریک خود بخود رول بیک ہونے لگے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا میں انقلاب برپا کرنے والی تمام تحریکیں صرف اور صرف اپنے بانیوں کے گرد گھومتی ہیں۔ اگر بانیوں کی شخصیتیں بے لوث اور کردار بے داغ رہے تو انقلاب بڑی سے بڑی طاقتوں سے بھی نہ رک سکے۔

مکہ میں برپا ہونے والا انقلاب تاریخ کے تمام انقلابوں سے مختلف تھا۔ اس کے پیش نظر

Marfat.com

صرف سیاسی، ریاستی، جغرافیائی یا مذہبی رسوم وعبادات کو ہی نہیں بدلنا تھا بلکہ یہ تو وہ تحریک برپا کی جا رہی تھی جس نے پوری کائناتِ انسانی کو ایک دین دینا تھا۔ اور پھر یہ دین کسی خاص وقت یا خاص قوم تک لایا جانے والا نظام تھوڑا تھا، بلکہ اس نے تو قیامت تک آنے والی تمام کی تمام نسلِ انسانی کی رہنمائی کرنا تھی۔ نہ صرف رہنمائی مقصود تھی، بلکہ اسے دنیوی اور اخروی زندگی میں کامیاب بھی بنانا تھا۔

اس لئے بانیٔ تحریک پر ذمہ داریاں بھی اسی قدر تھیں۔ ان کے کندھوں پر بار بھی اسی قدر گراں تھا۔ ذرا سوچئے! کیا متضاد عمل شخصیت یہ بارِ گراں اٹھانے کے قابل تھی؟ کیا مادی خواہشات کی پروردہ ذات یہ تحریک پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی تھی؟ کیا جھوٹی لیڈر شپ چمکانے والی ہستی عرب جیسے اکھڑ اور بدمزاج لوگوں کو متاثر کر سکتی تھی؟ کیا عہدے یا کرسی سے مرعوب شخصیت اللہ کا سچا اور حقیقی رس عام لوگوں کے دلوں میں گھول سکتی تھی؟ پھر ایسی بھرپور مخالفت کے مقابلے میں جو بظاہر عقلی دلائل پر مبنی تھی۔ جس کے پیچھے عوام کا اکثریتی دباؤ تھا۔ جو ظاہر اور موجودات پر مبنی تھی۔

تحریکی نشوونما کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے بانیٔ انقلاب کا ہونا ضروری تھا۔ اس وقت مکہ تو ایک اخلاق باختہ سوسائٹی کا نام تھا۔ اس کے لیڈر اور نمائندے بداخلاقی کے پتلے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ بانیٔ انقلاب کی شخصیت اتنی جاندار اور مضبوط ہو کہ بڑے سے بڑا مخالف بد اخلاقی کا جھوٹا الزام تک نہ دے سکے۔ وہ انقلابی نظام وفکروعمل کا معترف ہو نہ ہو، بانیٔ انقلاب کی شخصیت وکردار کا ضرور معترف ہو جائے۔

قارئین!! انقلابی تحریکوں کے ساتھ اکثر ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے کہ انقلاب کے بانیوں کو مختلف ترغیبات دے کر گمراہ کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ اس طرح کی ترغیبات اور لالچ آپؐ کو بھی دیے گئے۔ جن کی تفصیلات مناسب مواقع پر بیان کی جائیں گی۔ مختصراً اگر قائد تحریک میں ذرہ برابر بھی لالچ یا اخلاقی پستی موجود ہو تو اس کے پرکشش ترغیبات میں پھنستے دیر نہیں لگتی۔ یوں تحریک کسی بھی مرحلے پر اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔

یہ فطری کلیہ ہے کہ پست فطرت لوگوں میں اخلاقی جرأت کا فقدان رہتا ہے۔ وہ کبھی اس قسم کی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ نہیں کر پاتے جس قسم کا مظاہرہ حضورؐ نے مشرکین کا مشورہ سن کر کیا۔ یہ مشورہ باب کے شروع میں رقم کیا گیا ہے۔

بہرکیف!! رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت تو ہر لحاظ سے مکمل اور جامع تھی۔ بڑے

سے بڑے دشمن بھی آپ کو صادق و امین کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

جنگ بدر میں اخنس بن شریق[2] نے ابوجہل سے علیحدگی میں پوچھا: اے ابوالحکم! اس وقت میرے اور تیرے درمیان کوئی تیسرا موجود نہیں۔ سچ سچ بتاؤ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی جھوٹے ہیں؟ (نعوذ باللہ)

ابوجہل نے جواب دیا۔ خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن تم ذرا سوچو کہ اگر حجابت کعبہ اور کلید برداری سقایت حجاج یعنی حجاج کو پانی پلانے کا انتظام اور نبوت سب کچھ بنو ہاشم کے پاس چلا جائے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔

ایک اور جگہ وہ کہتا ہے کہ اے محمدؐ[3] میں تمہیں جھوٹا نہیں کہتا، لیکن جس چیز کی تم دعوت دیتے ہو۔ اسے نہیں مانتا۔

میرے خیال میں حضورؐ کے اخلاقی دلائل میں یہ ادنیٰ سی مثالیں ہیں۔ آیئے ذرا آگے چلتے ہیں۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

ابو جہل پر کیا بیتی

کسی بھی قسم کی قیادت (Leadership) کے لئے ضروری ہے کہ وہ متضاد شخصیت کی مالک نہ ہو۔ ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار نہ ہو۔ ذہانت اور سنجیدگی کی بام عروج پر ہو۔ حلم اور بردباری میں یکتا ہو۔

اگر قیادت ان خوبیوں سے متصف نہیں تو یقیناً اس قیادت کے پروردہ کوئی تاریخ ساز کردار ادا نہیں کر سکتے۔ متضاد شخصیت قائد کے زیر سایہ کام کرنے والے کئی ذہن توڑ پھوڑ کا شکار ہو جائیں گے۔ اوپر سے شدید نفسیاتی مخالفت انہیں بکھیر کر رکھ دے گی۔ اعصابی تناؤ یا ذہنی دباؤ سے آہستہ آہستہ تحریک، قوم یا نظریاتی گروپ بوکھلاہٹ کا شکار ہو جائے گا۔

بہر کیف کچھ ایسی ہی صورتحال قائدانِ مکہ کو درپیش تھی۔ ان کے پیروکار اسی قسم کی نفسیاتی صورت حال سے دوچار تھے۔ ایک تو ان کے قائد متضاد اور غیر نظریاتی شخصیتوں کے مالک، اوپر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار اور خلقِ عظیم ان کے اعصابی تناؤ اور نفسیاتی دباؤ میں اضافہ کر رہا تھا۔

مشرکین چونکہ تضادات کا شکار تھے۔ ان کے ضمیر اندر سے ان کی مخالفت کر رہے تھے۔ وہ ظاہراً، قولاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کے معترف تھے۔ عرف عام میں وہ اندر سے سچائی قبول کر چکے تھے، مگر صرف سرداریاں، عہدے یا وزارتیں چھن جانے کا خوف مخالفت پر کھڑا کئے ہوئے تھا۔ اس بات کی تصدیق اس وقت ہو گئی جب فتح مکہ کے وقت تمام مخالفین مکہ حصارِ اسلام میں داخل ہوئے۔

ابو جہل اپنے دور کا بہترین ادیب، شاعر اور نقاد تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مکہ کا بہت بڑا سیاسی لیڈر بھی تھا۔ نہ صرف اعلان نبوت سے پہلے، بلکہ نبوت کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی قدغن نہ لگا سکا۔ ہٰذَا الصَّادِقُ "ھٰذَا الاَمِین" ہی کہا کرتا تھا۔ یہی کردار کی پختگی اور اخلاق اعلیٰ ظرفی تھی جو دوسرے مخالفین کی طرح ابو جہل کی شخصیت پر بھی حاوی ہوتی چلی گئی۔ دوسروں کی طرح وہ بھی

Marfat.com

پیٹھ پیچھے خوب الم غلم بولتا مگر جب کبھی اکیلے میں حضورؐ سے مل جاتا تو کوئی بات نہ کر پاتا۔
تاریخ کا ادراک رکھنے والے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں انقلابی تحریک میں شخصیت کا سحر یا رُعب کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی اصول ماہرینِ سرد جنگ کے نزدیک بھی تسلیم شدہ ہے کہ شخصیت کا رعب اور دبدبہ قوموں میں نئی روح پھونک دیتا ہے۔
یاد رہے کہ شخصیت جسمانی ڈیل ڈول کا نام نہیں، بلکہ یہ تو اخلاق و کردار اور اقوال و اعمال کی یکسوئی سے عبارت ہے۔ یہ ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔
میرے خیال میں شاید مشرکین مکہ اس مسحور کن شخصیت سے مرعوب ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر یا ساحر کہتے تھے۔ آئندہ پیش آمدہ واقعات حضورؐ کے شخصی رعب اور قائدانہ دبدبہ کا منہ بولتا اور زندہ و جاوید ثبوت ہیں۔

———(((اللہ اکبر)))———

ایک دفعہ اراش[4] کا ایک آدمی کچھ اونٹوں کے ساتھ تجارتی غرض سے مکہ آیا۔ اونٹ بکنے کے لئے منگل منڈی کھڑے کئے گئے۔ چند آدمی بولی دینے لگے تو ابو جہل نے انھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ اونٹ میں نے خریدنے ہیں۔ تمام خریدار تِلک گئے۔ کوئی خریدار نہ رہا تو ابو جہل نے اپنی مرضی کی قیمت پر سستے داموں خرید لیے اور قیمت ادا کرنے کا وعدہ کر کے اونٹ لے گیا۔
ایک دن، دو دن، اونٹوں کے مالک نے انتظار کیا اور پھر کئی دن گھر جا کر ابو جہل سے رقم مانگتا رہا۔ ابو جہل نے رقم دینے سے یکسر انکار کر دیا۔
تنگ آمد بجنگ آمد۔ اس شخص نے حرم میں کھڑے ہو کر مدد کی فریاد کی۔ سردارانِ مکہ بھی حرم میں موجود تھے۔ سب نے یہ جواب دیا کہ ہم ابو الحکم کے خلاف تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ انھوں نے ازراہِ مذاق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ جو کونے میں بیٹھے ہیں، تیری ضرور مدد کریں گے۔
غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔ وہ اجنبی مذاق اور حقیقت کا فرق محسوس نہ کر سکا۔ اپنی فریاد سنانے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا تو یہ سردارانِ مکہ کھسر پھسر کرنے لگے کہ اب مزہ آئے گا۔ اب پتا چلے گا۔
اس اراشی نے خدمتِ اقدسؐ میں مدعا بیان کیا۔ رحمتِ عالمؐ کو یہ کیسے گوارا تھا کہ اس کے شہر میں اجنبی لٹتے رہیں اور آپؐ خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہیں۔
آپؐ نے اسی وقت ابو جہل کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ ابو جہل اٹھا۔ اندر سے آواز دی کون؟

Marfat.com

فرمایا میں ہوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

آواز سنتے ہی حلق خشک ہونے لگا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی۔ طوباً و کرہاً، دل کو تسلی دلاسہ دیتا کسی نہ کسی طرح دروازے تک آ پہنچا۔

حضورؐ کو اراشی کے ساتھ دیکھتے ہی رنگ فق اور دل کمزور ہونے لگا۔ ہونٹ خشک اور زبان گنگ ہوگئی۔

آپؐ نے بغیر کسی تمہید کے حکم دیا کہ اس شخص کا حق ادا کرو۔ یہ حضورؐ کے اخلاق و کردار کا رعب تھا یا کہ پاکدامنی اور حیا کا اعجاز۔ ابوجہل نے بلا چون و چرا رقم ادا کر دی۔

مشرکین کا خیال تھا کہ ابھی تک ابوجہل نے (نعوذ باللہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی درگت بنا دی ہوگی۔ انھوں نے صورتحال دیکھنے کے لئے مخبر بھیج دیئے۔ اندازوں کے برعکس صورتحال نے مخبروں کو مبہوت کر دیا۔

وہ واپس جا کر آنکھوں دیکھا حال[5] سنانے لگے کہ خدا کی قسم ہم نے آج جیسا عجیب و غریب واقعہ کبھی دیکھا ہی نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی ابوالحکم کا رنگ فق ہوگیا۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اراشی کا حق ادا کرنے کو کہا تو ایسے لگتا تھا جیسے حکم بن ہشام کے جسم میں جان نہیں۔ وہ تو کوئی چلتا پھرتا تابوت ہے۔ اس نے سدھائے ہوئے جانور کی طرح حکمِ محمد صلی اللہ علیہ کی تعمیل کی۔

سرد جنگ میں اس قسم کی کارروائی کو سفید پروپیگنڈا کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد قیادت کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ سرد جنگ میں اسے لاٹھی بچالینا کہتے ہیں۔ یعنی غیر محسوس انداز میں قائدانہ کمزوریوں کی رونمائی کی جاتی ہے۔

یقیناً وار تو بڑا گہرا تھا۔ اگر کوئی اخلاقی جرأت سے عاری شخصیت ہوتی تو یقیناً ایک اجنبی کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں کیونکر ڈالتی۔ دوسرے ملک کا باشندہ جہاں اپنی قسمت پر روتا، وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی (نعوذ باللہ) خالی بڑیں ہانکنے کی کہانیاں لے کر اپنے ملک میں داخل ہوتا، لیکن.......... الحمدللہ ہر قسم کی مخالفت اسلامی تحریک کے اثرات روکنے کی بجائے اسے مزید زود اثر کر گئی اور شاید قرآن نے ایسی مخالفتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝[6]

مفہوم: اور تمھارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔

دیکھیئے ایک تو وہ اراشی بذات خود حضورؐ کا معترف ہوگیا، دوسرے جہاں جہاں سے گزرا

Marfat.com

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مداح سرائی کرتا چلا گیا۔ تیسرے اگر اپنے علاقے یا قبیلے میں بااثر تھا تو فطری طور پر جس جس نے سنا اس کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قریب سے دیکھنے کا تجسس ابھرا ہوگا۔ شخصیت قریب سے دیکھنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں اپنے کانوں سے سننے کا فطری تجسس پیدا ہوا ہوگا۔

سرد جنگ نفسیاتی جنگ یا پروپیگنڈا جنگ کا معمولی شعور رکھنے والے بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ تجسس بیدار کرنا کسی انقلابی تحریک کے لئے کتنی بڑی کامیابی تصور کی جاتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم شاید ایسے کام بڑی مدت میں کر پاتے جو محض مخالفوں کی بھرپور مخالفت کی وجہ سے بغیر سوچے بغیر کسی منصوبہ بندی کے بغیر وسائل ضائع کئے تکمیل پا گئے۔

—(((اللہ اکبر)))—

اس واقعہ سے مشرکین صحیح معنوں میں پانی پانی ہو گئے تھے۔ ہر کوئی چلتے پھرتے خواہ مخواہ اس طرح ہاتھ ہلاتا جاتا اور اشارے کرتا جا رہا ہوگا جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر خود سپردگی کے عالم میں کہہ رہا ہو۔

''سوچا تھا کیا؟ کیا ہو گیا؟

اور جب کبھی اکیلے تنہائی میں بیٹھتے ہوں گے تو ہاتھ ماتھے پر یعنی ماتھا پکڑ کر یہی بڑبڑاتے ہونگے۔

سوچا تھا کیا؟ کیا ہو گیا؟

کچھ ایسی حالت میں ایک دن پھر دربار سجاتے ہیں۔ دارالندوہ میں بیٹھتے ہیں۔ وقتی طور پر شرم مانع ہوتی ہے۔ پھر شرم لمبی لمبی پگڑیوں کے نیچے دب جاتی ہے۔ کل کی بھول جاتی ہے۔ آج کی شروع ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کی ہانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس ہانک کا موضوع صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہوتی ہے۔

تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو والی بات تھی۔ ایک یتیم لاوارث بچہ پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس چیختا چلاتا آیا۔ بڑی بڑی پگڑیوں سے مرعوب التجا کرنے لگا کہ میرا باپ مرنے سے پہلے مجھے ابوجہل کے پاس وصی کر گیا یعنی تمام مال و متاع اور ورثہ امانت کے طور اس کے حوال کر کے وصیت کی کہ اس مال سے میرے بیٹے کی نگہداشت کرنا۔ جب بالغ ہو جائے تو خرچ کیا ہوا رکھ لینا، باقی ترکہ ورثہ اس کے حوالے کر دینا۔

صاحبو!! میں انتہائی بھوک اور تنگ میں گزر بسر کرتا ہو، مگر ابوجہل باپ کا چھوڑا ہوا ترکہ

Marfat.com

مجھے دینے کو تیار نہیں۔ مارے بھوک اور ننگ کے اصرار کرتا ہوں تو ظالم بجائے دو لقمے کھانا دینے کے مارتا پیٹتا ہے۔

صاحبو!! میری درخواست ہے کہ میرے باپ کا چھوڑا ہوا مجھے لے دیجئے تاکہ لوازماتِ ضروری چلا سکوں، مگر بجائے اس یتیم ولاوارث کی مدد کرنے کے ان جھوٹی دستاروں سے ایک اور شر نکلی۔ شرارتاً کہنے لگے وہ دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہیں۔ ان کے پاس جاؤ۔ وہ ضرور تیری مدد کرے گا۔

بچہ معصوم تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ابوجہل سے ٹھنی ہوئی ہے۔ مذاق اور جھوٹ کی پرکھ اس کی معصومیت سے بالا تھی۔ اس قسم کی میٹھی شرارت اس کی حدِ شعور سے بالا تھی۔

اٹھا اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں فریاد کناں ہوا۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذاتِ خود یتیمی کے کٹھن دور کا تجربہ تھا۔ فریاد سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بچے کو ساتھ لیا اور ابوجہل کے پاس گئے۔ اس نے استقبال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس بچے کا مال اسے لوٹا دو۔ اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ بچے کا پورا حق ادا کر دیا۔

سردارانِ مکہ کسی مزیدار جھڑپ کی امید لئے بیٹھے تھے۔ خلافِ توقع صورتحال دیکھ کر بوکھلا گئے۔ غصے سے پھنکارتے ہوئے ابوجہل سے کہنے لگے کہ تو نے بھی اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ دیا۔

ابوجہل نے جواب دیا: خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی اس قسم کی بات لے کر آتے ہیں، پتا نہیں مجھے اپنے اوپر اختیار کیوں نہیں رہتا۔ بس جو وہ کہتے ہیں، لاشعوری طور پر مجھ سے ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی کارروائیاں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی قد کاٹھ کم کرنے کے لئے کی جاتی تھیں۔ ایسی حرکتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائدانہ وقار مجروح کرنے کے لئے عمل میں لائی جاتی تھیں۔

قربان جائیں رسولِ امّی صلی اللہ علیہ وسلم پر اخلاقی جرأت اور بہترین قائدانہ فیصلوں سے ایسی تمام مخالفتیں اپنے حق میں بدل لیتے۔ یوں ہر مخالف کارروائی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور نکھر کر سامنے آ جاتی۔

مخالفین بار بار کی ناکامیوں سے بوکھلا کر طعن و تشنیع اور گالی گلوچ پر اتر آئے۔ ذرا ایک لمحے

Marfat.com

کے لئے اپنی ذاتی انا (Iggo) کو قریب قریب بلا کر پوچھئے تمھیں گالی دینے والا بھلا لگتا ہے؟ کیا تمھاری انا معاف کرنے پر آمادہ ہوگی۔ یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ انتقام پسندی انسانی جبلت ہے۔(Human Natur) اور انسان فطری تقاضے پورے کرنے پر مجبور ہوتا ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفین کی گھٹیا حرکات کا جواب دینا تو درکنار کبھی ان کی سطح پر جا کر سوچا بھی نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو گالیوں کے جواب میں دعائیں دیتے۔ مخالفت کرنے والوں کی امانتوں کی حفاظت کرتے۔ آپؐ راہوں میں کانٹے بچھانے والوں کی عیادت کرتے۔ ان کا بوجھ خود اٹھا کر کئی میل ان کے ساتھ چلتے۔ اگر کوئی مخالف گھر پر نہ ہوتا تو اس کی بکریاں خود چرا لاتے۔ انھیں دودھ دیتے، مگر وہ کم بخت اس قسم کے حسنِ سلوک کے باوجود مخالفت سے باز نہ آتے۔

———(((اللہ اکبر)))———

سرد جنگ کی تکنیک کے لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی عظمت و برتری دراصل سب سے پہلی اور آخری فتح تھی۔ مخالفین کی یہ زہریلی کارروائیاں سفید پروپیگنڈا کے زمرے میں آتی ہیں، جنھیں معمولی کوشش سے کاؤنٹر کر دیا جاتا تھا۔ حالانکہ یہ جوابی حملہ دفاعی تدبیر کے طور پر اختیار کیا جاتا تھا، مگر یہ دفاعی تدبیر تمام مخالفت کی گرد جھاڑ دیتی تھی۔ اس طرح تحریک نقصان کے بجائے فوائد سے ثمر بار ہوجاتی اور مخالفین تلملا اٹھتے۔

یہ مخالفین کی شخصیتوں پر ایک طرح سے دوہرا حملہ ثابت ہوتا۔ ایک طرف تو انھیں اپنی کم فہمی اور کم عقلی کا قلق ہوتا اور دوسرے رسول امّی کی فراست اور کامیابی کا دکھ گھائل کرتا اور یوں وہ ہڑ بڑا کر کسی نئے منصوبے پر سوچتے۔ کوئی نئی گراؤنڈ تلاش کرتے۔ کوئی نیا گل کھلانے کی کوشش کرتے۔

اسی طرح ایک دن آپ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم [8] حرم شریف میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔

بنی زبیدہ کا ایک آدمی حرم میں داخل ہوا اور با آواز بلند کہنے لگا: ''اے قریش کے لوگو! اگر تم نے باہر سے آنے والوں کا مال تجارت لوٹنا شروع کر دیا تو تمھارے پاس باہر سے کوئی خاک مالِ تجارت لائے گا۔''

آپ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو اسے پاس بلا کر پوچھا: ''اصل واقعہ کیا ہے؟''

اس نے عرض کیا کہ ابوالحکم نے میرے تین اونٹ خریدنے کی خواہش ظاہر کی، مگر قیمت بہت کم لگائی۔ مقابلے میں اگر کوئی بولی دینے لگا تو اسے ڈرا دھمکا کر بھگا دیا۔ بعد ازاں ابوالحکم کے

Marfat.com

مقابلہ میں کوئی بولی دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔اب میں اگر اس قیمت پر بیچتا ہوں تو بہت نقصان ہوگا۔

آپ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تینوں اونٹ صحیح قیمت پر خود خرید لئے۔

ابوجہل بھی ابوجہلوں کی مجلس دارالندوہ میں براجمان تھا۔حضورؐ اس کے پاس تشریف لے گئے اور کہا کہ اگر آئندہ کسی سے ایسی حرکت کی تو میں سختی سے پیش آؤں گا۔

ابوجہل نے عاجزانہ جواب دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔

وہاں موجود امیہ بن خلف اور دوسرے سردار تڑپ کر ابوجہل سے کہنے لگے کہ تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو کمزوری دکھائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تو عنقریب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والا ہے۔

ابوجہل نے اُزردگی سے جواب دیا۔بخدا میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا، مگر آج مجھے ایسے لگا جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں نیزہ بردار کھڑے ہیں۔اگر میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے حیل وحجت کی تو یہ دونوں نیزے میرے جسم میں گھونپ دیں گے۔مارے خوف کے میرے منہ سے نکل گیا کہ میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔

اگر عقل مند یا حقیقت پسند ہوتے تو ایسے واضح دلائل دیکھ کر اسلام اختیار کر لیتے، مگر وہ تو ہمارے آج کے اقتدار پرست سیاستدانوں کی طرح صرف اقتدار پرست تھے۔ان کی عقل تو محض عہدوں وزارتوں اور کرسیوں تک محدود تھی۔وہ اپنے آپ سے باہر نکل کر سوچتے تو کچھ سمجھ میں آتا، اپنے آپ سے باہر نکل کر سوچنے کو وہ اپنی سرداریوں کی موت تصور کرتے تھے۔اس لئے وہ اپنی جھوٹی چودھر، جھوٹی سیاست یا جھوٹی سیاسی انا کے خول میں بند رہے اور اسی حالت میں انھیں موت نے آلیا۔

لیکن جب تک زندہ رہے اسلام کی مخالفت کو اپنی کامیابی تصور کرتے رہے، حالانکہ قرآن نے واضح الفاظ میں ان کی ناکامی کی تشہیر کر دی تھی۔

اسلام کے مقابلہ میں بار بار ناکامی کے باوجود مخالفت پر ڈٹے رہنا ان کا بوکھلایا پن تھا۔گھٹیا اور بے تکے انداز میں مخالفت کرنا ان کی کم عقلی اور بے یقینی کی مثالیں تھیں۔ایسی بے یقینی کہ جس کا اندر سے یقین رکھتے تھے، مگر باہر سے بڑھکیں مار مار کر ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ باتیں ہم سے منوانا ممکن نہیں۔

جس طرح آج ہم کہتے ہیں کہ سود کے بغیر بینکاری ممکن نہیں۔ سود کے بغیر ہماری معیشت تباہ ہو جائے گی، حالانکہ سود کے ساتھ بھی ہماری معیشت تباہ ہو چکی ہے۔

اس بات کا ہم سب کو اچھی طرح یقین ہے کہ سود حرام ہے۔ اس کا چھوڑنا لازم ہے۔ حکم خداوندی کو سیدھے سچے انداز میں مان لینے میں ہی فائدہ ہے، لیکن ہم ظاہراً اور عملاً بے یقینی کا شکار ہیں۔ سودی نظام ترک کرنے میں معیشت کی تباہی تصور کر رہے ہیں۔

نظامِ معیشت تو صرف ایک شعبہ ہے۔ یہ پوری کی پوری دنیا اللہ کے حکم سے چل رہی ہے۔ وہ خدا جو پورے کے پورے نظامِ کائنات کو چلانے پر قادر ہے، کیا وہ سود کے بغیر نظامِ معیشت کو نہیں چلا سکتا۔

حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کر کے خواہ اچھے سے اچھا نظام ہی کیوں نہ اپنا لیا جائے۔ اہلِ یقین و ایمان کے عقیدہ کے مطابق وہ کم از کم مسلمانوں میں نہیں چل سکتا۔

یہی سوچ مشرکین مکہ کی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپنے سیاسی معاشی اور معاشرتی ڈھانچے کو بچا لیا جائے، کیونکہ اس میں ان کی کرسی، ان کا کردار اور ان کے عہدے محفوظ تھے اور اسلام جو کچھ لا رہا تھا، اس سے ان کی چودھریں، ان کی سرداریاں غیر محفوظ نظر آ رہی تھیں۔ اس لئے وہ بار بار شرمندگیوں کے باوجود مخالفت پر ڈٹے ہوئے تھے۔

---(((اللہ اکبر)))---

ان واقعات سے واقعی ابوجہل کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ سردارانِ قریش کو جمع کر کے کہنے لگا۔ اے گروہ قریش تم نے دیکھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح ہمارے دین میں کیڑے نکالتے، باپ دادا کو گمراہ کہتے، ہماری عقلوں کو بے عقلی قرار دیتے، ہمارے بتوں کو برا بھلا کہنے میں طاق ہیں۔

خدا کی قسم اب میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ کل میں ایک بڑا پتھر لے کر آؤں گا۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ ریز ہوں گے تو میں اس پتھر سے ان کا سر کچل دوں گا۔

اگلے روز واقعی یہ سٹھیایا ہوا پتھر لئے چھپ کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئیں۔ سجدہ میں گریں تو ان کا کام تمام کروں۔ کئی دوسرے قریشی بھی صبح سے مسجد الحرام میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

آپ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم حسب معمول تشریف لائے اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔

جب آپ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ ریز ہوئے تو ابوجہل پتھر لئے آہستگی سے آگے بڑھا۔ قریب پہنچا پھر یکا یک پچھلے پاؤں پلٹنا شروع کر دیا۔ پتھر ہاتھ سے گر گیا۔ رنگ فق ہو گیا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی اور دن کو تارے نظر آنے لگے۔ خوب بدحواس اور خوف زدہ ہوا۔

لوگ تو کچھ اور امید لگائے بیٹھے تھے، مگر یہ کیا ہو گیا۔ پورا مجمع حیران تھا کہ ابوالحکم کو کیا ہو گیا۔ یہ اتنا قریب جا کر اپنی رضا پوری کئے بغیر پلٹ آیا۔

خاص خاص قریشی اٹھ کر اس کے قریب گئے۔ پوچھنے لگے۔ اے ابوالحکم تمھیں یہ کیا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر تو بٹر بٹر لوگوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر حواس مجتمع کر کے بولا کہ میں وہی کرنے لگا تھا جس کی میں نے قسم کھائی تھی۔ جب میں قریب پہنچا تو میرے آگے ایک بہت بڑا اونٹ حائل ہو گیا۔ یقین جانو میں نے اس سے پہلے کبھی اتنے بڑے سر، اتنی لمبی گردن اور اس طرح کی کچلیوں والا اونٹ نہیں دیکھا۔ وہ مجھے واقعی چپاڈالنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ سو میں ڈر گیا اور واپس آ گیا۔

کافی مدت بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے۔

بنو ہاشم اور بنو امیہ میں تاریخی چپقلش بھی تھی۔ ان قبائل کی آپس میں حصول مراتب پر ٹھنی رہتی۔ خاص طور پر عبدالمطلب کی وفات کے بعد بنو ہاشم کا وہ پہلے سا اثر و اقتدار نہیں رہا تھا۔ اب جبکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت فرمایا تو سب سے پہلے بنو اُمیہ نے ہی شور مچایا کہ یہ بات ہمیں منظور نہیں کہ سب کچھ بنو ہاشم کے پاس چلا جائے۔

تاریخ میں ابوجہل کی زبانی اس قسم کے تین بیانات درج ہیں جو بڑے قابل غور ہیں۔ ان میں سے ابوجہل کا ایک قول درج کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ باقی دو بیانات مناسب مواقع پر درج ہو چکے ہیں۔ ایک دفعہ اخنس بن شریق یا کسی اور کے پوچھنے پر ابوجہل گویا ہوا۔

"ہم [10] میں اور بنی عبد مناف [11] میں عہدوں کے حصول کے لئے کشمکش ہوئی۔ انھوں نے لوگوں کو کھانا کھلایا تو ہم نے کہا۔ ہم بھی کھلائیں گے۔ انھوں نے لوگوں کو اونٹ دیے تو ہم نے کہا، ہم بھی دیں گے۔ انھوں نے سخاوت کی تو ہم نے بھی کی حتیٰ کہ ہم دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ یعنی تیراندازی کے انداز میں ایک دوسرے کے مقابلہ پر نکل آئے اور دونوں میں خوب کشمکش ہوئی۔ ہماری مثال شرط کے دو گھوڑوں کی سی تھی۔ اب یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک نبیؑ ہے جس کے پاس آسمانوں سے وحی آتی ہے۔ ہم اس بات کو نہیں مانتے اور نہ ہی اسے سچا جانیں

Marfat.com

گے۔

یہ تو تھا ان کی مخالفت کا پیچ۔ وہ اسی بنیاد پر بار بار ناکام ہونے کے باوجود مخالفت کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اخلاقی یا مذہبی دلیل نہ تھی۔ محض خاندانی عزت و شرف کو بنیاد بنا کر لڑ رہے تھے۔ اس لڑائی کے اثرات بنو امیہ کے علاوہ باقی قبائل میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ جوں جوں اس قضیے کا بھرم کھلتا گیا، توں توں مخالف پروپیگنڈا کے اثرات ختم ہوتے چلے گئے۔

جیسے جیسے تحریک اسلامی پھیلتی گئی۔ ایسے ایسے اس کی مخالفت میں شدت آتی گئی۔ ابو جہل تو صحیح معنوں میں ابو جہل بن گیا۔ باولے کتے کی طرح سر مارتا پھر رہا تھا، مگر اس کی ایک چل نہ سکی۔

(((الحمد للہ)))

Marfat.com

جب مشرکین عذاب کے طلبگار ہوئے تو

وہ تو سرگشتہ خمار رسوم وقیود تھے۔ یہ محض مخالفت برائے مخالفت تھی۔ ان کے پاس مخالفت کی کوئی واضح وجہ یا دلیل موجود نہ تھی۔ اس لئے جب بھی منصوبہ بندی کے لئے بیٹھتے، دنیا بھر کی مہمل باتیں موضوع بن جاتیں۔ ہر کوئی اپنے ترکش کے تیر نکالنے کی کوشش کرتا اور جب تک ذہنی ترکش سے سارے تیر نکل نکل کر ہوا نہ ہو جاتے، اس وقت تک خاموش نہ ہوتا۔

ان کی اخلاقی یادداشتیں دیکھئے کہ کبھی یہ خود کسی نبی کا انتظار کیا کرتے تھے۔ کسی رسول کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے۔ یہ کوئی افسانہ یا افسانوی بات نہیں ان کے اس رویے کی قرآن میں کئی ایک مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً دیکھئے:

مفہوم: "یہ تو بڑی بڑی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان میں آ گیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر قوم سے زیادہ سچ پر چلنے والے ہوتے، مگر جب ایک خبیر ان کے پاس آ گیا تو انھوں نے حق سے فرار اختیار کیا۔ یہ زمین پر اور زیادہ متکبر ہو گئے اور اس نبیؐ کے خلاف بری چالیں چلنے لگے، حالانکہ بری چالیں چلنے والے کو لے بیٹھتی ہیں۔" (سورہ......آیہ 42-43)

مشرکین کی اخلاقی یادداشت کا اندازہ لگا لیجئے کہ وہ تو اپنی منہ مانگی مراد کی مخالفت کر رہے تھے۔

یقیناً یہ نفسیاتی ہلچل مچا دینے والی بات تھی۔ قرآن کی یہ دلیل ان کے منہ پر بہت بڑا طمانچہ تھی۔ ایک اور ثبوت ملاحظہ کیجئے پھر نفسیاتی حوالے سے بحث ہو گی۔

وَاِنْ كَانُوا لَيَقُوْلُوْنَ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ كَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ٥

☆مفہوم: "یہ لوگ[12] اس سے پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس بھی وہ ذکر کرنے والا ہوتا جو پچھلی قوموں کے پاس تھا اور ہم بھی اللہ کے برگزیدہ بندے ہوتے۔ (مگر جب وہ آ گیا) تو ماننے سے انکار کر دیا۔ اب عنقریب اس کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔" (سورہ والصفت

Marfat.com

آیۃ 167 تا 170۔)

سچی بات منوانے کے لئے بعض دانا لوگ گھما پھرا کر اشارے کنائے سے سچائی کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسی ایسی خوش اسلوب اور لطیف اور اپنائیت سے بھرپور مثالیں پیش کرتے ہیں کہ سننے والا خود بخود قائل ہو جاتا ہے اور ایسی مثالیں سن کر گواہی دینے لگتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

نفسیاتی لحاظ سے اس قسم کی قرآنی یلغار مشرکین پر بڑی شدت سے ہو رہی تھی۔ یقیناً وہ سننے والے جو کل تک اس قسم کی قسمیں کھا رہے تھے یا اس قسم کی خواہشات کا اظہار کر رہے تھے، آج سنتے ہی قرآن کی حقانیت کے قائل ہو چکے ہوں گے۔ ان میں سے کئی ایک تو علانیہ اسلام میں داخل ہو چکے ہوں گے اور جو اسلام کی حقانیت تسلیم کرنے سے ابھی تک گریزپا ہوں گے، وہ بھی اخلاقی لحاظ سے ٹوٹ پھوٹ چکے ہونگے کیونکہ اسلام ان کی منہ مانگی مراد تھا اور وہ منہ مانگی مراد ٹھکرا رہے تھے۔ محض جھوٹی انا اور معاشرتی رسوم و رواج کا بھرم رکھنے کے لئے مخالفت کر رہے تھے۔

پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ انقلابی تحریکیں صرف اور صرف اپنے بانیوں کے گرد گھومتی ہیں۔ بانئ انقلاب کی شخصیت اور کردار تحریک کی جان ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بانئ انقلاب کی شخصیت اور کردار ہی تحریکی ''منشور'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے عمل کے آئینے میں تحریک کے مستقبل کو دیکھا جا سکتا ہے۔ تحریک کے اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس بات کا پتا چلایا جا سکتا ہے کہ پیش آمدہ وقت میں تحریک کیا کردار ادا کرے گی۔

یقیناً مشرکین اس قسم کی آیات سن کر ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے۔ ان کی شخصیتیں بکھر جاتی تھی۔ وہ اخلاقی پستی کی عمیق گہرائیوں میں جا گرتے تھے اور اس نفسیاتی دباؤ (Dippression) میں وہ زیادہ شدت سے مخالفت پر اتر آتے اور عجیب و غریب قسم کی واہی تباہی بکنا شروع کر دیتے۔ جب کچھ نہ بن پڑتا تو پھر اکٹھے ہو کر کوئی نئی بات اختراع کرتے یا نیا شوشہ چھوڑتے۔

اس معاملے میں ابلیس پوری شیطانیت کے ساتھ ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ صحن حرم میں دارالندوہ کا اجلاس جاری تھا۔ دنیا بھر کی مہمل باتیں ہو رہی تھیں۔

اسی اثناء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے۔ دیکھتے ہی کسی شیطان کی زبان دراز ہوئی: ''لے آؤ عذاب۔ لاتے کیوں نہیں ہو۔'' یہ سننا تھا کہ پوری شیطانیت ٹھٹھے مارنے لگی اور بک بک کرنے لگی۔

کسی نے کہا: کیا سنا نہیں؟ عنقریب عذاب الٰہی آ رہا ہے۔ کوئی اور بولا اچھا!!! کب اور کس

دن یہ عذاب ادھر پہنچے گا۔" کوئی کھلی بیہودگی سے آپ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا (نعوذ باللہ) یہی تو ہیں جو عذاب لا رہے ہیں۔ ان سے ہی پوچھ لو۔ کوئی اور واضح کمینگی کرتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی استقامت کا اندازہ لگایئے کہ انتہائی تلخ، نشتر کی طرح نا قابل برداشت طنز سن کر بھی خاموشی سے گزر جاتے، حالانکہ آپ کے ہاتھ اٹھانے کی دیر تھی کہ وہ سب کچھ ہو جاتا جسے ان لوگوں نے مذاق بنایا ہوا تھا۔

ان لوگوں کے پاس اہل ایمان کو تنگ کرنے کا ایک اور اشغلا آ گیا۔ اس عذاب الٰہی والی بات کو انھوں نے مسلمانوں کی چھیڑ بنا دیا۔

کسی راستے، کسی گلی یا کسی بازار میں کوئی مسلمان مل جاتا تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ عذاب سے متعلق فقرے کستے۔ حجت بازی کرتے۔ اس کا ناطقہ بند کر دیا جاتا۔ اگر پھر وہ بیچارہ سنی ان سنی کر کے گزر جاتا تو شہر کے آوارہ لڑکوں کو اس کے پیچھے لگا دیا جاتا اور ارے عذاب، ارے عذاب کے نعرے لگاتے ہوئے اسے گھر تک چھوڑ کر واپس مڑتے۔

اگر کسی راستے میں سرکار دو عالم خود نظر آ جاتے تو بڑے منظم طریقہ سے فقرے چست کئے جاتے۔ ایک پوچھتا: "ارے میاں عذاب کب آ رہا ہے۔ دوسرا بولتا عذاب کا ایک اپنا مزہ ہوتا ہے ذرا ہمیں بھی چکھاتے جاؤ۔"

یہ سلسلہ بھی کئی دنوں تک چلتا رہا۔ خدا کے مفلس اور ناتواں ماننے والوں کا گھروں سے باہر قدم رکھنا دوبھر ہو گیا۔ یہ سب کچھ جاننے سمجھنے کے باوجود کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہوا معمولی جملہ بھی ان کی پھبتی بن جائے گا۔ عذاب کے لئے اٹھایا جانے والا ہاتھ کا اشارہ بھی انھیں ملیامیٹ کر دے گا۔ اس کے باوجود مخالفین اس قسم کی حرکتوں سے باز نہیں آ رہے تھے۔

تنگ آمد بجنگ آمد۔ دریدہ زبانوں کو لگام دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حرم کی طرف مائل بہ سفر تھے۔ مخالفین روایتی فقرہ زنی اور جگت بازی میں مصروف تھے۔ ایک بہت بڑا ہجوم اکابرین قریش کی اس جگت بازی پر ٹھٹھے مار مار کر ہنس رہا تھا۔

آپ سرکار رفتار کے اور مجمعے کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو گئے۔ یوں دوبدو دیکھ کر مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ خاموشی چھا گئی۔ یہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی رعب تھا کہ پوری محفل میں کوئی ایک بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ سب کی نظریں بھرپور تجسس میں جھکی ہوئی تھیں۔ ہر کوئی سوچ رہا تھا۔ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔

Marfat.com

ادھر رخ پر انوار صلی اللہ علیہ وسلم پر اشتعال تھا، نہ پریشانی، بلکہ آپ تو حسب معمول مطمئن اور مسرور تھے۔ بولنا شروع کیا تو لب ولہجہ میں بھی کسی قسم کی جھول یا اکھڑ پن کا شائبہ تک نہ تھا، بلکہ پہلے کا سا ٹھہراؤ موجود تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی صاف، سادہ اور باوقار انداز میں مخالف فقرہ بازیوں، حجتوں اور جگتوں کا ان قرآنی الفاظ میں جواب دیا۔

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝[13] (سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر 110)

☆مفہوم: انسان خیر کی بجائے شر مانگتا ہے اور انسان بڑا جلد باز ثابت ہوا ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

دیکھئے مشرکین مکہ کی فقرہ بازیوں اور جگتوں پر کتنا جچا تلا اور مختصر جواب ہے۔ ان کے رویوں پر کتنی بھرپور تنقید ہے۔ جواب دینے کا کتنا لطیف اور سادہ انداز ہے۔ مخالفین کے لئے کوئی سخت لفظ بھی استعمال نہیں کیا، بلکہ لفظ انسان کی طرف اشارہ کر کے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے یہ ایک طرح کا بزرگانہ اندازِ تخاطب ہے۔ جس طرح کوئی بزرگ اپنے بچوں سے مخاطب ہو کر انتہائی شفیقانہ انداز میں کہتا ہے۔ نہیں بیٹا یہ کام ٹھیک نہیں اسے نہ کرو۔

اسی طرح لفظ ''انسان'' استعمال کر کے انتہائی رحم اور شفقت سے باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عذاب سننے میں تو آسان ہو سکتا ہے۔ عملاً دیکھنے میں اتنا آسان نہیں۔

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خیر خواہی کا جذبہ بھی جھلک رہا ہے کہ میں تمھارے لئے عذاب نہیں مانگ سکتا۔ تم چاہے جو بھی سلوک کرو۔ میں تو صرف تمھاری بھلائی ہی مانگوں گا۔

اس میں ایک طرح کی واشگاف تنبیہہ اور دھمکی بھی چھپی ہوئی ہے کہ ٹھہرو جلد بازی نہ کرو۔ اگر اللہ نے تمھارے لئے عذاب مقدر کر دیا ہے تو وہ اپنے وقت پر ضرور آئے گا۔ اس میں اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟

اس آیت نے صحیح معنوں میں مشرکین کو لاجواب کر دیا تھا۔ اب اگر کوئی مسلمان پر عذاب کا فقرہ چست کرتا تو وہ جواباً یہی آیت تلاوت کر دیتا۔ فقرہ کسنے والا بھیگی بلی بن کر کھسیانی ہنسی ہنستا بتیسی نکالتا ہوا کھسک جاتا۔

یہ سب کچھ وقتی تھا۔ وہ اسلام دشمنی میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ ہدایت ان سے دور کر دی

Marfat.com

گئی تھی اور کفران پر مسلط ہو چکا تھا۔ بڑی بڑی دلیلیں بھی انھیں راہِ راست پر نہ لا سکیں۔ اس طرح کی کئی اور دھمکیاں بھی قرآن کے ذریعے پیش کی گئیں۔ موضوع کو اور واضح کرنے کے لئے چند ایک آیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ (سورہ المومن آیت 21 تا 32)

مفہوم: اور کیا ان لوگوں نے چل پھر کر زمین نہیں دیکھی [14] انھیں ان لوگوں کے انجام کا علم نہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ تو ان (قریش مکہ) سے زیادہ طاقتور تھے اور ان سے زیادہ آثار زمین پر چھوڑ گئے۔ پھر اللہ نے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا اور ان کو کوئی بچا نہ سکا۔ ان کے پاس رسول آئے، مگر انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے انھیں پکڑ لیا۔ یقیناً وہ بڑی طاقت والا ہے اور وہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

سورہ القصص میں اس طرح متنبہ کیا گیا:

مفہوم: ''اور کتنی بستیاں ہم برباد کر چکے ہیں۔ جن کے [15] رہنے والے اپنی معیشت پر اتراتے تھے۔ سو ان کے مسکن یعنی کھنڈرات دیکھ لو جو پڑے ہوئے ہیں اور ان کے بعد کوئی ان میں آباد نہیں ہوا۔ آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔'' (سورہ القصص آیت 58)

یہ اقوامِ عاد و ثمود، قوم سبا، اہل مدین اور قوم لوط کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں اگلی آیت میں یوں ارشاد ہے۔

مفہوم: ''اور تیرا رب ان بستیوں کو تباہ کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان میں ایک رسول نہ بھیج دے جو انھیں ہماری آیات سنائے۔ اور ہم ان بستیوں کو تباہ کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے۔'' (سورہ القصص آیت 59)

بہر حال قرآن نے بے شمار اقوام کے قصے بیان کئے ہیں۔ یاد رہے قرآن کے سب سے پہلے مخاطب مشرکین مکہ تھے۔ یہ تمام لوگ اس قرآنی اسلوب اور اس اندازِ تخاطب کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ان کے اخلاقی رویوں کو واضح کرنے کے لئے یا اس تنبیہی انداز سے انھیں راست پر لانے کے لئے یہ انداز اختیار کیا جاتا تھا۔

ابھی کل ہی کی بات تھی جب ابرہہ نے حرمِ کعبہ پر حملہ کیا، ان میں سے اکثر و بیشتر بقید حیات تھے جنھوں نے ابابیلوں کے ہاتھوں ابرہہ کی تباہی دیکھی۔ پورا عرب اس واقعہ پر عش عش کر اٹھا تھا۔

خدا کا عذاب اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے بھی خدا کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھرپور مخالفت کر رہے تھے۔ نہ صرف مخالفت، بلکہ اس نبیؐ سے مطالبہ کر رہے تھے کہ خدا کا عذاب لے

Marfat.com

آ ئے، اگر وہ لا سکتا ہے تو...... حالانکہ وہ عرب کی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے۔ عاد وثمود کی اجڑی بستیاں ہی انھیں سمجھانے کے لئے کافی تھیں۔ جنھیں وہ جدِّ اعلیٰ مانتے تھے۔ ان کے جدِّ اوّل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے لوط علیہ السلام کی قوم کی داستان ابھی زندہ تھی۔ اس کے علاوہ یہودی ان کے پڑوسی تھے۔ ان سے ہی پوچھ لیتے کہ نبیوں کو تنگ کرنے والی اقوام پر کیا بیتی تو انھیں عذاب مانگنے کی کبھی ہمت نہ ہوتی۔

بہر حال یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت اللعالمینی کا کمال تھا کہ آپؐ نے ہر مخالفت کو بڑے دل گردے سے برداشت کیا۔ آپ نے نہ صرف برداشت کیا، بلکہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر مخالفین کی ہدایت کے لئے خدا کے حضور گڑ گڑاتے رہے۔ یہاں تک پوری پوری رات اسی دعا و استغفار میں گزر جاتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں سوج جاتے۔

مگر مخالفین تو اپنی سی کر گزرے۔ ان کو باز نہ آنا تھا، نہ آئے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ جب ان پر عذاب کا ہلکا سا ہیولا نازل ہوتا ہے تو ان عذاب مانگنے والوں پر کیا گزرتی ہے۔

—(((الحمد للہ)))—

Marfat.com

اور جب قحط پڑا تو

مشرکین قرآن کو وحیٔ الٰہی ماننے سے انکاری تھے۔[16] اس میں موجود تمثیلی قصوں کی ان باتوں سے تردید کرتے کہ یہ تو پرانے دقیانوسی قصے ہیں (نعوذ باللہ) یہ کون سی نئی باتیں ہیں۔ یہ تو جدید اور نیا زمانہ ہے۔ ترقی کا دورہ دورہ ہے۔ اس زمانے میں دقیانوسیت چلنے کی نہیں۔

وہ سوچتے کہ یہ کہانیاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خود ساختہ ہیں۔ ان کہاوتوں کی وجہ سے یعنی قرآن کی وجہ سے ہم مصائب میں گرفتار ہوئے جاتے ہیں یعنی جب سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا ہے، اس وقت سے ہماری جمعیت بکھر گئی ہے۔ اہل قریش گروپوں میں بٹ گئے ہیں اور طرح طرح کی پریشانیاں ان کا احاطہ کر رہی ہیں۔ اگر یہ قرآن سچا ہے تو پھر قریش کی یہ حالت کیوں ہے؟ ان برکات کی وجہ سے رحمتوں کا نزول ہونا چاہیے تھا۔ چہ جائیکہ ہم روز بروز مشکلوں میں گھرتے جا رہے ہیں۔

جب اسلام کی مخالفت زوروں پر تھی۔ مسلمانوں کا جینا دوبھر ہو چکا تھا۔ موالی اور غلاموں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ اسلام لانے والوں کو وراثت سے عاق کیا جا رہا تھا۔ اور تو اور خود رسالت مآب کی ذات طرح طرح کی زیادتیوں کا نشانہ بن رہی تھی۔

عین انھی دنوں میں مکہ کو قحط نے آ لیا۔ چشمے خشک ہو گئے۔ باریں اجڑ گئیں۔ لوگ فاقوں سے مرنے لگے۔ اور تو اور امرأ مکہ بھی خشک پتوں سے زندگی کو سہارا دینے پر مجبور ہو گئے۔ خشک گھاس کھا کر زندہ رہنے کی کوششیں کرنے لگے۔ جانوروں کی سوکھی کھالیں ابال ابال کر کھانے پر مجبور ہو گئے۔

نیرنگیٔ فطرت دیکھیے کہ وہ جو کل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دے رہے تھے۔ وہ جو کل آپؐ پر پتھر برسا رہے تھے۔ وہ جو کل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنوں، ساحر اور دیوانہ کہہ رہے تھے۔ وہ جو کل قرآنی آیات کو جھٹلا رہے تھے۔ وہ جو کل قرآن کے معنی بدل رہے تھے۔ آیاتِ قرآنی کو

Marfat.com

اساطیر الاولین یعنی پرانے دقیانوسی قصے یا پرانی گھسی پٹی کہانیاں قرار دے رہے تھے۔ آج عذاب الٰہی کی معمولی سی جھلک دیکھی تو چیخ اٹھے۔ وہی ایوان مکہ، وہی دارالندوہ، وہی ابلیس کی اسمبلی (Parliement) محمد ﷺ سے دعا کروانے کا بل پاس کرنے پر مجبور ہوگئی۔ مخالفین کے وہی سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خدا سے دعا کیجئے کہ ہمارے سروں سے یہ عذاب ٹل جائے۔ اپنے رب سے کہیئے کہ قحط ختم کر دے۔ اگر عذاب ٹل جاتا ہے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔

رحمت اللعالمین کی ذات اپنے خدائے بزرگ و برتر سے دست بدعا ہوتی ہے اور قحط ختم ہو جاتا ہے۔ عذاب ٹل جاتا ہے اور خدا کی رحمتوں کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔

یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی برتری کا منہ بولتا ثبوت ہے اور مشرکین کی کم ظرفی پر ایک بہت بڑا طمانچہ ہے۔

سرد جنگ میں بانیٔ انقلاب کی اخلاقی برتری ہی اصل تحریکی محرک ہے۔ سننے اور دیکھنے والوں نے اندازہ کرلیا ہوگا کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔ کون اعلیٰ ظرف اور کون کم ظرف ہے۔ کس کے ساتھ خدا کی بے پناہ طاقتیں اور رحمتیں ہیں اور کون لوگ محض جھوٹی پھوں پھاں کے سوا کچھ نہیں رکھتے۔ انقلابی تحریکوں کے منشور محض جملوں کا گورکھ دھندنہیں ہوتے، بلکہ منشور کا ایک ایک لفظ اپنے آپ کو منوا کے رہتا ہے۔

انقلابی تحریکوں کے خلاف جتنا جھوٹ بولا جاتا ہے، جتنا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، اس کا مقصد بانیٔ انقلاب کی شخصیت کو داغدار کرنا، اس کی طرف سے پیش کئے جانے والے نظام کو غلط اور نہ چل سکنے والا قرار دینا ہوتا ہے۔ اگر مخالفین ان مقاصد میں کامیاب ہو جائیں تو تحریک ابتدائی دنوں سے آگے نہیں بڑھتی۔

مگر اسے جھوٹا یا کم تر ثابت کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس جیسا آزاد (Liberal) خودمختار انسانیت پرور متبادل نظامِ زندگی پیش کیا جائے۔ انقلاب کے وہ مخالفین جو یہ متبادل نظام پیش کررہے ہوں، ہو بہو اپنے پیش کردہ نظام کی عملی تصویر بن جائیں اور اسے رائج اور نافذ کرنے میں بانیٔ انقلاب سے بھی زیادہ مخلص اور بلند اخلاق ہوں۔

لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ انقلاب کا خاکہ اس وقت جنم لیتا ہے جب معاشرہ رائج شدہ نظاموں کے ظلم و ستم کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ جب نظامِ زندگی کے نام پر اور قانون وضابطے کے

Marfat.com

نام پر انسانیت کا قتل عام شروع ہو جاتا ہے۔ انسانیت اپنے حفاظتی حصار سے تنگ آ کر تڑپنا اور سسکنا شروع کر دیتی ہے۔

بہر حال رحمت عالمؐ کی اخلاقی برتری ایک طرح سے تحریکی حصار کا کام دے رہی تھی۔ یقیناً جو مخالفین آج عذاب ٹالنے کے لئے دعائیں کروا رہے تھے، اندر سے سچائی کے معترف ہو چکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ان کے اعصاب پر سوار ہو چکی تھی۔ جنھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں پر یقین تھا، یقیناً انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعاؤں کا بھی یقین ہوگا اور یہی چیز تحریک کے لئے حصار کا کام دے رہی تھی۔

———(((اللہ اکبر)))———

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دعا تو قبول فرمالی، مگر ساتھ ہی سورہ الدخان میں صاف صاف بتا دیا کہ یہ مخالفین اسلام لانے والے نہیں۔ یہ مخالفت سے ٹلنے والے نہیں۔

اس سورہ میں مشرکین مکہ پر فرعون اور قوم موسیٰ کی مثالیں چسپاں کی گئی۔ یعنی قوم فرعون پر مختلف عذاب نازل ہوئے، مگر وہ قوم ان مشرکینِ مکہ کی طرح ایسی انکاری قوم تھی کہ جب عذاب کا شکار ہوتے تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کرتے کہ اگر تمھارے ربّ نے یہ عذاب ٹال دیا تو وہ ایمان لے آئیں گے۔ جب عذاب ٹل جاتا تو وہ صاف صاف مکر جاتے۔ پھر پہلے سے بھی زیادہ شدت سے مخالفت شروع کر دیتے، بلکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے منصوبے بنانے لگتے۔ مشرکین مکہ کو انھیں سے مماثل کر کے بتایا جارہا ہے کہ تم بھی اسی طرح کے لوگ ہو۔ تم بھی اللہ کے نبی کی جان کے دشمن ہو اور ان کے قتل کے منصوبے بناتے رہتے ہو۔

یہ تمثیل مشرکین مکہ کے سامنے اس لئے پیش کی گئی اور انھیں قوم فرعون کے ساتھ اس لئے مشابہت دی گئی کہ فرعون اور آل فرعون بھی ظاہری شان و شوکت اور حکومت واقتدار کے نشے میں بدمست تھی۔ وہ بھی حکومت واقتدار کے نشہ میں موسیٰؑ اور ان کے غریب و مفلس ماننے والوں کو تنگ کرتے تھے۔

بالکل اسی طرح سرداران قریش اور ان کے حواری بھی جھوٹی نخوت، جعلی آن بان، سردارانہ برتری کے بل بوتے پر رسولِ امّی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ماننے والوں کو تنگ کر رہے ہیں۔

دوسرا یہ تمثیل ایک طرح کی دھمکی بھی ہے کہ تم فرعون اور اس کی قوم سے زیادہ قوی نہیں۔ تم موسیٰ علیہ السلام کے مخالفین سے زیادہ اثر ورسوخ والے نہیں۔ ان کی حالت دیکھ لو اور اپنی اوقات

Marfat.com

پہچان لو۔ اگر تم مخالفت سے باز نہ آئے تو بعید نہیں کہ تم پر بھی اسی قسم کے عذاب مسلط کر دیئے جائیں گے۔ تم بھی اسی طرح غرق کر دیئے جاؤ گے۔

مشرکین کی تازہ حرکت یعنی اس وعدے پر دعا کروانا کہ اگر قحط ختم ہو جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے، ان پر قرآن کا بہت بڑا اخلاقی حملہ تھا۔ جس نے مشرکین کو توڑ پھوڑ دیا ہوگا۔ کیونکہ وہ وعدہ خلافی کے مرتکب ہو کر اپنے آپ کو جواب دینے سے بھی گریز پا ہوں گے۔ کسی نہ کسی طرح اپنے ضمیر کو مطمئن (Justify) کر رہے ہوں گے۔ مگر کر نہیں پا رہے ہوں گے۔

قارئین مزہ نہیں آ رہا۔ فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے نامکمل ذکر سے طبیعت بوجھل سی ہو چلی ہے آیئے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے واقعے پر نظر ڈال کر دیکھا جائے تا کہ کھل کر پتا چل سکے کہ مشرکین پر یہ تمثیل کیوں مدلل کی جا رہی ہے۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور فرعونِ مصر

اہل مصر آگ کی پوجا کرتے تھے۔ لفظ فرعون کے معنی ہی اس بات کی دلیل ہیں۔ فرعون کے لفظی معنی ہیں سورج کا بیٹا۔ اس لئے اہلِ مصر فرعون کو اپنے دیوتا سورج کا زمینی وارث سمجھتے تھے۔ اس کی پوجا پاٹ کرتے اور اسے سجدہ کرتے تھے۔ مصر کی قدیم تاریخ[17] سے پتا چلتا ہے کہ فرعون کسی فرد کا نہیں، بلکہ یہ ایک عہدے کا نام تھا۔ جیسے ہمارے ہاں وزیر اعظم کسی فرد کا نہیں، ملک کی سربراہی کے لئے ایک عہدے کا نام ہے۔

آثار قدیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں فرعونوں کے تین سلسلے چلے۔ ان میں سے ہر ایک دس یا گیارہ خاندانوں پر پھیلا ہوا ہے اور ہر ایک سلسلہ کئی صدیوں پر محیط ہے۔ اس قوم کی ہدایت کے لئے مختلف وقتوں میں مختلف انبیاء اکرامؑ مبعوث ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام مختلف اوقات میں مصریوں کی ہدایت کے لئے تفویض ہوئے۔

چونکہ فرعون ایک عہدے کا نام تھا اس لئے جو بھی شخص اس عہدے پر متمکن ہوتا۔ اسے فرعون ہی کہا جاتا۔

اس عہدۂ فرعونیت پر کل 31 خاندان متمکن رہے۔ ان شاہانِ مصر کا عہد تین ہزار قبل (3000 ق م) مسیح سے شروع ہوتا ہے اور 332 ق م تک چلا جاتا ہے۔ ان فراعین کا کل دور حکومت (2778) دو ہزار سات سو اٹھہتر سال بنتا ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام 1520 ق۔م قبل مسیح پیدا ہوئے۔ آپ علیہ السلام کا جس فرعون سے واسطہ پڑا، اس کے نام میں اختلاف ہے۔ اس کا نام کسی نے پتامن، کسی نے آموسس، کسی نے ولید بن ریان، کسی نے قابوش بن مصعب بن ریان کسی نے مصعب بن ریان اور کسی نے رعمیس دوم لکھا۔ ابن کثیر نے اس کی کنیت بھی ابو مرہ بتائی، مگر زیادہ تر اسے ابن ریان ہی کہا جاتا ہے۔

ہامان اس کا وزیر اعظم تھا۔ فرعون کو جب خبر ملی کہ بنی اسرائیل میں سے ایک نبیؐ پیدا ہوگا جو

Marfat.com

اس کی حکومت کو تاراج کردے گا تو اسی ہامان کے مشورے سے فرعون نے بچوں کے قتل کا قانون رائج کیا۔

یاد رہے کہ بنی اسرائیل کا تعلق حضرت یعقوب علیہ السلام سے تھا۔ اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا۔ یہ عبرانی یا سریانی کا لفظ ہے۔ اسرا کے معنی "بندہ" اور ایل کے معنی "اللہ" کے ہیں۔ لفظ اسرائیل کے معنی ہیں اللہ کا بندہ۔ حضرت یعقوب ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ اس لئے بنی اسرائیل اصل میں بنی اسحاق ہی ہیں۔

جاشان مصر کے ایک صوبے یا علاقے کا نام تھا۔ رعمیس مصر کا ایک شہر تھا جسے فرعون نے اپنے نام پر بنایا تھا۔ بنی اسرائیل کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے وادیٔ سینا کی طرف گئے تو اس وقت چھ لاکھ تین ہزار پانچ سو پچھتر بنی اسرائیل بھی آپؑ کے ساتھ تھے۔

یہ قرآن میں بیان کیا جانے والا طویل قصہ ہے۔ یہ قصہ بذات خود کسی کتاب کا متقاضی ہے جو ہم آئندہ فرصت پر موخر کر کے سرد جنگ کے اخلاقی موضوع کی طرف چلتے ہیں۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ نسب یعقوب علیہ السلام سے ملتا ہے اور حضرت ہارون علیہ السلام آپؑ کے سگے بڑے بھائی تھے جو عمر میں آپ سے تین یا چار سال بڑے تھے۔

——(((اللہ اکبر)))——

بڑا عجیب و غریب خواب تھا جو فرعون نے آج رات دیکھا تھا۔ صبح بیداری کے بعد فرعون کے چہرے پر پریشانی ہویدا تھی۔ وزیر اعظم ہامان نے پوچھا بدولت کے چہرے پر پریشانی کے اثرات نظر آ رہے ہیں۔

فرعون نے جواب دیا میں نے عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔ کاہنوں اور نجومیوں کو فوراً حاضر خدمت کیا جائے۔

تھوڑی دیر بعد کاہنوں کی ایک کثیر تعداد حاضر باش[18] ہو گئی تو فرعون گویا ہوا۔ میں نے خواب دیکھا کہ "میں جاشان کے علاقہ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اچانک زمین سے دو پودے پھوٹتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی دیکھتے بڑے درخت بن جاتے ہیں اور ان کی اونچائی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ آسمان کو چھونے لگتے ہیں اور ان کا سایہ ساری زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔"

تمام کاہنوں نے فرعون کا خواب بڑے انہماک سے سنا۔ جب بات مکمل ہو گئی تو ایک بڑے بوڑھے نے سوال کیا "کیا جاشان وہی علاقہ تو نہیں جہاں ہمارے خداوند کی عبادت نہیں ہوتی۔"

ہامان نے جواب دیا "ہاں یہ وہی علاقہ ہے جہاں قوم بنو اسرائیل آباد ہے، مگر یہ بنی اسرائیل کھاتے تو ہمارا ہیں، مگر گن کسی اور خدا کے گاتے ہیں۔" (نعوذ باللہ)

بوڑھے کاہن نے بڑے گہرے انداز سے کہا: "جی میں سمجھ گیا۔"

پھر تمام چھوٹے بڑے کاہن اپنی پوتھیاں کھول کر بیٹھ گئے۔ کچھ الم غلم پڑھنے کے بعد مشورہ کر کے بتانے لگے کہ:

"مابدولت کا اقبال ہمیشہ بلند رہے اور آپ کی بادشاہت رہتی دنیا تک قائم رہے۔ جناب نے جو خواب دیکھا ہے، اس کی تعبیر اتنی اچھی نہیں۔ ہماری پوتھیاں کہتی ہیں کہ جاشان میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو آپ کی بادشاہی ختم کر دے گا۔ اس کے ساتھ اس کا بھائی بھی ہوگا جو اس کا معاون ومددگار بنے گا۔"

فرعون یہ تعبیر سنتے ہی غضبناک ہو گیا اور حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی لڑکا پیدا ہو، اسے قتل کر دیا جائے۔ دائیوں کو بلا کر یہ حکم پاس کر دیا کہ جو بھی بچہ پیدا ہو اسے فوراً قتل کر دیا جائے۔ اس حکم کی پاسداری کئی سال تک ہوتی رہی۔ ہزاروں نومولود بچے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیئے جاتے۔

اس علاقے میں دو دائیاں صفرہ اور نوعہ ایسی تھیں جو رحم دل اور خدا ترس تھیں۔ صرف یہ دو خواتین حکم عدولی کرتی رہیں۔ فرعون کو جب اس حرکت کی خبر ہوئی تو ان خواتین کو دربار میں بلا کر پوچھا گیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ۔

"عبرانی عورتیں مصری عورتوں کی طرح نرم ونازک نہیں۔ وہ اتنی سخت جان ہیں کہ دائیہ کے پہنچنے سے پہلے ہی بچے کو جنم دے لیتی ہیں۔"

فرعون اس بات پر مطمئن ہو گیا، مگر بچوں کے قتل کا حکم واپس نہیں لیا، نہ ہی اپنے ظلم میں کمی کی۔

انھی دنوں عمران کے ہاں بچہ جنم لے چکا تھا۔ ابھی تک انھوں نے بچے کو چھپا کے رکھا ہوا تھا۔ بچے کی والدہ محترمہ ہر وقت اپنے خدا سے اپنے نوخیز کی سلامتی کے لئے دعا گو رہتیں۔ وہ اور ان کی بیٹی پوری رات جاگ کر گزارتیں۔ انھیں ہر وقت یہی فکر لاحق رہتی کہ مبادا فرعون کے ہرکارے بچہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ مسلسل جاگنے سے ماں بیٹی کی طبیعتیں بوجھل ہو چکی تھیں۔ ایک رات بیٹھے بیٹھے بچے کی ماں کو اونگھ آ گئی، لیکن بچے کی بہن جاگ رہی تھی۔

رات کافی گزر چکی تھی، جب اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ آواز سن کر بچی گھبرا گئی۔

Marfat.com

اس نے ہلا کر ماں کو جگایا۔ پھر ایک اور دستک ہوئی۔ ماں پہلے تو گھبرائی۔ پھر ہمت کر کے پوچھا کون ہے؟

جواب آیا میں ہوں شغرہ دروازہ کھولو۔

دروازہ کھلا تو شغرہ اندر آئی اور بتایا فرعون کے جاسوسوں کو بچے کی اطلاع مل چکی ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت کا انتظام کر لیا جائے۔ شاید تھوڑی دیر تک سرکاری آدمی بچہ قتل کرنے کے لئے یہاں پہنچ جائیں۔

عمرانؑ کی بیوی غم سے نڈھال ہو گئی۔ اسی حالت میں اس پر بیہوشی کی غنودگی طاری ہو گئی۔ غنودگی کی حالت میں کسی نے بتایا کہ ایک صندوق میں بچہ ڈال کر اسے رال اور روغن سے لپیٹ کر دریا میں بہا دو۔ انھوں نے صبح ہونے تک ایسا ہی کیا۔ یعنی بچے کو صندوق میں رکھ کر دریا میں بہا دیا۔

(((اللہ اکبر)))

خدا کی ذات بڑی مسبب الاسباب ہے۔ اگر وہ ذات پاک جل شانہٗ کسی کو بچانا چاہے تو بغیر سبب کے بچا لے اور اگر کسی کو غرق کرنا چاہے تو سفینوں میں بھی غرق کر دے۔ اگر چاہے تو تمام اسباب بے سبب ہو جائیں اور اگر چاہے تو بغیر اسباب کے بھی نوازشوں کے انبار لگا دے۔

ذرا غور کیجئے آگ کا کام جلانا ہے، مگر ابراہیمؑ کے لئے گلزار کر دی گئی۔ چھری کا کام کاٹنا ہے، مگر اسمٰعیلؑ کے لئے کند کر دی گئی۔ یہ سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے غور کیجیے جس قوم کے ہزاروں بچے قتل کر دیئے گئے۔ دیکھئے اسی قوم کے ایک بچے کی پرورش کا کتنا اچھا انتظام کیا جا رہا ہے۔

فرعون کی بیٹی دریا کی سیر کر رہی تھی۔ کیا دیکھتی ہے کہ سامنے دریا میں ایک صندوق بہا چلا آ رہا ہے۔ سوچنے لگی کہ شاید اس میں کوئی خزانہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی نوکروں اور کنیزوں سے کہتی ہے یہ صندوق دریا سے نکالا جائے۔ شہزادی کا حکم تھا۔ فوراً تعمیل ہوئی۔ باہر لا کر جب صندوق کھولا گیا تو دیکھنے والے حیران ہو کر کہنے لگے کہ یہ تو بچہ ہے۔ بڑا ہی پیارا۔ انتہائی خوبصورت شیر خوار معمول کے مطابق وہ بچہ اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ فرعون کی بیٹی نے صندوق اٹھوایا اور اپنی ماں آسیہ کے پاس لے گئی۔

فرعون کی بیوی بچہ دیکھ کر حیرانی سے بولی: یہ کون ہے۔ اس کی بیٹی نے جواب دیا: [19] یہ موشی ہے۔

Marfat.com

یاد رہے کہ موشی قبطی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں (نہ ڈوبنے والا)

مصر کی قدیم زبان قبطی تھی۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو سب سے پہلے موشی ہی کہا گیا۔ یہاں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ مورخین کہتے ہیں سب سے پہلے موسیٰ کا نام موشی فرعون کی بیٹی نے رکھا اور علامہ طبری کہتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام کے لیے سب سے پہلے لفظ موشی فرعون کی بیوی آسیہ نے استعمال کیا۔ بہرحال سب سے پہلے نام موشی ہی استعمال ہوا جو بعدازاں عربی زبان میں موسیٰ بن گیا۔

موسیٰ علیہ السلام والد اور والدہ دونوں کی طرف [20] سے بنی اسرائیل تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام ہارون اور بہن کا مریم تھا۔ والدہ کا نام یوحانہ اور والد کا نام عمران تھا۔

فرعون کی بیوی آسیہ نے حضرت موسیٰ کو اپنا بیٹا بنالیا۔ قدرتِ خداوندی کا کمال دیکھئے جس کی پیدائش کو روکا جارہا ہے۔ اسی کو فرعون کے گھر پرورش کے لئے بھیج دیا گیا۔

یہ بڑی طویل داستان ہے۔ اکثر واقعات اختصار کی نظر کرتے ہوئے ہم اپنے اصل موضوع سے متعلق واقعات پر توجہ صرف کریں گے۔

فرعون کے گھر پرورش پا کر جب آپؑ عنفوانِ شباب کو پہنچے تو دیکھنے والے بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ آپؑ انتہائی وجیہ، خوبصورت، بارعب اور پروقار شخصیت کا مظہر نظر آتے تھے۔ مصری عورتیں شرارت اور شوخی میں اپنی مثال آپ تھیں، مگر موسیٰ علیہ السلام کے رعب کا یہ عالم تھا کہ وہ خواتین ہزار خواہشوں کے باوجود آپ کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہ پاتیں۔ آپ جہاں جہاں سے گزرتے، وہاں مرد و زن نظریں جھکائے مؤدب کھڑے ہو جاتے۔ ایک ہیبت تھی جو دلوں پر طاری ہو گئی۔ آپ ایک دن کسی جگہ سے گزر رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں دو آدمی جھگڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک اسرائیلی ہے اور دوسرا قبطی۔ مصری بار بار اسرائیلی کو مار رہا تھا۔ شانِ کلیمی کو یہ ظلم ناگوار گزرا آپ نے قبطی (مصری) کو ایک مکا دے مارا۔ بس اسی سے اس کا کام تمام ہو گیا۔ قبطی مر گیا اور اسرائیلی بھاگ گیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

اگلے روز موسیٰ علیہ السلام کیا دیکھتے ہیں کہ وہی اسرائیلی کسی اور سے جھگڑ رہا ہے وہ جھگڑالو شریف زادہ آج پھر پٹ رہا تھا۔ موسیٰؑ کو دیکھتے ہی مدد کے لئے پکارنے لگا۔ آپؑ سمجھ گئے کہ یہ تو پھڈے باز قسم کا آدمی ہے۔ کل اس نے خواہ مخواہ ایک آدمی کو مروا دیا۔ آپؑ کو اس اسرائیلی پر غصہ آ گیا۔ آپؑ غصے سے اس کی طرف بڑھے تو وہ یہ شور مچاتا ہوا بھاگ گیا کہ۔

"کل تو نے ایک مصری کو قتل کر دیا اور آج مجھے قتل کرنا چاہتا ہے"۔ یہ ہے بھلائی کا بدلہ

Marfat.com

برائی۔ حضرت سعدی شیرازیؒ نے خوب کہا ہے "نکوئی بابداں کردن چناں است چوں بد کردن بجائے نیک مرداں"

یعنی "برے آدمی کے ساتھ بھلائی کرنا ایسے ہی ہے جیسے نیک آدمی سے برائی کی جائے۔"

بہر حال وہ اسرائیلی تھا۔ ڈرپوک اور مکار۔ بنی اسرائیل یعنی یہودی آج بھی ایسے ہی ہیں۔ آج بھی جہاں یہودی ہوگا، وہاں لڑائی جھگڑا ہوتا ہی رہے گا۔ وہاں امن قائم نہیں ہوسکتا۔

بہر حال لوگوں کو پتا چل گیا کہ کل والے مقتول کا قاتل موسیٰؑ ہے۔ قبطیوں نے اس بات کو اچھالا اور دربارِ فرعون تک لے گئے۔ اوپر سے فرعون کے وزیر ہامان نے جلتی پر تیل ڈالا۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو پابہ زنجیر لانے کا حکم دیا۔

محترمہ بی بی آسیہؓ کو خبر ہوئی تو اس نے موسیٰؑ کے پیچھے اپنا خاص آدمی اس پیغام کے ساتھ بھجوایا کہ وہ جلد از جلد مصر چھوڑ جائیں، ورنہ ان کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ ہرکارہ موسیٰؑ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جب اس نے پیغام سنایا تو حضرت موسیٰؑ علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ بی بی آسیہ کا حکم ہے تو میں اس پر ضرور عمل کروں گا۔

پھر حضرت موسیٰؑ مصر سے ہجرت کر کے مدائن (مدین) چلے گئے۔ وہاں حضرت شعیب علیہ السلام سے ملے اور کافی عرصہ ان کی خدمت میں حاضر رہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی صفورہ موسیٰ علیہ السلام کے نکاح میں دیدی۔ پھر ایک دن واپسی کا ارادہ کر کے حضرت شعیب سے اجازت مانگی انھوں نے اجازت دے دی۔

واپس آتے ہوئے کوہِ طور[21] پر آپؑ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا اور دو معجزے عطا کیے گئے۔

ایک تو عصائے کلیمی کا معجزہ تھا جسے زمین پر پھینکتے تو بہت بڑا اژدھا بن جاتا۔ اگر اٹھا لیتے تو وہی بکریاں ہانکنے والی لاٹھی بن جاتا۔

دوسرا چمکتے ہاتھ کا معجزہ تھا۔ اگر اپنا ہاتھ بغل میں رکھ کر باہر نکالتے تو وہ چمکنے لگتا۔ دوبارہ بغل میں لے جا کر نکالتے تو وہی قدرتی ہاتھ بن جاتا۔

یہ دو معجزے عطا ہونے کے بعد آپؑ کو حکم ملا کہ مصر جا کر فرعون اور اس کی قوم میں توحید کی تبلیغ کریں اور انھیں راہِ ہدایت کی طرف بلائیں۔

———(((اللہ اکبر)))———

یہ حکم ملتے ہی آپؑ فرعون کے دربار میں پہنچے اور کہا "اے فرعون میں خدا کی طرف سے بھیجا

Marfat.com

جانے والا رسول ہوں"۔

فرعون غضبناک ہو کر بولا۔ کونسا خدا۔ تم کس خدا کی بات کر رہے ہو۔

آپ نے جواب دیا "وہی خدا جو رب العالمین ہے۔ جو زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب کا رب ہے۔

سنا تم لوگوں نے یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ کوئی دیوانہ ہے یا پاگل؟ (نعوذ باللہ)

پھر غور سے دیکھنے کے بعد کہنے لگا کیا تو وہی تو نہیں ہے جو کل تک ہمارے ٹکڑوں پر پلتا رہا اور ہاں تو نے ایک قبطی کو بھی قتل کیا تھا۔

حضرت موسیٰؑ نے فوراً مان لیا کہ ہاں میں وہی ہوں مگر اب اپنے خدا کی طرف سے تیری اور تیری قوم کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

فرعون یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو کر بولا "میرے سوا کوئی اور بھی خدا ہے؟ (نعوذ باللہ)

اللہ کے نبی پر یہ بات بہت گراں گزری۔ فرمایا اے فرعون تیری کیا ہستی کہ تو خدا کا مقابلہ کرے۔ تو تو صرف ظالم ہے ظالم۔ جھوٹا اور بے ایمان قسم کا انسان ہے۔"

خدا تو بس خدا ہی ہے۔ وہ تو زمین و آسمان اور مشرق و مغرب کا خدا ہے اور وہ تنہا و یکتا ہے۔ یہ ساری کائنات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ آپؑ نے بے دھڑک توحید کا پیغام سنایا۔

آج تک کسی نے اتنی کھری کھری سنانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ فرعون مرعوب ہو گیا، مگر ظاہرداری کا بھرم رکھنے کے لئے بولا۔ اے موسیٰؑ! ہم نے تجھے پالا پوسا کیا ہماری بھلائیوں کا یہی بدلا ہے۔ اگر ہماری بھلائیوں کا یہی عوض ہے تو سن میں اپنی ناشکری کی پاداش میں تجھے قیدی بنا کر اتنا ماروں گا کہ تو اپنے خدا کو یاد کر کے روئے گا۔

اللہ کے نبی پر اس دھمکی کا اثر نہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ آپؑ نے اور زیادہ مدلل درسِ توحید دیا تو فرعون نے ثبوت مانگا۔ حضرت موسیٰؑ نے عصا زمین پر پھینک دیا۔ جو ایک بہت بڑے اژدھا کی شکل میں فرعون کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ یہ دیکھتے ہی ڈر کر کہنے لگا، ہاں ہاں ثبوت دیکھ لیا۔ بس بس اسے روکو۔ آپ نے اس کو پکڑا تو وہ لاٹھی تھی، صرف لاٹھی، جس سے بکریاں ہانکی جاتی ہیں۔ جھاڑیوں کے پتے جھاڑ کر بکریوں کو کھلائے جاتے ہیں۔

پھر آپؑ نے ہاتھ بغل میں دبایا اور باہر نکالا تو وہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ دوبارہ بغل میں دبا کر نکالا تو وہی عام ہاتھ تھا۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے مصاحبین بول اٹھے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

Marfat.com

بعدازاں مصری جادوگر بلائے گئے۔ بعض روایتوں میں ان کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے۔

ہر ایک جادوگر نے اپنے جادو کے زور سے ایک ایک سانپ بنا کر پھینکا اور جب حضرت موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ اژدھا کی شکل اختیار کر کے جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل گیا۔ تمام جادوگر سچائی تسلیم کرتے ہوئے سجدے میں گر پڑے۔

کیسی عجیب بات ہے۔ یہ کام تو موسیٰ علیہ السلام کو رسوا کرنے کے لئے کیا گیا تھا، مگر فرعون کی رسوائی کا سبب بن گیا۔

فرعون جادوگروں سے کہنے لگا کہ تم سب لوگ موسیٰ کے ساتھ ساز باز کیے ہوئے تھے۔ میرے حکم کے بغیر موسیٰ علیہ السلام کے خدا پر ایمان لے آئے ہو۔ میں تمھیں عبرت ناک سزا دوں گا، مگر کسی پر اثر نہ ہوا۔ ان کے دلوں میں خوف خدا داخل ہو چکا تھا، وہ فرعون سے کیوں ڈرتے۔

ادھر بی بی آسیہ بھی ایمان لے آئیں۔ انھیں ہزار دھمکیاں دی گئیں، مگر انھوں نے ایمان نہ چھوڑا۔ بالآخر انھیں شہید کر دیا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی امت میں یہ پہلی عورت تھیں جو اسلام کی خاطر شہید ہوئیں۔

اب موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے منصوبے بننے لگے۔ اگرچہ کچھ لوگ فرعون کو اس حرکت سے باز رکھنا چاہتے تھے، مگر کابینہ کی اکثریت اس بات پر بضد تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کا کام تمام کر دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ ابھی یہ مشورے ہو رہے تھے کہ خدا کی غیرت جوش میں آ گئی۔

فرعون کی قوم پر "خون" کا عذاب نازل ہو گیا۔ جہاں جہاں پانی موجود تھا، وہاں وہاں خون بھر گیا۔ لوگ پیاسے مرنے لگے تو شور مچاتے فرعون کے پاس آئے کہ پانی کا انتظام کیا جائے۔ فرعون نے نئے کنویں کھودنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے جواب دیا کہ ہم ایسا کر چکے ہیں۔ نئے کھودے جانے والے کنوؤں سے بھی خون ہی نکلتا ہے۔

وزیر اعظم ہامان کو بلا کر مشورہ کیا گیا۔ ان دونوں کو پورا یقین تھا کہ یہ موسیٰ کے خدا کا کرشمہ ہے۔ لوگوں سے کہا گیا کہ تم جاؤ ہم کوئی اور بندوبست کرتے ہیں۔

رات کو موسیٰ علیہ السلام کو دربار میں بلا کر درخواست کی گئی کہ اے موسیٰ قوم پیاسی مر رہی ہے۔ اگر تو اپنے خدا سے کہہ کر پانی کا بندوبست کروا دے تو میں تیرے خدا پر ایمان لے آؤں گا۔

اس وعدے پر موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو فوراً ہر جگہ تمام کنوؤں دریاؤں جھیلوں اور نہروں

Marfat.com

میں خون کی جگہ پانی بھر گیا۔ اس کے بعد جب فرعون کو وعدہ یاد دلایا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا، بلکہ قوم سے کہنے لگا کہ یہ سارا بندوبست میں نے کیا ہے۔

بعدازاں اس کی قوم پر مینڈکوں کا عذاب نازل ہوا۔ تمام جھیلوں، دریاؤں اور چشموں میں پانی کی جگہ مینڈک بھر گئے۔ پھر قوم نے شور مچایا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کو دربار میں بلایا گیا۔ پھر ایمان لانے کے وعدے پر دعا کروائی گئی اور جب عذاب ٹل گیا تو پھر وعدے سے مکر گئے۔

ایک دن خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ فرعون کو وعدہ یاد دلائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ ساتھ ہی یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے وعدہ پورا نہ کیا تو ماسوائے بنی اسرائیل کے پوری قوم کے مویشی مر جائیں گے، مگر اس نے خدا کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

اگلے دن پوری قوم فرعون کے مویشی مر گئے۔ انھوں نے ضد میں آ کر خدا کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

حضرت موسیٰ نے کسی تنور سے ایک مٹھی راکھ لی اور دربار فرعون میں جا کر آسمان کی طرف پھونک دی۔ اس مٹھی بھر راکھ (انتھراکس۔ آج کل انتھراکس نام کے ایک پوڈر یا میڈیلسن نے ایسا ہی خوف یورپ اور امریکہ کو لاحق ہے حالانکہ یہ سارا اُن کا خود ساختہ ڈراما ہے) سے دو طرح کے عذاب نازل ہوئے، ایک تو ''پھوڑوں'' کا عذاب تھا اور دوسرا ''آلودگی'' کا عذاب۔ یعنی پوری قوم اور ان کے تمام جانور پھوڑوں اور پھپھولوں کی گرفت میں آ گئے۔ نیز گرد و غبار اور آلودگی ہر جگہ پھیل گئی۔ یہ آلودگی ایسی ظالم تھی کہ سانس لینا مشکل ہو گیا۔

اب کی بار پھر حضرت موسیٰ سے درخواست کی گئی کہ اگر یہ عذاب ٹل جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے اور قوم بنو اسرائیل کو رہا کر دیں گے۔

آپؑ نے پھر دعا فرمائی[22] اور عذاب ٹل گیا، مگر قوم نے پھر ایمان و یقین سے انکار کر دیا۔

اس انکار پر ایک بار پھر گرفت میں لے لیا گیا۔ اب کے تو آسمان سے بڑے بڑے اولے برسنا شروع ہو گئے۔ ان اولوں سے مکانوں کی چھتیں چھلنی چھلنی ہو گئیں۔ آبادیوں میں کہرام مچ گیا۔ ہر سو ہاہا کار، چیخیں اور شور شرابہ شروع ہو گیا۔

اس بار پھر فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے رجوع کیا۔ کہنے لگا اب تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ میں ایمان نہ لاؤں۔ بس اپنے رب سے کہہ کر یہ عذاب ٹال دے۔

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تیرے دل میں اب بھی کھدی موجود ہے۔ تو اب بھی ایمان نہیں لائے گا، مگر میں یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ تو ضرور

Marfat.com

وعدہ خلافی کرے گا پھر بھی دعا کروں گا۔ چنانچہ آپؑ نے دعا فرمائی اور عذاب ٹل گیا۔
مگر وہ ظالم پھر مکر گیا۔
قارئین ایک بار پھر اللہ کا غضب جوش میں آیا۔ انتہائی گرم ہوا چلنے لگی اور ٹڈیوں کے غول اتر پڑے یہ ٹڈیاں تمام کھڑی فصلیں چاٹ گئیں اور سبزے کا نام ونشان مٹ گیا۔
فرعون نے ایک بار پھر اللہ کے نبیؑ سے واسطہ جوڑا۔ اپنی حماقت پر شرمندگی ظاہر کر کے وعدہ کیا کہ یہ عذاب ٹل جائے تو تم جو کہو گے من وعن تسلیم کر لوں گا۔
اللہ کے نبی نے ایک بار پھر دعا فرمائی تو عذاب ٹل گیا۔
مگر فرعون کو ایمان نہ لانا تھا، نہ لایا۔ بالآخر اسے نیل میں غرق کر دیا گیا۔
یہ ایک طویل داستان ہے جو بار بار کسی علیحدہ تصنیف پر اکسا رہی ہے جس پر الحمد للہ ”کلیم اللہ“ کے عنوان سے کام جاری ہے۔
”مکہ کی سرد جنگ“ کی اشاعت کے جلدی بعد انشاء اللہ منظر عام پر آ جائے گی۔
بہر حال موضوع کا جتنا تقاضہ تھا اسے پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور طوالت سے اجتناب برت کر موضوع کے مطابق چلتے رہے ہیں۔
قارئین یہ واقعات مشرکین مکہ کو سنائے جا رہے ہیں۔ یقیناً فرعون اور اس کی قوم کی تاریخ کے آئینے میں مشرکین مکہ اپنے عکس دیکھ رہے ہوں گے۔
قرآن کا اسلوب ہی ایسا ہے کہ اس میں بات براہ راست بھی ہے اور اشارے کنائے سے بھی کی جاتی ہے۔ چونکہ مقصد انسانیت کی فلاح ونجات ہے، اس لئے براہ راست چوٹ کرنے سے اجتناب برتا گیا ہے۔
سرد جنگ ویسے بھی سرد انداز میں لڑی جاتی ہے۔ تحریکی اور تنظیمی مقاصد کے حصول کا آسان اور احسن طریقہ بھی یہی ہے کہ افراد کی بجائے اقوام کو ترجیح دی جائے۔ اگر تحریک اپنے اوپر افراد کو حاوی کر لے تو مقاصد کا حصول مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔
اس طرح کا اسلوب اپنانے کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشرکین پر یہ واضح کر دیا جائے کہ تم کیا چیز ہو تمھاری اوقات ہی کیا ہے۔ یہاں تو بڑے بڑے ہو گزرے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اے مکہ کے مشرکو تم تو کچھ بھی نہیں ہو۔ اے رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرنے والو!! تم تو فرعون سے زیادہ طاقتور نہیں ہو اور نہ ہی ہامان سے زیادہ عقلمند ہو۔ خدائے بزرگ وبرتر کے نزدیک تم تو مکھن میں بال کے برابر بھی نہیں ہو۔ وہ ذات جب چاہے گی، تمھیں پکڑ لے گی۔ خدا کے

Marfat.com

نزدیک تمھاری اوقات ہی کیا ہے۔

قرآن کے آئینہ میں نبیوں کی مخالفت کرنے والوں کی حالت دیکھ لواور اپنے آپ کو پہچان لو۔

اس کے علاوہ مشرکین کے اخلاقی دیوالیہ پن کو فرعون کے اخلاقی دیوالیہ پن سے مشابہ کیا گیا ہے۔ فرعون بھی اندر سے سچائی کو مانتا تھا۔ جو بار بار وعدہ کرتا رہا کہ اب یہ کردو تو میں ایمان لے آؤں گا۔ اب یوں ہو جائے تو میں ایمان لے آؤں گا۔ ذرا دیکھو تو سہی، رسول اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تم بھی اندر سے سچائی کو مانتے ہو۔ جبھی تو راتوں کو چھپ کر قرآن سنتے ہو۔

حالیہ چند روزہ قحط میں تم نے بھی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی اپیل کی تھی اور فرعون بھی موسیٰ علیہ السلام سے مشکل کے وقت دعائیں کرواتا تھا۔ تم بھی کم ظرف ہو، وہ بھی کم ظرف تھا۔ جس طرح فرعون برباد ہوا اسی طرح تمھاری بربادی بھی یقینی ہے۔

یہی پیغام تھا جو قرآن نے 37 سورتوں میں مشرکین مکہ کو موسیٰ علیہ السلام اور قومِ فرعون کی مثالوں سے دیا، مگر وہ بھی فرعون کی طرح نہ ماننے والے تھے اور نہ مانے۔

اتنا کچھ دیکھنے سننے کے بعد بھی جن کے مقدر میں سیاہ کاری لکھی جا چکی تھی، وہ سیاہ کار ہی رہے۔ آیئے ذرا آگے کا حال معلوم کرتے ہیں کہ اس سے آگے کیا ہوا؟ یا کیا کیا گیا؟

———((الحمد للہ))———

Marfat.com

اور جب چاند دو ٹکڑے ہوا

جب مشرکین مکہ سے کسی طرح بن نہ پڑی تو انھوں نے علماء یہود [23] سے دریافت کیا کہ وہ کون سا سوال کریں۔ کونسا نشان طلب کریں جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرم کھل جائے۔

یہودی علماء نے بتایا کہ "جادو کا اثر زمین تک محدود ہے۔ اُن سے تم کہو کہ چاند کو دو ٹکڑے کر دیں۔ یقیناً آپ ایسا نہیں کر پائیں گے۔ یوں جادو کا پول کھل جائے گا۔"

دارلندوہ نے یہ بل پاس کیا اور اگلے ہی روز حضورؐ کے سامنے رکھ دیا۔ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ یہ تو ایک طرح خدا کی آزمائش کرنے والی بات تھی اور کم از کم آپؐ سے یہ توقع نہ تھی کہ اپنے بلند و برتر خدا کی آزمائش شروع کر دیتے۔ آپؐ خاموشی سے اس کا جواب دیئے بغیر اٹھ گئے۔

دراصل یہ سوال یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ کے فک بحر معجزہ سے اخذ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کا معجزہ موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی اور سے ممکن نہیں۔ حالانکہ اس معجزہ اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

کم و بیش چھ سال قبل ہجرت کا زمانہ تھا۔ سرور دو عالم ﷺ [24] صحن حرم میں حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، جبیر بن مطعمؓ، انس بن مالکؓ اور کئی اور صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ مشرکینِ مکہ بھی قریب ہی محفل جمائے بیٹھے تھے۔

آپ سرکارؐ نے اپنے رب کے حکم سے انگشت شہادت اٹھائی اور چاند کی طرف اشارہ کیا۔ اشارہ کرنا تھا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا کوہِ حرا کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف نظر آنے لگا۔

سرکار دو عالمؐ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے باآواز بلند فرمایا۔

"اِشْهَدُوْ"

دیکھو۔ "گواہ رہنا"

یہ اعلان ان مشرکین کے لئے تھا۔ جنھوں نے "یہ معجزہ" طلب کیا تھا۔ جو آپؐ کو جادوگر،

Marfat.com

آپؐ کے کلام کو جادو کا کلام اور آپؐ کے ماننے والوں کو سحر زدہ کہتے تھے۔

یہ بہت بڑی برہان تھی۔ نبوت کی سچائی کے لئے بہت بڑا ثبوت تھا۔ دل میں معمولی سی روشنی بھی ہوتی تو فوراً کلمہ پڑھ کر حصارِ دین میں داخل ہو جاتے، مگر ان کے لئے فلاحِ دارین کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اس زندہ و جاوید معجزہ کو دیکھتے ہی کہنے لگے کہ:

"یہ تو کھلا جادو ہے" [25]

اس پر لغوی اور معنوی بحث سے پہلے اس کی قرآنی تصدیق بھی کر لی جائے۔ قرآن نے اس تاریخی اور کائنات کے یکتا واقعہ پر یوں مہرِ تصدیق ثبت فرمائی۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ (سورہ القمر آیت 1-2)

مفہوم: وقت آ گیا اور چاند پھٹ گیا اور یہ کافر لوگ جب کوئی بڑا نشان دیکھتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے جو ہوتا رہتا ہے۔"

(((اللہ اکبر)))

مشرکین کی طرف سے طلبِ معجزہ کی بات اسپوتاج کے زمرے میں آتی ہے۔ اگر حضورؐ ایسا نہ کر پاتے تو مشرکین کے ہاتھ ایک مدلل عنوان آ جاتا۔ جس کی وہ خوب تشہیر کرتے خوب پروپیگنڈہ کرتے کہ دیکھیں جی ہم نے یہ سوال کیا تھا۔ اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اگر وہ واقعی خدا کے بھیجے ہوئے ہوتے تو یہ کونسا مشکل تھا۔ جس خدا کی وہ بات کر رہے ہیں۔ بقول ان کے وہ تو بہت بڑا خدا ہے۔ اتنے عظیم خدا کے لئے اتنا معمولی سا کام کوئی مشکل تھا۔ اس لئے ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ تھوڑا بہت جادو ہے یا کہانت جس سے معمولی قسم کے شعبدے دکھا رہے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

یوں اس قسم کے پروپیگنڈا سے تحریکی اثرات سکڑنا شروع ہو جاتے ہیں اور تحریک سبوتاژ ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

لیکن حضورؐ نے مشرکین کا مطالبہ پورا کر کے آئندہ ہونے والے پروپیگنڈا کو ختم کر دیا۔

سرد جنگ میں اسے کاؤنٹر اسپوتاج کا نام دیا جاتا ہے یعنی وہ کارروائی جو مخالفین کے مطالبہ پر رونما ہوتی ہے۔ حقیقت میں اس قسم کا مطالبہ رکھ کر کارروائی کی ابتداء کرنے والے اپنی شکست و ہزیمت کا خود ہی سامان کر لیتے ہیں۔ ان کے زعم میں ان کے سوال کا جواب ناممکن ہوتا ہے۔ جب جواب مل جاتا ہے تو انھیں چھپنے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کے لئے

Marfat.com

وقت نہیں ملتا۔

یقیناً چاند نے دوٹکڑے ہوکر مشرکین کی ہوا بند کردی تھی۔ان کے لئے زندگی کا حاشیہ تنگ کر دیا تھا۔ان کی خوشیاں چھین کر مسلمانوں کی جھولی میں ڈال دی تھیں۔

نوآموز کارکنانِ تحریکِ اسلامی کے جذبے دوبالا کر دیے تھے۔وہ نئے جذبوں اور نئے ارمانوں کے ساتھ مزید گہرائی میں چلے گئے تھے۔ان کا ایمان ان کا یقین بام عروج پر پہنچ چکا تھا۔

ان نوآموز کارکنان کو پتا چل چکا تھا کہ ان کی قیادت کوئی معمولی قیادت نہیں۔ان کی تحریک کوئی معمولی تحریک نہیں۔ان کا مذہب یا عقیدہ کوئی معمولی مذہب یا عقیدہ نہیں۔اس لئے وہ خود بھی کوئی معمولی کارکن نہیں۔

یہ معجزہ جہاں مشرکین کے لئے نوید عذاب تھا، وہاں کارکنوں کے لئے نوید ترقی تھا۔جہاں مشرکین کی زندگی کا باب ختم ہونے کی بشارت دے رہا تھا، وہاں مسلمین کے شاندار مستقبل کی گواہی دے رہا تھا۔

مشرکین مکہ چونکہ عقیدہ آخرت کے منکر تھے۔اس لئے ان پر واضح کر دیا گیا کہ جو خدا چاند کو دوٹکڑے کر کے جوڑ سکتا ہے، وہ انسان کے بکھرے ہوئے اعضا بھی ایک جگہ جمع کرنے پر قادر ہے۔

جو خدا اپنے نبی کی انگلی کے اشارے سے چاند کو دوٹکڑے کر سکتا ہے، وہ مشرکین کو ناکام اور مسلمین کو کامران بھی کر سکتا ہے۔جو خدا نبی کے اشارے پر شق القمر جیسا مافوق الفطرت واقعہ رونما کر سکتا ہے، وہ نبیؐ کے اشارے سے مشرکین پر کسی دن عذاب بھی مسلط کر سکتا ہے۔

بہر حال یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرد محاذ پر بہت بڑی کامیابی تھی اور مشرکینِ مکہ کے منہ پر بہت بڑا طمانچہ۔ہائے ری بے عقلی!! مخالفین یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے، بلکہ الٹا کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہے جادو۔

اس واقعہ کے بعد سورہ قمر نازل ہوئی جو مشرکین کے لئے ایک اور صدمہ تھی۔اس سورۃ میں مشرکین کو اقوام سابقہ کے ساتھ مماثل کر کے اشارہ کیا گیا کہ اقوام ماضیہ بھی تمہاری طرح نبیوں سے معجزے طلب کرتی رہیں۔معجزے دیکھنے کے بعد بھی وہ تمہاری طرح ایمان سے کتراتی رہیں۔اللہ نے بالآخر ان کو مغضوب کیا۔شاید تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔

سورہ قمر پر نظر ڈالنے سے پہلے معجزہ اور جادو کا فرق معلوم کر لیں۔

Marfat.com

(((اللہ اکبر)))

سحر کا لغوی معنی جادو ہے اور جادو نظر بندی کا دوسرا نام ہے۔ جسے موجودہ دور میں مسمریزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ دراصل ایک طرح کی شعبدہ بازی ہے اس سے قوتِ متخیلہ اور نظر پر اثر ڈالا جاتا ہے اسی کا ایک نام ہپناٹزم بھی ہے۔ یہ اس علم کے ایک طرح سے فنی ارتقاء کا نام ہے۔

جادو میں دراصل دیکھنے والے کی نظر اور تخیل پر قابو پایا جاتا ہے۔ دیکھنے والا ہی صرف پردوں کے پیچھے چلا جاتا ہے یعنی دیکھی جانے والی چیز کے متعلق اس کا تصور یا تخیلی خاکہ بدل جاتا ہے، ورنہ وہ چیز اپنی اصلی حالت میں قائم رہتی ہے۔ آسان الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ جادو صرف نظر کے دھوکے کا نام ہے۔

صاحب ''رحمت اللعالمین'' نے جادو کی مثال یوں بیان کی ہے [26] جیسے ایک شخص رات کو چلتے ہوئے زمین پڑی ایک رسی دیکھ کر اسے سانپ سمجھ لیتا ہے۔ اپنی اس سمجھ یا سوچ کی وجہ سے اس پر اتنا ہی خوف طاری ہو جاتا ہے، جتنا کہ اصل سانپ دیکھ کر ہونا چاہیے، حالانکہ یہ رسی سانپ نہیں، صرف رسی ہے۔

معجزہ لغوی اعتبار سے عام سا لفظ ہے جو اعجاز سے مشتق ہے جس کے معنی عاجز کر دینے والے کے ہیں۔ اصطلاحاً ایسے مافوق الفطرت واقعے کا نام ہے جو فطرت کے عمومی اصول وضوابط کے مخالف وقوع پذیر ہو یہ صرف انبیاءِ اکرام کے ساتھ منسلک ہے یعنی عام آدمی خواہ کتنا ہی خدا کا لاڈلا کیوں نہ ہو، معجزہ پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ کمال صرف نبیوں کے لئے مختص ہے۔

جادوگری نظروں کے دھوکہ کا نام ہے جبکہ معجزہ میں اصلی حقیقت موجود ہوتی ہے اور یہ وہ چیز ہے جو نبی کو جادوگر سے اعلیٰ اور بلند و برتر بناتی ہے۔

مثلاً موسیٰ علیہ السلام پتھر پر عصا مارتے ہیں تو وہاں سے بارہ چشمے ابل پڑتے ہیں۔ یہ کوئی شعبدہ نہیں، بلکہ حقیقت تھی۔

قرآن مجید میں موسیٰ علیہ السلام اور مصر کے ساحروں کا قصہ مذکور ہے۔ مصری جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں پھینکیں تو وہ سانپ بن کر چلنے لگیں۔ یہ ایک طرح کی نظر بندی تھی۔ حقیقت میں وہ لاٹھیاں تھیں جب ان کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو اس نے اژدھا بن کر تمام سانپوں کو نگل لیا اور پھر جب اسے پکڑا تو وہ پہلے والا عصا تھا۔

مصری جادوگر اس حقیقت کو پا گئے کہ اگر یہ جادو ہوتا تو کچھ دیر بعد ان کی لاٹھیاں ظاہر ہو

Marfat.com

جاتیں کیونکہ نظر بندی خاص وقت اور جگہ تک محدود ہوتی ہے۔ جبکہ ہزاروں کی تعداد میں لاٹھیاں نگل کر عصائے کلیمی دکھائی دے رہا ہے اوران کی لاٹھیوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ چونکہ یہ حقیقت تھی جسے دیکھ کر مصری جادوگر مسلمان ہو گئے اور فرعون کو یہ کہنا پڑا کہ تم بھی موسیٰؑ کی جماعت کے آدمی ہو۔ تم موسیٰؑ سے ملے ہوئے ہو ورنہ یہ جادو کے سوا کچھ نہیں۔

بالکل فرعون کی طرح مشرکینِ مکہ نے بھی شق القمر کا عظیم اور مافوق الفطرت واقعہ دیکھنے کے بعد حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ بعد میں سورۃ قمر کی صورت میں اللہ نے ان کی خوب دُرگت بنائی۔

ان کو اقوام کہنہ کی طرف متوجہ کر کے سمجھایا گیا کہ اقوام عاد وثمود بھی معجزے دیکھ کر یہی بات کہتی تھیں کہ یہ تو صاف صاف جادو ہے۔ قوم نوحؑ نے بھی اللہ کے نبی کو زچ کر دیا تھا۔ جو ان پر اللہ کا غضب ہوا۔ ان میں سے کسی قوم کو سیلاب نے غرق کر دیا کوئی قوم تیز طوفان کی نذر ہو گئی اور کسی کو صرف ایک چیخ نے ختم کر دیا۔

یہ قرآنی اسلوب کا کمال ہے۔ قصہ کسی کا بیان کیا جاتا ہے تو سمجھایا کسی کو جا رہا ہے۔ پنجابی کے مشہور معقولہ "کہنا بیٹی کو سمجھانا بہو کو" کے مصداق فرعون، قوم لوطؑ، قوم عاد وثمود کے عذابوں کی یاددہانی اس لئے کروائی جا رہی ہے کہ مشرکینِ مکہ ان اقوامِ سابقہ سے عبرت پکڑیں اور مخالفت ترک کر کے تحریک اسلامی میں شامل ہو جائیں۔

بہرحال جنھیں ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں۔ اس عظیم واقعہ نے بھی مشرکین پر کوئی اثر نہ کیا۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی اسلام کی مخالفت تھا۔ سو وہ اپنے اس کام پر ڈٹے رہے۔

13 سالہ مکی زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جو بھرپور مخالفت سے خالی ہو۔ جیسے جیسے تحریک پھیلتی گئی، ایسے ایسے مخالفت تیز ہوتی گئی، مگر آفرین ہے!! نبیؐ تو نبیؐ ان کے کسی ادنیٰ صحابیؓ کے پائے ثبات میں کبھی ذرہ بھر لغزش نہیں آئی۔

(((الحمد للہ)))

حواشی:

1- سیرت النبی، جلد دوم، صفحہ 165، ابن ہشام، جلد اول۔

2- ابن ہشام، جلد اول، سرور عالم، جلد دوم۔

Marfat.com

3- سرورعالم، جلددوم، بروایت حضرت علیؓ۔
4- اراس ایک قبیلے کا نام تھا۔
5- ابن ہشام، جلداول، سرورعالم، جلددوم۔
6- اَلَم نَشْرَح آیت نمبر4۔
7- سرورعالم، جلددوم، بحوالہ اعلام النبوہ از قاضی ابوالحسن۔
8- سرورعالم، جلددوم، بحوالہ انساب الاشراف، جلداول۔
9- ابن ہشام، جلداول۔
10- ابن ہشام، جلداول۔
11- عبدمناف دراصل بنوہاشم کا مورث اعلیٰ تھا جس کی وجہ سے بنی ہاشم کو بنی عبدمناف کہا جاتا تھا۔
12- مندرجہ بالا آیات کی تفسیر دیکھئے تفہیم القرآن، انوارالقرآن، تفسیر عثمانی، تفسیر مظہری، تفسیر ابن کثیر۔
13- دیکھئے تفسیر ابن کثیر، تفہیم القرآن، انوارالقرآن، تفسیر مظہری۔
14- دیکھئے تفہیم القرآن، تفسیر سورہ مومن آیۃ 21 تا 32۔
15- انوارالقرآن، تفہیم القرآن، تفسیر عثمانی میں تفصیلات دیکھئے۔
16- ابن ہشام، جلداول۔ رحمت اللعالمینؐ، سیرت النبیؐ، پیغمبر اعظم وآخر وغیرہ۔ پوری تیرہ سالہ مکی زندگی قرآن اور عقیدہ آخرت کے حوالے سے ایسی باتوں سے بھری پڑی ہے۔
17- قصص القرآن، جلددوم، سیرت انبیاء اکرام، جلداول اور سیارہ کا انبیاء اکرام نمبر تفہیم القرآن۔
18- تاریخ ابن خلدون۔
19- تاریخ ابن خلدون، اور تاریخ طبری میں ان واقعات کی تفصیلات موجود ہیں۔
20- تاریخ ابن خلدون۔
21- قصص القرآن۔ سیرت انبیائے اکرام۔
22- سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا ہارون علیہ السلام اور قوم فرعون کا قصہ القرآن کا طویل ترین قصہ ہے کلام مجید کی 37 سورتوں میں یہ واقعات یا ان پر روشنی ڈالی گئی ہے جن آیات میں یہ

Marfat.com

واقعات درج ہیں ان کی تعداد تقریباً 537 بنتی ہے۔ اس لیے واقعات کو موضوع کے موافق مختصر کرنے پر مجبور ہوں۔

-23 رحمت اللعالمینؐ باب معجزات۔

-24 صحیحین میں عبداللہ بن مسعودؓ حضرت علیؓ سے اور بیہقی میں جبیر بن مطعم یہ واقعہ روایت ہے۔ ان روایات میں حضرت علیؓ، جبیرؓ اور عبداللہ بن سعود چشم دید جبکہ عبداللہ بن عباس اور انس بن مالک مرسل صحابی اور راوی ہیں۔

-25 انوار القرآن، جلد دوم، سورہ قمر آیت 1-2۔

-26 رحمت اللعالمینؐ۔

Marfat.com

باب:9

سفارتی محاذ

یہودی علماء سے سفارت ومشاورت اوران کے سوال؟

اتنے واضح دلائل سن کر بھی مخالفین اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔ان کے پاس کہنے سننے کو تو کچھ بھی نہ رہا تھا۔اپنے پورے جتن کر چکے تھے،مگرانھیں کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔اب تو ان کی عقل وفکر جواب دے چکی تھی۔آخر فیصلہ کرتے ہیں کہ یہودیوں سے مدد لی جائے۔وہ ضرور کوئی معقول حل بتائیں گے۔سو یہود مدینہ کے پاس ایک سفارت بھیجتے ہیں۔وہ سفارت اپنا مدعا بیان کرتی ہے کہ ''اے اہل کتاب ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو[1] جھٹلانے میں عاجز آ چکے ہیں۔کوئی ایسی تدبیر بتاؤ جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا ثابت کیا جا سکے۔

یہودی علماء انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ''جاؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو کہ یعقوب کی اولاد مصر کیوں منتقل ہوئی۔یقیناً وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکیں گے۔

یہودی یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ واقعہ اہل کتاب کے سوا کوئی نہیں جانتا۔مکہ میں تو کوئی یہودی بھی نہیں رہتا جس نے کسی سے یہ قصہ بیان کیا ہو۔نہ ہی مکہ میں کوئی ایسی درس گاہ ہے جس میں لوگوں کو تاریخ سے روشناس کروایا جاتا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جس سے یہ سوال کیا جاتا ہے وہ امّی یعنی ان پڑھ ہیں۔کبھی ممکن ہی نہیں کہ اس سوال کا جواب مل جائے۔

ان حالات کے پیش نظر بات تو واقعی بڑی گہری اور منجھی ہوئی تھی۔قرآن سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس سوال کا جواب ناممکن ہے۔

مشرکین کا وفد واپس آیا تو انھوں نے جھٹ پٹ یہ مطالبہ رکھ دیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر تم واقعی سچے ہو تو بتاؤ کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد مصر کیوں منتقل ہوئی۔

یقیناً سوال کرنے والے اس زعم میں بیٹھے ہوں گے کہ''لگ پتا جائے گا''اب دیکھیں

Marfat.com

گے کیسے جواب دیتے ہیں۔

ادھر یہ بات کوئی اتنی مشکل نہ تھی۔ جس خدا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تھا، اسی خدا نے یعقوبؑ اور یوسف علیہ السلام کو نبی بنایا تھا۔ وہ قادر مطلق تو ناممکن کو ممکن کرنے پر قادر تھا اس کے نزدیک نبی کو یہ قصہ بتا دینا کون سی مشکل بات تھی۔ چنانچہ سورہ یوسف کی شکل میں جواب وحی فرما دیا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ قرآن کے عام اسلوب سے ہٹ کر یہ جواب وحی ہوا۔ قرآن کا عمومی اسلوب یہ ہے کہ کسی قصے کو کسی ایک جگہ مذکورہ نہیں کیا، بلکہ مختلف جگہوں پر جزواً بیان کیا، لیکن قصہ یوسفؑ مسلسل ایک ہی سورۃ میں بیان کر دیا۔

شاید اسی وجہ سے خود قرآن نے اسے احسن القصص قرار دیا۔ یاد رہے کہ قرآن میں واقعات اور قصے بیان کرنے کا صرف یہی مقصد ہے کہ پند و نصائح، حکمتیں اور نصیحتیں واضح کی جائیں تاکہ سننے والے عبرت پکڑیں اور دین میں داخل ہو جائیں۔

یہ سورہ مشرکین کے سوال کا بڑا واضح اور مدلل جواب تھا۔ اس کے نزول نے پورے مکہ میں تہلکا مچا دیا۔ یعقوبؑ اور یوسفؑ کا ذکر قرآن کی تصدیق اور ثبوت کی دلیل تھا۔ یوسف علیہ السلام کا خواب اور برادران یوسفؑ کا حسد، حضورؐ کے اعلان نبوت اور مشرکین مکہ کی بے جا مخالفت سے نسبت پیدا کر رہا تھا۔ اوپر سے قرآنی اسلوب کی مٹھاس اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و کردار کی اثر آفرینی نے اس قصے کو چار چاند لگا دیئے۔ اسے جس نے ایک بار سنا بس بار بار سننے کے تجسس میں مبتلا ہو گیا۔

اس کی اثر آفرینی کا تو اب بھی یہی عالم ہے کہ جو ایک بار پڑھتا ہے اس کا دل بار بار پڑھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ گو اس کا اثر عام پیدائشی مسلمان کے لئے بڑا نارمل ہے، مگر اس وقت جب یہ قصہ پہلی بار تلاوت کیا گیا تو اس نے پورے مکہ کو ہلا کے رکھ دیا۔

آیئے حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات زندگی کی تفصیلات سے اس قصے کی اثر آفرینی کا جائزہ لیتے ہیں۔ گو ہمارا موضوع مشرکین کی طرف سے کیا جانے والا سوال ہی ہے، مگر اس کا جواب پوری طرح سمجھنے کے لئے قصے کا حضرت یعقوب علیہ السلام سے شروع کرنا ضروری ہی نہیں ناگزیر بھی ہے۔

—(((الحمد للہ)))—

Marfat.com

حضرت یعقوب علیہ السلام

سیدنا یعقوب[2] علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ آپ کی والدہ کا نام رُفقہ اور بڑے بھائی کا نام عیسُو تھا۔ آپ کا سن ولادت 1836 قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔

دونوں بھائیوں میں کسی معاملہ[3] پر ان بن ہو گئی۔ بڑا بھائی خون کا پیاسا ہو گیا تو یعقوب علیہ السلام کو جان کے لالے پڑ گئے۔ آپ جنگلوں میں نکل گئے۔ عرصہ دراز تک وہیں بھٹکتے رہے کچھ مدت بعد والدہ کی یاد نے ستایا تو چھپتے چھپاتے ملنے چلے آئے۔

دیکھتے ہی والدہ کا دل غنچۂ بہار کی طرح کھل اٹھا۔ بچے نے سیس نوائے ماں کو بوسے دیئے، ماں نے شدت سے سینے کے ساتھ لگایا اور ساری کی ساری مادرانہ شفقت یعقوبؑ پر نچھاور کر دی۔ سچ ماہیے ان احساسات کی ترجمانی تو کوئی ماں ہی کر سکتی ہے۔

ماں ماں ہی ہوتی ہے۔ کہنے لگیں بیٹا تم یوں کب تک مارے مارے پھرتے رہو گے۔ چھوڑ دو یہ سب کچھ۔ میری مانو تو اپنے ماموں لابان کے پاس ''فدان'' میں چلے جاؤ۔ وہ شہر کا سردار اور بڑی شوکت و عزت والا ہے۔ اسے تیرے وہاں رہنے پر خوشی ہو گی اور پھر اس کی دو بیٹیاں بھی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی تیرے نکاح میں دے دے۔

بیٹے کو ماں سے جدائی کٹھن نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگا اماں میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔

بیٹے کے احساسات ماں سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔ ماں نے کہا: ''مگر مجھے تمھاری جان عزیز ہے۔ اگر تیرے بھائی نے تجھے مار دیا تو میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ میں تمھارے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔ میری مان اپنے ماموں لابان کے پاس چلا جا۔''

ماں کا حکم سر آنکھوں پر۔ بالآخر یعقوب علیہ السلام شہر حران یا فدان[4] کو روبہ سفر ہوئے۔ دو منزل کی ایک کرتے شہر حران میں پہنچے تو شہر کے نواح میں پانی پینے کی غرض سے ایک کنویں پر رکے۔ اس کنویں پر ایک خوبصورت دوشیزہ کو کھڑے دیکھا۔

Marfat.com

ادھر لڑکی نے جب ایک اجنبی کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو تھوڑی سی ہمت کر کے پوچھا کہ تو کون ہے اور کدھر کا ارادہ ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جھجکتے ہوئے جواب دیا کہ تم مجھے اور میرے اونٹ کو پانی پینے کی اجازت دے سکتی ہو۔

لڑکی نے کہا: ہاں ہاں کیوں نہیں۔

اس کے بعد آپؑ نے خود پانی پیا اور اونٹ کو بھی پلایا۔ پانی پینے کے بعد پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہوئے، مگر حیا کی وجہ سے زبان پر کوئی بات آ نہیں رہی تھی۔

اب کے لڑکی خاصی حیران ہو کر پوچھتی ہے کہ تم کون ہو اور کہاں جانا ہے۔

اس شہر کے سردار لابان میرے ماموں ہیں۔ مجھے اُن کے پاس جانا ہے اور میری ماں نے بتایا تھا کہ لابان کی دو بیٹیاں بھی ہیں۔

یہ سن کر لڑکی نے کہا تم ٹھیک جگہ پر پہنچے۔ میں لابان کی بیٹی ''راحیل'' ہوں۔ میری ایک بڑی بہن ''لیاہ'' بھی ہے۔ آؤ میں تمھیں تمھارے ماموں سے ملوائے دیتی ہوں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ماموں نے بڑا پرتپاک استقبال کیا۔ جب یعقوبؑ نے اپنی مصیبت بیان کی تو ماموں نے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''بیٹا یہاں تمھیں کوئی خطرہ نہیں۔ میری محترم بہن رفقہ کی آنکھوں کے نور بلا تکلف یہاں رہو۔ یہ گھر تمھارا اپنا ہے اور یہاں تم پوری طرح محفوظ و مامون ہو۔''

یاد رہے!! اسرائیلی روایات میں لڑکی سے پہلی ملاقات پر دیکھتے رہنے کو بڑا مبالغہ آمیز حد تک بیان کیا گیا۔ جبکہ قرآن اس معاملے میں بالکل خاموش ہے۔ اس بات کی وضاحت بے حد ضروری ہے کہ نبیؑ کی ذات نبوت سے پہلے بھی اتنی ہی معصوم ہوتی ہے۔ جتنی کہ نبوت کے بعد۔ یعقوب علیہ السلام چونکہ نبی تھے اور نبی کسی اجنبی خاتون کو نظرِ غیر سے نہیں دیکھ سکتا۔ کنویں پر لڑکی کی طرف دیکھنے کا مقصد پانی پینے کی اجازت مانگنا تھا۔ یعقوب علیہ السلام چونکہ پیکرِ شرم و حیا تھے، اس لئے حیا مانع ہوئی۔ جب زبان نے کچھ یارانہ کیا اور جب لڑکی نے خود بولنے میں پہل کر دی تو آپ نے بھی جھجکتے ہوئے جواب دے دیا۔

مختصر یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ''حران'' میں ماموں کے ہاں مقیم ہو گئے۔ ان کے ماموں نے عہد لیا کہ وہ دس سال تک ان کی بکریاں چرائیں تو اس مدت کو حق مہر قرار دے کر اپنی بڑی بیٹی لیاہ سے نکاح کر دوں گا، جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی والدہ کا میلان ''لابان''

Marfat.com

کی چھوٹی بیٹی راحیل کی طرف تھا۔

لیکن لابان نے کہا کہ یہ ہماری روایات کے خلاف ہے۔ہاں پہلے دس سال پورے کر کے لیاہ سے نکاح کرلو اور اگلے دس سال پھر بکریاں چرانے کا معاہدہ کرو تو راحیل بھی تمھارے نکاح میں دے دی جائے گی۔

چنانچہ آپؑ نے پہلی دس سالہ مدت پوری کرنے کے بعد لیاہ[5] اور اگلی دس سالہ مدت پوری کرنے کے بعد راحیل سے نکاح کرلیا۔ان کے علاوہ لیاہ کی کنیز زلفا اور راحیل کی کنیز بلہا بھی آپ کے نکاح میں آ گئیں۔ان چاروں بیویوں میں سے اولاد ہوئی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1- لیاہ سے راؤبین، شمعون، لاوی، یہودا، ویسا کر اور زبولون پیدا ہوئے۔

2- راحیل سے دولڑکے یوسف اور بنیامین پیدا ہوئے۔

3- بلہا سے دان اور نفتالی نے جنم لیا۔

4- زلفا سے جاؤ اور اشیر ملے۔

یعقوب علیہ السلام کے ہاں کل بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔ان کی اولاد بڑی پھلی پھولی۔بعض روایات میں مذکور ہے کہ آپ کی نسل میں سے ستر ہزار انبیاء اکرام پیدا ہوئے۔

یاد رہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ہی دوسرا نام اسرائیل ہے۔یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں اللہ کا بندہ۔قرآن کی سات سورتوں[6] کی گیارہ آیات میں آپ کا ذکر ملتا ہے۔

بہرحال! حضرت یعقوب علیہ السلام بیس سال حران میں گزارنے کے بعد اپنے دادا حضرت ابراہیم کے دارالہجرت فلسطین میں آ کر آباد ہوئے اور باقی زندگی وہیں گزاری۔

ادھر ان کے بڑے بھائی عسو گھر سے ناراض ہوکر اپنے تایا حضرت اسماعیل کے پاس شہر مکہ میں چلے گئے۔ان کی لڑکی سے شادی کر کے کسی قریبی شہر میں آباد ہو گئے۔عیسو تاریخ میں ''ادوم'' کے نام سے معروف ہوئے۔

ہمارا اصل موضوع تو سرد جنگ کا سفارتی محاذ ہے۔چونکہ مشرکین نے یہ سوال کیا تھا کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد مصر کیسے جا آباد ہوئی۔یوسف علیہ السلام کون تھے۔اس لئے یہ معمولی سا تعارف ضروری تھا۔تفصیلات سے پھر بھی گریز کیا ہے۔آیئے سوال کے دوسرے حصے کی طرف چلتے ہیں یعنی یوسف علیہ السلام کون تھے اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد مصر میں کیسے آباد ہوئی۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

یوسف علیہ السلام کون تھے اور مصر کیسے پہنچے؟

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بارہ اولادیں تھیں جو چار بیویوں کے بطن سے پیدا ہوئیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بڑی بیوی لیاہ اور چھوٹی بیوی راحیل دونوں سگی بہنیں تھیں۔ بلہا اور زلفا دونوں ان کی کنیزیں تھیں جو راحیل اور لیاہ کے نکاح کے بعد حضرت یعقوب کی زوجیت میں آئیں۔ بڑی بیوی لیاہ کے بطن سے چھ اور باقی تینوں کے بطن سے دو دو بیٹے پیدا ہوئے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام راحیل کے بطن سے پیدا ہوئے۔ جس وقت آپؑ اس دنیا میں تشریف لائے، ان دنوں حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے ماموں لابان کے پاس حاران میں تھے۔ یاد رہے اسی کو شہر فدان یا آرام بھی کہا جاتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کی پیدائش کے چند سال بعد آپ کے والد محترم ہجرت کر کے ارضِ کنعان (موجودہ فلسطین) کے شہر جدون میں منتقل ہو گئے۔ یہاں پہنچنے کے چند سال بعد راحیل کے بطن سے یوسفؑ کے چھوٹے بھائی (بنیامین) بن یامین پیدا ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے بعد آپ کی والدہ راحیل کا انتقال ہو گیا۔

آپؑ کا حسب نسب نبی ابن نبی ابن نبی یعنی یوسف علیہ السلام ولد یعقوب علیہ السلام ولد اسحاق علیہ السلام ولد ابراہیم علیہ السلام ہے۔

بہر حال والدہ کی وفات کے بعد آپ سے والد کی محبت دو چند ہو گئی۔ وہ خصوصی شفقت کرنے لگے۔ پل بھر کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ اسی وجہ سے سوتیلے بھائی یوسف علیہ السلام سے حسد کرنے لگے۔ باپ کی یوسف علیہ السلام پر خصوصی نوازشیں انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ ہر وقت اسی حسد میں کڑھتے اور دانت پیستے رہتے تھے اور باپ کی نظروں سے گرانے کے لئے طرح طرح کی سازشیں سوچتے رہتے تھے۔

جب یوسف علیہ السلام بارہویں سن میں ٹہل رہے تھے تو رات کو ایک عجیب وغریب خواب دیکھتے ہیں یہیں سے ان کے مصائب ومشکلات کا ایک دور شروع ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

آپؑ نے والد محترم سے خواب عرض کیا کہ ابا جان میں نے رات کو خواب میں گیارہ ستاروں اور شمس وقمر کو اس حالت میں دیکھا کہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

والد محترم خواب سن کر گم سم سے ہو گئے۔ سوچ کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گئے۔ انتہائی غور وفکر کے بعد کہنے لگے: ''بیٹا یہ خواب کسی اور سے بیان نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خواب سن کر تیرے بھائی تیری جان کے دشمن ہو جائیں یا کوئی شیطانی چال چل جائیں۔ ہاں بیٹا یہ خواب سچ ثابت ہوگا۔ تیرا رب تجھے بہت نوازے گا اور میری اولاد پر اپنی نعمتیں تمام کر دے گا۔ جس طرح میرے باپ اسحاق علیہ السلام اور میرے دادا ابراہیم علیہ السلام پر نعمتیں تمام کی تھیں۔

اسے محض اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ جس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے گوشۂ جگر یوسفؑ کو ان کے خواب کی تعبیر بتا رہے تھے۔ اس وقت یوسفؑ کی خالہ اور سوتیلی ماں لیاہ کسی اوٹ سے یہ ساری باتیں سن رہی تھیں۔

یہ خواب ہضم کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ اس لئے سنتے ہی بیتاب ہو گئیں اور فوراً جا کر اپنے بیٹوں کو یوسفؑ کے خواب اور اس کی تعبیر کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

یہ واقعہ جلتی پر تیل ڈالنے والی بات تھی۔ وہ تو پہلے ہی یوسفؑ سے باپ کے والہانہ پیار پر کڑھتے رہتے تھے۔ اب تو کریلے نیم پر چڑھ گئے۔ اس واقعہ نے انھیں آپے سے باہر کر دیا۔ ان کے دلوں میں حسد و بغض نے پورا پورا گھر کر لیا۔ وہ سوچنے لگے کہ یوسفؑ نے ان کا باپ ان سے چھین لیا ہے۔ کیوں نہ اس کا قصہ تمام کر دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

پہلے پہل تو یوسفؑ کے قتل کی منصوبہ بندی ہوئی جسے ان کے بڑے بھائی یہودا نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ قتل کرنا خدا کے ہاں بہت بڑا جرم ہے اور اس جرم کی کڑی سزا مقرر ہے۔ پھر یہودا نے ہی مشورہ دیا کہ کہیں دور افتادہ علاقے میں لے جا کر یوسف کو کسی اندھے کنویں میں پھینک دیا جائے۔ جہاں سے کوئی نہ کوئی قافلہ انھیں نکال کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اس طرح ہم قتل جیسے جرم سے بھی بچ جائیں گے اور یوسف بھی باپ کی نظروں سے دور ہو جائے گا۔ اس عقلمندانہ رائے سے سب نے اتفاق کیا اور اگلے دن اپنے والد کے پاس جا کر عرض کرنے لگے:

''ابا جان! لگتا ہے آپؑ یوسفؑ کے متعلق ہم پر اعتبار نہیں کرتے۔ ہم نے جب بھی اسے گھمانے پھرانے یا سیر سپاٹے کے لئے اپنے ساتھ جانے کی کوشش کی آپؑ نے انکار کر دیا۔ پتا نہیں آپؑ کیوں ڈرتے ہیں، حالانکہ وہ ہمارا لاڈلا اور ہم اس کے دل و جان سے خیر خواہ ہیں۔ ہم اس کا دکھ اپنا دکھ اور اس کی خوشی اپنی خوشی سمجھتے ہیں۔

یعقوب علیہ السلام نے جواب دیا: "میرے بچو! تم نے یہ کیسے تصور کرلیا کہ مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں۔

اس پر یہودا بولا: "اگر یہ بات نہیں تو اسے ہمارے ساتھ صحرا کی سیر کے لئے بھیج دیں۔ وہ وہاں کھیلے کودے گا۔ ہمارے ساتھ بکریاں چرائے گا۔ یوں ہمارے درمیان جو سوتیلے پن کی تھوڑی بہت اجنبیت ہے، وہ ختم ہوجائے گی۔

دوسرا بھائی جو پاس ہی کھڑا تھا بولا: ابا جان ہم یقین دلاتے ہیں کہ یوسفؑ کی حفاظت و نگرانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔"

(((اللہ اکبر)))

دراصل حضرت یعقوب علیہ السلام نے کل رات یہ خواب دیکھا تھا کہ یوسفؑ ایک ٹیلے کی چوٹی پر اکیلے کھڑے ہیں اور ان پر دس بھیڑیے چاروں طرف سے حملہ آور ہیں۔ ان دس میں سے نو بھیڑیے چیر پھاڑنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو دسواں یوسفؑ کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر اسی دوران زمین پھٹ جاتی ہے اور یوسفؑ اس میں غائب ہوجاتے ہیں اور تین یوم بعد نمودار ہوتے ہیں۔

یعقوب علیہ السلام اسی خواب میں کھو جاتے ہیں۔ انھیں بیٹوں کی موجودگی کا احساس تک نہیں رہتا۔ کافی دیر بعد ایک بیٹا یوں گویا ہوتا ہے۔ ابا جان کدھر کھو گئے ہیں۔ آپؑ ہماری باتوں کا جواب تو دیں۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ ہم سے بدگمان ہیں جو ہماری بات سے اتفاق نہیں کررہے۔

یعقوب علیہ السلام خواب کے خیالوں سے نکل آتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ نہیں بیٹا مجھے بدگمانی نہیں بس ایک وہم سا لگتا ہے کہ تمھاری غفلت یا لاپروائی کی وجہ سے کہیں کوئی بھیڑیا یوسف کو نہ اٹھالے اور اگر ایسے ہوا تو میں کیسے زندہ رہوں گا۔

باپ کے یہ الفاظ سن کر سب یک زبان ہوکر کہنے لگے: "ابا حضور کیا آپ کو ہماری مضبوطی، بہادری اور طاقت پر شک ہے؟ کیا ہم جیسے بہادروں کی موجودگی میں ایسا ممکن ہے؟ کیا ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑیئے ایسی جرأت کرسکتے ہیں۔ اگر آپؑ یہ سمجھتے ہیں تو پھر ہم سے زیادہ بزدل اور بے غیرت کون ہوسکتا ہے۔"

جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی خواہش کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ رہا تو انھوں نے یوسفؑ کو پیار دلاسہ دے کر اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرلیا۔ پھر ایک دن یوسفؑ نے خود اپنے باپ سے

گزارش کی کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ جنگل کی سیر کو جانا چاہتے ہیں۔ غالباً یہ ان کی پہلی خواہش تھی جسے باپ ٹھکرا نہ سکا۔ سو بھائیوں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی۔

اس طرح یوسفؑ کے سوتیلے بھائی اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جنگل میں پہنچ کر بکریاں چرنے چگنے کے لئے چھوڑ دی گئیں۔ آج میدان بالکل ان کے ہاتھ میں تھا اور قسمت بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ سوتیلے بھائیوں میں سے ایک نے یوسفؑ کے پھول جیسے رخسار پر پورے زور سے طمانچہ رسید کیا۔ معصوم لڑھکنیاں لیتا ہوا مدد کے لئے دوسرے کے قدم میں جا گرا تو اس نے بھی مکوں اور گھونسوں کی بارش کر دی حتیٰ کہ وہ جس بھائی کے دامن میں پناہ گزین ہونے کی کوشش کرتا، وہی مارتے مارتے بے حال کر دیتا۔

الغرض اسے جب کہیں سے امان نہ ملی تو روتے روتے اور آہ وزاری کرتے ہوئے فریاد کناں ہوا۔ اے میرے محترم بھائیو! تم تو مجھے جنگل کی سیر کے لئے لائے ہو۔ انواع واقسام کے جنگلی میوے اور پھل کھلانے کے لئے لائے ہو۔ پھلوں کے بدلے مکے اور جوتے کھلا رہے ہو۔ آخر میری غلطی کیا ہے؟ مجھ سے کون سی اتنی بڑی خطا سرزد ہو گئی ہے؟ بھائیو! میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟ میں نے کون سا پہاڑ ڈھا دیا ہے جو مجھے مارنے پر تلے ہوئے ہو۔ یہ نوعمر اُن سے رو رو کر فریاد کرتا رہا۔ اس پر کسی کو ترس نہ آیا۔

ان میں سے ایک نے کہا "تم جانتے ہو کہ تمھیں کیوں مارا جا رہا ہے۔"

یوسفؑ نے عرض کیا: "بھائی جان! میں یہی تو پوچھ رہا ہوں آخر میرا قصور کیا ہے۔"

دوسرا بولا: جاننا چاہتے ہو تو سنو! یہ تمھارا خواب اور تمھارے باپ کی طرف سے بتائی جانے والی تعبیر ہے۔

آپؑ نے روتے ہوئے عرض کیا: "بھائیو!! اگر مجھے ایسا خواب نظر آیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

اس بات پر انھوں نے دوبارہ مارنا شروع کر دیا۔ مار کھاتے کھاتے جب وہ گر پڑا تو اسے گھسیٹتے ہوئے بڑے بھائی یہودا کے پاس لے گئے۔ یوسفؑ نے زاروقطار روتے ہوئے یہودا سے رحم کی اپیل کی۔ اسے تھوڑا سا ترس آ گیا۔ اس نوجوان نے ابھی تک خاموشی سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ اپنے بھائیوں سے کہنے لگا کہ "تم نے گھر سے نکلتے ہوئے عہد کیا تھا کہ اسے قتل نہیں کرو گے، لہٰذا اپنے وعدے پر قائم رہو اور اسے قتل کرنے سے باز آ جاؤ۔"

یہ الفاظ سن کر سب شش وپنج میں پڑ گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ کافی دیر سوچنے کے بعد ان

Marfat.com

میں سے ایک نے کہا تو ٹھیک ہے اب اس طرح کرتے ہیں کہ اسے رسّی سے باندھ کر کنویں میں پھینک دیتے ہیں۔ سب نے اس سے اتفاق کیا۔

پھر جب یوسفؑ کی قمیض اتارنے لگے تو اس نے گریہ زاری کرتے ہوئے عرض کیا:

''بھائیو خدا کے لئے مجھے بے پردہ نہ کرو۔ میری قمیض میرے جسم پر رہنے دو۔''

اس پر ایک بھائی بولا۔ بس بس اب تم خواب والے گیارہ ستاروں اور سورج چاند سے التجا کرو۔ وہ تمہیں سجدہ کر سکتے ہیں تو قمیض نہیں دے سکتے۔ اس طرح یوسف علیہ السلام التجائیں کرتے رہے، مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ بالآخر تھک ہار کر انھوں نے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ کوئی ہے کوئی ہے جو میرے بوڑھے باپ کو بتا سکے کہ ظالموں نے اس کے بیٹے کو کس بے دردی سے مارا پیٹا اور اب کنویں میں پھینک رہے ہیں، مگر یہ آواز صدا بہ صحرا بن گئی۔ کسی نے مدد کو نہ آنا تھا نہ کوئی آیا۔

آخر اسی میں جکڑ کر کنویں میں پھینکا جانے لگا۔ رسی سب سے بڑے بھائی یہوُدا کے ہاتھ میں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کنویں میں اتار رہا تھا تا کہ یکدم گرنے سے مر نہ جائے، مگر قریب کھڑے شمعون نے خنجر سے رسی کاٹ دی۔

مگر تدبیر خداوندی دیکھئے کہ عین اس وقت جب رسی کاٹ دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ جبرائیل کو حکم دیتے ہیں: ''یوسفؑ کو بچالو۔'' جبرائیلؑ یوسفؑ کو پکڑ کر پانی سے اوپر ایک پتھر پر بٹھا دیتے ہیں۔

قارئین!! خدا جو کرنا چاہتا ہے، اسے ساری دنیا مل کر بھی نہیں روک سکتی اور خدا جو نہیں کرنا چاہتا، اسے اگر ساری دنیا کرنے پر لگ جائے تو نہیں کر سکتی۔ یہی دیکھئے کہ یوسفؑ کے بھائی اپنی نظر میں یوسفؑ کو منظر عام سے ہٹا چکے ہیں جبکہ قدرت خداوندی دیکھیے کہ یہیں سے ایک نیا کھیل شروع کر رہی ہے۔

بہر حال!!! اسی کنویں میں یوسفؑ پر وحی نازل ہوئی جس میں بھائیوں کی ستم رسانی اور ان کی آئندہ زندگی کے لئے عزت وشرف کی نوید تھی۔ بعض روایتوں کے مطابق جبرائیل جنت میں سے ایک قمیص لائے جو یوسف علیہ السلام نے پہنی۔ اس وحی کی قسم کے بارے بعض مفسرین میں اختلاف ہے۔ چونکہ میرے موضوع اختلافی مسلک نہیں فضائلی مسلک ہے اس لئے ہم اس بحث میں الجھے بغیر حسب موضوع چلتے ہیں۔

———(((اللہ اکبر)))———

Marfat.com

گناہ آخر گناہ ہے۔ یہ اعصاب پر سواری کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ برادران یوسف ہنسی خوشی، اچھلتے کودتے گھر کی طرف رواں دواں تھے کہ احساس جرم نے خوشی کے رنگوں کو بے رنگ کرنا شروع کر دیا۔

ان میں سے ایک کہنے لگا: بھائیو ہم نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ ہمیں ندامت اور شرمندگی کے ساتھ خدا سے اپنے جرم کی معافی مانگنی چاہیے اور عہد کرنا چاہیے کہ بوڑھے باپ کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ ان کی خوشی اپنی خوشی اور ان کا دکھ اپنا دکھ سمجھیں گے۔ باقی تمام نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اس دوران میں احساس جرم نے کسی اور کے دماغ میں انگڑائی لے کر احساس دلایا تو وہ بولا: ''بھائیو! کیا تمھیں معلوم ہے؟ یوسف علیہ السلام کو نہ پا کر تمھارے باپ پر کیا گزرے گی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تم اپنے باپ کو کیا جواب دو گے۔ اسے یوسف علیہ السلام کے نہ آنے کی کیا وجہ بتاؤ گے۔''

واقعی! ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ اب انھیں احساسِ ندامت نے دبا لیا تھا۔ انھیں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ باپ کو کیا جواب دیں گے۔ ان کے دل کی کیسے تشفی کریں گے۔ کافی سوچ فکر کے بعد ایک بولا: ''کیا تمھیں معلوم ہے کہ ابا جان نے چلنے سے پہلے کہا تھا، مجھے ڈر ہے یوسف علیہ السلام کو کوئی بھیڑیا نہ کھا جائے، لہٰذا اب یہی بہتر ہے کہ ابا جان کو بتایا جائے کہ ہمارے بھائی کو بھیڑیا کھا گیا۔ اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور پھر اپنے سفید جھوٹ کو سچ دکھانے کے لئے انھوں نے ایک بکری ذبح کی۔ اس کے خون کے چھینٹے یوسف علیہ السلام کے کرتے پر لگا دیئے تاکہ ان کا ڈرامہ ہٹ ہو جائے۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئے۔ آسمان پر شفق کی سنہری کرنیں پھیلی ہوئی تھیں۔

انھوں نے باپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے چہروں پر مگرمچھ کے آنسو سجائے، رونی صورتیں بنائیں۔ ادھر یعقوب علیہ السلام بڑی شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ اب یوسف کو ان کے درمیان نہ پایا تو غیر ارادی طور پر سینے میں زبردست چوٹ لگی۔ ایک ہوک سی اٹھی۔ جھٹ سے پوچھا: ''کدھر ہے میرا یوسف۔''

برادران یوسف نظریں جھکائے رونی سی صورتیں بنائے، مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے بولے: ''ابا حضور! ہم جنگل میں دوڑنے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ہم دوڑتے دوڑتے کافی دور نکل گئے اور ہمارے پیارے بھائی یوسف کافی پیچھے رہ گئے۔ کھیل میں مگن ہونے کی وجہ سے ہمیں اس کا

Marfat.com

کوئی خیال نہ رہا۔ بدقسمتی سے اسے ایک بھیڑیا اٹھا کر کھا گیا۔"

ابا جان ہمیں معلوم ہے کہ آپ ہماری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ لیکن اپنی اس بات کا ثبوت ہمارے پاس یوسف کے کرتے کی شکل میں موجود ہے۔

یہ ساری رام کہانی سنانے کے بعد انھوں نے یوسف علیہ السلام کی خون آلودہ قمیض پیش کر دی۔ اس خبر نے یعقوبؑ پر سکتہ طاری کر دیا۔ ان کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ کافی دیر وہ آس پاس سے بے خبر اسی حالت میں رہے۔ جب ہوش آیا تو یوسف کا کرتا پکڑا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ انھیں کرتا دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کرتا خون آلود ضرور ہے، مگر کہیں سے پھٹا ہوا نہیں۔ ذہن میں شک کا جالی بننے لگتا ہے کہ یہ کیسا فنکار قسم کا بھیڑیا ہے جس نے یوسف کو بڑی صفائی سے کرتا پھاڑے بغیر کھالیا ہے۔ چنانچہ جلد ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

مگر نبیؑ کے صبر و فراست کا اندازہ لگایئے کہ اس وقت انتہائی عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ بیٹوں کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا۔ آپؑ نے صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا:

"عزیز بیٹو! تم جتنے مرضی بہانے بنالو، تمھارا جھوٹ چھپ نہیں سکتا۔ بقول تمھارے اگر واقعی یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے نے کھایا ہے تو خدا کی قسم اس بھیڑیے سے زیادہ رحم دل اس دنیا میں کوئی موجود نہیں جس نے قمیض چیرے پھاڑے بغیر بڑی صفائی سے میرے یوسف کو کھالیا۔"

بات تو واقعی پانی پانی کر دینے والی تھی۔ ان کا جھوٹ پکڑا جا چکا تھا۔ زمین انھیں چھپنے کو جگہ نہیں دے رہی تھی۔ بس سر جھکائے نظریں پاؤں میں گاڑھے کھڑے تھے۔ صاحبانِ تفاسیر کے مطابق انھیں اس شرمندگی کی حالت میں دیکھ کر اللہ کے نبی نے حکم دیا:

"جاؤ اس بھیڑیے کو پکڑ لاؤ جس نے میرے یوسفؑ کو کھایا ہے میں اس سے تفصیلات معلوم کرلوں گا۔"

یہ ان کے لئے صفائی پیش کرنے کا ایک اور موقع تھا چنانچہ وہ جھٹ پٹ بھیڑیے کی تلاش کو نکل کھڑے ہوئے۔ تھوڑا دور جا کر مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔

ان میں سے ایک بولا: یہ کون سا مشکل کام ہے۔ جنگل میں چلتے ہیں۔ وہاں سے کوئی بھی بھیڑیا پکڑ کر اس کے منہ میں بکری کا خون لگا دیں گے اور اسے ابا جان کی سرکار میں پیش کر دیں گے۔ یہ مکارانہ تجویز سب کے دل کو لگی۔ یوں وہ جنگل کو نکل گئے۔

بھیڑیا پکڑنا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ طاقت اور بہادری ان کی خداداد صلاحتیں

تھیں۔ یہ تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ بہت معمولی کام تھا۔ چنانچہ معمولی تگ و دو کے بعد انھوں نے ایک کمزور سا بھیڑیا پکڑا اس کے منہ کو بکری کا خون لگا دیا اور یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اللہ کے نبیؑ نے بھیڑیے کے قریب جا کر پوچھا: ''اے ظالم بھیڑیے تجھے میرے معصوم، نرم و نازک اور پھول سے بیٹے کو کھاتے ہوئے ذرا بھی ترس نہیں آیا۔''

یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ درندہ بھی بول پڑے گا۔ ان کے الفاظ غم کی شدت اور بیٹے کی جدائی کے عکاس تھے۔ اس وقت ان کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب بھیڑیے نے پھرل پھرل بولنا شروع کر دیا۔ اتنی نازک صورتحال دیکھ کر سب نیویاں ڈال کر کھسک گئے۔

سبحان اللہ! خدا کی شان ملاحظہ فرمائیے بھیڑیا اللہ کے نبی سے کچھ یوں مخاطب ہوتا ہے:

''اے اللہ کے نبیؑ اور مجھے قسم ہے پیدا کرنے والے کی!! میں نے تمھارے یوسف علیہ السلام کو نہیں کھایا۔ نبیوں کا ماس ہم پر حرام ہے اور ہاں میں تو خود مدت سے تکلیف اور رنج میں مبتلا ہوں۔

یعقوب علیہ السلام نے پوچھا تجھے کیا تکلیف ہے۔ بیان کرو۔

بھیڑیا کہنے لگا: ''چند روز قبل سفر کے دوران میرا بھائی مجھ سے بچھڑ گیا۔ میں پچھلے تین روز سے بھوکا پیاسا اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ تمھارے بیٹوں نے مجھ کمزور کو پکڑ لیا اور میرے منہ پر بکری کا خون لگایا اور آپؑ کے حضور پیش کر دیا۔

یہ سن کر یعقوب علیہ السلام نے بھیڑیے کو کھانا کھلایا۔ اس کے بھائی کے ملنے کی دعا کی اور رخصت کر دیا۔ چند دن بعد اس بھیڑیے کو اس کا بھائی مل گیا۔

———(((اللہ اکبر)))———

اللہ کے نبیؑ بیٹے کی جدائی میں رو رہے تھے کہ بارگاہ ایزدی سے جبرائیلؑ حاضر ہوئے۔ یعقوب علیہ السلام نے بڑی بے تابی سے پوچھا: ''اے جبرائیلؑ ہمارا یوسف ہمیں کہاں ملے گا۔ کیا میں اسے کبھی ڈھونڈ سکوں گا۔ وہ مجھے کہاں سے ملے گا۔'' پھر اسی حالت میں انھوں نے ہاتھ اٹھا دیئے اور دعا کرنے لگے کہ اے خدائے بزرگ و برتر میرے یوسف کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔

جبرائیلؑ نے فرمایا اے یعقوب علیہ السلام تو نے جسے اپنا بیٹا سونپا ہے، وہی اس کی حفاظت فرما رہا ہے۔ بے شک اس سے معلوم کر لے۔

اس پر یعقوب علیہ السلام کو یاد آیا کہ رخصت کرتے وقت اس نے اللہ کے بجائے یوسف کو

بیٹوں کے سپرد کیا تھا۔ انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ یا اللہ میں خطاوار ہوں۔ میری خطاؤں سے درگزر فرما۔

پھر انھوں نے جبرائیل سے کہا کہ ملک الموت سے پوچھو، کیا اس نے یوسف کی جان قبض تو نہیں کی۔ حضرت جبرائیلؑ نے چند لمحوں بعد واپس آ کر بتایا کہ تمھارا بیٹا بقیدِ حیات ہے اور ابھی تک اس کی روح قبض کرنے کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ یہ خبر سنا کر جبرائیل واپس چلے گئے۔ حضرت یعقوبؑ کے دل کو تھوڑی سی تسلی ہوئی، مگر وہ بیٹے کی جدائی میں مسلسل گریہ زاری کرتے رہے۔ بعض روایات میں درج ہے کہ روتے روتے ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔

یہاں مفسرین ایک اور روایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک دن یعقوب علیہ السلام نے کسی رشتہ دار کی دعوت کی۔ اسی دَوران میں خدا کا ایک نیک بندہ کھانے کا سوال لے کر حاضر ہوا۔ یعقوب علیہ السلام نے کہا تم یہیں ٹھہرو، میں کھانا لے کر آتا ہوں۔ مہمانوں کے پاس جا کر وہ اس فقیر کو کھانا کھلانا بھول گئے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ وہ فقیر انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو بددعا دے کر چلا گیا۔ اس کے یہ الفاظ تھے۔ ''اے خدا تو اس سے اس کی خوشیاں چھین لے۔'' اس کی یہ دعا قبول ہوئی جو اللہ تعالیٰ نے یہ پریشانی نازل کی۔ اسی لئے بذریعہ الہام یعقوب علیہ السلام کو بتایا گیا کہ اب تو چالیس سال تک اسی پریشانی میں مبتلا رہے گا۔

یہ علم ہونے کے بعد یعقوب علیہ السلام نے دعا کی کہ اے باری تعالیٰ مجھ سے یہ خطا ارادتاً نہیں ہوئی۔

اس پر ایک بار پھر جبرائیلؑ نازل ہوئے اور فرمایا کہ بندوں پر جو غم اور دکھ آتا ہے انھیں سمجھنا چاہئے کہ خدا جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ اس کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں۔ جبرائیلؑ ان الفاظ کے بعد واپس چلے گئے اور یعقوب علیہ السلام رو رو کر بیٹے کے لئے دعائیں مانگتے رہے۔

مفسرین کے مطابق برادران یوسف کنویں کی مسلسل نگرانی کر رہے تھے۔ دو دن اسی حالت میں گزر گئے۔ تیسرے دن ایک قافلہ ادھر آ نکلا یہ اسماعیلیوں کا قافلہ تھا جو شرقِ اردن یا حجاز مقدس سے مصر جا رہا تھا۔ یہ خالصتاً تجارتی قافلہ تھا جس کے پاس مصالحہ جات، کھالیں، بخورات اور بلسان تھے۔

یاد رہے یوسفؑ کے دادا حضرت اسحاق علیہ السلام تھے۔ اسحاق علیہ السلام کے بڑے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حکم سے مکہ مکرمہ میں آباد ہوئے تھے۔ یہ قافلہ انھیں کی نسل میں سے تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوسف علیہ السلام کو کنویں میں

Marfat.com

سے نکالنے والے کوئی پرائے نہیں، ان کے اپنے ہی تھے۔ مورخین کے مطابق یہ پہلا قافلہ تھا جس نے حجاز سے مصر کا تجارتی سفر کیا۔

قافلے والوں نے کنواں دیکھا تو وہاں رک گئے اور اونٹوں کو چرنے چگنے کے لئے چھوڑ دیا۔ قافلہ سالار نے بشریٰ نام کے ایک شخص کو پانی نکالنے کے لئے کہا۔ اور جب انھوں نے پانی نکالنے کے لئے کنویں میں ڈول ڈالا تو اس وقت جبرائیلؑ اللہ کا حکم لے کر آئے اور کہا: ''اے یوسفؑ اس ڈول میں بیٹھ جاؤ۔''

یوسفؑ یہ خیال کر رہے تھے کہ شاید ان کے بھائیوں کو ترس آ گیا اور وہ نکالنے کے لئے چلے آئے۔ کنویں سے نکل کر دیکھا تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ ادھر پانی نکالنے والے کے سامنے بھی ایک نئی صورت حال تھی۔ ایک حسین و جمیل اور انتہائی خوبصورت لڑکا اس کے سامنے تھا۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ حسن یوسفؑ کا ثانی کوئی شخص اللہ نے پیدا ہی نہیں کیا۔ آگے چل کر مصر میں یوسف کو دیکھ کر عورتوں کے ہاتھ کاٹ لینے کا واقعہ مفسرین کے اس قول کی تصدیق کرتا ہے۔

وہ اسماعیلی جس نے ڈول باہر نکالا تھا۔ دیکھتے ہی پکار اٹھا ''ھذا غلام ھذا غلام'' اے قافلہ والو دیکھو کتنا حسین و جمیل غلام ہاتھ آ گیا ہے۔

قافلہ سالار نے دیکھتے ہی کہا: ''اوہ یارو! یہ تو کنویں میں سے چاند نکل آیا ہے۔'' حسن یوسفؑ کے سامنے ان کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ جبھی تو انھوں نے پوچھا تھا اے نوجوان سچ سچ بتاؤ تم فرشتے ہو یا واقعی بنی آدم میں سے ہو۔

آپؑ نے بتایا کہ میں بھی تمھاری طرح کا انسان ہی ہوں۔ میرا تعلق بھی نسلِ آدم ہی سے ہے۔ اسی دوران میں برادران یوسفؑ جو کنویں کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہاں پہنچ گئے۔

سب سے بڑا بھائی یہودا کہنے لگا: ''اے قافلے والو یہ ہمارا غلام ہے۔ کسی غلطی پر ہم نے تھوڑا سا جھاڑا جھڑکا تو یہ اس کنویں میں آ چھپا، لہٰذا تم اسے ہمارے حوالے کر دو۔ کیونکہ ہمارے غلام پر ہمارا ہی حق فائق ہے۔''

یہ سفید جھوٹ سن کر یوسف علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کہ وہ اہلِ قافلہ کو اصل حقائق سے آگاہ کر دے۔ ارادہ بھانپتے ہوئے پاس ہی کھڑے شمعون نے کان میں مار دینے کی دھمکی دے کر بولنے سے روک دیا۔ یوں اہلِ قافلہ خاموشی دیکھ کر سمجھ گئے کہ یوسفؑ جھوٹے ہیں اور دوسرے نوجوان سچے ہیں۔

قافلہ سالار کا نام مالک بن زعر تھا۔ اس نے برادران یوسف سے کہا کہ اگر واقعی یہ تمھارا

غلام ہے اور تمھارے ڈر کی وجہ سے اس کنویں میں آ چھپا ہے تو تم اس طرح کرو! اسے ہمارے ہاتھ فروخت کر دو۔

بھائیوں کو یہ بات بہت پسند آئی۔ کہنے لگے: "لاؤ کیا دیتے ہو۔"

مالک ابن زعر نے کہا: میرے پاس صرف اٹھارہ درہم ہیں جن سے بازار میں خرید و فروخت نہیں ہوسکتی۔ تم اگر چاہو تو ان کے عوض اپنا غلام میرے حوالے کر دو۔"

دراصل یہ اٹھارہ درہم کنعانی نہیں تھے اور کنعان میں رائج بھی نہیں تھے۔ یہ کنعان اور حجاز کی نئی اور پرانی کرنسی کا فرق تھا جسے بعض مورخوں نے کھوٹے سکے لکھا ہے۔ حقیقت میں وہ کھوٹے درہم نہیں تھے، بس ان کا کنعان میں چلنا مشکل تھا۔

بہرحال برادرانِ یوسف کی خواہش کوئی مال بنانا تو تھا نہیں وہ تو بس اسے اپنے باپ سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ان متروکہ درہموں پر راضی ہو گئے۔

———(((اللہ اکبر)))———

بچپن کا واقعہ ہے کہ ایک دن یوسفؑ نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ لاشعوری طور پر ایک خود کلامی زبان سے پھسل گئی۔ اپنے آپ سے کہنے لگے: "یوسف اگر تو غلام ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی شخص تیرے دام نہ دے سکتا۔ سوچ کا یہ انداز خدا کو پسند نہ آیا جو اتنی تھوڑی قیمت اور کھوٹے سکوں کے عوض بکوا دیا۔ مفسرین کے بقول اس تھوڑے سے فخر کے عوض یہ پکڑ ہوئی جو صرف غیر مروج اٹھارہ درہم قیمت لگی۔

فارسی مقولہ ہے۔

مقربان رابیش بود حیرانی۔

بڑے لوگوں کی پریشانیاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔

قارئین یہ تدبیر فطرت ہے کہ دانے کو گل و گلزار ہونے سے پہلے زمین کے اندر گلنا سڑنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جتنا بڑا منصب قسمت میں لکھ دیتی ہے، اس منصب کے ساتھ اتنی بڑی سختیاں بھی لکھ دی جاتی ہیں۔ بڑے ظرف کے لئے بڑا کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔

میں تو صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ یوسفؑ کے اس حالیہ کھیل کے متعلق انھیں یہ تندی بادِ مخالف صرف اونچا اڑانے کے لئے چلائی گئی تھی۔ جس شاہانہ منصب کے لیے آپؑ کو چنا گیا تھا" اس کے لئے یہ سختیاں ضروری تھیں۔"

Marfat.com

مختصر یہ کہ مالک بن زعر نے اٹھارہ درہم میں مستقبل کے شہنشاہ مصر اور خدا کے برگزیدہ نبی کو غلام بنالیا۔ اس دور کے عام رواج کے مطابق یوسف کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں اور ایک موٹا پشمینہ اوڑھا کر اونٹ پر سوار کرلیا۔ امیرِ قافلہ کافی عقلمند آدمی تھا۔ زمانے کے سیاہ وسفید سے واقف تھا۔ اسے اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ مصر میں وہ اس غلام کے منہ مانگے دام وصول کرلے گا۔

قافلہ مصر کی جانب روبہ سفر تھا۔ فطرت کی بوقلمونی دیکھئے کہ اسی راستہ پر یوسفؑ کی والدہ دفن تھیں۔ جب قافلہ قبر کے قریب پہنچا تو آپؑ بے اختیار اونٹ سے اتر کر والدہ کی قبر سے چمٹ کر رونے لگے۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو اور منہ سے یہ الفاظ نکل نکل کر گرنے لگے:

"اے ماں دیکھ میرے سوتیلے بھائیوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ مجھے باپ کی خدمت سے محروم کر دیا۔ مجھے بے گھر اور بے وطن کر دیا۔ ماں اٹھ کے دیکھ تیرا بیٹا صرف چند درہم کے عوض بک گیا۔ ماں میں کہاں جاؤں، کدھر کا رخ کروں۔ اے ماں اٹھ کر دیکھ تو سہی، تیرا بیٹا غلامی کی بیڑیاں پہنے تیری قبر سے چمٹا پڑا ہے......"

آپؑ والدہ محترمہ کی قبر سے چمٹے آہ وزاری میں ایسے محو ہوئے کہ قافلے کا خیال ہی نہ رہا۔ ادھر تھوڑی دور جا کر کسی نے دیکھا کہ نئے غلام کا اونٹ خالی جا رہا ہے تو اس نے قافلے کو رکنے کا کہہ کر خود پیچھے کو دوڑ لگا دی۔ یوسفؑ کے سر پر کھڑا ہو کر بولا تیرے پہلے مالک ٹھیک ہی کہتے تھے۔ تو تو واقعی بھگوڑا ہے۔ یہ بولتے ہوئے اس بدبخت نے آپؑ کے منہ پر زور سے طمانچہ رسید کیا۔ ہائے! اس ہائے کے پیچھے کتنا کرب اور درد تھا۔ درد کی شدت سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اسی درد وکرب میں آپ اپنے خدا سے فریادی ہوئے:

"اے میرے خالق و مالک تو تو جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ یا اللہ مجھ میں شدائد و مصائب برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔ میرے مالک مجھے ان ظالموں کے ظلم سے محفوظ رکھ۔ میرے مولیٰ میری مدد فرما۔"

وہ آدمی گھسیٹ کر قافلے تک لے گیا اور اونٹ پر سوار کر دیا۔ یوں قافلہ دوبارہ عازم سفر ہوا، مگر اللہ کے نبیؑ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ بارگاہِ خداوندی میں قبولیت پا چکے تھے۔

ہوا یوں کہ پرسکون اور صاف و شفاف فضا اچانک سیاہ بادلوں میں گھر گئی۔ سیاہ گھنگھور گھٹائیں بجلی کی چمک کے ساتھ کڑکنے لگیں۔ آندھی سے زیادہ تیز یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں۔ پھر اچانک اتنی تند و تیز بارش ہونے لگی کہ ہر طرف ہاہاکار مچ گئی۔

Marfat.com

بیشتر قافلہ بکھر کر مر گیا اور جو بچے ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ سوچنے لگے پتا نہیں کون سا گناہ سرزد ہو گیا جو یہ عذاب نازل ہوا۔ وہ سیاہ بخت جس نے حضرت یوسفؑ کے نازک گالوں پر طمانچہ مارا تھا، ابھی تک زندہ تھا۔ چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ یہ ساری خطا میری ہے۔ میں نے ہی اس معصوم پر ظلم کیا جو یہ قیامت ٹوٹی۔

باقی تمام مسافروں نے رحم کی درخواست کی جس پر حضرت یوسفؑ نے خدا سے دعا کی تو عذاب ٹل گیا۔ موسم حسب معمول نکھر گیا۔ لوگوں نے آپؑ کا شکریہ ادا کیا اور قافلہ اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

(نوٹ: یہ تمام واقعات سورۂ یوسف کی مختلف تفسیروں سے ماخوذ ہیں)۔

(((الحمد للہ)))

Marfat.com

یوسف علیہ السلام کے وقت مصر

دوتن: وہ مقام جہاں بائبل کے مطابق برادران یوسفؑ نے حضرت یوسف کو کنویں میں پھینکا تھا۔

سکم: وہ جگہ جہاں حضرت یعقوبؑ کی آبائی جائیداد تھی اب اس کا نام نابلس ہے۔

حبرون: یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت یعقوبؑ رہتے تھے اس کو الخلیل بھی کہتے ہیں۔

ممفس: قدیم مصر کا دارالحکومت۔ اب اسے منف کہتے ہیں قاہرہ کے قریب اس کے کھنڈرات موجود ہیں۔

جشن: وہ علاقہ جہاں حضرت یوسفؑ نے بنی اسرائیل کو آباد کیا تھا۔

ایلہ: فلسطین کی پرانی بندرگاہ اب اسرائیل کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے، موجودہ نام ایلات ہے۔

Marfat.com

یوسفؑ بازارِ مصر سے تختِ مصر تک

''عین شمس'' آج بھی مصر کے دارالحکومت ''قاہرہ'' کے نزدیک واقع ہے۔ یہ ان دنوں مصر کا دارالحکومت تھا۔ ریان فرعونِ مصر اسی دارالحکومت میں تخت شاہی پر براجمان تھا۔

مصر میں داخل ہونے سے پہلے ہی یوسف علیہ السلام کا چرچا پورے ملک میں پھیل چکا تھا کہ مالک ابن زعر ایک غلام لا رہا ہے جس کا حسن و خوبصورتی میں کوئی ثانی نہیں۔ اس لئے جہاں جہاں سے قافلہ گزرتا، وہاں لوگ ہجوم کی شکل میں یوسف علیہ السلام کو دیکھنے کے لئے آ کھڑے ہوتے۔ مالک ابن زعر اعلان کرتا جا رہا تھا کہ وہ اس غلام کو مصر کے دارالحکومت ''عین شمس'' میں فروخت کرے گا۔ اس اعلان نے خواہ مخواہ لوگوں میں اشتیاق پیدا کر دیا کہ چلئے دیکھتے ہیں، اس بے مثل غلام کی کیا قیمت لگتی ہے۔

جب قافلہ اپنی منزل مقصود پر پہنچا تو لوگوں نے دیکھ لیا کہ انھوں نے یوسف علیہ السلام کو جیسے سنا تھا، اس سے بھی بڑھ کر پایا۔ امیر قافلہ یوں تو یوسف علیہ السلام کو غلام سمجھ کر لایا تھا، مگر دوران سفر انتہائی عقیدت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ جس گھر میں ٹھہرا، اسے خوب سجایا، اپنے غلام کے لئے گھر کے در و دیوار سجائے۔ مخملیں قسم کے قالین بچھائے۔ خوبصورت پردے لگائے۔ صرف گھر سجانے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ یوسف علیہ السلام کو انتہائی اعلیٰ قسم کا لباس اور سونے اور ہیروں سے مزین تاج پہنایا۔

اس کارروائی کے بعد اس نے مشتہر کیا کہ میرے پاس ایک خوبصورت، خوب سیرت، حیا دار، شرمیلا اور تابع فرمان غلام ہے۔ میں اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ خواہش مند حضرات فلاں دن فلاں جگہ فلاں وقت پر بولی کے لئے رابطہ کریں۔

یہ اعلان سنتے ہی پورا شہر تو کیا، پورا مصر امنڈا چلا آیا۔ یہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ گاہک کم اور حسن یوسفی کے تماشائی زیادہ تھے۔ جو چند ایک خریدار تھے۔ وہ اپنی کم مائیگی کے ڈر سے بولی لگانے سے شرم محسوس کر رہے تھے۔ اس وقت ایک بار پھر یوسفؑ پریشان ہوئے۔ سوچنے لگے کہ

Marfat.com

مالک ابن زعر نے مجھے میرے بھائیوں سے صرف اٹھارہ کھوٹے درہم کے عوض خرید لیا تھا،مگر آج کوئی اتنے بھی دینے کو تیار نہیں۔کیا میں اس قدر بے مقصد اور بے فائدہ چیز ہوں۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ اس وقت اللہ کی طرف سے بذریعہ الہام بتایا گیا کہ یوسفؑ یاد کرو اس وقت کو جب تم نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گھمنڈ کیا تھا۔اب تجھے یہ دن دیکھنا پڑے،مگر ابھی تو خدا کا فضل و کرم بھی دیکھ لے گا۔

مالک ابن زعر نے دیکھا کہ لوگ تو صرف دیکھنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔اس طرح تو کوئی بولی دینے کا نہیں۔اس نے خود پکے آڑھتیوں کی طرح کچھ یوں پہلی بولی کا اعلان شروع کیا۔ دیکھو بھائیو!!اس حسین و جمیل غلام کو دیکھو۔یہ اپنی مثال آپ ہے۔اس کی دنیا میں کوئی مثل نہیں۔ بے شک ساری دنیا میں تلاش کر کے دیکھ لو۔اس جیسا خوبصورت نہیں ملے گا۔ہاں تو ہے کوئی خریدار۔کوئی بولی لگائے گا۔کوئی نہیں تو چلو ٹھیک ہے میں خود ہی اس کی قیمت بتا دیتا ہوں۔لو سنو۔

اگر کوئی خریدنا چاہے تو میں اسے ایک ہزار بدرے[8] ساٹھ ہزار عقد مروارید،ایک ہزار جامہ اطلس،ایک ہزار گھوڑے،ایک ہزار رومی کنیزوں اور ایک ہزار تلواروں کے عوض بیچ سکتا ہوں۔ سبحان اللہ! کہاں اٹھارہ کھوٹے سکے اور کہاں اتنی حیران کن قیمت۔یہ سب حسن و کمال قدرت ہے۔یہ سن کر لوگ بس دیکھتے ہی رہ گئے۔خریداروں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔انھوں نے اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ لیا۔حسرتوں کو ہائے حسرت کی گتھی میں بند کر لیا۔بس سب کے دل کی دل میں ہی رہ گئیں۔

اور پھر عزیز مصر فوطیفار آگے بڑھا کہنے لگا۔اس حسین و جمیل غلام کی یہ کیا قیمت ہوئی۔میں اسے اس سے دوگنی قیمت پر خریدتا ہوں۔چنانچہ اس نے دوگنی قیمت پر خرید لیا اور یوسف علیہ السلام کو اپنے گھر جا کر اپنی بیوی راعیل کے حوالے کر کے کہنے لگا:

''دیکھو اس غلام کا خیال رکھنا۔ممکن ہے اس کی وجہ سے ہمیں کسی دن فوائد حاصل ہوں یا ہم اس کو لے پالک بیٹا بنا لیں۔''

یاد رہے کہ عزیز مصر کسی شخص کا نام نہیں،بلکہ یہ ایک عہدے کا نام تھا۔جیسے ہمارے ہاں وزیراعظم یا صدر شخص کے نام نہیں۔امام قرطبیؒ کے نزدیک عزیز مصر ''فوطیفار'' لاولد تھا۔ابن کثیر کے نزدیک عزیز مصر ان دنوں وزارت خزانہ کے منصب کا نام تھا اور ریان بن اسیدان دنوں فرعون مصر تھا جو قوم عمالقہ میں سے تھا۔

اور ہاں عزیز مصر کی بیوی کے نام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔قرآن[9] نے اس عورت کو امراۃ

Marfat.com

العزیز کا نام دیا ہے، لیکن مفسرین نے راعیل یا زلیخا نام لکھا ہے۔ دراصل لفظ زلیخا، زُلَخ یا یَزُلَخ یا زلخاً سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں پھسلنا یا دروازہ بند کرنا۔ چونکہ عزیز مصر کی بیوی عشق یوسفی میں پھسلی تھی۔ جو اس کا صفاتی نام زلیخا ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اصل نام میں بدلتا گیا۔ اسی لئے اکثر و بیشتر مورخین نے اس کا نام زلیخا ہی لکھا ہے۔

ان دنوں مصر کا زمانے میں طوطی بولتا تھا۔ مصری لوگ اپنے آپ کو مہذب ترین اور باقی قوموں کی محافظ تصور کرتے تھے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو انتہائی اعلیٰ وارفع سمجھتے تھے اور باقی اقوام وقبائل کو اجڈ اور بدوخیال کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے پچھلی چند صدیوں سے باقی اقوام سے میل ملاپ ختم کر لیا تھا اور کنعانی ان کے نزدیک انھیں اقوام ناخواندہ اور غیر مہذب میں شامل تھے۔ حالانکہ کنعانی خالصتاً ابراہیم علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔

شرف و بزرگی کے یہ معیار تو انسانوں کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ خدا کے نزدیک تو یہ چیزیں بے معنی ہیں۔ اس قدرت کاملہ کی نیرنگی دیکھئے کہ برادران یوسف علیہ السلام نے حسد اور بغض میں اپنے بھائی کو کنویں میں پھینک دیا۔ جب حجازی قافلہ نے انھیں کنویں سے نکال لیا تو بھائیوں نے اسے باپ سے دور کرنے کے لئے صرف اٹھارہ دینار کے عوض اسی قافلہ سالار کو بیچ دیا۔ اپنی نظر میں وہ یوسف علیہ السلام کی زندگی کا درخشندہ باب، یعنی وہ خواب بند کر چکے تھے، مگر قدرت کے ارادے میں کچھ اور ہی تھا۔

یوسف علیہ السلام کے لئے یہ غلامی دراصل شاہی کا پہلا زینہ ثابت ہوتی ہے۔ عزیزِ مصر کے گھر میں آپؑ کی پوشیدہ صلاحیتیں عقلمندی، امانت، دیانت اور پاک وشفاف شخصیت وغیرہ کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ عزیزِ مصر آپ علیہ السلام کا معترف ہوتا چلا جاتا ہے اور مہربانیاں اور بزرگانہ شفقتیں نچھاور کرنے لگتا ہے۔ اپنی بیوی زلیخا کو حکم دیتا ہے کہ اس بچے کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہ کرے، بلکہ اسے اپنا بیٹا سمجھ کر سلوک کرے۔

یہ خدا کی قدرت کاملہ کا ہی کمال تھا کہ یوسف علیہ السلام کو غلامی میں بھی آقائی کے مزے دے دیئے۔ فوطیفار کی بیوی بھی ایسی تھی کہ دل وجان نچھاور کر رہی تھی۔ اپنا گھر کیا ہوتا ہے شاید یوسف کو بھلا دے۔ اتنی محبت اور شفقت اس گھر سے مل رہی تھی۔

پھر اسی جگہ سے اسی گھر سے یوسف علیہ السلام کی زندگی کا تاریک دور شروع ہوتا ہے۔ ایک سیاہ باب رقم ہوتا ہے جو شاندار ماضی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ مشکلات کا نیا دور بھی اصل میں قطرے کے گوہر ہونے تک چلتا ہے۔

Marfat.com

یاد رہے یہ واقعہ سورہ یوسف کی شکل میں مشرکین مکہ کے جواب میں مشرکین مکہ کے سامنے قرآن کے حلاوت آگیں اثرات کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔ برادرانِ یوسفؑ کا سراپا عزیزانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و کردار کو یوسف علیہ السلام کے کردار سے رعایت دے کر بیان کیا جا رہا ہے کہ اے مشرکینِ مکہ! برادرانِ یوسف کے آئینے میں اپنا کردار دیکھ لو اور تدبیرِ خداوندی کا مقابلہ کرنے سے باز آ جاؤ۔

بہر کیف!! عزیزِ مصر کے گھر میں خوشیوں اور شفقتوں بھرے ماحول میں اچانک تغیر آتا ہے۔ یہ تغیر یوسف علیہ السلام کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے جاتا ہے۔

—(((اللہ اکبر)))—

وقت کا پہیہ چلتا رہا۔ عزیزِ مصر، فوطیفار کی بیوی کسی اور نہج پر چل نکلی۔ اس کا زاویہ نگاہ کچھ غیر ضروری خواہشات کی پیروی کر رہا تھا۔ یہ انداز تو کچھ مر مٹنے کی عکاسی کر رہا تھا۔ زلیخا اب باقاعدہ کسی منصوبہ بندی کے تحت حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف مائل تھی۔ ہر وقت یوسف علیہ السلام کو اپنی نظروں کے سامنے رکھتی۔ انواع واقسام کے کھانے کھلاتی، آرام و آسائش کا خاص خیال رکھتی۔ لباس فاخرہ پہنا کر سر پر مرصع قسم کا تاج پہنانا اور اعلیٰ قسم کی مسند پر بٹھانا اور پھر تصور جاناں کی کیفیت میں پہروں یوسف علیہ السلام کو دیکھتے رہنا اس کا معمول بن چکا تھا۔

گویا یوسف علیہ السلام کی دلجوئی اس کی زندگی کا مقصد اور خدمت اس کا معمول بن چکا تھا۔ یہ سب کچھ ایسے ہی نہیں تھا۔ یہ تو اک ہوک تھی جو اس کے دل سے نکل کر یوسف علیہ السلام کی خدمت پر مامور کر چکی تھی۔ اس ہوک کو زلیخا نے اپنے دل کے اندر بند کر لیا تھا، مگر یہ دل لگی، دلجوئی اور جذبے کسی پوشیدہ آواز کی بھرپور عکاسی کر رہے تھے۔ اگر واشگاف الفاظ میں بیان کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ زلیخا عشقِ یوسف علیہ السلام کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس آگ نے آہستہ آہستہ الاؤ کی شکل اختیار کر لی۔ اس الاؤ نے بالآخر ایک دن زلیخا کی روح کو جلا دیا۔ روح جل گئی تو وہ آگ شیطان بن کر باہر لپک پڑی۔

مجازی عشق میں اکثر یہی ہوتا ہے کہ عاشق عشق کی آگ میں جلتے جلتے صدق کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ عشق میں صدق کو چھوڑنے کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عشق پر جذباتیت نے غلبہ پا لیا اور عاشق شیطان یا نفس امارہ بالسوء کا غلام بن کر تحت الثریٰ کے پاتال میں جا گرا۔

بہر حال اس محترمہ نے یوسف علیہ السلام کو اشارے کنائے سے اپنی طرف مائل کرنے کی بھرپور کوشش کی، مگر مردِ آہن کی پاکبازی اور حیاداری کے سامنے ناکام رہی، وہ مصر کی خاتون اول

Marfat.com

نہ سہی خاتون دوم ضرور تھی۔اس ناکامی نے اس کے اندر کے شیطان کو وحشی بنادیا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام بھی جوانی کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ جوانی یوں تو بڑی بدمست ہوتی ہے۔اوپر سے زلیخا کی مصاحبت۔کون ہے جو اس رعنائی خیال سے اپنے آپ کو بچانے کی سوچے گا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام تو نبی ابن نبی ابن نبی ابن نبی تھے۔ حیا اور شرافت اس خاندان کی پگ تھا۔ پاکبازی اس خاندان کا بنیادی وصف تھا۔ امانت اور دیانت اس قبیلے کا طرۂ امتیاز تھا۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مصریوں اور کنعانیوں کی ہدایت کے لئے اس غلام کو چن رکھا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مصر کی خاتون دوئم کے اشارے کنائے پر مرمٹتا۔

زلیخا کو یقین ہو گیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ یہ بیل اس طرح تو منڈھے چڑھنے سے رہی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دل کے ارمان دل میں ہی رہ جائیں اور پنچھی ہاتھ سے نکل جائے۔ آخر اس نے اپنی سی کر گزرنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے کسی بہانے سے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے خاص خلوت خانہ میں بلا بھیجا۔وہ آ گئے تو یہ محترمہ آرام سے اٹھی اور خلوت گاہ کے تمام دروازے بند کر دیئے۔اس محترمہ کی مثبت حسیات سلب ہو چکی تھیں اور وہ منفی جذبات کے تلاطم میں ڈوبتی چلی گئی۔اب واضح انداز میں یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف مائل کرنے لگی۔حالات سازگار اور وقت مناسب تھا۔فوطیفار کے پرکھوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس کی بیوی کیا کرنے لگی ہے۔پھر عزیز مصر کی بیوی ہونے کے ناطے اسے کوئی ڈر یا خوف بھی نہ تھا۔ باالفاظ دیگر سارا مصر اس کا اپنا تھا۔اس غلام (نعوذ باللہ) کی کیا حیثیت تھی کہ محترمہ کے حکم سے سرتابی کرتا۔

چہرے پر توبہ شکن مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کو مخاطب کرتی ہے۔

پیارے یوسف علیہ السلام تیرے بال کتنے نرم و ملائم ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے نظریں زمین پر گاڑتے ہوئے جواب دیا۔ یہی بال سب سے پہلے میرے جسم سے پراگندہ ہوں گے۔

وہ دوبارہ حسن پرستی اور اپنی آنکھوں میں سما لینے کے انداز میں بولی!! یوسف علیہ السلام! کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمھاری آنکھیں کس قدر حسین اور خوبصورت ہیں۔ان آنکھوں میں تو پوری کائنات کا حسن سمٹ آیا ہے۔

آپؑ نے بدستور بغیر دیکھے جواب دیا۔اے میرے مالک فوطیفار کی زوجۂ محترمہ یہی خوبصورت اور حسین آنکھیں سب سے پہلے بہہ جائیں گی۔

Marfat.com

الغرض زلیخا نے اپنے شیشے میں اتارنے کے لئے ہر حسین داؤ چلایا۔

یقیناً حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ اس مرحلے کی سنگینی کا اندازہ آپؑ کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جب آپؑ نے خدا سے مدد اور پناہ مانگی: وہ الفاظ کچھ یوں ہیں۔

''میں خدا سے پناہ طلب کرتا ہوں بے شک تمھارا شوہر میرا آقا ہے، لیکن اللہ ظالموں اور خیانت کرنے والوں کو پناہ نہیں دیتا۔''

خاتونِ مصر کے ترکش کے تمام تیر بے نشانہ رہے تو وہ جذبات[10] کی وحشت میں یوسف علیہ السلام پر ٹوٹ پڑی۔ اس مرحلے پر اللہ کے نبی نے خدا کو یاد کیا تو خلوت گاہ کے تمام دروازے کھل گئے۔ وہ باہر کی طرف لپکے۔ زلیخا نے پکڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کشمکش میں آپؑ کی قمیض پیچھے سے پھٹ گئی۔

اسی حالت میں یوسف علیہ السلام اور زلیخا ایک ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے باہر نکلے تو سامنے عزیزِ مصر کو کھڑے پایا۔ فوطیفار اپنے ایک چچا زاد سے مصروفِ گفتگو تھا۔ اس نے بیوی اور غلام کو اس حالت میں دیکھا تو حیرانی و پشیمانی کے بھنور میں غوطے کھانے لگا۔ اس کی آنکھیں غصے سے شعلے برسانے لگیں۔

سچ ہے کہ عورت عورت ہی ہوتی ہے۔ خاوند کو غصے میں دیکھ کر زار و قطار رو رو کر کہنے لگی۔ اے میرے سرتاج تو ہی بتا۔ اس آدمی کی کیا سزا ہو سکتی ہے جو اپنے مالک کی غیر موجودگی میں اس کی عزت پر ڈاکا ڈالتا ہے۔

بیوی کے اس بیان نے اسے آگ بگولا کر دیا تھا۔ اس پر ایک رنگ آ اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فیصلہ صادر کرتا حضرت یوسف علیہ السلام بول پڑے۔ اے مالک آج تیری بیوی نے مجھے ورغلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس نے مجھے اپنی طرف بلانے کی تمام کوششیں کیں۔ آخر کار میں وہاں سے بھاگ نکلا، مگر اب آپ کو دیکھ کر اس نے مجھ پر الزام دھر دیا جو کہ سراسر جھوٹ ہے۔

فوطیفار آبدیدہ ہو کر مخاطب ہوا: ''یوسف علیہ السلام میں نے تمھیں غلاموں کی طرح نہیں، بلکہ بیٹوں کی طرح رکھا ہے۔ اس پدرانہ پن میں اپنے گھر کا سب کچھ تجھے بنا دیا تھا، مگر آج تو نے میری مہربانیوں کا یہ صلہ دیا۔''

عزیزِ مصر نے یہ الفاظ یوں تو بڑی روانی سے کہہ دیئے، لیکن اس کا دل ان لفظوں کی تردید کر

Marfat.com

رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ میرے گھر میں اس غلام کو رہتے ہوئے عرصہ گزر گیا۔ اس کو کبھی کسی نے جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ اتنی قبیح خیانت اور دروغ گوئی کیسے کر سکتا ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

عزیز مصر نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ اس بات نے یوسف علیہ السلام کو خاصہ پریشان کر دیا۔ وہ صحیح معنوں میں چکرا کر رہ گئے۔ سوچنے لگے کہ اپنی سچائی کے لئے گواہی کہاں سے لاؤں۔ یقیناً اس وقت زلیخا اور میرے سوا کوئی تیسرا کمرے میں موجود نہیں تھا۔ آپ علیہ السلام اسی فکر میں مگن تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی سچائی ثابت کر دی۔

قارئین یہاں روایت میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سچائی کی دلیل عزیز مصر کے چچازاد نے پیش کی اور بعض کا خیال ہے کہ سچائی کی دلیل وہاں پر موجود ایک شیر خوار بچے نے پیش کی۔ ہمارے نزدیک دوسری روایت زیادہ معتبر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ[11] اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق وہاں پر موجود ایک شیر خوار بچے کو قوت گویائی ملی۔ یہ بچہ اس گھر کے صحن میں گھوارے میں پڑا کھیل رہا تھا۔ وہ اللہ کے حکم سے بول اٹھا کہ اے عزیز مصر یوسف کا کرتا دیکھو۔ اگر وہ آگے سے پھٹا ہوا ہے تو یوسف جھوٹا ہے۔ اگر پیچھے سے پھٹا ہے تو یوسف سچا ہے۔" بات واقعی بڑی وزن دار تھی۔ یقیناً کرتا سامنے سے پھٹنے کا مطلب ہے کہ یوسف علیہ السلام نے زیادتی کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ زلیخا نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہاتھ چلائے۔ کرتا سامنے سے پھٹ گیا۔ کرتا پیچھے سے پھٹنے کا مطلب یہ تھا کہ یوسف اپنے آپ کو اس گناہ سے بچانے کے لئے بھاگ اٹھے۔ زلیخا نے پکڑنے کی کوشش کی تو کرتا ہاتھ میں آ گیا، مگر یوسف بھاگتے چلے گئے اس طرح کرتا پھٹ گیا۔

یہ واضح دلیل فوطیفار کے ذہن کو لگی۔ اس نے دیکھا کہ کرتا واقعی پیچھے سے پھٹا ہوا ہے۔ یوسف علیہ السلام کی سچائی سامنے آ گئی اور آگ بگولہ ہو کر زلیخا پر برس پڑا۔ اے خاتون تو جھوٹی ہے۔ تو نے ہی اس غلام کو ورغلانے کی کوشش کی۔

وہ جوشِ غضب میں اپنی بیوی کو مار ڈالنا چاہتا تھا، مگر وہ دوراندیش تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ سرگشتہ خمارِ رسوم و قیود تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے بیوی کو مار ڈالا تو بدنامی کا ٹھپا ماتھے پر چمٹ جائے گا۔ اس لئے اس نے ہوش و حواس سے کام لیتے ہوئے کہا۔ اے یوسف علیہ السلام جو کچھ ہو چکا، سو ہو چکا۔ اس بات کو بھلا دو۔ اس الزام سے درگزر کرو اور میری عزت کا خیال رکھتے ہوئے مجھے بدنامی سے بچانے کے لئے اس بات کو آئی گئی کر دو۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے

Marfat.com

خاموشی سے نظریں جھکا دیں جس کا مطلب تھا آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔

پھر فوطیفار زلیخا سے مخاطب ہوا۔ بلاشبہ یہ سب تیری چالاکی ہے۔ تم عورتوں کی چالاکیاں تو بہت بڑی ہوتی ہیں۔ تو تو اپنی سی کر گزری تھی۔ یہ تو صرف اس اعلیٰ ظرف ہے جس کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ اب تو اپنے کیے پر شرمندہ ہو اور استغفار کر۔ بے شک سراسر تو ہی قصوروار ہے۔

فوطیفار نے انتہائی عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس معاملے کو رفع دفع کر دیا۔

زلیخا یہ راز پوشیدہ نہ رکھ سکی۔ عورتوں کے معمول کے مطابق اس بی بی نے کسی راز دار کو نہ بتانے کی شرط پر سب کچھ بتا دیا۔ پھر خواص کی بیگمات میں یہ راز نہ بتانے کی شرط کا سلسلہ ایسے رواں ہوا کہ چند دنوں میں کوبکو پھیل گئی بات شناسائی کی۔

مصاحبین کی بیگمات جو زلیخا کی سہیلیاں تھیں، وہ بھی زلیخا کی طرح خوبصورت اور ریاستی عہدہ داروں کی بیویاں تھیں۔ رتبے میں زلیخا سے کم نہ تھیں۔ ناک چڑھا چڑھا کر کھسر پھسر کرنے لگیں۔ ایک کہتی اری! دیکھا اپنے غلام پر مرمٹی ہے۔ دوسری کہتی یہ کتنی ناگوار حرکت ہے۔ تیسری بولتی کتنی شرم کی بات ہے۔ کہاں عزیز مصر کی بیوی اور کہاں دو کوڑی کا غلام۔ الغرض جتنے منہ تھے، اتنی باتیں۔ یہ عورتیں اپنی عزیز سہیلی کو قصوروار ٹھہرا رہی تھیں، مگر ساتھ ساتھ وہ سوچ بھی رہی تھیں کہ آخر وہ غلام بھی تو کوئی بڑی شئے ہوگا جو زلیخا جیسی خوبصورت اور سگھڑ سیانی دیوانی ہوئی جا رہی ہے۔ ان بیگمات نے یوسف علیہ السلام کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔

مفسرین لکھتے ہیں ان عورتوں میں ایک سپہ سالار (Army Chief) کی بیوی تھی۔ دوسری کوتوال (Inspector General Police) کی بیوی، تیسری مصر کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار تاجر کی بیگم، چوتھی حاجب کی زوجہ اور پانچویں شاہی مطبخ کے نگران کی بیوی تھی۔

ان کے مذاق، پھبتیاں اور نوکدار باتیں زلیخا کو بڑی ناگوار گزریں۔ اس نے سوچا کہ اس بدنامی کو دور کر دینا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی سہیلیوں اور عمائدین سلطنت کی بیویوں کو اپنے گھر میں پھلوں کی دعوت پر بلایا۔ محل کے ایک بڑے کمرے میں دسترخوان بچھائے۔ سب سے پہلے تو انھیں کھانا کھلایا اور کھانے کے بعد انواع و اقسام کے پھل چن دیئے۔ پھل کاٹنے کے لئے انھیں چھریاں پیش کی گئیں۔

دوسری طرف یوسف علیہ السلام کو خوبصورت لباس اور مرصع تاج پہنا کر برابر والے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ جب یہ معزز خواتین چھریاں پکڑ کر پھل کاٹنے لگیں تو زلیخا نے غلام کو بلا بھیجا۔ یہ حکم سن کر جونہی یوسف علیہ السلام ان عورتوں کے سامنے سے گزرے تو مصاحبینِ مملکت اور

Marfat.com

عمائدینِ شہر کی عورتیں بس ہائے ری تیری شان کہہ کر دیکھتی رہ گئیں۔ یوسف علیہ السلام کے حسن کا جادو ان کے سر چڑھ گیا۔ جن چھریوں سے وہ پھل کاٹ رہی تھیں، مدہوشی میں انھوں نے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ کہنے لگیں زلیخا! یہ تیرا غلام تو واقعی کسی رتبے والا بزرگ یا فرشتہ ہے۔

زلیخا بولی دیکھا نا میں کوئی غلط کہتی تھی۔ تم تو ایسے ہی باتیں بناتی رہیں۔ مجھ مجبور پر الزام لگاتی رہیں، لیکن اب میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں اسے جیل میں ڈلوا دوں گی۔ یہ سن کر وہ تمام کی تمام یوسف علیہ السلام سے کہنے لگیں: ''تمھیں اپنی محسنہ سے اتنی بے توجہی نہیں برتنی چاہیے۔ تمھیں اپنی مالکہ کی خواہش کا خیال رکھنا چاہیے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے بغلی کمرے میں جا کر بارگاہ الٰہی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے: ''اے رب العزت جس کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں اس سے تو جیل جانا ہی بہتر ہے۔ اے میرے پروردگار اگر تو مجھے ان کے شر سے نہیں بچائے گا تو ممکن ہے میں ان کی طلب کا شکار ہو جاؤں۔ تو ہی میرے مولیٰ میری مدد کر اور مجھے ثابت قدمی عطا فرما۔''

اللہ تعالیٰ نے اسی وقت جبرائیل امین علیہ السلام کو بھیج کر قبولِ دعا اور نبی مقرر کیے جانے کی خوشخبری سنائی۔

فوطیفار سمجھ رہا تھا کہ بات آئی گئی ہو گئی، جبکہ زلیخا مرغ نیم بسمل بن چکی تھی۔ ظالم عشق نے اسے تو پاگل بنا دیا تھا۔ اسے تو اپنا آپ یاد ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو ہر ایک کو راز دار سمجھ کر اپنا دل کھول کر رکھ دیتی تھی۔ اس لئے بات آئی گئی ہونے کی بجائے کوبکو پھیل گئی۔ فوطیفار کو اس تشہیر کا علم ہوا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے مگر وہ جوش میں ہوش قائم رکھنے کا قائل تھا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ یوسف کو جیل بھجوا دیا جائے۔ اس طرح یوسف علیہ السلام بھی کسی بہت بڑے گناہ سے بچ جائیں گے اور زلیخا کی نظروں سے دور رہنے کی وجہ سے زلیخا کو بھی شاید چین آ جائے گا۔ یوں وہ خود کسی پیش آمدہ بہت بڑے حادثے سے بچ جائے گا۔

مفسرین کے بقول اس طرح یوسف علیہ السلام کو مرصع تاج اور لباس فاخرہ پہنا کر جیل بھیجا گیا۔ جیل کے نگران (Supertandent) نے اعتراض کیا کہ یہ جیل کے قوانین کے خلاف ہے۔ زلیخا نے وضاحت کی یہ قیدی نہیں حصاری ہے۔ جس طرح آج ہم سزا یافتہ کو قیدی اور زیر سماعت کیسوں والے زیر حراست افراد کو حوالاتی کہتے ہیں۔ اسی طرح اس دور میں بھی فیصلہ صادر ہونے کے بعد کسی ملزم کو قیدی کہا جاتا تھا اور زیر سماعت لوگوں کو حصاری گردانا جاتا تھا۔

زلیخا نے مزید حکم بھیجا کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ قیدیوں جیسا سلوک نہ کیا جائے۔

جیل کو خوب صاف رکھا جائے۔ اسے عود وعنبر سے معطر کیا جائے۔ ایک خوبصورت تخت بنایا جائے اور یوسف علیہ السلام کو ہر طرح کا آرام اور آسائش مہیا کی جائے۔ چنانچہ ناظمِ جیل نے اس حکم کی مکمل تعمیل کی۔

———(((اللہ اکبر)))———

ایک بے قصور کو قصوروار اور ایک بے گناہ کو گناہ گار قرار دے دیا گیا۔ یہ بھی تدبیرِ خداوندی تھی۔ محل سے نکل کر جیل جانا حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے اچھا شگون ثابت ہوا۔ یہاں عمومی ماحول میں آپؑ کو اپنی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا موقع ملا۔ اصل میں جیل کی زندگی آپؑ کے شاندار مستقبل کی بنیاد ثابت ہوتی ہے۔

آپؑ کے چند روز بعد دو اور اہم قیدی[12] جیل میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک شاہی خانساماں "مخلب" اور دوسرا شاہی ساقی "نیوشن" تھا۔

دراصل واقعہ یوں ہوا کہ قیصرِ روم نے فرعونِ مصر "ریان" کو زہر دینے کے لئے چند آدمی بھیجے، مگر منصوبے کی تکمیل سے پہلے ہی فرعون کو اس سازش کا پتا چل گیا۔ اصل آدمیوں کا تو ابھی تک پتا نہیں چلا تھا۔ ان دونوں کو مشکوک سمجھ کر زیرِ حراست لے لیا گیا۔ یہ دونوں اس جرم سے انکاری تھے۔

یوسف علیہ السلام جب جیل پہنچے تو مفسرین کے بقول ان کی عمر چالیس برس ہو چکی تھی اور انھیں نبی مبعوث کر دیا گیا۔ آپؑ پیغمبرانہ اخلاق کے سبب قیدیوں کی دلجوئی کرتے۔ جسے غمگین دیکھتے، اسے تسلی دلاسہ دے کر غم غلط کرنے کی کوشش کرتے۔ رہائی کے لئے ڈھارس بندھاتے۔ اگر کوئی قیدی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کرتے اور صبر کی وصیت کرتے۔

حضرت یوسف کو ان نئے قیدیوں کی آمد کا علم ہوا تو آپؑ ان کے پاس گئے۔ انھیں تسلی دلاسہ دیا۔ صبر کی تلقین کی اور ساتھ ساتھ وعظ و تبلیغ سے بھی نوازا۔

وحی آنے کے بعد آپؑ کے کندھوں پر تبلیغِ دین کی ذمہ داری عائد ہو چکی تھی۔ اس لئے آپؑ لوگوں کو خدا کی توحید کی طرف بھی بلا رہے تھے۔ یوں اپنے اخلاق اور آفاقی قسم کی تبلیغ سے آپ پوری جیل میں ہر دلعزیز ہو گئے۔

ایک روز ان نوآموز قیدیوں نے کوئی خواب دیکھا۔ وہ دونوں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے۔ اپنے اپنے خواب عرض کئے اور کہنے لگے کہ آپؑ ہمیں بزرگ معلوم ہوتے ہیں ہمارے خوابوں کی تعبیر بتایئے۔

Marfat.com

حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ دونوں ابھی جوان ہیں۔ خدا کے دین کے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔ اس لئے آپؑ نے انھیں دین کی طرف بلاتے ہوئے کہا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے علمِ تعبیر عطا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے مجھے یہ علم بھی عطا کیا ہے جو کچھ تمھارے کھانے لئے آنا ہوتا ہے۔ میں پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ آج کیا، کتنا اور کس وقت آئے گا اور تم دیکھ لیتے ہو، وہی کچھ آتا ہے جو میں بتاتا ہوں۔

ذَالِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىْ رَبِّىْ ○

مفہوم: یہ کوئی رمل، جفر، کہانت یا شعبدہ نہیں۔

یہ تو میرا رب بذریعہ وحی مجھے تعلیم کرتا ہے، مگر میں تم سے ایک اور بات کہتا ہوں۔ ذرا اس پر غور کیجئے۔ میں اس قوم میں شامل نہیں جو اللہ پر ایمان نہیں لائے اور نہ ہی اس کی عبادت کرتی ہے۔ میں تو اپنے بڑوں یعنی ابراہیم علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی پیروی کرتا ہوں۔ میرے بزرگ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ یہ تو محض فضل ربی ہے جو اس نے اہل ایمان پر کیا کہ انھیں ہدایت یاب کیا، مگر اکثر لوگ خدا کی اس نعمت کا شکر نہیں بجا لاتے۔

عزیزم! تم نے کبھی غور کیا، کئی ایک معبودوں کی عبادت کرنا بہتر ہے یا صرف اس خدا کی جو غالب و یکتا ہے تم خدا کے علاوہ جس کی بھی عبادت کرتے ہو، اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جن کو تمھارے آباؤ اجداد نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے۔ خدا کی طرف سے ان کی کوئی تصدیق نہیں ملتی۔

حکومت اور اقتدار تو صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے اور اس خدائے بزرگ و برتر کا حکم ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ اسی کا نام سیدھا دین ہے، مگر اکثریت اس بات سے ناواقف ہے۔

اس کے بعد ان دونوں کے خواب پوچھے گئے تو نبوشن[13] نے بتایا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے۔

اس کی تعبیر آپؑ نے یہ بتائی کہ وہ اپنے پرانے کام یعنی شاہی ساقی کے عہدے پر بحال ہو جائے گا۔

محلب نے خواب عرض کرتے ہوئے کہا کہ اس نے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا رکھا ہوا

Marfat.com

ہے، ان روٹیوں پر اڑتے ہوئے پرندے جھپٹ رہے ہیں۔ آپؑ نے اس کی تعبیر یوں بیان کی کہ جرم ثابت ہونے پر سزائے موت ہو جائے گا اور اس کی لاش پرندے نوچیں گے۔

یہ بتانے کے بعد آپؑ نے نیوشن سے وعدہ لیا کہ جب وہ رہا ہو کر دربار میں جائے تو بادشاہ کو بتا دے کہ تیرے قید خانے میں ایک بے گناہ قیدی پڑا ہے۔ ان دونوں قیدیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

کچھ عرصہ بعد یہ تعبیریں سچ ثابت ہو گئیں، لیکن نیوشن رہا ہونے کے بعد اپنا وعدہ بھول گیا۔ اسے دنیاداری میں وعدہ یاد نہ رہا۔ یوسف علیہ السلام کو مزید چند سال قید میں گزر گئے۔

مفسرین کے بقول یوسف علیہ السلام کا قید میں رہنے کا کل عرصہ آٹھ سال بنتا ہے۔ ان آٹھ سالوں میں آپؑ کا صبر اور استقامت بام عروج پر نظر آتے ہیں۔

اسی طرح ایک دن فرعونِ مصر ریان خواب دیکھتا ہے کہ سات دبلی گایوں نے سات موٹی تازی گایوں کو نگل لیا۔ اسی طرح کھیت کی سرسبز و شاداب سات بالیوں کو سات سوکھی بالیوں نے نگل لیا۔ یہ خواب دیکھ کر فرعونِ مصر بڑا پریشان ہوا نجومی اور کاہن تعبیر بتانے کے لئے بلائے گئے، مگر کسی نے کوئی معقول جواب نہ دیا۔

اس خواب سے نیوشن کو یوسف علیہ السلام یاد آ گئے۔ اف میرے خدایا! میں نے تو ان سے ایک وعدہ کیا تھا کہ رہا ہونے کے بعد میں بادشاہ سے آپؑ کی بے گناہی کا ذکر کروں گا۔ یاد آتے ہی وہ آگے بڑھا اور عرض کیا: ''بادشاہ حضور اگر کچھ مہلت دیں تو میں اس خواب کی تعبیر لا سکتا ہوں۔''

فرعون مصر ریان نے اجازت دی۔ جب نیوشن جیل پہنچا تو یوسف علیہ السلام عبادت یا نماز میں مصروف تھے۔ وہ فارغ ہوئے تو نیوشن نے فرعون کا خواب بیان کر کے اس کی تعبیر پوچھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر و بردباری کا اندازہ لگائیے کہ نہ تو نیوشن کو سالوں وعدہ بھولے رہنے پر ملامت کی، نہ مطعون کیا اور نہ ہی تعبیر بتانے میں کسی کنجوسی سے کام لیا اور نہ ہی منفی سوچ کو نزدیک پھٹکنے دیا کہ انھی لوگوں نے مجھے برسوں بے گناہ قیدی بنائے رکھا۔ اب اگر یہ تباہ ہوتے ہیں تو ہو جائیں، میری جانے بلا، ان سے تعلق ہی کیا، نا صرف خواب کی تعبیر ہی بتائی، بلکہ تعبیر کے مضر اثرات سے بچنے کا حل بھی بتا دیا۔

فرمایا اس خواب کی تعبیر کی بنا پر تم لوگ سات سال جم کر کھیتی باڑی کرو گے۔ پیداوار خوب

Marfat.com

ہوگی۔ جب فصل کی کٹائی کا وقت آئے تو اپنی ضرورت سے زائد غلہ بالیوں میں ہی رکھ کر محفوظ کر لینا۔اس کے بعد سات سال سخت قحط سالی کے ہوں گے۔ان سات برسوں میں تمھارا جمع کیا ہوا غلہ تمھارے کام آئے گا۔ بعدازاں پھر ایک سال ایسا آئے گا کہ گھٹائیں خوب جم کر برسیں گی۔ لوگ پھلوں اور دانوں سے عرق و تیل خوب نکالیں گے۔ سات موٹی گائیں اور سرسبز بالیاں خوشحالی کی علامت ہیں اور سات دبلی گائیں اور خشک بالیاں قحط کی علامت ہیں جو خوش حالی کے سالوں میں ہونے والی پیداوار کو کھا جائیں گی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر کے ساتھ ایک اضافی بیان بھی جاری کر دیا کہ خشک سالی کے بعد بارش خوب ہوں گی۔ حضرت قتادہؓ کے بقول یہ اضافی بیان منجانب وحی تھا۔تا کہ لوگوں کو پتا چل جائے کہ یہ تعبیر منجانب اللہ ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

نیوشن نے واپس جا کر بادشاہ کو تعبیر بتائی اور ساتھ ہی یوسف علیہ السلام کے اخلاق، عادات اور معاملات کا بھی ذکر کر دیا۔ یہ باتیں سن کر ریان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔اس کے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ ایسے نفیس اور عمدہ شخص کی زیارت کرنی چاہیے۔اس نے نیوشن کو حکم دیا کہ اس آدمی کو فوراً دربار میں حاضر کرو۔

مگر ساقی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو پیغام دیا تو آپؑ نے باہر آنے سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس وقت تک باہر نہیں آؤں گا جب تک عورتوں کا معاملہ واضح نہیں ہو جاتا۔

یاد رہے یہ بھی کمالِ خداوندی ہے وہ جس طرح انبیاء اکرام کو یقین عطا فرماتے ہیں، اسی طرح فہم وفراست میں بھی حدِ کمال پر بٹھاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور نبی کی شخصیت پر جھوٹے الزام کا داغ بھی دین کے لئے مضر ہوتا ہے ویسے بھی نبی کسی کا احسان مند ہونا (ماسوا دینی کام کے) گوارا نہیں کرتا۔اس لئے آپؑ نے سوچا کہ میں جس جھوٹے الزام میں گرفتار ہوں۔ اگر اس کی برات ثابت ہو جائے تو پھر رہائی میرا قانونی حق ہوگا۔

عقل مندی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جس جھوٹے الزام میں برسوں جیل کاٹی، اس کی حقیقت ہر خاص وعام پر واضح ہو جائے تا کہ عصمتِ یوسفی پر کسی کو شک وشبہ نہ رہے۔اس کے علاوہ دینی اور تحریکی کام کے لئے ایک اعتماد اور یقین کی فضا درکار ہوتی ہے۔اس شکوک وشبہات والی فضا میں

Marfat.com

کھل کھلا کر دعوت و تبلیغ کا کام ممکن نہیں تھا پھر عزیز مصر کو یہ یقین دلانا بھی مقصود تھا کہ یوسف علیہ السلام نے ان کی امانت میں خیانت نہیں کی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا جواب لے کر ساقی فرعون کے پاس پہنچا تو اس نے تحقیقات کا حکم دے دیا۔ ادھر تحقیقات شروع ہوئیں، ادھر حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ جبرائیلؑ نے قبول دعا کی خوشخبری سنائی۔ آپؑ والد بزرگوار کی جدائی سے بڑے پریشان تھے۔ جبرائیل سے والد محترم کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ بھی آپؑ کی یاد میں پریشان ہیں۔ آپؑ کی یاد سے فارغ ہوں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگے رہتے ہیں۔

آپؑ نے پوچھا، کیا ان کی اس غم والم کے عوض فلاح بھی ہوگی یا نہیں۔

جبرائیلؑ نے جواب دیا۔ انھیں اس کے عوض ہر روز ایک شہید کا درجہ ملے گا۔ یہ سن کر آپ مطمئن ہوگئے اور جبرائیلؑ واپس چلے گئے۔

ادھر تحقیقات کا عمل شروع تھا۔ صورتحال کچھ اس طرح ہوگئی کہ عورتیں سچ بولنے پر مجبور ہو گئیں۔ وہ ساری کی ساری یک زبان بولیں۔

''خدا کی پناہ ہم نے تو یوسف میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔''

اب زلیخا کی باری تھی اس سے اس واقعہ کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے سوچا کہ تمام معزز خواتین ایک زبان ہیں۔ اب اس کی دال گلنے سے رہی۔ اس لئے اس نے بھی اقبال جرم کرتے ہوئے کہا کہ میں [14] نے ہی یوسف علیہ السلام سے اپنی خواہش پوری کرنے کی کوشش کی تھی، بلاشبہ وہ تو اس معاملہ میں سچے ہیں۔

حقائق سامنے آجانے کے بعد ناظرین وحاضرین میں یوسف علیہ السلام کی زیارت کا بے پناہ اشتیاق پیدا ہوا۔ ایک جم غفیر آپؑ کو جیل سے دربار تک لانے کے لئے گیا۔ یوں آپؑ غلاموں کی منڈی سے دربار مصر تک پہنچے۔

آپؑ کے اخلاق و کردار کی شہرت بام عروج تک پہنچ چکی تھی۔ لوگ دیوانہ وار آپؑ کی زیارت کے لئے آرہے تھے۔ بالآخر آپؑ کو انسانی فطرت اور خدا کی مہربانیوں کا اعلان کرنا پڑا۔ آپؑ نے عوام الناس کو مخاطب کیا۔

لوگو! میں اپنے نفس کو بطور انسان بری اور پاک نہیں سمجھتا۔ کیونکہ نفس تو ہمیشہ برا ہی سوچتا ہے، سوائے اس نفس کے جس پر خدا رحیم ہو۔ بالفاظ دیگر میری پاکدامنی خدا کے رحم و کرم کی عکاس

Marfat.com

ہے، بے شک میرا رب بڑا غفور الرحیم ہے۔
قارئین مضمون مشرکین مکہ کے سامنے باندھا جارہا ہے۔ یہ خوشبوئیں صحن حرم میں بکھیری جا رہی ہیں۔ یہ گل افشانی مخالفین اسلام کے سامنے کی جارہی ہے۔ آج ہم پیدائشی مسلمان سورۃ یوسف کے اس تاثر کو سمجھنے سے قاصر ہیں جس تاثر نے ریگزار مکہ کے ذرات کو تڑپا کے رکھ دیا تھا۔ آج کا مسلمان سورہ یوسف کے ان ادبی محاسن اور فصاحت و بلاغت کی اثر آفرینیوں سے نابلد ہے جس نے عتبہ شیبہ، ابولہب، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، نظر بن حارث اور امیہ بن خلف جیسوں کی نیندیں حرام کردی تھیں۔

(((الحمد للہ)))

Marfat.com

اولاد یعقوب مصر میں

قدرت خداوندی کا کمال دیکھئے کہ وہ کنعان کے چرواہے کو اپنے دور کے ترقی یافتہ ملک کی امارت کے لئے منتخب کر لیتی ہے۔

یوسف علیہ السلام کی بے گناہی انھیں جیل سے دربار تک لے جاتی ہے اور زلیخا کا اقبال جرم آپ کی پاکبازی اور اعلیٰ ظرفی کو شہرت دوام بخش دیتا ہے۔ یوں فرعون کے دل میں آپ کی عزت ومنزلت دو چند ہو جاتی ہے۔

زلیخا کا شوہر فوطیفار بھی وہاں موجود تھا۔ ریان اسے مخاطب کرتا ہے۔ یوسف علیہ السلام تیرا غلام ہے۔ تو اسے ہمارے ہاتھ فروخت کر دے تا کہ میں اسے تیری جگہ عزیز مصر مقرر کر سکوں۔ فوطیفار نے غلامی سے فوراً آزاد کر دیا۔ پھر وہ یوسف علیہ السلام سے مخاطب ہوتا ہے: ''تم عقلمند اور امین ہو۔ میں تمھیں وزارت دینا چاہتا ہوں آپ کا کیا خیال ہے۔''

بعد ازاں یوسف علیہ السلام کی پسندیدہ وزارت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے کہا مجھے وزارت خزانہ دے دی جائے۔ میں امین بن کر اس کی حفاظت کروں گا اور لوگوں کی خوراک کی ضروریات بھی پوری کروں گا۔ آپ کی یہ تجویز کردہ وزارت آپ کو سونپ دی گئی۔

یاد رہے کہ ان دنوں اتنی لمبی چوڑی کابینہ رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ عموماً دو چار وزیر ہی کافی سمجھے جاتے تھے۔ خیال یہی ہے کہ عزیز مصر اصل میں وزارت عظمیٰ کا نام تھا۔ جس کے زیر کمان خزانہ، خارجہ اور خوراک کے محکمے تھے۔ وزارت داخلہ اور دفاع وغیرہ سپہ سالار اعظم کے زیر کمان تھیں اور باقی تمام امور براہ راست بادشاہ کے پاس تھے۔

مفسرین کے بقول حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے پہلے فرد تھے جو وزیر خوراک وخزانہ مقرر ہوئے۔ آپ نے ریان کو اسلام کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے آپ کو پورے مصر کا وزیر اعظم یعنی عزیز مصر بنا دیا۔ بعد ازاں اس نے سب کچھ آپ کے حوالے کر دیا۔ حضرت یوسف نے امور سلطنت سنبھالنے کے بعد سات سالہ قحط سے بچنے کی

Marfat.com

تدبیریں شروع کر دیں۔ آپؑ نے حکومتی خزانے سے غلہ خریدنا شروع کیا۔ خوشحالی کے دو سالوں میں اناج جمع کیا جاتا رہا۔ علاوہ ازیں نئی زمینوں کو حکومتی سطح پر قابل کاشت بنایا جاتا رہا۔ زمین آباد ہو جاتی تو کاشتکاروں کے حوالے کر دی جاتی۔

اناج کو گلنے سڑنے اور کیڑا لگنے سے بچاؤ کی یوں تدبیر کی گئی کہ اناج کو بالیوں سمیت گودام کیا گیا۔ اس طرح سات سال اناج ہر قسم کے گزند سے محفوظ رہا۔

سابق عزیز مصر جناب فوطیفار بدنامی کے زیر اثر بیمار ہو گئے اور دو ہی سال بعد راہی ملک عدم ہوئے۔ مفسرین کے بقول فوطیفار کی وفات کے بعد زلیخا یوسف علیہ السلام کے نکاح میں آ گئیں۔ بعض غیر مصدقہ روایات کے مطابق نکاح کے وقت بی بی زلیخا اماں زلیخا ہو چکی تھیں۔ نکاح کے بعد معجزانہ طور پر اللہ کے فضل و کرم سے جوان ہو گئیں۔ ان روایتوں کی قرآن و حدیث یا کسی معتبر راوی سے تصدیق نہیں ملتی۔ (اللہ اعلم)

والیِ مصر حضرت یوسف علیہ السلام کے نکاح کو چھ برس بیت گئے۔ اس دوران زلیخا سے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک کا نام منشّی اور دوسرے کا نام افرائیم تھا۔ یہ 1708 قبل مسیح کا زمانہ بتایا جاتا ہے۔

اب فرعون کے خواب کی تعبیر کا وقت بھی آن پہنچا۔ صرف ایک ہی سال کی خشک سالی نے آدھی دنیا کو بھوکا ننگا کر دیا۔ صرف مصر میں اس قحط سے بچنے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ مصر میں اناج کی موجودگی کی خبر قریبی ممالک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سب سے پہلے یمن کی شہزادی نے مصر سے غلہ منگوایا۔

نئے والیِ مصر نے ضرورت مندوں کے لئے بقدر ضرورت غلہ دینے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس دریا دلی پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ اگر آپ یونہی غلہ بانٹتے رہے تو عنقریب ہم خود حاجت مند بن جائیں گے۔

آپؑ نے جواب دیا کہ لوگ اناج کے بغیر بھوکے مر جائیں گے۔ غلہ ہوتے ہوئے ضرورت مندوں کو بھوکے رکھنا بہت بڑا گناہ ہے، لہٰذا اس غرض سے جو بھی مصر میں داخل ہوگا اسے غلہ ضرور فروخت کیا جائے گا۔

ملک کنعان ان دنوں موجودہ فلسطین کے شہر الخلیل اور مضافات کا نام تھا۔ جہاں آج بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے مزارات واقع ہیں۔ یہ علاقہ بھی قحط سالی کی لپیٹ میں آ گیا۔

Marfat.com

———(((اللہ اکبر)))———

ایک دن حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا: "سنا ہے کہ والی مصر نے وافر مقدار میں غلہ گودام کر رکھا ہے اور وہ ضرورت مندوں کو فروخت کر رہا ہے۔ تم بھی مصر جاؤ اور اناج خرید لاؤ۔ باپ کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ یوسف علیہ السلام کے دس بھائیوں نے روانہ ہونے سے پہلے اپنے سوتیلے، اور یوسف علیہ السلام کے سگے، بھائی بنیامین کو بھی ساتھ لے جانے کے لئے اصرار کیا تو یعقوب علیہ السلام نے صاف انکار کر دیا۔

ہر آدمی کو ایک اونٹ کے وزن اٹھانے کی مقدار برابر اناج دیا جاتا تھا۔ وہ مصر پہنچ کر والی مصر کے سامنے پیش ہوئے تو والی مصر نے پہچان لیا، مگر برادران یوسف علیہ السلام نہیں جانتے تھے کہ جو والی مصران کے سامنے کھڑا ہے، یہ وہی یوسف علیہ السلام ہے جسے انھوں نے کنویں میں پھینک دیا تھا۔ بعدازاں اٹھارہ کھوٹے سکوں کے عوض بیچ دیا تھا۔

یوسف علیہ السلام عبرانی زبان بولتے ہوئے پوچھتے ہیں تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ تمھاری شکل وصورت کسی شاہی خاندان سے ہونے کی دلالت کر رہی ہے۔ اس سوال سے وہ ڈر گئے کہ شاید والی مصر اس بہانے غلہ دینے سے انکار کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جھوٹ بول دیا۔ جب ان سے ذرا سختی سے پوچھا گیا تو خالی ہاتھ لوٹنے کے خوف سے سچ بولنے پر مجبور ہو گئے۔ شمعون یوں گویا ہوا:

"اے عزیز مصر حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اپنے والد بزرگوار کے بارہ بیٹے تھے۔ ہم میں سے ایک جس کا نام یوسف تھا، باپ اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ ایک روز ہمارے ساتھ جنگل کی سیر کو گیا تو ایک بھیڑیئے نے اسے کھا لیا۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا: "تمھارے باپ کو صبر کیسے آ گیا۔"

شمعون نے جواب دیا: "اس سے چھوٹے کا نام بنیامین تھا۔ ہم اپنے باپ کی دل لگی کے لئے اسے ان کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔" حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا: "تمھاری اس بات کا کوئی گواہ ہے۔" سب سے بڑا بھائی یہودا کہنے لگا: "جناب عالی ہم اس ملک میں اجنبی ہیں یہاں ہماری گواہی کون دے گا۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اگر آئندہ آؤ تو بنیامین کو ساتھ لیتے آنا۔

یہودا کہنے لگا: "مگر ہمارا باپ تو بنیامین کو ایک ساعت کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔"

Marfat.com

ان میں سے ایک کا نام نفتالی تھا۔وہ کہنے لگا ہم آئندہ ضرور بنیامین کو ساتھ لائیں گے۔
اس بات پر حضرت یوسف نے بات ختم کرتے ہوئے کہا: ''چلو ٹھیک ہے، تم یوں کرو، ایک کو ادھر چھوڑ جاؤ۔ جب تم بنیامین کو لے آؤ گے۔ یہاں رہنے والے کو بھی چھوڑ دیا جائے گا۔''
عزیزِ مصر کا حکم تھا، اسے ٹالنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ پہلے تو وہ تمام ایک دوسرے کو مشورہ دیتے رہے کہ تم یہاں ٹھہر جاؤ۔ جب کسی نے بھی رضامندی ظاہر نہ کی تو قرعہ اندازی کی گئی اور قرعہ شمعون کے نام نکلا۔
باقی کو غلہ دے دیا گیا۔ دس میں سے نو کے لئے جانے کا حکم تھا۔ ادھر ملازمین کو حکم ملا کہ ان کے غلے کے اندر خفیہ انداز سے ان کی قیمت یعنی رقم بھی رکھ دی جائے تا کہ وہ رقم دینے کے بہانے دوبارہ آ جائیں۔
ابن کثیر نے اس کی کافی وجوہات لکھی ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:
1- ایک وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے قیمت لینا گوارا نہ کیا ہو۔ غلے کی قیمت اپنی جیب سے ادا کر دی ہو۔
2- یہ بھی ہو سکتا ہے، یوسف علیہ السلام نے یہ گمان کیا ہو کہ اگر آج قیمت لے لی تو شاید آئندہ آنے کے لئے ان کے پاس رقم ہی نہ ہو۔
3- تیسری خوبصورت وجہ بیان کی ہے کہ یہ چونکہ اولاد نبی تھی۔ یعقوب علیہ السلام ابھی بقیدِ حیات تھے۔ جب ان کو پتا چلے گا کہ غلے کی رقم واپس آ گئی ہے تو وہ انھیں یہ رقم لوٹانے کے لئے ضرور دوبارہ بھیجیں گے۔
بہر حال!! جب وہ اناج لے کر گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی رقم واپس آ گئی ہے۔ وہ اپنے باپ سے کہنے لگے: ''ابا جان! مصری کارندوں کی غلطی سے اناج کی قیمت بھی واپس آ گئی ہے۔ اسے واپس کر دینا چاہئے۔ ویسے بھی عزیزِ مصر نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی ہے اور بنیامین کو ساتھ لانے کا وعدہ بھی لیا ہے۔
ایک تو بیٹوں کا اصرار تھا، دوسرا رقم واپس آ جانے کی وجہ سے باپ نے دوبارہ واپس جانے کی اجازت دے دی، لیکن ساتھ ہی کہہ دیا کہ بنیامین کے متعلق میں ایسا ہی اعتماد رکھوں جیسا یوسفؑ کے متعلق رکھا تھا۔
ان الفاظ کا سیدھا سیدھا مطلب یہی تھا کہ میرے بیٹو! تمھاری بات کا کیا اعتبار؟ یوسف علیہ السلام کی طرح بنیامین کو بھی کھو بیٹھوں۔

آفرین ہے کہ اس کے باوجود، انھوں نے کلمہ حق کہہ دیا اور کہا کہ ہمارا خدا اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ وہ اس زمین و آسمان کا مالک و خالق ہے اور ہم اسی خدا کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کسی کو معبود تسلیم نہیں کرتے ۔ اگر ہم کسی اور کو معبود مانیں تو یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔

اس طرح ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا یقیناً بڑے دل گردے کا کام ہے۔ مطلبی اور لالچی لوگ ایسا نہیں کر پاتے۔

خدا کا نام سن کر بادشاہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ پہلے تو قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر کہتا ہے: ''جاؤ میں تمھیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ ان دنوں میں تمھارا عقیدہ بدل گیا تو ٹھیک، ورنہ سرِعام پھانسی لگا دیے جاؤ گے۔''

اس مختصر مدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، وہ نوجوان بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان دنوں میں وہ بس چلتے ہی چلے گئے۔ شہر اور آبادیاں ان کے راستے میں آتی رہیں، مگر وہ کہیں رکے نہیں۔ اس طرح وہ کسی دور افتادہ پہاڑی سلسلے میں جا گھسے۔ راستے میں کہیں سے ایک کتا بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ انھوں نے کتے کو بھگانے کی پوری کوششیں کیں، مگر اس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بس ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

چلتے چلتے دفعتاً انھیں ایک وسیع و عریض غار کا دہانہ نظر آیا۔ اسے محفوظ جان کر وہ غار کے اندر چلے گئے۔ ان کا کتا غار کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ تمام نوجوان بڑی لمبی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ تھکاوٹ سے اعصاب ٹوٹ رہے تھے۔ چنانچہ وہ غار کے اندر بیٹھتے ہی سو گئے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے ان پر لمبی نیند طاری کر دی اور وہ سوئے رہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات بڑی قدرتوں والی ہے۔

اس کی قدرت کاملہ کے کمالات اس کائنات ارضی پر بکھرے پڑے ہیں۔ ان توحید پرستوں پر خدا کی خاص عنایت ہوئی۔ لمبی نیند کے دوران میں نہ انھیں بھوک لگی، نہ ان کے جسموں کو زمین نے گزند پہنچائی اور نہ کوئی جنگلی جانور یا حشرات الارض میں سے کوئی زہریلا کیڑا ان تک پہنچ سکا۔

مفسرین کے بقول یہ نوجوان (309) یا تین سو (300) سال اسی حالت میں سوئے رہے اور ہر گزند سے محفوظ رہے۔

———(((البلہ الکبیر)))———

جب وہ بیدار ہوئے تو دنیا بدل چکی تھی۔ چند ادیوی ڈائنا (Diana) کے پجاری مسیحیت اختیار کر چکے تھے اور فقہی اور فروعی بحثوں میں الجھ چکے تھے۔ مسیحیت کی شکل میں گو توحید اپنائی جا

Marfat.com

چکی تھی، مگر عقیدۂ آخرت اور حیات بعد الموت کے عقیدے میں ابھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ بھاری اکثریت اب بھی عقیدہ آخرت کی منکر تھی۔

انھیں دنوں اصحاب کہف لمبی نیند سے بیدار ہوتے ہیں۔

یاد رہے کہف اس پہاڑی غار کو کہتے ہیں جو وسیع و عریض ہو۔ جو تنگ اور چھوٹی ہو اسے غار ہی کہا جاتا ہے۔ وہ نیند سے اٹھ کر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ وہ کتنی دیر سوئے۔ ان میں سے ہر ایک نے قیاس آرائی کی۔ کسی نے ایک دن، کسی نے آدھا دن، کسی نے دن کا بھی چوتھائی حصہ بتایا۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی دیر سوئے؟

جاگنے کے تھوڑی دیر بعد انھیں بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ انھوں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں تو چاندی کے کچھ سکے برآمد ہوئے۔ وہ سکے انھوں نے اپنے ایک ساتھی کو دیئے اور کہا کہ جاؤ شہر سے سامان خورد و نوش خرید لاؤ۔

اور ساتھ ہی نصیحت کرتے ہیں۔ دیکھنا پوری پوری احتیاط برتنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ تمھیں پہچان کر سنگسار کر دیں یا بادشاہ کے حوالے کر دیں۔ اگر بادشاہ کو خبر ہوگئی تو ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ یا تو اللہ کا نام لینا چھوڑ دیں اور یا پھر اللہ کی راہ میں جان دے دیں۔ اگر انھوں نے زبردستی اپنے مذہب میں شامل کر لیا تو یقیناً ہم فلاح نہ پاسکیں گے۔

جب یہ شخص شہر میں داخل ہوا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نہ کہیں مندر ہے اور نہ بت پرستی۔ مندروں کی جگہ ہیکل (مساجد) یا گرجے تعمیر ہو چکے ہیں۔ لوگ عیسائیت کے مطابق عبادت کر رہے ہیں۔

پھر بھی وہ ڈرتا ڈرتا ایک تندور یا کلچہ فروش کی دکان پر پہنچا۔ وہاں سے چند روٹیاں خریدیں اور چاندی کے سکے تھما دیئے۔ ان چاندی کے سکوں پر پرانے بادشاہ کی تصویر تھی۔ یہ کرنسی تو مدتوں پہلے تبدیل ہو چکی تھی۔

دکاندار روپے دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ پوچھتا ہے یہ روپے تو نے کہاں سے لئے ہیں۔ وہ نوجوان جواب دیتا ہے۔ یہ روپے تو میرے اپنے ہیں میں نے کہیں سے نہیں لئے۔

دکاندار اور نوجوان میں تو تکار شروع ہو جاتی ہے۔ بات بڑھتے بڑھتے دور نکل جاتی ہے۔ لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے۔ ہر کوئی دیکھنے والا یہ کرنسی دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ بات چلتی چلتی کوتوال تک پہنچ جاتی ہے۔ پولیس پکڑ کر معاملے کو کوتوال کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔

کوتوال نوجوان سے پوچھتا ہے: "اے نوجوان صحیح صحیح بات کرو۔ یہ سکہ تو بہت پرانا ہے اس

Marfat.com

وقت جب یہ سکہ رائج تھا۔ فلاں بادشاہ کی حکومت تھی۔ اس کو مرے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ یہ سکہ تو ہمارے بوڑھوں نے بھی نہیں دیکھا۔ جبکہ تم ابھی نوجوان ہو۔ سچ بتاؤ اصل معاملہ کیا ہے۔

نوجوان یہ سن کر حیران رہ گیا کہ جس ظالم بادشاہ کے خوف سے وہ غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے، وہ مدت پہلے مر چکا۔ واقعہ بڑا چونکا دینے والا تھا۔ نوجوان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ رنگ فق ہو گیا۔ کچھ دیر وہ دم بخود حالت میں کھڑا رہا اور پھر آہستگی سے خود کلامی کے انداز میں کہنے لگا:

''اس ظالم بادشاہ کے خوف اور ڈر سے ابھی کل ہی تو میں اور میرے ساتھیوں نے ایک غار میں پناہ لی تھی۔''

واقعہ تو ناقابل یقین تھا۔ اس لئے کوتوال اس نوجوان کو لے کر اس غار کی طرف چل نکلا۔ لوگوں کا ہجوم بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ بات سچ ثابت ہو گئی جو لوگوں میں پہیلی کی طرح عام ہو گئی کہ پرانے زمانے میں چند نوجوان اپنا ایمان بچانے کے لئے غائب ہو گئے تھے۔ پھر ان کا آج تک پتا نہیں چل سکا۔

یہ خبر ایسی نہ تھی جو چھپی رہ جاتی۔ آناً فاناً پورے شہر میں یہ ہوا پھیل گئی کہ ظالم بادشاہ کے خوف سے غائب ہونے والے نوجوان مل گئے ہیں۔ تین سو سال پرانا واقعہ تھا۔ بڑا حیران کن اور پر تجسس تھا۔ لوگ جوق در جوق ان کو دیکھنے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بادشاہ وقت کو پتا چلا تو خود حاضر خدمت ہوا اور دعائیں حاصل کیں۔

اب ان نوجوانوں پر حقیقت افشا ہوئی کہ وہ تین سو سال پہلے کے لوگ ہیں۔ انھوں نے لوگوں سے سلام ودعا کی اور غار میں جا کر لیٹ گئے۔ اس کے بعد عوام الناس نے تلاش کی ہزار کوششیں کیں، مگر ان کو ملنا تھا نہ ملے۔

اور جب لوگ تلاش سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے یادگار کے طور پر اس پہاڑی پر ایک مسجد تعمیر کر دی۔

یوں قوم میں جو مناظرہ حیات بعد الموت کا چل رہا تھا، ختم ہو گیا۔ اصحاب کہف کا یہ واقعہ قوم میں پھیلے غلط اختلافات کو ختم کر گیا۔ لوگوں کو یقین آ گیا کہ اگر یہ نوجوان تین سو سال سونے کے بعد اسی حالت میں اٹھائے جا سکتے ہیں جس حالت میں سوئے تھے تو انسان مرنے کے بعد کیوں نہیں اٹھایا جا سکتا۔ جو خالق کائنات یہ سب کچھ کر سکتا ہے، اس کے لیے مرنے کے بعد زندہ کر لینا کونسا مشکل کام ہے۔

Marfat.com

—(((اللہ اکبر)))—

قارئین یہ واقعہ مشرکین کے سوال کرنے پر پیش کیا گیا۔اب ذرا سرد جنگ کے حوالے سے غور کیجئے اور سورہ کہف کی اثر آفرینی کا اندازہ لگایئے کہ کل تک جو لوگ اس زعم میں یہ سوال کر رہے تھے کہ اس کا جواب محمد ﷺ کے پاس نہیں ہے۔اس یقین کے ساتھ سوال کر رہے تھے کہ اس کا جواب نہ ملنے کی صورت میں ہم محمد ﷺ کو جھٹلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔اسلام سے متاثر ہونے والوں کو سمجھانا آسان ہو جائے گا کہ دیکھیں میاں! ہم نے محمد ﷺ سے یہ سوال کیا تھا جس کا جواب وہ نہیں دے پائے۔یقیناً اگر وہ نبی ہوتے اور واقعی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہوتے تو یہ کونسی مشکل بات تھی۔پھر جس دنیا اور آخرت والے خدا کی وہ بات کرتے ہیں، اگر واقعی محمد ﷺ کا خدا ایسا ہی تھا جیسا وہ بتاتے ہیں تو اس کے لئے یہ گرہ کھول دینا کونسا مشکل کام تھا۔بس میاں! چھوڑو کس کے پیچھے لگے ہوئے ہو (نعوذ باللہ) یہ سب جھوٹ ہے۔

لیکن مشرکین کے تصورات کی عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ان کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی جب سورۃ کہف نے تاریخ کا سربستہ راز کھول کے رکھ دیا۔گم گشتہ اوراق تاریخ کو ان کے سامنے پیش کر دیا تو انھیں چھپنے کے لیے جگہ نہیں مل رہی تھی۔

آج ہم پیدائشی مسلمان قرآن کے ان اثرات کو محسوس کرنے سے قاصر ہیں جو اہلِ مکہ نے محسوس کئے تھے۔ذرا دیکھئے جب یہ واقعہ پہلی دفعہ اہلِ مکہ کے سامنے پیش کیا گیا ہوگا تو وہ کیوں نہ جھوم جھوم اٹھے ہوں گے۔اصحاب کہف کے آئینے میں حضور ﷺ اور صحابہ اکرام کی جماعت کو دیکھ رہے ہوں گے انھیں اصحاب کہف کی تصویریں اسلام کے فدائیوں کی شکل میں نظر آ رہی ہوں گی۔

ظالم اور بت پرست بادشاہ کا سراپا مشرکین مکہ کی صورت میں نظر آ رہا ہوگا۔(Diana) چندا دیوی کے پجاری لات منات اور عزیٰ کی شکل میں دکھائی دیتے ہوں گے یقیناً کرداروں کی اس مماثلت نے سچے کو سچا اور جھوٹے کو جھوٹا ثابت کر دیا ہوگا۔لامحالہ کئی نوجوان یہ سن کر واشگاف اعلانِ حق کر چکے ہوں گے۔کئی مناسب موقع کی تلاش کر رہے ہوں گے اور کئی سچ اور جھوٹ کے تجسس میں گھر گئے ہوں گے۔

پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مخالفینِ اسلام بھی عقیدۂ آخرت کے منکر تھے۔عقیدۂ آخرت ایسی حقیقت ہے جو ماننے والوں کو خود بخود توحید کا پابند بنا دیتا ہے۔روزِ جزا اور اعمال کی جوابدہی کا تصور انسان کو احکاماتِ خداوندی کا پابند بنا دیتا ہے اور جب تصورِ آخرت عقیدۂ آخرت میں بدل جائے تو تمام عقائد خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔مثلاً عقیدۂ آخرت اور احکامات الٰہی کا ذریعہ تو

Marfat.com

رسالت ہی ہے۔ بندوں پر احکاماتِ الٰہی علیحدہ علیحدہ تو نازل نہیں ہوتے۔ یہ تو سب کچھ کسی رسول یا نبی کے ذریعے بتایا جاتا ہے۔ جب آخرت، روز جزا و سزا، جنت اور دوزخ کو مان لیا تو رسالت کو تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ باقی نہیں رہتی۔

اصحابِ کہف کے مذکورہ واقعہ میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ شہر افسوس (Afcivis) کے لوگ رسالت کو مان لینے کے باوجود اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ مرنے کے بعد انسان کو کیسے زندہ کیا جائے گا۔ تقریباً تین سو سال پہلے والے جوانوں کو پیش کر کے شہر افسوس والوں پر یہ واضح کر دیا گیا کہ اگر ان نوجوانوں کو اتنا عرصہ حالتِ نیند میں رکھنے کے بعد اسی حالت میں جگایا جا سکتا ہے جس حالت میں وہ سوئے تھے تو مرنے کے بعد انسان کو زندہ کر لینا کونسا مشکل ہے۔ افسوس (Afcivis) والوں نے یہ دیکھا تو سارا جھگڑا ختم ہو گیا اور وہ آخرت کے قائل ہو گئے۔

یہ تو ''کہنا بیٹی کو اور سمجھانا بہو کو'' والی بات ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ تاریخ کا ایک گم گشتہ واقعہ ہے، لیکن اس کے مخاطب اہلِ مکہ تھے۔ وہ بھی تو آخرت سے انکار کر رہے تھے۔ واقعہ پرانا تھا، لیکن عبرت اور نصیحت کی جدت لیے ہوئے تھا۔ مشرکین کو بڑا کھل کر بتایا جا رہا ہے کہ دیکھو ایک ظالم اور بت پرست بادشاہ نے اللہ کے ماننے والوں سے کیا سلوک کیا اور اللہ نے اپنے بندوں پر کیسا کرم فرمایا۔ انھیں کس نے کامران کیا اور ان کو لوگوں کے لیے کس نے ذریعہ ہدایت بنایا۔

اے اہلِ مکہ آج تم بھی اس روش پر چل نکلے ہو۔ تمھارے پاس میرا رسول میری آیات بیان کر رہا ہے۔ تمھیں ہدایت کی طرف بلا رہا ہے اور تم اس کی مخالفت کر رہے ہو۔ دیکھ لینا تمھارا انجام ان ظالموں سے مختلف نہیں ہوگا۔

یہ واقعہ ایک تعبیر بھی ہے اور عبر بھی۔ ایک نصیحت بھی ہے اور دھمکی بھی۔ مخالفین کے سوال کا جواب بھی ہے اور بد عقیدہ لوگوں کے لئے ایک نیا سوال بھی۔ مشرکین کی عقل کا تاریخی ماتم بھی ہے اور عقل والوں کے لیے کامیابی کی نوید بھی۔

جن کے مقدر میں ہدایت لکھی جا چکی تھی، وہ بلا خوف و خطر حصارِ دین میں داخل ہو گئے اور جن کی قسمت تاریک تھی، وہ اس بحرِ فیض کے ساحل پر کھڑے ہو کر بھی پیاسے ہی رہے۔

———((الحمد للہ))———

نوٹ: تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ تفسیر ابنِ کثیر۔ سورہ الکہف، تفہیم القرآن، تفسیر عثمانی، تفسیر مظہری، موضح القرآن۔ قصص الانبیاء، سیرت... اکرام۔

Marfat.com

ذوالقرنین کون تھے؟

ذوالقرنین کا اصل نام مصعب[26] بن عبداللہ تھا۔ یہ سام بن نوحؑ کی اولاد میں سے تھے۔ بعض ماہرین علم الانساب ان کا سلسلہ حمیر بن سبا سے ملاتے ہیں جو تاریخ میں سبائی خاندان کے نام سے معروف تھا۔ ذوالقرنین اس شخص کا لقب ہے، مگر قرآن نے بھی یہ لقب ہی استعمال کیا ہے۔ اس کا دور حکومت تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح ہے۔ اس لحاظ سے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہم عصر ہیں۔

دراصل عربی میں "قرن" سینگ کو کہتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے مشرق ومغرب تک حکومت کی، اس لیے اسے ذوالقرنین یعنی دو قرنوں والا کہا گیا۔

ذوالقرنین اللہ کے نبی[27] تھے۔ سلیمان علیہ السلام کی طرح نیک اور عادل بادشاہ تھے۔ ان کے وزیر اعظم حضرت خضر علیہ السلام تھے جن کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آتا ہے۔

ذوالقرنین پیادہ پا حج کے لئے گئے۔ ان دنوں حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں تھے۔ انھیں پتا چلا تو ذوالقرنین کا مکہ سے باہر نکل کر استقبال کیا۔ پھر آپ دونوں حرم شریف میں گئے۔ طواف کعبہ کیا قربانیاں دیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کے لیے دعا اور نصیحت فرمائی۔

بعض مفسرین کے بقول وہ دو قرن یعنی دو صدیاں تخت حکومت پر براجمان رہے۔

قرآن نے آپؑ کے چار اوصاف بیان کیے ہیں۔

1- لقب یا نام ذوالقرنین تھا۔

2- وہ اتنے بڑے حکمران تھے کہ عنانِ حکومت مشرق ومغرب سے لے کر شمال تک پھیلی ہوئی تھی۔

3- وہ صاحب ایمان اور عادل بادشاہ تھے۔

4- یاجوج اور ماجوج سے بچاؤ کے لیے ایک آہنی دیوار تعمیر کی۔ آیئے قرآنی اثرات سے بھی استفادہ کر کے دیکھیں۔ قرآن ذوالقرنین کا ذکر کچھ یوں کرتا ہے۔

Marfat.com

مفہوم: ہم نے ان کو زمین پر صاحب اقتدار بنایا اور ایسا صاحب اقتدار بنایا کہ ہر قسم کے وسائل کی بھرمار کردی۔ اس اللہ کے نیک بندے نے پہلے مغرب کی طرف مہم جوئی کی، یہاں تک کہ وہ غروب آفتاب کی جگہ پر پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ سورج ایک کالے پانی کی جھیل میں غروب ہو رہا ہے۔

وہاں اسے ایک ظالم، مشرک اور بے ہدایت قوم ملی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ''اے ذوالقرنین تمھیں کھلی چھٹی ہے۔ جس طرح چاہو، اس قوم پر تصرف کرو یعنی سزا دو یا نرمی برتو۔''

قارئین!! یہی چیز ذوالقرنین کو نبی ثابت کرتی ہے۔ کسی عام آدمی کو براہ راست حکم نہیں دیا جاتا۔ خدا کا یہ حکم الہام ہے یا وحی یہی ذوالقرنین کے نبی ہونے کی دلیل ہے۔ آگے اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

بہرکیف ذوالقرنین نے کہا کہ اس قوم میں سے جو ظالم ہوگا، ہم اسے سزا دیں گے اور جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا، اسے معاف کر دیا جائے گا اور ہاں ظالم جب اللہ کی طرف لوٹیں گے تو وہاں بھی سخت عذاب ان کا منتظر ہوگا۔ پس جو ان میں سے ایمان لایا اور نیک راستہ اختیار کیا، خدا کے ہاں اس کی اچھی جزا ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ نرمی کا انداز اختیار کریں گے۔

مغربی مہم سے فارغ ہو کر اس نے مشرقی مہم شروع کی یہاں تک کہ طلوع آفتاب کی حد تک پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ سورج ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے پاس دھوپ سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں۔

غالباً یہ قوم جنگلی اور بے گھر قوم تھی جو ابھی تک فن تعمیر سے نا آشنا تھی۔

یہاں قبضہ و تصرف کے بعد ذوالقرنین تیسری مہم یعنی شمال کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ مہم جوئی کرتے کرتے وہ دو پہاڑوں کے درمیان یعنی انتہائی شمال میں ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو ان کی زبان نہیں جانتی تھی۔ بڑی مشکلوں سے انھیں سمجھایا گیا۔

اس قوم کے اکابرین ذوالقرنین کے دربار میں فریادی ہوئے کہ یہاں یاجوج اور ماجوج تباہی پھیلاتے رہتے ہیں۔ بادشاہ سلامت ہمارے اور اس قوم کے درمیان ایک بند تعمیر کر دیجیے، ہم اس کام کے لیے آپ کی حکومت کو ٹیکس دینے کے لیے تیار ہیں۔

بادشاہِ وقت ذوالقرنین نے جواب دیا: ''مجھے کسی ٹیکس کی ضرورت نہیں۔ مجھے میرے اللہ نے جو کچھ دے رکھا ہے، میرے لیے وہی کافی ہے۔ میں تمھارے اور ان کے درمیان بند باندھ دیتا ہوں تم صرف محنت سے میری مدد کرو۔''

بادشاہ نے لوہے کی چادریں لانے کے لیے کہا۔ ان چادروں سے پہاڑوں کے درمیانی درے کو پاٹ دیا گیا پھر آگ دھکا دی گئی۔ جب یہ لوہے کی چادریں پگھلنے لگیں تو ان پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دیا گیا۔ اس طرح یہ لوہے کی دیوار یاجوج ماجوج کے سامنے ایک مضبوط حد بن گئی۔ اب اسے عبور کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔

دیوار مکمل ہونے کے بعد ذوالقرنین نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا: ''یہ سب میرے ربّ کی رحمت ہے، مگر جب اللہ کا حکم آجائے گا تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا بے شک میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔''

تفاسیر میں مزید تفصیلات درج ہیں۔ مفسرین بڑی معتبر روایات کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ یہ اقوام یاجوج ماجوج بھی انسانی نسل میں سے ہیں، کیونکہ قرآن وحدیث میں کہیں جن وانس اور فرشتوں کے علاوہ ان [28] کے برابر کی مخلوق کا ذکر نہیں ملتا۔ مفسرین تو باقاعدہ ان نبیوں کے نام بھی بتاتے ہیں جن کو اس قوم کی طرف مبعوث کیا گیا۔

اس کے ساتھ ساتھ مفسرین اور محدثین یہ بھی بتاتے ہیں کہ یاجوج ماجوج صبح سے شام تک اس دیوار کو توڑنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ شام تک دیوار کا کچھ حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ شام کو وہ کل دوبارہ اس دیوار کے بقیہ حصہ کو توڑنے کا ارادہ کر کے کام ختم کر دیتے ہیں۔ اللہ کی قدرت سے ٹوٹی ہوئی دیوار رات کو جڑ جاتی ہے۔ وہ اگلے دن پھر پہلے کی طرح شام کو کام بند کر دیتے ہیں کہ یہ قوم اس کام پر اس وقت تک لگی رہے گی جب تک اللہ کی مرضی سے دیوار کے ٹوٹنے کا وقت نہیں آجاتا۔

بالآخر وہ انشاء اللہ کہہ کر کام شروع کریں گے تو یہ دیوار ٹوٹ جائے گی اور یاجوج ماجوج دنیا میں تباہی مچا دیں گے۔ ادھر عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوگا۔ وہ امت محمدیہ میں شامل ہوں گے۔ سب سے پہلے دنیا کو فتنہ دجال سے نجات دلائیں گے اور دوسری مہم یاجوج ماجوج کے خلاف شروع کریں گے۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی ملاقات

ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل [29] سے خطاب فرمار ہے تھے کہ کسی نے پوچھا فی زمانہ سب سے بڑا عالم کون ہے۔ آپؑ نے جواب دیا کہ مجھے اللہ بزرگ و برتر نے سب سے زیادہ علم عطا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناگوار گزری۔ فوراً وعید نازل ہوئی۔ تمھارا منصب یہ تھا کہ اپنے آپ کو علم خداوندی کے سپرد کرتے یعنی کہتے اللہ ہی علیم وخبیر ہے۔ اے موسیٰ مجمع البحرین پہ جاؤ۔ وہاں ہمارے ایک بندے سے ملو۔ وہ کئی امور میں تجھ سے زیادہ عالم ہے۔

حضرت موسیٰ نے عرض کیا: "اے پروردگار اس نیک بندے تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ایک مچھلی پکڑ کر اپنے توشہ دان میں رکھ لو اور مجمع البحرین کی طرف چلنا شروع کردو۔ جہاں وہ مچھلی غائب ہو جائے۔ اس مقام پر تلاش کرنے سے وہ بندہ مل جائے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی پکڑ کر اپنے توشہ دان (Tiften) میں رکھی اپنے خلیفہ یوشع بن نون علیہ السلام کو ساتھ لیا اور دو سمندروں کے ملاپ کی طرف کوچ کیا۔

وہ خدا کا نیک بندہ کون تھا۔ قرآن اس بارے میں خاموش ہے۔ اکثر علمائے تاریخ اور فقہائے حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ اس نیک بندے کا نام خضر علیہ السلام تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش کو نکل کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے اس مقام پر پہنچے جہاں دو سمندر آپس میں ملتے تھے۔ لمبی مسافت تھی۔ کافی دن مسلسل چلتے چلتے آپ نڈھال سے ہو چکے تھے۔ کچھ دیر ستانے کی غرض سے ایک پتھر پر ٹیک لگا کر سو گئے۔ آپؑ کے ساتھی یوشع بن نون پر بھی بیٹھتے ہی نیند طاری ہو گئی۔

اللہ کے حکم سے اس مچھلی میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ زنبیل (توشہ دان) سے نکل کر سمندر میں تیرنے لگی۔ خدا کی قدرت سے مچھلی جہاں تیرتی جا رہی تھی، وہاں پانی برف کی طرح جمتا چلا جا

رہا تھا۔ پانی پر برف کی ایک پٹی سی نمودار ہو رہی تھی۔ دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سمندر کے بیچ میں ایک خط یا لکیر کھینچ کر ایک پگڈنڈی بنا دی گئی ہے۔

اتفاق سے حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ سے پہلے بیدار ہو گئے۔ انھوں نے یہ سارا منظر بچشم خود دیکھ لیا، مگر جب موسیٰ علیہ السلام جاگے انھیں یہ واقعہ بتانا بھول گئے۔

انھوں نے اٹھتے ہی اپنا سفر دوبارہ شروع کیا مسلسل ایک دن اور ایک رات چلتے رہے۔ دوسرے دن کا آغاز تھا کہ موسیٰ فرمانے لگے۔ مجھے تھکان نے نڈھال کر دیا اور بھوک اپنی پوری شدت سے چمک اٹھی ہے۔ یوشعؑ لاؤ وہ مچھلی بھون کر کھاتے ہیں۔

یہاں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنی منزل تک موسیٰؑ کو تھکن محسوس نہیں ہوئی۔ یہ سفر بھول کی وجہ سے بتائی گئی منزل سے آگے کا تھا، اس لیے موسیٰ کو بھوک اور تھکاوٹ نے آلیا۔

مچھلی کا سن کر یوشع کو یاد آیا کہ وہ تو بتانا ہی بھول گئے پھر موسیٰ سے مخاطب ہوئے حضرت مقام صخرہ پر جب ہم لیٹ گئے تو مچھلی زنبیل سے نکل کر سمندر میں داخل ہو گئی۔ وہ جہاں جہاں چلتی گئی وہاں وہاں ایک راستہ نمودار ہوتا گیا اور جب آپؑ بیدار ہوئے تو میں یہ بتانا بھول گیا۔ شاید یہ شیطان کی کارستانی تھی۔

یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ”جس مقام کی ہمیں تلاش تھی، یہ وہی مقام ہے جہاں مچھلی غائب ہوئی۔“ پھر دونوں واپس مقام صخرہ کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچ کر موسیٰ علیہ السلام حضرت یوشعؑ کو باہر بٹھا کر مچھلی کے بنائے ہوئے راستے پر سمندر میں داخل ہو گئے جہاں یہ راستہ ختم ہوا، وہاں دیکھا تو حضرت خضر علیہ السلام عمدہ پوشاک پہنے بیٹھے تھے۔ موسیٰ نے سلام عرض کیا اور تعارف کروایا۔ میں ہوں موسیٰ۔ حضرت خضرؑ نے کہا: ”موسیٰ بنی اسرائیل کے نبی۔“

حضرت موسیٰ نے جواب دیا ”ہاں“ بزرگوار میں تم سے وہ علم حاصل کرنے آیا ہوں جو خدا نے صرف تمھیں عطا کیا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: ”تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکو گے۔ خدا تعالیٰ نے مجھے اپنے رموز و اسرار کا وہ تکوینی علم عطا کیا ہے جو تمھیں نہیں ملا اور خدا نے جو شرعی علم تجھے عطا کیا ہے، وہ مجھے نہیں ملا۔“

حضرت موسیٰ کہنے لگے: ”انشاء اللہ آپ مجھے صبر و ضبط کرنے والا پائیں گے۔“

پھر حضرت خضرؑ کہنے لگے: ”میں صرف ایک شرط پر تمھارے ساتھ چل سکتا ہوں کہ جو کچھ نظر آئے اگر تمھاری عقل اور علم کے منافی ہو تو اس پر اعتراض نہیں کرو گے، یہاں تک کہ میں خود اس کی

حقیقت تمھیں نہ بتا دوں۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''مجھے منظور ہے میں کسی عجیب بات پر اصرار نہیں کروں گا۔''

———(((اللہ اکبر)))———

یہ شرائط طے پانے کے بعد موسیٰؑ اور خضرؑ کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ وہ سمندر کی طرف چل پڑے۔ ساحل پر پہنچے تو ایک کشتی پر نظر پڑی۔ خضر علیہ السلام نے کشتی والوں سے کرایہ پوچھا۔ وہ کشتی والے خضر علیہ السلام کے واقف کار تھے۔ انھوں نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا اور بضد دونوں کو کشتی پر سوار کر لیا۔ کشتی سوئے منزل تیرنے لگی۔ کشتی کچھ زیادہ دیر نہ چلی تھی کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ کر سوراخ کر دیا۔

بڑا عجیب آدمی ہے۔ کشتی والوں نے مفت سوار کیا یعنی احسان کیا اور اس احسان کا یہ بدلہ۔ موسیٰ علیہ السلام سے برداشت نہ ہو سکا۔ کہنے لگے یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اس طرح تو یہ کشتی اپنے سواروں سمیت ڈوب جائے گی۔

خضر علیہ السلام نے کہا: ''ہوئی ناں وہی بات جو میں کہتا تھا کہ آپ صبر اور ضبط نہیں کر سکیں گے۔''

حضرت موسیٰؑ شرمندہ سے ہو کر کہنے لگے: ''بھول چوک معاف۔ میں تو اس وعدہ کو بالکل بھول ہی گیا تھا۔ اس لیے میرے ساتھ زیادہ سختی سے کام نہ لیں۔''

اسی اثناء میں ایک چڑی اڑتی ہوئی آئی اور ایک قطرہ پانی کا اٹھا کر چلتی بنی۔ اس پر حضرت خضر علیہ السلام یوں گویا ہوئے: ''بے شک علم الٰہی کے مقابلہ میں میرا اور تیرا علم ایسے ہی ہے جیسے چڑیا کی چونچ میں سمندر کے پانی کا یہ قطرہ۔''

اسی اثناء میں کشتی ساحل کے قریب چلی گئی۔ آپ دونوں اتر کر ایک سمت چل دیے۔ ان کا سفر ساحل کے ساتھ ساتھ جاری تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک میدان میں بچے کھیل رہے ہیں۔ حضرت خضرؑ نے آگے بڑھ کر ایک بچے کو پکڑا اور مار دیا۔

حضرت موسیٰؑ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ کہنے لگے: ''تم نے یہ کیا کیا۔ ناحق ایک معصوم کی جان لے لی۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔''

حضرت خضر بول اٹھے: ''میاں میں نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکیں گے۔''

حضرت موسیٰ نے درخواست کی: ''اس بار معاف کر دیجیئے ۔اگر آئندہ بھی ایسا ہی ہوا تو مجھے الگ کر دینا۔''

ایک بار پھر دونوں محوِ سفر ہوئے۔ چلتے چلتے ایک بستی میں پہنچے۔اس بستی کے رہنے والے خوشحال اور آسودہ حال تھے۔ مہمان نوازی ان پر واجب تھی۔آپؑ دونوں نے مہمان بننے کی درخواست کی۔ جسے بستی والوں نے ٹھکرا دیا۔آپ وہاں سے چل دیے۔ابھی بستی میں سے گزر رہے تھے کہ دیکھتے ہیں کہ ایک دیوار گرنے کے قریب ہے۔حضرت خضر نے سہارا دے کر اس دیوار کو کھڑا کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت پر یہ بات بھی گراں گزری۔سوچنے لگے بڑا عجیب آدمی ہے بستی والوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔اس دیوار کی مزدوری کے عوض کھانا حاصل کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو کیا نہیں، الٹا مفت کھاتے میں دیوار سیدھی کر دی۔بستی والوں نے یہی احسان کیا تھا کہ ہمیں بستی سے نکل جانے کا حکم دیا۔ایسے لوگوں کے ساتھ اس نیکی کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ یہ سوچ کر موسیٰ علیہ السلام نے ٹوکا، حضرت یہ تردد کرنے کی ضرورت کیا تھی۔

یہ الفاظ سن کر حضرت خضر علیہ السلام گرم ہو گئے۔ کہنے لگے: ''بس بھئی میرا تمھارا ساتھ ممکن نہیں۔''

"هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَ بَيْنِكَ"[30]

مفہوم: ''اب میری تمھاری جدائی کا وقت آ گیا ہے۔''

پھر حضرت خضرؑ نے ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی کے تابع تھا۔ میں نے کوئی کام اپنی طرف سے نہیں کیا، بلکہ خدا کی طرف سے عطا کردہ احکامات یا اس تکوینی علم کے مطابق کیا جو اپنی خاص عنایت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے۔

بعدازاں آپ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان واقعات کے حقائق بتائے اور رخصت ہو گئے۔ ان حقائق کو اللہ تعالیٰ نے سورہ الکہف میں جس طرح بیان کیا، اس کا مفہوم کچھ یونہی تھا جو اوپر بیان کیا گیا۔

قارئین!! یہ میری کمزوری۔کم علمی یا قرآن کے متعلق احتیاط سمجھ لیجئے جو ترجمے کو تفہیمی انداز میں لکھ رہا ہوں۔اس اندازِ تحریر کا کسی اور کو فائدہ ہو نہ ہو، مجھے کم از کم یہ فائدہ حاصل ہے کہ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ ترجمے میں کمی بیشی کی صورت میں جو مواخذہ ہوتا ہے، شاید مفہوم میں وہ مواخذہ نہ

ہو۔شاید کم علمی یا کم فہمی کی بنا پر اللہ کسی کی و بیشی سے درگزر فرمادے۔اس لیے لفظ ترجمہ کی بجائے مفہوم لکھ دیتا۔ ہوں اللہ ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمائے ''آمین''

ان واقعات کی حقیقت قرآن نے کچھ یوں بیان فرمائی:

''بس اب میرے اور تمھارے درمیان علیحدگی کا وقت آ گیا ہے، مگر جن باتوں پر آپؐ سے صبر نہیں ہوسکا، ان کی حقیقت کچھ یوں تھی۔ جس کشتی میں ہم نے سوراخ کیا، وہ کشتی چند مسکینوں کی ملکیت تھی اور وہ کشتی جس بندرگاہ پر اتر رہی تھی، وہاں کا ظالم بادشاہ ہر اچھی اور نئی کشتی اپنے قبضہ میں لے لیتا تھا۔ ان مساکین کی مدد کے لیے ہم نے اس کشتی میں سوراخ کر دیا تاکہ بادشاہ اسے پرانی سمجھ کر چھوڑ دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

رہا بچہ قتل کرنے کا معاملہ تو اس میں حقیقت یہ تھی کہ اس بچے کے والدین انتہائی نیک اور پاک باز تھے۔ یہ بچہ بڑا ہو کر سرکشی اور کفر کرنے والا تھا۔ مجھے اس کے والدین پر ترس آیا اور میرے دل نے گواہی دی کہ اس لڑکے کے عوض اللہ تعالیٰ انھیں نیک اور صالح اولاد عطا فرمائے، اس لیے اس بچے کو قتل کر دیا۔''

مفسرین کے بقول یہ امرِ ربی تھا۔ خضر علیہ السلام نے اپنی طرف سے نہیں کیا۔ بعدازاں واقعی اللہ تعالیٰ نے اس مقتول بچے کے والدین کو نیک اور صالح اولاد سے تسکین عطا کی۔

اور ہاں جو دیوار میں نے سیدھی کی، وہ دو یتیم لڑکوں کی ملکیت تھی۔ اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا۔ ان لڑکوں کا والد ایک نیک انسان تھا اور بستی کے لوگ ظالم تھے۔ بس تمھارے پروردگار کی مرضی یہ تھی کہ جب یہ نوعمر جوان ہوں تو ان کا خزانہ انھیں مل جائے۔

مفسرین کہتے ہیں اگر دیوار گر جاتی تو شاید لوگ خزانہ لوٹ کر لے جاتے، اس لیے خضر علیہ السلام نے اپنے ربّ کے حکم سے وہ دیوار سیدھی کر دی۔

آخر میں خضر علیہ السلام نے کہا: ''یاد رکھو میں نے جو کچھ کیا اللہ کے حکم سے کیا۔ اپنے اختیار سے نہیں کیا اور یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جس پر تم صبر نہ کر سکے۔''

اس کے بعد خضر علیہ السلام حضرت موسیٰؑ سے علیحدہ ہو گئے۔

———(((اللہ اکبر)))———

مشرکین کے وجود پر یہ بہت بڑا تازیانہ تھا۔ یہ ان کے سوالیہ عمل کا ردِعمل تھا۔ اپنے زُعم میں انھوں نے بہت بڑا علمی اور منطقی حملہ کیا تھا، مگر مدلل جوابی حملہ (Counter AttacK) نے نہ

Marfat.com

صرف مکہ بلکہ نواح مکہ میں حضورؐ کی سچی اور حقیقی شہرت کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بھرپور مخالفت نے تحریک اسلامی کو دوسرے علاقوں میں پہنچنے کا موقع فراہم کیا۔ مخالفت جتنی شدید ہوتی گئی، بانیٔ انقلابؐ اور اس کی تحریک کے اثرات اسی تیزی سے پھیلتے چلے گئے۔

اسلام نے تشہیر و اشاعت کی وہ منازل، جو بہت زیادہ مادی اور مالی وسائل خرچ کرنے کے بعد طے کرنا تھیں، وہ مخالفوں کی اندھی مخالفت کے باعث بغیر کسی کوشش کے طے ہو گئیں۔

اہل مدینہ بھی پہلے پہل مشرکین کی زبانی اسلام سے متعارف ہوئے۔ ان میں سے کچھ تو خود کسی غرض سے مدینہ آئے تو انھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت سے روکا گیا۔ یہ غالباً اوس و خزرج کے لوگ تھے جو تقریباً آدھی صدی کی جنگ و جدل میں اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے۔ اس طویل جنگ و جدل نے ان میں امن اور حقیقت پسندی کو پیدا کر دیا تھا۔ یہ لوگ لڑائی جھگڑوں سے گھن اور اکتاہٹ محسوس کر رہے تھے۔ جب انھیں ایک نبی کے متعلق بتایا گیا، گو بتانے والے اسے جادو گر کاہن یا کاذب کی شکل میں پیش کر رہے تھے (نعوذ باللہ)، لیکن سننے والے افراد کے ذہن حقیقت کو سمجھنے اور پرکھنے کا ادراک حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے وہ فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آتے گئے۔

ان کے علاوہ یہودِ مدینہ سے بار بار مدد طلب کی گئی۔ جس کے جواب میں قرآنی زبان وا ہوئی تو اہلِ مدینہ کے تمام شکوک دور ہوتے گئے اور وہ اسلام کی حقانیت کے قائل ہوتے چلے گئے۔

یہ کہنا بجا ہے کہ اہل مدینہ صرف اور صرف مشرکین کی مخالفت کی وجہ سے اسلام کے قریب آئے اور ایسا قریب آئے کہ آئندہ چند سالوں میں اسلامی تحریک کا بنیادی ستون ثابت ہوئے۔ مستقبل قریب میں ان کا تجسس یقین میں بدل گیا۔ پھر تجسس یقین میں ایسا بدلہ کہ جذبوں کی بام عروج تک جا پہنچا، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا ان کا یقین جذبوں کی معراج پہ جا ٹھہرا۔

یقیناً اہل مدینہ کے جذبات کی ترجمانی کے لیے یہ مناسب وقت نہیں۔ ان کے جذبات کو مناسب وقت پر پیش کیا جائے گا۔

———(((الحمد للہ)))———

حواشی:

1- سیرت انبیاء اکرام، جلد اول، صفحہ 295-294۔ ابن کثیر تفسیر سورہ یوسف تفہیم القرآن، انوار القرآن، تفسیر مظہری۔

2- سیرت الانبیاء، جلد اول۔

3- یہ روایت تورات کی ہے۔

4- کچھ روایتوں میں شہر ''حران'' لکھا ہے اور کچھ میں شہر فدان درج ہے۔

5- ان دنوں دو سگی بہنیں بیک وقت نکاح رکھی جاسکتی تھیں۔ مگر شریعت محمدیہ میں جائز نہیں۔

6- سورہ بقرہ، آیات 132-133-136-140۔ سورہ انعام، آیت 84۔ سورہ مریم، آیت 6۔ سورہ انبیاء، آیت 72۔ سورہ نساء، آیت 163۔ سورہ یوسف، آیات 6-38۔ سورہ ص، آیت 45

7- بعض مفسرین نے قافلہ سالار کا نام مالک بن زعر لکھا ہے۔

8- بدرہ اس وقت ایسی تھیلی کو کہتے تھے جس میں سات ہزار دینار یا ایک ہزار درہم ہوتے تھے۔

9- سورہ یوسف آیت 30 اور آیت 51

10- سورہ یوسف آیت نمبر 23 تا 35

11- مسند احمد۔ مستدرک حاکم، سیرت انبیاء اکرام، جلد اول۔

12- ابن کثیر۔

13- سورہ یوسف۔ آیات 36 تا 42

14- سورہ یوسف۔ آیات 50 تا 57

15- سورہ یوسف۔ آیات 58 تا 68۔ تفہیم القرآن۔ تفسیر ابنِ کثیر۔ تفسیر مظہری۔ ترجمان القرآن۔

16- یہ روایت تورات کی ہے۔

17- یہ تمام واقعات دیکھیے سورہ یوسف آیت 69 تا 87

18- تفسیر در منثور سورۃ یوسف۔

19- تفسیر مظہری سورۃ یوسف، سیرت انبیاء اکرام قصص القرآن اور تفسیر قرطبی

Marfat.com

20- تفہیم القرآن سورہ یوسفؑ آیت 88

21- سیرت انبیاء اکرام جلد اول

22- سورۃ یوسف آیات 88 تا 98

23- تفسیر ابن کثیر بروایت حضرت حسنؓ

24- سیرت انبیاء اکرام جلد اول، تفسیر مظہری سورۃ یوسف آیات 99 تا 104

25- سورہ بقرہ، پہلا رکوع۔

26- تاریخ ابن ہشام۔

27- ابن کثیر البدائیہ والنہائیہ

28- بہشتی زیور از مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

29- قصص القرآن۔

30- سورۃ الکہف رکوع 9-10

Marfat.com

آفرین ہے کہ اس کے باوجود، انھوں نے کلمہ حق کہہ دیا اور کہا کہ ہمارا خدا اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ وہ اس زمین و آسمان کا مالک و خالق ہے اور ہم اسی خدا کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کسی کو معبود تسلیم نہیں کرتے۔ اگر ہم کسی اور کو معبود مانیں تو یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔

اس طرح ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا یقیناً بڑے دل گردے کا کام ہے۔ مطلبی اور لالچی لوگ ایسا نہیں کر پاتے۔

خدا کا نام سن کر بادشاہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ پہلے تو قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر کہتا ہے: ''جاؤ میں تمھیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ ان دنوں میں تمھارا عقیدہ بدل گیا تو ٹھیک، ورنہ سرعام پھانسی لگا دیئے جاؤ گے۔''

اس مختصر مدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، وہ نوجوان بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان دنوں میں وہ بس چلتے ہی چلے گئے۔ شہر اور آبادیاں ان کے راستے میں آتی رہیں، مگر وہ کہیں رکے نہیں۔ اس طرح وہ کسی دور افتادہ پہاڑی سلسلے میں جا گھسے۔ راستے میں کہیں سے ایک کتا بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ انھوں نے کتے کو بھگانے کی پوری کوششیں کیں، مگر اس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بس ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

چلتے چلتے دفعتاً انھیں ایک وسیع و عریض غار کا دہانہ نظر آیا۔ اسے محفوظ جان کر وہ غار کے اندر چلے گئے۔ ان کا کتا غار کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ تمام نوجوان بڑی لمبی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ تھکاوٹ سے اعصاب ٹوٹ رہے تھے۔ چنانچہ وہ غار کے اندر بیٹھتے ہی سو گئے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے ان پر لمبی نیند طاری کر دی اور وہ سوئے رہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات بڑی قدرتوں والی ہے۔

اس کی قدرت کاملہ کے کمالات اس کائنات ارضی پر بکھرے پڑے ہیں۔ ان توحید پرستوں پر خدا کی خاص عنایت ہوئی۔ لمبی نیند کے دوران میں نہ انھیں بھوک لگی، نہ ان کے جسموں کو زمین نے گزند پہنچائی اور نہ کوئی جنگلی جانور یا حشرات الارض میں سے کوئی زہریلا کیڑا ان تک پہنچ سکا۔

مفسرین کے بقول یہ نوجوان (309) یا تین سو (300) سال اسی حالت میں سوئے رہے اور ہر گزند سے محفوظ رہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

جب وہ بیدار ہوئے تو دنیا بدل چکی تھی۔ چندا دیوی ڈائنا (Diana) کے پجاری مسیحیت اختیار کر چکے تھے اور فقہی اور فروعی بحثوں میں الجھ چکے تھے۔ مسیحیت کی شکل میں گو توحید اپنائی جا

Marfat.com

چکی تھی، مگر عقیدۂ آخرت اور حیات بعد الموت کے عقیدے میں ابھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ بھاری اکثریت اب بھی عقیدہ آخرت کی منکر تھی۔

انھیں دنوں اصحاب کہف لمبی نیند سے بیدار ہوتے ہیں۔

یاد رہے کہف اس پہاڑی غار کو کہتے ہیں جو وسیع و عریض ہو۔ جو تنگ اور چھوٹی ہو اسے غار ہی کہا جاتا ہے۔ وہ نیند سے اٹھ کر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ وہ کتنی دیر سوئے۔ ان میں سے ہر ایک نے قیاس آرائی کی۔ کسی نے ایک دن، کسی نے آدھا دن، کسی نے دن کا بھی چوتھائی حصہ بتایا۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی دیر سوئے؟

جاگنے کے تھوڑی دیر بعد انھیں بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ انھوں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں تو چاندی کے کچھ سکے برآمد ہوئے۔ وہ سکے انھوں نے اپنے ایک ساتھی کو دیئے اور کہا کہ جاؤ شہر سے سامان خورد ونوش خرید لاؤ۔

اور ساتھ ہی نصیحت کرتے ہیں۔ دیکھنا پوری پوری احتیاط برتنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ تمھیں پہچان کر سنگسار کر دیں یا بادشاہ کے حوالے کر دیں۔ اگر بادشاہ کو خبر ہو گئی تو ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ یا تو اللہ کا نام لینا چھوڑ دیں اور یا پھر اللہ کی راہ میں جان دے دیں۔ اگر انھوں نے زبردستی اپنے مذہب میں شامل کر لیا تو یقیناً ہم فلاح نہ پا سکیں گے۔

جب یہ شخص شہر میں داخل ہوا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نہ کہیں مندر ہے اور نہ بت پرستی۔ مندروں کی جگہ ہیکل (مساجد) یا گرجے تعمیر ہو چکے ہیں۔ لوگ عیسائیت کے مطابق عبادت کر رہے ہیں۔

پھر بھی وہ ڈرتا ڈرتا ایک تندور یا کلچہ فروش کی دکان پر پہنچا۔ وہاں سے چند روٹیاں خریدیں اور چاندی کے سکے تھما دیئے۔ ان چاندی کے سکوں پر پرانے بادشاہ کی تصویر تھی۔ یہ کرنسی تو مدتوں پہلے تبدیل ہو چکی تھی۔

دکاندار روپے دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ پوچھتا ہے یہ روپے تو نے کہاں سے لئے ہیں۔ وہ نوجوان جواب دیتا ہے۔ یہ روپے تو میرے اپنے ہیں میں نے کہیں سے نہیں لئے۔

دکاندار اور نوجوان میں تو تکار شروع ہو جاتی ہے۔ بات بڑھتے بڑھتے دور نکل جاتی ہے۔ لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے۔ ہر کوئی دیکھنے والا یہ کرنسی دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ بات چلتی چلتی کوتوال تک پہنچ جاتی ہے۔ پولیس پکڑ کر معاملے کو کوتوال کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔

کوتوال نوجوان سے پوچھتا ہے: ''اے نوجوان صحیح صحیح بات کرو۔ یہ سکہ تو بہت پرانا ہے اس

وقت جب یہ سکہ رائج تھا۔فلاں بادشاہ کی حکومت تھی۔اس کو مرے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔یہ سکہ تو ہمارے بوڑھوں نے بھی نہیں دیکھا۔جبکہ تم ابھی نوجوان ہو۔سچ بتاؤ اصل معاملہ کیا ہے۔

نوجوان یہ سن کر حیران رہ گیا کہ جس ظالم بادشاہ کے خوف سے وہ غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے، وہ مدت پہلے مر چکا۔واقعہ بڑا چونکا دینے والا تھا۔نوجوان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔رنگ فق ہوگیا۔کچھ دیر وہ دم بخود حالت میں کھڑا رہا اور پھر آہستگی سے خود کلامی کے انداز میں کہنے لگا:

''اس ظالم بادشاہ کے خوف اور ڈر سے ابھی کل ہی تو میں اور میرے ساتھیوں نے ایک غار میں پناہ لی تھی۔''

واقعہ تو ناقابل یقین تھا۔اس لئے کوتوال اس نوجوان کو لے کر اس غار کی طرف چل نکلا۔لوگوں کا ہجوم بھی ان کے ساتھ تھا۔وہاں پہنچ کر یہ بات سچ ثابت ہوگئی جو لوگوں میں پہیلی کی طرح عام ہوگئی کہ پرانے زمانے میں چند نوجوان اپنا ایمان بچانے کے لئے غائب ہوگئے تھے۔پھر ان کا آج تک پتا نہیں چل سکا۔

یہ خبر ایسی نہ تھی جو چھپی رہ جاتی۔آناً فاناً پورے شہر میں یہ ہوا پھیل گئی کہ ظالم بادشاہ کے خوف سے غائب ہونے والے نوجوان مل گئے ہیں۔تین سو سال پرانا واقعہ تھا۔بڑا حیران کن اور پر تجسس تھا۔لوگ جوق در جوق ان کو دیکھنے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔بادشاہ وقت کو پتا چلا تو خود حاضر خدمت ہوا اور دعائیں حاصل کیں۔

اب ان نوجوانوں پر حقیقت افشا ہوئی کہ وہ تین سو سال پہلے کے لوگ ہیں۔انھوں نے لوگوں سے سلام ودعا کی اور غار میں جا کر لیٹ گئے۔اس کے بعد عوام الناس نے تلاش کی ہزار کوششیں کیں، مگر ان کو ملنا تھا نہ ملے۔

اور جب لوگ تلاش سے مایوس ہوگئے تو انھوں نے یادگار کے طور پر اس پہاڑی پر ایک مسجد تعمیر کر دی۔

یوں قوم میں جو مناظرہ حیات بعد الموت کا چل رہا تھا، ختم ہوگیا۔اصحاب کہف کا یہ واقعہ قوم میں پھیلے غلط اختلافات کو ختم کر گیا۔لوگوں کو یقین آ گیا کہ اگر یہ نوجوان تین سو سال سونے کے بعد اسی حالت میں اٹھائے جا سکتے ہیں جس حالت میں سوئے تھے تو انسان مرنے کے بعد کیوں نہیں اٹھایا جا سکتا۔جو خالق کائنات یہ سب کچھ کر سکتا ہے، اس کے لیے مرنے کے بعد زندہ کر لینا کونسا مشکل کام ہے۔

Marfat.com

———(((اللہ اکبر)))———

قارئین یہ واقعہ مشرکین کے سوال کرنے پر پیش کیا گیا۔اب ذرا سرد جنگ کے حوالے سے غور کیجئے اور سورہ کہف کی اثر آفرینی کا اندازہ لگایئے کہ کل تک جو لوگ اس زُعم میں یہ سوال کر رہے تھے کہ اس کا جواب محمد ﷺ کے پاس نہیں ہے۔اس یقین کے ساتھ سوال کر رہے تھے کہ اس کا جواب نہ ملنے کی صورت میں ہم محمد ﷺ کو جھٹلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔اسلام سے متاثر ہونے والوں کو سمجھانا آسان ہو جائے گا کہ دیکھیں میاں! ہم نے محمد ﷺ سے یہ سوال کیا تھا جس کا جواب وہ نہیں دے پائے۔یقیناً اگر وہ نبی ہوتے اور واقعی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہوتے تو یہ کونسی مشکل بات تھی۔پھر جس دنیا اور آخرت والے خدا کی وہ بات کرتے ہیں، اگر واقعی محمد ﷺ کا خدا ایسا ہی تھا جیسا وہ بتاتے ہیں تو اس کے لئے یہ گرہ کھول دینا کونسا مشکل کام تھا۔بس میاں! چھوڑو کس کے پیچھے لگے ہوئے ہو (نعوذ باللہ) یہ سب جھوٹ ہے۔

لیکن مشرکین کے تصورات کی عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ان کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی جب سورۃ کہف نے تاریخ کا سربستہ راز کھول کے رکھ دیا۔گم گشتہ اوراق تاریخ کو ان کے سامنے پیش کر دیا تو انھیں چھپنے کے لیے جگہ نہیں مل رہی تھی۔

آج ہم پیدائشی مسلمان قرآن کے ان اثرات کو محسوس کرنے سے قاصر ہیں جو اہلِ مکہ نے محسوس کئے تھے۔ذرا دیکھئے جب یہ واقعہ پہلی دفعہ اہلِ مکہ کے سامنے پیش کیا گیا ہوگا تو وہ کیوں نہ جھوم جھوم اٹھے ہوں گے۔اصحاب کہف کے آئینے میں حضور ﷺ اور صحابہ اکرام کی جماعت کو دیکھ رہے ہوں گے انھیں اصحاب کہف کی تصویریں اسلام کے فدائیوں کی شکل میں نظر آ رہی ہوں گی۔

ظالم اور بت پرست بادشاہ کا سراپا مشرکین مکہ کی صورت میں نظر آ رہا ہوگا۔(Diana) چندا دیوی کے پجاری لات منات اور عُزیٰ کی شکل میں دکھائی دیتے ہوں گے یقیناً کرداروں کی اس مماثلت نے سچے کو سچا اور جھوٹے کو جھوٹا ثابت کر دیا ہوگا۔لامحالہ کئی نوجوان یہ سن کر واشگاف اعلانِ حق کر چکے ہوں گے۔کئی مناسب موقع کی تلاش کر رہے ہوں گے اور کئی سچ اور جھوٹ کے تجسس میں گھر گئے ہوں گے۔

پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مخالفینِ اسلام بھی عقیدۂ آخرت کے منکر تھے۔عقیدۂ آخرت ایسی حقیقت ہے جو ماننے والوں کو خود بخود توحید کا پابند بنا دیتا ہے۔روزِ جزا اور اعمال کی جوابدہی کا تصور انسان کو احکاماتِ خداوندی کا پابند بنا دیتا ہے اور جب تصورِ آخرت عقیدۂ آخرت میں بدل جائے تو تمام عقائد خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔مثلاً عقیدۂ آخرت اور احکامات الٰہی کا ذریعہ تو

رسالت ہی ہے۔ بندوں پر احکامات الٰہی علیحدہ علیحدہ تو نازل نہیں ہوتے۔ یہ تو سب کچھ کسی رسول یا نبی کے ذریعے بتایا جاتا ہے۔ جب آخرت، روز جزا و سزا، جنت اور دوزخ کو مان لیا تو رسالت کو تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ باقی نہیں رہتی۔

اصحابِ کہف کے مذکورہ واقعہ میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ شہر افسوس (Afcivis) کے لوگ رسالت کو مان لینے کے باوجود اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ مرنے کے بعد انسان کو کیسے زندہ کیا جائے گا۔ تقریباً تین سو سال پہلے والے جوانوں کو پیش کر کے شہر افسوس والوں پر یہ واضح کر دیا گیا کہ اگر ان نوجوانوں کو اتنا عرصہ حالتِ نیند میں رکھنے کے بعد اسی حالت میں جگایا جا سکتا ہے جس حالت میں وہ سوئے تھے تو مرنے کے بعد انسان کو زندہ کر لینا کونسا مشکل ہے۔ افسوس (Afcivis) والوں نے یہ دیکھا تو سارا جھگڑا ختم ہو گیا اور وہ آخرت کے قائل ہو گئے۔

یہ تو ''کہنا بیٹی کو اور سمجھانا بہو کو'' والی بات ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ تاریخ کا ایک گم گشتہ واقعہ ہے، لیکن اس کے مخاطب اہلِ مکہ تھے۔ وہ بھی تو آخرت سے انکار کر رہے تھے۔ واقعہ پرانا تھا، لیکن عبرت اور نصیحت کی جدت لیے ہوئے تھا۔ مشرکین کو بڑا کھل کر بتایا جا رہا ہے کہ دیکھو ایک ظالم اور بت پرست بادشاہ نے اللہ کے ماننے والوں سے کیا سلوک کیا اور اللہ نے اپنے بندوں پر کیسا کرم فرمایا۔ انھیں کس نے کامران کیا اور ان کو لوگوں کے لیے کس نے ذریعہ ہدایت بنایا۔

اے اہلِ مکہ آج تم بھی اس روش پر چل نکلے ہو۔ تمھارے پاس میرا رسول میری آیات بیان کر رہا ہے۔ تمھیں ہدایت کی طرف بلا رہا ہے اور تم اس کی مخالفت کر رہے ہو۔ دیکھ لینا تمھارا انجام ان ظالموں سے مختلف نہیں ہوگا۔

یہ واقعہ ایک تعبیر بھی ہے اور عبر بھی۔ ایک نصیحت بھی ہے اور دھمکی بھی۔ مخالفین کے سوال کا جواب بھی ہے اور بدعقیدہ لوگوں کے لئے ایک نیا سوال بھی۔ مشرکین کی عقل کا تاریخی ماتم بھی ہے اور عقل والوں کے لیے کامیابی کی نوید بھی۔

جن کے مقدر میں ہدایت لکھی جا چکی تھی، وہ بلا خوف و خطر حصار دین میں داخل ہو گئے اور جن کی قسمت تاریک تھی، وہ اس بحرِ فیض کے ساحل پر کھڑے ہو کر بھی پیاسے ہی رہے۔

———(((الحمد للہ)))———

نوٹ:۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے۔ تفسیر ابن کثیر۔ سورہ الکہف، تفہیم القرآن تفسیر عثمانی، تفسیر مظہری، موضح القرآن۔ قصص الانبیاء سیرت انبیاء اکرام۔

Marfat.com

ذوالقرنین کون تھے؟

ذوالقرنین کا اصل نام مصعب[26] بن عبداللہ تھا۔ یہ سام بن نوحؑ کی اولاد میں سے تھے۔ بعض ماہرین علم الانساب ان کا سلسلہ حمیر بن سبا سے ملاتے ہیں جو تاریخ میں سبائی خاندان کے نام سے معروف تھا۔ ذوالقرنین اس شخص کا لقب ہے، مگر قرآن نے بھی یہ لقب ہی استعمال کیا ہے۔ اس کا دور حکومت تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح ہے۔ اس لحاظ سے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہم عصر ہیں۔

دراصل عربی میں ''قرن'' سینگ کو کہتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے مشرق و مغرب تک حکومت کی، اس لیے اسے ذوالقرنین یعنی دو قرنوں والا کہا گیا۔

ذوالقرنین اللہ کے نبی[27] تھے۔ سلیمان علیہ السلام کی طرح نیک اور عادل بادشاہ تھے۔ ان کے وزیر اعظم حضرت خضر علیہ السلام تھے جن کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آتا ہے۔

ذوالقرنین پیادہ پا حج کے لئے گئے۔ ان دنوں حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں تھے۔ انھیں پتا چلا تو ذوالقرنین کا مکہ سے باہر نکل کر استقبال کیا۔ پھر آپ دونوں حرم شریف میں گئے۔ طواف کعبہ کیا قربانیاں دیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کے لیے دعا اور نصیحت فرمائی۔

بعض مفسرین کے بقول وہ دو قرن یعنی دو صدیاں تخت حکومت پر براجمان رہے۔

قرآن نے آپؑ کے چار اوصاف بیان کیے ہیں۔

1-لقب یا نام ذوالقرنین تھا۔

2-وہ اتنے بڑے حکمران تھے کہ عنانِ حکومت مشرق و مغرب سے لے کر شمال تک پھیلی ہوئی تھی۔

3-وہ صاحب ایمان اور عادل بادشاہ تھے۔

4-یاجوج اور ماجوج سے بچاؤ کے لیے ایک آہنی دیوار تعمیر کی۔ آیئے قرآنی اثرات سے بھی استفادہ کر کے دیکھیں۔ قرآن ذوالقرنین کا ذکر کچھ یوں کرتا ہے۔

Marfat.com

مفہوم: ہم نے ان کو زمین پر صاحب اقتدار بنایا اور ایسا صاحب اقتدار بنایا کہ ہر قسم کے وسائل کی بھر مار کر دی۔ اس اللہ کے نیک بندے نے پہلے مغرب کی طرف مہم جوئی کی، یہاں تک کہ وہ غروب آفتاب کی جگہ پر پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ سورج ایک کالے پانی کی جھیل میں غروب ہو رہا ہے۔

وہاں اسے ایک ظالم، مشرک اور بے ہدایت قوم ملی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ''اے ذوالقرنین تمھیں کھلی چھٹی ہے جس طرح چاہو، اس قوم پر تصرف کرو یعنی سزا دو یا نرمی برتو۔''

قارئین!! یہی چیز ذوالقرنین کو نبی ثابت کرتی ہے۔ کسی عام آدمی کو براہ راست حکم نہیں دیا جاتا۔ خدا کا یہ حکم الہام ہے یا وحی یہی ذوالقرنین کے نبی ہونے کی دلیل ہے۔ آگے اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

بہر کیف ذوالقرنین نے کہا کہ اس قوم میں سے جو ظالم ہوگا، ہم اسے سزا دیں گے اور جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا، اسے معاف کر دیا جائے گا اور ہاں ظالم جب اللہ کی طرف لوٹیں گے تو وہاں بھی سخت عذاب ان کا منتظر ہوگا۔ پس جو ان میں سے ایمان لایا اور نیک راستہ اختیار کیا، خدا کے ہاں اس کی اچھی جزا ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ نرمی کا انداز اختیار کریں گے۔

مغربی مہم سے فارغ ہو کر اس نے مشرقی مہم شروع کی یہاں تک کہ طلوع آفتاب کی حد تک پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ سورج ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے پاس دھوپ سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں۔

غالباً یہ قوم جنگلی اور بے گھر قوم تھی جو ابھی تک فن تعمیر سے نا آشنا تھی۔

یہاں قبضہ و تصرف کے بعد ذوالقرنین تیسری مہم یعنی شمال کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ مہم جوئی کرتے کرتے وہ دو پہاڑوں کے درمیان یعنی انتہائی شمال میں ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو ان کی زبان نہیں جانتی تھی۔ بڑی مشکلوں سے انھیں سمجھایا گیا۔

اس قوم کے اکابرین ذوالقرنین کے دربار میں فریادی ہوئے کہ یہاں یاجوج اور ماجوج تباہی پھیلاتے رہتے ہیں۔ بادشاہ سلامت ہمارے اور اس قوم کے درمیان ایک بند تعمیر کر دیجیے، ہم اس کام کے لیے آپ کی حکومت کو ٹیکس دینے کے لیے تیار ہیں۔

بادشاہِ وقت ذوالقرنین نے جواب دیا: ''مجھے کسی ٹیکس کی ضرورت نہیں۔ مجھے میرے اللہ نے جو کچھ دے رکھا ہے، میرے لیے وہی کافی ہے۔ میں تمھارے اور ان کے درمیان بند باندھ دیتا ہوں تم صرف محنت سے میری مدد کرو۔''

Marfat.com

بادشاہ نے لوہے کی چادریں لانے کے لیے کہا۔ ان چادروں سے پہاڑوں کے درمیانی درے کو پاٹ دیا گیا پھر آگ دھکا دی گئی۔ جب یہ لوہے کی چادریں پگھلنے لگیں تو ان پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دیا گیا۔ اس طرح یہ لوہے کی دیوار یاجوج ماجوج کے سامنے ایک مضبوط حد بن گئی۔ اب اسے عبور کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔

دیوار مکمل ہونے کے بعد ذوالقرنین نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا: "یہ سب میرے ربّ کی رحمت ہے، مگر جب اللہ کا حکم آجائے گا تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا بے شک میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔"

تفاسیر میں مزید تفصیلات درج ہیں۔ مفسرینؒ بڑی معتبر روایات کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ یہ اقوام یاجوج ماجوج بھی انسانی نسل میں سے ہیں، کیونکہ قرآن وحدیث میں کہیں جن وانس اور فرشتوں کے علاوہ ان 28 کے برابر کی مخلوق کا ذکر نہیں ملتا۔ مفسرین تو باقاعدہ ان نبیوں کے نام بھی بتاتے ہیں جن کو اس قوم کی طرف مبعوث کیا گیا۔

اس کے ساتھ ساتھ مفسرین اور محدثین یہ بھی بتاتے ہیں کہ یاجوج ماجوج صبح سے شام تک اس دیوار کو توڑنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ شام تک دیوار کا کچھ حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ شام کو وہ کل دوبارہ اس دیوار کے بقیہ حصہ کو توڑنے کا ارادہ کر کے کام ختم کر دیتے ہیں۔ اللہ کی قدرت سے ٹوٹی ہوئی دیوار رات کو جڑ جاتی ہے۔ وہ اگلے دن پھر پہلے کی طرح شام کو کام بند کر دیتے ہیں کہ یہ قوم اس کام پر اس وقت تک لگی رہے گی جب تک اللہ کی مرضی سے دیوار کے ٹوٹنے کا وقت نہیں آجاتا۔

بالآخر وہ انشاء اللہ کہہ کر کام شروع کریں گے تو یہ دیوار ٹوٹ جائے گی اور یاجوج ماجوج دنیا میں تباہی مچا دیں گے۔ ادھر عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوگا۔ وہ امت محمدیہ میں شامل ہوں گے۔ سب سے پہلے دنیا کو فتنہ دجال سے نجات دلائیں گے اور دوسری مہم یاجوج ماجوج کے خلاف شروع کریں گے۔

———(((الحمد للہ)))———

موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی ملاقات

ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل[29] سے خطاب فرما رہے تھے کہ کسی نے پوچھا فی زمانہ سب سے بڑا عالم کون ہے۔ آپؑ نے جواب دیا کہ مجھے اللہ بزرگ و برتر نے سب سے زیادہ علم عطا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناگوار گزری۔ فوراً وعید نازل ہوئی۔ تمھارا منصب یہ تھا کہ اپنے آپ کو علم خداوندی کے سپرد کرتے یعنی کہتے اللہ ہی علیم وخبیر ہے۔ اے موسیٰ مجمع البحرین پہ جاؤ۔ وہاں ہمارے ایک بندے سے ملو۔ وہ کئی امور میں تجھ سے زیادہ عالم ہے۔

حضرت موسیٰ نے عرض کیا: "اے پروردگار اس نیک بندے تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ایک مچھلی پکڑ کر اپنے توشہ دان میں رکھ لو اور مجمع البحرین کی طرف چلنا شروع کر دو۔ جہاں وہ مچھلی غائب ہو جائے۔ اس مقام پر تلاش کرنے سے وہ بندہ مل جائے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی پکڑ کر اپنے توشہ دان (Tiften) میں رکھی اپنے خلیفہ یوشع بن نون علیہ السلام کو ساتھ لیا اور دو سمندروں کے ملاپ کی طرف کوچ کیا۔

وہ خدا کا نیک بندہ کون تھا۔ قرآن اس بارے میں خاموش ہے۔ اکثر علمائے تاریخ اور فقہائے حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ اس نیک بندے کا نام خضر علیہ السلام تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش کو نکل کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے اس مقام پر پہنچے جہاں دو سمندر آپس میں ملتے تھے۔ لمبی مسافت تھی۔ کافی دن مسلسل چلتے چلتے آپ نڈھال سے ہو چکے تھے۔ کچھ دیر ستانے کی غرض سے ایک پتھر پر ٹیک لگا کر سو گئے۔ آپؑ کے ساتھی یوشع بن نون پر بھی بیٹھتے ہی نیند طاری ہو گئی۔

اللہ کے حکم سے اس مچھلی میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ زنبیل (توشہ دان) سے نکل کر سمندر میں تیرنے لگی۔ خدا کی قدرت سے مچھلی جہاں تیرتی جا رہی تھی، وہاں پانی برف کی طرح جمتا چلا جا

Marfat.com

رہا تھا۔ پانی پر برف کی ایک پٹی سی نمودار ہو رہی تھی۔ دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سمندر کے بیچ میں ایک خط یا لکیر کھینچ کر ایک پگڈنڈی بنا دی گئی ہے۔

اتفاق سے حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ سے پہلے بیدار ہو گئے۔ انھوں نے یہ سارا منظر بچشم خود دیکھ لیا، مگر جب موسیٰ علیہ السلام جاگے انھیں یہ واقعہ بتانا بھول گئے۔

انھوں نے اٹھتے ہی اپنا سفر دوبارہ شروع کیا مسلسل ایک دن اور ایک رات چلتے رہے۔ دوسرے دن کا آغاز تھا کہ موسیٰؑ فرمانے لگے۔ مجھے تھکان نے نڈھال کر دیا اور بھوک اپنی پوری شدت سے چمک اٹھی ہے۔ یوشعؑ لاؤ وہ مچھلی بھون کر کھاتے ہیں۔

یہاں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنی منزل تک موسیٰ کو تھکن محسوس نہیں ہوئی۔ یہ سفر بھول کی وجہ سے بتائی گئی منزل سے آگے کا تھا، اس لیے موسیٰؑ کو بھوک اور تھکاوٹ نے آلیا۔

مچھلی کا سن کر یوشع کو یاد آیا کہ وہ تو بتانا ہی بھول گئے پھر موسیٰؑ سے مخاطب ہوئے حضرت مقام صخرہ پر جب ہم لیٹ گئے تو مچھلی زنبیل سے نکل کر سمندر میں داخل ہو گئی۔ وہ جہاں جہاں چلتی گئی وہاں وہاں ایک راستہ نمودار ہوتا گیا اور جب آپؑ بیدار ہوئے تو میں یہ بتانا بھول گیا۔ شاید یہ شیطان کی کارستانی تھی۔

یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "جس مقام کی ہمیں تلاش تھی، یہ وہی مقام ہے جہاں مچھلی غائب ہوئی۔" پھر دونوں واپس مقامِ صخرہ کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچ کر موسیٰ علیہ السلام حضرت یوشعؑ کو باہر بٹھا کر مچھلی کے بنائے ہوئے راستے پر سمندر میں داخل ہو گئے جہاں یہ راستہ ختم ہوا، وہاں دیکھا تو حضرت خضر علیہ السلام عمدہ پوشاک پہنے بیٹھے تھے۔ موسیٰ نے سلام عرض کیا اور تعارف کروایا۔ میں ہوں موسیٰؑ۔ حضرت حضرؒ نے کہا: "موسی بنی اسرائیل کے نبی۔"

حضرت موسیٰ نے جواب دیا "ہاں" بزرگوار میں تم سے وہ علم حاصل کرنے آیا ہوں جو خدا نے صرف تمھیں عطا کیا ہے۔

حضرت حضر علیہ السلام نے فرمایا: "تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکو گے۔ خدا تعالیٰ نے مجھے اپنے رموز و اسرار کا وہ تکوینی علم عطا کیا ہے جو تمھیں نہیں ملا اور خدا نے جو شرعی علم تجھے عطا کیا ہے، وہ مجھے نہیں ملا۔"

حضرت موسیٰ کہنے لگے: "انشاء اللہ آپ مجھے صبر و ضبط کرنے والا پائیں گے۔"

پھر حضرت خضرؒ کہنے لگے: "میں صرف ایک شرط پر تمھارے ساتھ چل سکتا ہوں کہ جو کچھ نظر آئے اگر تمھاری عقل اور علم کے منافی ہو تو اس پر اعتراض نہیں کرو گے، یہاں تک کہ میں خود اس کی

حقیقت تمھیں نہ بتادوں۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''مجھے منظور ہے میں کسی عجیب بات پر اصرار نہیں کروں گا۔''

(((اللہ اکبر)))

یہ شرائط طے پانے کے بعد موسیٰ اور خضرؑ کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ وہ سمندر کی طرف چل پڑے۔ ساحل پر پہنچے تو ایک کشتی پر نظر پڑی۔ خضر علیہ السلام نے کشتی والوں سے کرایہ پوچھا۔ وہ کشتی والے خضر علیہ السلام کے واقف کار تھے۔ انھوں نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا اور بضد دونوں کو کشتی پر سوار کر لیا۔ کشتی سوئے منزل تیرنے لگی۔ کشتی کچھ زیادہ دیر نہ چلی تھی کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ کر سوراخ کر دیا۔

بڑا عجیب آدمی ہے۔ کشتی والوں نے مفت سوار کیا یعنی احسان کیا اور اس احسان کا یہ بدلہ۔ موسیٰ علیہ السلام سے برداشت نہ ہو سکا۔ کہنے لگے یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اس طرح تو یہ کشتی اپنے سواروں سمیت ڈوب جائے گی۔

خضر علیہ السلام نے کہا: ''ہوئی ناں وہی بات جو میں کہتا تھا کہ آپ صبر اور ضبط نہیں کر سکیں گے۔''

حضرت موسیٰؑ شرمندہ سے ہو کر کہنے لگے: ''بھول چوک معاف۔ میں تو اس وعدہ کو بالکل بھول ہی گیا تھا۔ اس لیے میرے ساتھ زیادہ سختی سے کام نہ لیں۔''

اسی اثناء میں ایک چڑی اڑتی ہوئی آئی اور ایک قطرہ پانی کا اٹھا کر چلتی بنی۔ اس پر حضرت خضر علیہ السلام یوں گویا ہوئے: ''بے شک علم الٰہی کے مقابلہ میں میرا اور تیرا علم ایسے ہی ہے جیسے چڑیا کی چونچ میں سمندر کے پانی کا یہ قطرہ۔''

اسی اثناء میں کشتی ساحل کے قریب چلی گئی۔ آپ دونوں اتر کر ایک سمت چل دیے۔ ان کا سفر ساحل کے ساتھ ساتھ جاری تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک میدان میں بچے کھیل رہے ہیں۔ حضرت خضرؑ نے آگے بڑھ کر ایک بچے کو پکڑا اور مار دیا۔

حضرت موسیٰؑ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ کہنے لگے: ''تم نے یہ کیا کیا۔ ناحق ایک معصوم کی جان لے لی۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔''

حضرت خضر بول اٹھے: ''میاں میں نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکیں گے۔''

حضرت موسیٰ نے درخواست کی: ''اس بار معاف کر دیجیے۔ اگر آئندہ بھی ایسا ہی ہوا تو مجھے الگ کر دینا۔''

ایک بار پھر دونوں محوسفر ہوئے۔ چلتے چلتے ایک بستی میں پہنچے۔ اس بستی کے رہنے والے خوشحال اور آسودہ حال تھے۔ مہمان نوازی ان پر واجب تھی۔ آپؑ دونوں نے مہمان بننے کی درخواست کی۔ جسے بستی والوں نے ٹھکرا دیا۔ آپ وہاں سے چل دیے۔ ابھی بستی میں سے گزر رہے تھے کہ دیکھتے ہیں کہ ایک دیوار گرنے کے قریب ہے۔ حضرت خضر نے سہارا دے کر اس دیوار کو کھڑا کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت پر یہ بات بھی گراں گزری۔ سوچنے لگے بڑا عجیب آدمی ہے بستی والوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ اس دیوار کی مزدوری کے عوض کھانا حاصل کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو کیا نہیں، الٹا مفت کھاتے میں دیوار سیدھی کر دی۔ بستی والوں نے یہی احسان کیا تھا کہ ہمیں بستی سے نکل جانے کا حکم دیا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ اس نیکی کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ یہ سوچ کر موسیٰ علیہ السلام نے ٹوکا، حضرت یہ تردد کرنے کی ضرورت کیا تھی۔

یہ الفاظ سن کر حضرت خضر علیہ السلام گرم ہو گئے۔ کہنے لگے: ''بس بھئی میرا تمھارا نبھا ممکن نہیں۔''

"هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ"[30]

مفہوم:۔ ''اب میری تمھاری جدائی کا وقت آ گیا ہے۔''

پھر حضرت خضرؑ نے ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی کے تابع تھا۔ میں نے کوئی کام اپنی طرف سے نہیں کیا، بلکہ خدا کی طرف سے عطا کردہ احکامات یا اس تکوینی علم کے مطابق کیا جو اپنی خاص عنایت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے۔

بعد ازاں آپ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان واقعات کے حقائق بتائے اور رخصت ہو گئے۔

ان حقائق کو اللہ تعالیٰ نے سورہ الکہف میں جس طرح بیان کیا، اس کا مفہوم کچھ یونہی تھا جو اوپر بیان کیا گیا۔

قارئین!! یہ میری کمزوری۔ کم علمی یا قرآن کے متعلق احتیاط سمجھ لیجیے جو ترجمے کو تفہیمی انداز میں لکھ رہا ہوں۔ اس انداز تحریر کا کسی اور کو فائدہ ہو نہ ہو، مجھے کم از کم یہ فائدہ حاصل ہے کہ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ ترجمے میں کمی بیشی کی صورت میں جو مواخذہ ہوتا ہے، شاید مفہوم میں وہ مواخذہ نہ

Marfat.com

ہو۔شاید کم علمی یا کم فہمی کی بنا پر اللہ کسی کی و بیشی سے درگزر فرما دے۔ اس لیے لفظ ترجمہ کی بجائے مفہوم لکھ دیتا۔ ہوں اللہ ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمائے''آمین''

ان واقعات کی حقیقت قرآن نے کچھ یوں بیان فرمائی:

''بس اب میرے اور تمھارے درمیان علیحدگی کا وقت آ گیا ہے، مگر جن باتوں پر آپ سے صبر نہیں ہو سکا، ان کی حقیقت کچھ یوں تھی۔ جس کشتی میں ہم نے سوراخ کیا، وہ کشتی چند مسکینوں کی ملکیت تھی اور وہ کشتی جس بندرگاہ پر اتر رہی تھی، وہاں کا ظالم بادشاہ ہر اچھی اور نئی کشتی اپنے قبضہ میں لے لیتا تھا۔ ان مساکین کی مدد کے لیے ہم نے اس کشتی میں سوراخ کر دیا تا کہ بادشاہ اسے پرانی سمجھ کر چھوڑ دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

رہا بچہ قتل کرنے کا معاملہ تو اس میں حقیقت یہ تھی کہ اس بچے کے والدین انتہائی نیک اور پاک باز تھے۔ یہ بچہ بڑا ہو کر سرکشی اور کفر کرنے والا تھا۔ مجھے اس کے والدین پر ترس آیا اور میرے دل نے گواہی دی کہ اس لڑکے کے عوض اللہ تعالیٰ انھیں نیک اور صالح اولاد عطا فرمائے، اس لیے اس بچے کو قتل کر دیا۔''

مفسرین کے بقول یہ امرِ ربی تھا۔ خضر علیہ السلام نے اپنی طرف سے نہیں کیا۔ بعدازاں واقعی اللہ تعالیٰ نے اس مقتول بچے کے والدین کو نیک اور صالح اولاد سے تسکین عطا کی۔

اور ہاں جو دیوار میں نے سیدھی کی، وہ دو یتیم لڑکوں کی ملکیت تھی۔ اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا۔ ان لڑکوں کا والد ایک نیک انسان تھا اور بستی کے لوگ ظالم تھے۔ بس تمھارے پروردگار کی مرضی یہ تھی کہ جب یہ نوعمر جوان ہوں تو ان کا خزانہ انھیں مل جائے۔

مفسرین کہتے ہیں اگر دیوار گر جاتی تو شاید لوگ خزانہ لوٹ کر لے جاتے، اس لیے خضر علیہ السلام نے اپنے ربّ کے حکم سے وہ دیوار سیدھی کر دی۔

آخر میں خضر علیہ السلام نے کہا:''یاد رکھو میں نے جو کچھ کیا اللہ کے حکم سے کیا۔ اپنے اختیار سے نہیں کیا اور یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جس پر تم صبر نہ کر سکے۔''

اس کے بعد خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ سے علیحدہ ہو گئے۔

———(((اللہ اکبر)))———

مشرکین کے وجود پر یہ بہت بڑا تازیانہ تھا۔ یہ ان کے سوالیہ عمل کا ردعمل تھا۔ اپنے زُعم میں انھوں نے بہت بڑا علمی اور منطقی حملہ کیا تھا، مگر مدلل جوابی حملہ (Counter AttacK) نے نہ

Marfat.com

صرف مکہ بلکہ نواحِ مکہ میں حضورؐ کی سچی اور حقیقی شہرت کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بھرپور مخالفت نے تحریک اسلامی کو دوسرے علاقوں میں پہنچنے کا موقع فراہم کیا۔ مخالفت جتنی شدید ہوتی گئی، بانیٔ انقلابؐ اور اس کی تحریک کے اثرات اسی تیزی سے پھیلتے چلے گئے۔

اسلام نے تشہیر و اشاعت کی وہ منازل، جو بہت زیادہ مادی اور مالی وسائل خرچ کرنے کے بعد طے کرنا تھیں، وہ مخالفوں کی اندھی مخالفت کے باعث بغیر کسی کوشش کے طے ہو گئیں۔

اہل مدینہ بھی پہلے پہل مشرکین کی زبانی اسلام سے متعارف ہوئے۔ ان میں سے کچھ تو خود کسی غرض سے مدینہ آئے تو انھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت سے روکا گیا۔ یہ غالباً اوس و خزرج کے لوگ تھے جو تقریباً آدھی صدی کی جنگ و جدل میں اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے۔ اس طویل جنگ و جدل نے ان میں امن اور حقیقت پسندی کو پیدا کر دیا تھا۔ یہ لوگ لڑائی جھگڑوں سے گھن اور اکتاہٹ محسوس کر رہے تھے۔ جب انھیں ایک نبی کے متعلق بتایا گیا، گو بتانے والے اسے جادوگر کاہن یا کاذب کی شکل میں پیش کر رہے تھے (نعوذ باللہ)، لیکن سننے والے افراد کے ذہن حقیقت کو سمجھنے اور پرکھنے کا ادراک حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے وہ فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آتے گئے۔

ان کے علاوہ یہودِ مدینہ سے بار بار مدد طلب کی گئی۔ جس کے جواب میں قرآنی زبان وا ہوئی تو اہلِ مدینہ کے تمام شکوک دور ہوتے گئے اور وہ اسلام کی حقانیت کے قائل ہوتے چلے گئے۔

یہ کہنا بجا ہے کہ اہل مدینہ صرف اور صرف مشرکین کی مخالفت کی وجہ سے اسلام کے قریب آئے اور ایسا قریب آئے کہ آئندہ چند سالوں میں اسلامی تحریک کا بنیادی ستون ثابت ہوئے۔ مستقبل قریب میں ان کا تجسس یقین میں بدل گیا۔ پھر تجسس یقین میں ایسا بدلہ کہ جذبوں کی بام عروج تک جا پہنچا، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا ان کا یقین جذبوں کی معراج پہ جا ٹھہرا۔

یقیناً اہل مدینہ کے جذبات کی ترجمانی کے لیے یہ مناسب وقت نہیں۔ ان کے جذبات کو مناسب وقت پر پیش کیا جائے گا۔

———((الحمد للہ))———

Marfat.com

حواشی:

-1 سیرت انبیاء اکرام، جلد اول، صفحہ 295-294۔ ابن کثیر تفسیر سورہ یوسف تفہیم القرآن، انوار القرآن، تفسیر مظہری۔

-2 سیرت الانبیاء، جلد اول۔

-3 یہ روایت تورات کی ہے۔

-4 کچھ روایتوں میں شہر ''حران'' لکھا ہے اور کچھ میں شہر فدان درج ہے۔

-5 ان دنوں دو سگی بہنیں بیک وقت نکاح رکھی جا سکتی تھیں۔ مگر شریعت محمدیہ میں جائز نہیں۔

-6 سورہ بقرہ، آیات 132-133-136-140۔ سورہ انعام، آیت 84۔ سورہ مریم، آیت 6۔ سورہ انبیاء، آیت 72۔ سورہ نساء، آیت 163۔ سورہ یوسف، آیات 6-38۔ سورہ ص، آیت 45

-7 بعض مفسرین نے قافلہ سالار کا نام مالک بن زعر لکھا ہے۔

-8 بدرہ اس وقت ایسی تھیلی کو کہتے تھے جس میں سات ہزار دینار یا ایک ہزار درہم ہوتے تھے۔

-9 سورہ یوسف آیت 30 اور آیت 51

-10 سورہ یوسف آیت نمبر 23 تا 35

-11 مسند احمد۔ مستدرک حاکم، سیرت انبیاء اکرام، جلد اول۔

-12 ابن کثیر۔

-13 سورہ یوسف۔ آیات 36 تا 42

-14 سورہ یوسف۔ آیات 50 تا 57

-15 سورہ یوسف۔ آیات 58 تا 68۔ تفہیم القرآن۔ تفسیر ابن کثیر۔ تفسیر مظہری۔ ترجمان القرآن۔

-16 یہ روایت تورات کی ہے۔

-17 یہ تمام واقعات دیکھیے سورہ یوسف آیت 69 تا 87

-18 تفسیر در منثور سورۃ یوسف۔

-19 تفسیر مظہری سورۃ یوسف، سیرت انبیاء اکرام قصص القرآن اور تفسیر قرطبی

Marfat.com

-20 تفہیم القرآن سورہ یوسفؑ آیت 88

-21 سیرت انبیاء اکرام جلد اول

-22 سورۃ یوسف آیات 88 تا 98

-23 تفسیر ابن کثیر بروایت حضرت حسنؓ

-24 سیرت انبیاء اکرام جلد اول، تفسیر مظہری سورۃ یوسف آیات 99 تا 104

-25 سورہ بقرہ، پہلا رکوع۔

-26 تاریخ ابن ہشام۔

-27 ابن کثیر البدائیہ والنہائیہ

-28 بہشتی زیور از مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

-29 قصص القرآن۔

-30 سورۃ الکہف رکوع 9-10

Marfat.com

باب:10

سرد جنگ کا محاذِ دہشت گردی

محاذ دہشت گردی

درالارقم کی قرآنی اور تاریخی تشریحات سے ایوان ندوہ میں ہلچل مچ گئی۔ ابو جہل، عتبہ، اُمیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث اور دارالندوہ کی تمام گورننگ باڈی پریشان پھرنے لگی۔ جب ان میں سے کسی سے قرآن کے بیان کردہ تاریخی اعلامیے کے متعلق پوچھا جاتا تو بغلیں جھانکنے لگتے۔ بانیٔ انقلابؐ اور قرآن کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ صابی کہنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی لفظ نہ تھا۔ اپنے باپ دادا کے دین پر قائم رہنے کے سوا ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہ تھی۔ ان کے ہر لفظ کو کاونٹر فار (Counter for) کیا جا رہا تھا۔

عرب کے عام روایتی انداز کے مطابق وہ رسول اللہ ﷺ کے ماننے والوں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے تھے، یہ باپ دادا کے دین سے پھرے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ تو گستاخانِ اسلاف ہیں۔ ان کی کیا سننا اور ان سے کیا تعلق رکھنا۔

یہ سب کچھ کہنے کے لیے انھوں نے ایک لفظ صابی گھڑا جو ان کی ساری مخالفت کا عکاس تھا۔ یاد رہے صابی اس کو کہتے ہیں جو باپ دادا کے دین سے باغی ہو گیا ہو۔

یہ لفظ ان کے سارے الزامات، الحاد اور بے دینی کو آسانی سے ادا کر دیتا تھا۔ اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہی تھا کہ مسلمانوں کی ایک نہ سنو۔ یہ گمراہ لوگ ہیں۔ ان کا فرقہ باپ دادا کے صدیوں پرانے دین سے باغی ہے۔ یہ جماعت یا فرقہ تمام عربوں کو باپ دادا کے دین سے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہہ دینا کونسا مشکل کام تھا۔ یہ کہنے میں ہینگ لگتی تھی نہ پھٹکڑی۔ اس لیے یہ غلط خبر (Disinformation) بڑی سرعت سے پھیلائی جا رہی تھی۔

Marfat.com

تمام اہلِ مکہ کا حسب نسب تو ابراہیم علیہ السلام سے ملتا تھا۔ان کے مورث اعلیٰ تو خلیل و ذبیح علیہما اسلام ہی تھے۔وہ بھی بت شکن تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بھی بت شکن۔ان کا مذہب بھی توحیدی تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ کا بھی توحیدی دین تھا۔ان کا دین اور تعلیمات بھی وہی تھیں جو حضور ﷺ پیش کر رہے تھے۔اس حوالے سے مشرکین کا پروپیگنڈا جھوٹ اور باطل تھا۔باپ دادا کے دین سے تو وہ خود ہی پھرے ہوئے تھے۔یہ تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والی بات تھی۔

دارالندوہ کی تمام مشینری بڑی مشکل میں پھنس چکی تھی۔ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے اس تاریخی کردار کو وہ جھٹلا بھی نہ سکتے تھے۔تمام مناسکِ حج قرآنی بیان کی بہترین دلیل تھے۔اگر یہ نہ بھی ہو تو پھر بھی بت پرستی کا تاریخی کردار ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے کیسے منسلک کرتے۔قرآن کی تاریخی تشریحات نے مشرکین کو ہر جگہ لاجواب کر دیا تھا۔

ان سے کچھ نہ بن پڑا تو کہنے لگے چھوڑو یار یہ تو اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ یعنی پرانے گھسے پٹے قصے ہیں۔یہ اس جدید سائنسی اور ترقی یافتہ دور میں چلنے والی باتیں تھوڑی ہیں۔ہمیں تو جدید دور کے سائنسی اور آزادی پسند تقاضوں سے ہم آہنگ دین کی ضرورت تھی۔اس کے برعکس ہمیں ہزاروں سال پرانے بے گھر اور غاروں میں رہنے والے غیر مہذب (Uncivilized) انسانی نظام سے وابستہ کیا جا رہا ہے۔یہ کوئی چلنے والی باتیں ہیں۔نہ نہ ہرگز نہیں۔اب انسان پڑھ لکھ چکا ہے۔مہذب اور شائستہ بن چکا ہے۔اتنے دقیانوسی دین کو کون قبول کرے گا۔(نعوذ باللہ) دل کے سمجھانے کو خیال اچھا تھا۔

اس غیر مصدقہ افواہ (Disinformation) کے جواب میں قرآن نے آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام، ہابیل اور قابیل، طوفان نوحؑ، اقوام عاد و ثمود، ابراہیمؑ اور نمرود، موسیٰ اور فرعون، اور اقوام بنو اسرائیل کے ادوار کی حق و باطل کی طویل کشمکش کو پیش کر دیا۔

ان تمام قصوں میں بھرپور کشش اور تجسس تھا جو مکہ کے صاحبِ ادراک نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچے چلا جا رہا تھا۔

قرآن کے اس طویل نشریاتی اعلامیے سے بوکھلا کر نضر بن حارث[1] ایران سے خوبصورت طوائفیں خرید لایا اور مکہ میں موسیقی کی محفلیں جمانی شروع کر دیں۔نوجوانوں میں جوانی کے بھرپور جذبات ابھارنے کے لیے ان نیم برہنہ اور ایمان شکن اداؤں کی حامل لونڈیوں کو مسلمانوں کے

Marfat.com

پیچھے لگا دیا۔ پھر خود بھی موسیقی کی دھن پر سر بکھیرتے ہوئے سات سروں کا دریا بہاتے ہوئے، رستم اور اسفند یار کے قصے کہانیاں سنانے بیٹھ گیا۔ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ان توبہ شکن رنڈیوں سے ملواتا اور کہتا آؤ میں تمھیں قرآن سے زیادہ فصیح اور شیریں کلام سنواتا ہوں (نعوذ باللہ)۔

نضر بن حارث یہ گھسی پٹی کہانیاں سورۃ یوسف اور سورۃ کہف کے اس آفاقی پیغام کو جھٹلانے کے لیے پیش کر رہا تھا۔ وہ ان سربستہ رازوں کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ جن کا قرآنی بیان سن کر تورات اور انجیل بھی جھینپ سی گئی ہوں گی۔ قرآن کی اس پراسراریت نے پوری فضائے عرب کو حیران کر دیا تھا۔

ان کی اثر آفرینی کا تو اب بھی یہ عالم ہے کہ جو ایک بار سنتا ہے، بار بار سننے کو بیقرار ہے۔ مکہ کے نوجوانوں کے لیے یہ قرآنی قصے نضر بن حارث کی رومانوی داستانوں سے کہیں زیادہ دلچسپ تھے۔ اوپر سے قرآن کا یہ نشریاتی مواد سلسلہ وار چھوٹی چھوٹی اقساط میں پیش کیا جا رہا تھا۔ اس کے اس انداز سے لوگوں میں تجسس اور طلب کا جذبہ بام عروج تک پہنچ چکا تھا۔

———(((اللہ اکبر)))———

(Disinformation) جھوٹی خبروں کے پھیلاؤ کو روکنے کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ لوگوں میں طلب اور تجسس کا جذبہ ابھارا جائے۔ جزواً اور قسط وار ایسا مواد نشر کیا جائے جسے ایک بار سننے کے بعد خواہ مخواہ دل چاہے کہ اس سے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے؟ اور پھر بات کو ایسی جگہ نامکمل چھوڑ دیا جائے کہ اگلی قسط یا منظر دیکھنے پر انسان اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو جائے۔

سرد جنگ میں آج بھی اس تشویش اور تجسس کو برقرار رکھنے کے لیے گہری سوچ بچار سے کام لیا جاتا ہے کہ کون سی بات کس جگہ ہونی چاہیے۔ کون سا منظر کس جگہ پر لانا چاہیے، بلکہ آج کل تو نشریاتی اعلامیے پر بھرپور غور و خوض کیا جاتا ہے۔ مواد کی باقاعدہ پیمائش کی جاتی ہے۔ سامعین و حاضرین و ناظرین کی نفسیات پر غور کیا جاتا ہے۔ ماحول پر نظر دوڑائی جاتی ہے۔ لوگوں کی نجی اور مجموعی دلچسپیوں کا احاطہ کیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ اس نشریے کا ماحول پر تاثر کس حد تک اور کتنا گہرا ہوگا۔ کتنے فیصد لوگ دلچسپی لیں گے۔ کیا نشریہ مطلوبہ ہدف چھونے کے قابل ہوا ہے یا نہیں۔ یہ غلط واقعاتی رفتار یعنی غلط اطلاع کا(Disinformation) رخ کس حد تک موڑ سکتا ہے۔

قرآن بھی شاید انسان کے فطری نفسیاتی عمل کے پیش نظر تھوڑا تھوڑا کر کے قسط وار 23 سال

کے عرصہ میں نازل ہوا۔اس کی دلچسپی اور تجسس کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابوجہل، عتبہ اور ربیعہ وغیرہ خود ایک دوسرے سے چھپ چھپا کر قرآن سنا کرتے تھے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قرآن عرب کی عام روزمرہ کے عین مطابق تھا۔نضر بن حارث کے قصے عجمی کردار تھے۔عرب کی ان سے تہذیبی و ثقافتی مطابقت نہ تھی جبکہ قرآنی قصے زیادہ تر ان کے اپنے علاقوں کے معروف کردار تھے۔ان کے ماحول اور ثقافت سے مماثل تھے۔تاریخی اعتبار سے زیادہ تر ان کے اپنے آباواجداد کے متعلق تھے۔روایتی طور پر عرب اپنے بزرگوں کی پوجا کرتے تھے۔اس لیے قرآن کا بیان عجمی داستانوں سے زیادہ موثر تھا۔

سب سے بڑی وجہ قصہ بیان کرنے والے کا کردار اور شخصیت تھی۔حضور ﷺ کے کردار اور شخصیت کے مقابلہ میں مکہ کے تمام چودھری ریت کے اس ٹیلے کی مانند تھے جو ہَوا کے معمولی جھونکے سے اپنی جگہ بدل کر دوسری جگہ چلا جاتا ہے۔یعنی ایک مفاد پرست اور مصلحت کوش (Diplomate) آدمی کا کیا اعتبار کہ جو بات آج کر رہا ہے، وہ کل بھی کرے گا یا نہیں۔اپنی زبان پر قائم رہے گا یا نہیں۔

پھر دارالارقم اور دارلندوہ کے مابین تحریکی نصب العین کی سچائی اور خلوص کا بھی مسئلہ تھا۔ ایک طرف زندگی کے اعلیٰ و ارفع مقاصد تھے، دوسری طرف صرف جھوٹی اور خود ساختہ عزت و بزرگی تھی۔ان دونوں ایوانوں کو حزب اللہ اور حزب المشرکین یا حزب الشیطان کہا جائے تو بات جلدی سمجھ آجائے گی۔

حزب اللہ یعنی اللہ کے ماننے والے صرف اور صرف اسی کے آگے جھکنے والے انسانوں کی بامقصد جماعت تھی۔ان کا وجود زیادہ مستحکم تھا۔ان کا معبود حقیقی اور سچا تھا۔لاشعوری طور پر ان میں تحریکی سچائی خلوص اور اثر آفرینی تھی۔ان کی سچائی اور خلوص پُر تجسس اور کشش آمیز تھی۔

ان کے مقابل حزب الشیطان تھی یعنی جھوٹے، لعین اور دھتکارے ہوئے لوگوں کی ترغیبات میں پھنسے ہوئے، خدا کی ذات کا انکار کرنے والے، اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھروں کی پوجا کرنے والے۔یہ کسی مرکزیت پر قائم نہیں تھے، سینکڑوں ان گنت بتوں کی پوجا کرنے والے انسانوں کا گروہ یا جتھا تھا۔

جن کے مراکز یعنی دیوتا علیحدہ علیحدہ ہوں، وہ فطری طور پر اکٹھے نہیں رہ سکتے۔اگر وقتی طور پر اکٹھے ہو بھی جائیں تو عقیدوں کی دوری ان کے اجتماعی کاموں یا باتوں میں فطری منافقت اور

Marfat.com

جھوٹ پیدا کر دیتی ہے۔ اس فطری حسد اور بغض کی وجہ سے ان کی باتوں میں اثر اور سچائی نظر نہیں آتی۔ جب قول میں اثر اور سچائی کا فقدان ہو تو مخالفانہ کوششوں کا پھیلاؤ سکڑتا چلا جاتا ہے بس یہی کچھ اکابرینِ قریش کے پاس تھا جس کے کڑوے اثرات بالآخر انھیں کو سمیٹنا تھے۔

———(((اللہ اکبر)))———

عقیدے کی سچائی اور مرکزیت حزب اللہ کے یقین و ایمان میں پختگی اور تنظیم کو وسعت دے رہی تھی۔ غیر محسوس انداز سے اس کے اثرات اہلِ مکہ کے دلوں میں سرایت کر رہے تھے۔

اس اثر و نفوذ پر تمام مخالفین بھڑک اٹھے۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ تحریک اسلامی کو بزورِ قوت یا دہشت اور غنڈہ گردی سے روک دیا جائے۔ اسلام قبول کرنے والوں کے منہ تشدد اور مار پیٹ سے دوسری طرف پھیر دیے جائیں۔

پھر مخالفین نے یہی کچھ کیا کہ نبی برحق ﷺ کی 13 سالہ مکی زندگی انتہائی طوفان بدتمیزی اور مار دھاڑ سے بھری پڑی ہے۔

مسلمانوں کو قرآن کی تلاوت کا جذبہ بے قرار و بے خود کیے دیتا تو سرداران مکہ قرآن کی آواز سنتے ہی ان پر ٹوٹ پڑتے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نماز[2] میں قرآت با آواز بلند پڑھتے تھے۔ ایک دن وہ کسی عام گزرگاہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے، سننے والے اینٹ پتھر لیکر ان پر ٹوٹ پڑے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کو چھوڑا۔ آپ کئی روز تک اس مار پیٹ کی تکلیف میں گھر میں پڑے رہے۔

شاید سورۃ جن میں اللہ تعالیٰ نے آپؓ ہی کی طرف اشارہ کیا ہے "اور[3] جب اللہ کا بندہ اپنے ربّ کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اذیتیں دی گئیں تو آپؓ بامر مجبوری مکہ سے نکل پڑے۔ راستے میں احابش قبیلے کا سردار ملا۔ اس نے پوچھا صدیقؓ کدھر جا رہے ہو۔ آپ نے جواب دیا۔ میری قوم نے مجھے سخت اذیتیں دے کر نکال دیا ہے۔ احابش کے سردار نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ اے صدیق تم تو معاشرے کی زینت ہو۔ تم تو مصیبت زدوں کے کام آنے والے، غریبوں کے حامی اور نیک خو انسان ہو۔ چلو میں تمھیں پناہ دیتا ہوں پھر اس نے حرم میں کھڑے ہو کر اعلان کیا۔ اے قریش میں ابن ابی قحافہ کو پناہ دیتا ہوں۔ اب کوئی ان سے بھلائی کے سوا تعرض نہ کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک دن کعبہ کے صحن میں سورۃ رحمٰن با آواز بلند پڑھنے لگے تو

Marfat.com

مشرکین ان پر ٹوٹ پڑے۔ اتنا مارا اتنا مارا کہ چہرہ خون سے تر بتر ہو گیا، مگر وہ برابر تلاوت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پوری سورۃ رحمٰن پڑھ کے دم لیا۔

یاد رہے کہ وہ پہلے صحابی رسول ہیں جنھوں نے حضور ﷺ کے بعد سب سے پہلے حرم شریف میں قرآن بآواز بلند تلاوت کی۔

جب آپؓ دار ارقم بن ابی ارقم میں واپس آئے تو صحابہ نے خون آلود حالت میں دیکھ کر کہا ہمیں اسی چیز کا ڈر تھا، مگر ان کے تحریکی اور تنظیمی لگاؤ کا اندازہ کیجئے۔ وہ کہنے لگے۔ بخدا آج دشمنانِ دین میری نظروں میں جتنے ذلیل ہوئے، اتنے پہلے کبھی نہ تھے۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں اسی طرح ان کے سامنے کل بھی قرآن تلاوت کروں۔

دوستوں نے ہاتھ باندھ کر کہا نہ نہ بس بس میاں اتنا ہی کافی ہے تم نے انھیں وہ باتیں سنوا دیں جنھیں وہ سننا نہیں چاہتے تھے۔

———(((اللہ اکبر)))———

تشدد، غنڈہ گردی، لوٹ مار اور دہشت گردی کے مقام پر کھڑی رہنے والی تحریکیں بہت جلد اپنا ہدف چھو لیتی ہیں کیونکہ جسمانی اور روحانی اذیت ہی انسانی اعصاب مضمحل کرنے کا سب سے بڑا حربہ ہے۔ جو کارکنان اس اذیت ناک مرحلے میں ثابت قدم رہیں۔ ان کی تحریکوں کو انقلاب برپا کرنے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔

اس مرحلے پر عموماً تحریکیں غلط منصوبہ بندی یا غیر نظریاتی اور کم تربیت یافتہ کارکنان کی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہیں۔ غیر نظریاتی کارکنان جب تشدد اور غنڈہ گردی سے مرعوب ہو کر منہ موڑ لیتے ہیں تو تحریک میں ایک عام سی بددلی پھیل جاتی ہے۔ باقی ماندہ کارکنان کو یا تو زیر زمین ہونا پڑتا ہے یا تحریک سے دور رہنا پڑتا ہے۔ ایسی پر تشدد فضا میں ذاتی تحفظ انسان کی فطری کمزوری کے طور پر سامنے آتا ہے۔

سرد جنگ کا یہ مرحلہ بالکل ایسے ہی ہے، جیسے باقاعدہ جنگ میں اگلے مورچوں (First Line) پر لڑنے والی فوج کے اگلے مورچوں میں سے کسی نفسیاتی یا ذہنی ہیجان کے زیر اثر چند سپاہی بھاگ کھڑے ہوں تو پورے دفاعی محاذ (Defencive Sector) میں بددلی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ باقی ماندہ سپاہی بھی بددل (Demoral) ہو کر یا تو بھاگ کھڑے ہوتے ہیں یا پھر انھیں (Tactical) تدبیراتی پسپائی اختیار کرنا پڑتی ہے تاکہ بددلی جیسے نفسیاتی خوف پر قابو پا کر سپاہ کو دوبارہ منظم

(Reorgnize) کیا جا سکے۔ اکثر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ ایک دفعہ اکھڑا ہوا قدم کبھی سنبھلنے نہیں پایا ماسوا اس کے کہ کوئی بہترین ملٹری لیڈر اپنی لیاقت اور قائدانہ صلاحیت کے بل بوتے حالات پر قابو پا لے۔

اسی طرح سرد جنگ میں انقلابی تحریکوں کے لیے یہ مرحلہ بہت نازک ہوتا ہے۔ یہاں معمولی کمزوری بھی نا قابل تلافی نقصان میں بدل جاتی ہے ماسوا اس کے کہ انقلابی قائد اعلیٰ صلاحیتوں سے کام لے کر اس نازک موڑ پر تحریک کو بحسن وخوبی سے نکال لے۔

آیئے ذرا اس مرحلے پر بانی تحریک اسلامی کا بھی تھوڑا سا جائزہ ہو جائے۔

ابولہب حضور ﷺ کے سگے چچا، پڑوسی اور قریبی تھا، مگر اسلام کے سب سے پہلے اور بڑے دشمن بھی وہی تھا۔ آپؐ کے خلاف ہر سازش کی ابتداء بھی اسی کے گھر سے ہوئی۔ اس کی بیگم اُمِ جمیلہ ہجو گوئی میں استاد مانی جاتی تھی۔ اس کے شدید مخالفانہ رویے کے جواب میں قرآن نے سورہ لہب کی شکل میں چوٹ ماری تو تمام گھرانہ آگ بگولا ہو گیا۔ ان کے دندانِ ستم اور تیز ہو گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کو ان کے گھر جانے کے لیے ان کے دروازے کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ وہ محترمہ پوری طرح جان چکی تھی کہ ہجو گوئی اور کانٹے بچھانے والا عمل کوئی زیادہ کارگر نہیں رہا۔ اب اس بی جمالو نے مردہ جانوروں کی اوجڑی اور انتڑیاں اور گلی سڑی مردہ کھالیں حضورؐ کے گھر پھینکنا شروع کر دیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وار کو بھی صبر وشکر سے سہہ لیا تو وہ واہ واہ جمالو شہر کے اُوباش لڑکوں کو پیسے دیکر بلا لیتی اور اینٹیں روڑے مارنے پر لگا دیتی۔ مکہ کے اُوباش لڑکے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اینٹوں روڑوں کی بارش کر دیتے۔ اس سنگ باری سے بعض اوقات آپ کے گھر کی کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ جاتے۔ یاد رہے اُن دنوں کھڑکیاں لکڑی کی بنتی تھیں۔

آپ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کو گلی میں گزرتے دیکھ لیتی تو انھیں لڑکوں سے پتھر مروا کر لہولہان کر دیتی۔ آپؐ اپنی آستین سے چہرے کا خون صاف کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے تو وفا شعار بیوی کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ حضرت خدیجہؓ کے دل پر تیر چلنے لگتے۔ وہ درد بھرے لہجے میں فرماتیں۔ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ بہت تکالیف اٹھا رہے ہیں۔

حضورؐ جواب میں فرماتے ”خدیجہؓ جب انسان یہ جان لے کر وہ تکالیف کس مقصد اور کس ذات کے لیے اٹھا رہا ہے تو پھر کسی دکھ درد کا احساس ہی نہیں رہتا۔“

نظریہ سے لگن اور مقاصد کا حصول واقعی انسان کو نا قابل تسخیر بنا دیتا ہے، مگر انسان پھر بھی انسان ہی رہتا ہے۔ اس کے اعصاب کبھی نہ کبھی تھکاوٹ محسوس کر ہی لیتے ہیں۔ بلا ناغہ روزانہ کی اذیت رسانی کچھ نہ کچھ تو انسان کو تھکا ہی دیتی ہے۔ اسی طرح ایک دن حضور ﷺ نے خدا کے آگے ہاتھ پھیلا دیے۔

"اے میرے رب کریم تو بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی تیرا دین قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔"

یہ عجز اور انکسار بھی ذات خداوندی کو گوارا نہ ہوئی۔ فوراً حکم آیا:

"جو حکم دیا گیا ہے، اسے کھول کر سنا دو[4] اور مشرکوں کی ایذا رسانی پر توجہ نہ دو۔"

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش (نعوذ باللہ)

نبوت کے چوتھے سال تک مشرکین عام اذیتیں دینے پر اکتفا کرتے رہے۔اب جبکہ انھیں یقین ہو گیا کہ اسلام کا چراغ بجھنے کی بجائے اس کی ضیا پاشیوں میں اضافہ ہو رہا ہے تو انھوں نے بانیٔ تحریک کو ختم دینے کا فیصلہ کیا۔(نعوذ باللہ)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ صبح تڑکے اٹھ کر حرم میں چلے جاتے اور دیر تک اپنے رب کے حضور رکوع و سجود کرتے رہتے۔

دارالندوہ کی اسمبلی نے سوچا کہ سب سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول ختم کیا جائے۔ انھوں نے آپ سرکار کو بلا کر حکم دیا کہ وہ حرم میں داخل نہ ہوں۔

آپؐ نے جواب دیا: "حرم خدا کا گھر ہے اور خدا کے گھر آنے سے مجھے کون روک سکتا ہے"۔

ابو جہل، ولید بن مغیرہ اور عتبہ وغیرہ نے کہا ہم روک کر دکھائیں گے۔

ان دنوں صحرائے عرب میں سزائے موت دینے کے لیے ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا کہ جسے سزائے موت دینا ہوتی، اس کے منہ پر گندگی اور خون سے بھری اونٹ کی اوجری چڑھا دی جاتی اور گلے میں تھیلی کی طرح اس کا منہ کسی رسی سے باندھ دیا جاتا۔اس طرح مقتول کا پورا نظام تنفس مکمل طور پر آکسیجن کے حصول و اخراج کے لیے معطل ہو جاتا۔اوپر سے گندگی اور کثافت چند لمحوں میں اس کے اعصاب کو معطل کر دیتی۔یوں وہ چند لمحوں میں تڑپ تڑپ کر زندگی کو خیر باد کہہ دیتا۔

ایک دن رسالت مآب ﷺ اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھے۔ابو جہل اور اس کے ساتھی دبے پاؤں حرم میں داخل ہوئے۔ان کے پاس گندگی سے بھری اونٹ کی اوجری[5] تھی۔اللہ کے نبی ﷺ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھے۔ابو جہل نے ٹھرتی سے اُوجری رسالت مآب ﷺ کے سر پر چڑھا دی۔اس کے دوسرے ساتھیوں نے اُوپر سے دبوچ لیا۔ آپ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم اس میں بری طرح پھنس گئے۔انھوں نے ہوا بھرے غبارے کی طرح

Marfat.com

اوجری منہ پر کس دی۔

پیغمبر انقلاب نے اپنے طور پر اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کی پوری کوشش کی، مگر ممکن نہ ہو سکا۔ حرم میں موجود لوگوں میں سے چند ایک آپ کی مدد کرنا چاہتے تھے، مگر سرداران مکہ کے ڈر سے دبکے کھڑے رہے۔ حرم میں موجود عورتوں میں سے ایک عورت اس منظر کی تاب نہ لا سکی۔ وہ منہ لپیٹ کر نبیؐ کے گھر کی طرف دوڑ کھڑی ہوئی اور ہانپتی کانپتی آواز میں حضور کی بیٹی رقیہؓ سے کہا جتنی جلدی ہو سکے، اپنے باپ کی مدد کو پہنچو۔ اگر دیر ہو گئی تو محمد ﷺ کو زندہ نہ دیکھ سکو گی (نعوذ باللہ)

حضرت رقیہ روتی پیٹتی شور مچاتی کعبہ کی طرف دوڑ پڑیں۔ مشرکین نے جب سیدہ رقیہؓ کو آتے دیکھا تو فوراً کھسک لیے اور منہ چھپا کر بھاگ نکلے۔ محترمہ رقیہؓ نے رسی کھولی اور اوجری سے آپ کو نجات دلائی۔ بیٹی نے اپنے سر کی چادر سے باپ کے چہرے سے کثافتوں کو صاف کیا۔ گھر پہنچ کر بانی انقلابؐ نے بیٹی کی مدد سے خون صاف کیا۔ پھر غسل فرمایا اور کپڑے بدلے۔ حضرت رقیہؓ نے وہ کپڑے فوراً دھو کر دھوپ میں ڈال دیے۔

اپنے مشن سے لگن کا یہ عالم تھا کہ اگلے روز سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پھر لوگوں کے سامنے بلاخوف و خطر درسِ قرآن دے رہے تھے۔ آج آپ کے سجدوں میں پہلے سے بھی زیادہ خشوع و خضوع تھا۔ مخالفوں کی مخالفت کے زہر میں بجھ کر آج آپؐ کی آواز اور لب و لہجہ پہلے سے بھی زیادہ اثر آفرین تھا۔

———(((اللہ اکبر)))———

سرد جنگ میں پروپیگنڈا کی ایک اصطلاح سٹاکنگ Stalking بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ عرف عام میں اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک منصوبے کی ناکامی کی شکل میں دوسرا منصوبہ پہلے سے تیار ہوتا ہے۔ مشرکین مکہ کی مسلسل کارروائیاں اسی زمرے میں آتی ہیں۔

قریش مکہ چونکہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ بانی تحریک کو ختم کیے بغیر تحریک کو دبانا ناممکن ہے۔ اس لیے وہ قتل کا کوئی موقع ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

حرم شریف میں پہروں سجدے میں پڑے رہنا حضور ﷺ کا معمول تھا۔ اس بار انھوں نے عتبہ کو حضورؐ کے قتل کی ذمہ داری سونپی۔ عتبہ حرم میں داخل ہوا تو رسول اللہ ﷺ حسب معمول سجدہ ریز تھے۔ عتبہ نے اپنے جوتے اتار دیے۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا حضور ﷺ کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ بڑی پھرتی سے اوپر چادر لپیٹ کر اتنا شدید حملہ کیا کہ آپ کی ناک اور منہ سے خون بہہ

Marfat.com

کر سجدہ گاہ پر پھیل گیا۔ پہلا وار ہی بڑا زبردست تھا۔ اوپر سے دشمن دین نے بڑی تیزی سے پے در پے کئی وار کیے۔ مگر اس دفعہ نبی کی قوت مدافعت نے حملہ آور کی ایک نہ چلنے دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعانہ قوت سے خائف ہو کر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ گھر واپس آئے اور خون آلود چہرہ صاف کر کے دوبارہ خدا کی حمد و ثناء میں لگ گئے۔

یہ واقعات تو حیران کن ہیں ہی، لیکن اصل حیرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کرنے والوں کے خلاف کبھی برا لفظ تک نہیں بولا، بلکہ الٹا ان کے لیے اپنے رب سے ہدایت طلب کرتے رہے۔

آپؐ نے ہر دشمنی اور ہر اذیت ناک مخالفت کو صبر و شکر کے عمیق سمندر میں ڈبو دیا۔ ادھر مخالفین ہیں کہ کوئی موقع ہاتھ سے نکلنے نہیں دیتے۔ ادھر آپ سرکارؐ ہیں کہ پیمانہ صبر ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے۔ اب تو نہ صرف بانی تحریک کو نشانہ بنایا جا رہا تھا، بلکہ ہر اس آدمی پر عقوبت خانے کھل جاتے جو اس عالمی انقلابی تحریک میں شامل ہو جاتا۔

—(((اللہ اکبر)))—

موجودہ دور سرد جنگ کا دور ہے کم و بیش دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود کسی نہ کسی سطح پر، کسی نہ کسی محاذ پر سرد جنگ میں ملوث ہیں۔ خصوصاً تیسری دنیا کے غریب اور مسلم ممالک تو خواہ مخواہ عالمی سرد جنگ کا نشانہ بنے ہوئے ہیں (G-8) گروپ آٹھ کی سپر طاقتیں اس عالمی سرد جنگ کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں اور قانونِ بین الاقوام ان کی پشت پر ہے۔ تیسری دنیا کے اکثر مسلمان ممالک میں ایک غدر کی سی حالت طاری ہے۔ دہشت گردی ان ممالک میں معمول بن چکی ہے۔ عوام کہیں راہ چلتے گولیوں کا نشانہ بن رہے ہیں، کہیں لوگ بم دھماکوں کی نذر ہو رہے ہیں اور کہیں اسی دہشت گردی سے قوم کی معاشی اور سیاسی حالت کو کمزور کیا جا رہا ہے۔ بہر حال دہشت گردی کے مقاصد کا تاریخ کے ساتھ تجزیہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس کے مقاصد تاریخ میں بھی یہی تھے جو آج ہیں۔

آج کسی ملک کی سیاسی ساخت کو کمزور کرنے اور اندرونی عدم استحکام پیدا کرنے یا قومی سطح پر بددلی پھیلانے یا معاشی ناہمواری پیدا کرنے کے لیے دہشت گردی کی جاتی ہے۔

مثلاً ناپسندیدہ حالات میں عوام اپنی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جس سے ملک میں شدید معاشی اقتصادی اور سیاسی بحران جنم لیتے ہیں۔ ان حالات میں متعلقہ قوم تنزلی کی طرف تیزی سے بڑھنے لگتی ہے حتیٰ کہ وہ وقت آ جاتا ہے جب اقوام عالم پاکستان جیسے نظریاتی

Marfat.com

ملک کو ٹوٹتے دیکھ لیتی ہیں یا روس جیسا شوشلسٹ ملک اقتصادی بدحالی کے ہاتھوں مرنے لگتا ہے۔

اگر یہی دہشت گردی یا سرد جنگ کسی تحریک یا تنظیم کے خلاف برپا کی جائے تو اس کا مقصد تنظیمی کارکنوں کو بددل کرنا یا تحریک کے تیز ترین اثرات کے پھیلاؤ کی رفتار کم کرنا ہوتا ہے، لیکن اچھے قائد اس مرحلے پر اپنے ملک یا تنظیم کو بحسن وخوبی نکال لیتے ہیں۔

مکہ کی دہشت گردی کا نشانہ بننے والے اہل ایمان کے حالات سن کر شاید "را"، "موساد" کے جی بی اور سی آئی اے کے مظالم بھی شرما جائیں۔

لیکن آفرین ہے وہ کارکن جنھوں نے جان بوجھ کر عیش و آرام کی زندگی کو لات ماری جنھوں نے ارادتاً کانٹوں سے بھرے راستے چنے۔ جو دیکھتے ہوئے بھی آتشِ نمرود میں کود پڑے۔ جنھوں نے عیش وعشرت کی جگہ مشکلاتِ زیست کو منتخب کیا۔ جنھوں نے وزراء، امرا نوابوں وڈیروں سرداروں اور چودھریوں میں بیٹھنے کی بجائے غلاموں کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دی۔ جنھوں نے عالی شان محل چھوڑ کر فاقہ کشی کے بیابانوں میں بسیرا کیا۔ جنھیں جگمگاتی کوٹھیوں کی بجائے پہاڑی چٹانیں زیادہ خوبصورت اور مخملیں نظر آئیں۔ جنھوں نے دین کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دینا بہتر سمجھا۔ جو اپنا آپ اپنے اعزہ واقارب چھوڑ کر دین کے حصار میں چلے گئے۔ جنھوں نے نہ صرف مال واولاد، بلکہ رگوں کا خون تک نچوڑ کر تحریکِ اسلامی کو دے دیا دین میں داخلے کے بعد جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ دکھوں، تکلیفوں اور مصائب سے عبارت ہے۔ جن کی زندگی کا ایک ایک دن تاریخ میں ایک الگ داستان کی طرح رقم ہے۔

آیئے ذرا اس ساز کو چھیڑ کر دیکھیں تو سہی جس میں ہمارے شاندار ابتدائی ماضی کے نغمے خاموش ہیں۔ مکہ کے ان نوجوانوں کے حالات پر نظر ڈالنے کی کوشش تو کریں جنھوں نے مصائب کی آندھیوں کے نہ صرف تھپیڑے سہے، بلکہ ظلم کی ان آندھیوں کا رخ موڑ کے رکھ دیا۔ جن کے ایمان ویقین نے ظلم و بربریت کی تاریک ترین راتوں میں بھی تحریک اسلامی سے وابستگی کی شاندار تاریخ رقم کی۔

—(((الحمد للہ)))—

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں پر بربریت

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جسے احابش[7] کے سردار نے مکہ کی زینت قرار دیا تھا۔ نوفل بن خویلد انھیں حضرت طلحہ کو پہروں باندھے رکھتا۔ کوڑے مار مار کر کہتا کہ محمد ﷺ کا دین ترک کرو گے تو کھولوں گا، مگر اس دشمن دین کو ہمیشہ صاف صاف جواب ملا۔

حضرت زبیر[8] بن عوامؓ کا چچا انھیں چٹائی میں لپیٹ کر درخت سے لٹکا دیتا اور نیچے سے کڑوی دھونی دے کر کہتا اب اسلام سے رجوع کرو گے کہ نہیں۔

حضرت زبیرؓ جواب دیتے میں کفر کبھی نہیں کروں گا۔

حضرت عثمان کا چچا[9] انھیں رسیوں سے باندھ کر مارتا پیٹتا اور کہتا تو نے باپ دادا کا دین چھوڑ کر محمد ﷺ کا دین قبول کیا۔ میں تمھیں اس وقت تک مارتا رہوں گا جب تک تو محمد ﷺ کا دین چھوڑ نہیں دیتا۔

حضرت مصعب[10] بن عمیر کو ان کے چچا زاد بھائی عثمان بن طلحہ نے اذیتیں دے دے کر بے ہوش کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ چوری چھپے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور مکہ سے باہر کسی دور افتادہ مقام پر رہنے لگے۔ پہلی ہجرتِ حبشہ میں مسلمانوں کے ساتھ ملک حبشہ چلے گئے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کو ان کی ماں[11] نے بڑا تنگ کیا۔ اس بڑی بی نے سعدؓ کے اسلام لانے پر بھوک ہڑتال کر دی۔ سائے میں بیٹھنا ترک کر دیا۔ حضرت سعدؓ کے لیے یہ بہت بڑی ذہنی اذیت تھی۔

حضرت خالد بن سعیدؓ کے والد نے باپ دادا کے دین کو چھوڑنے کی پاداش میں بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔

یہ وہ لوگ تھے جو مکہ میں صاحب اثر اور اہل ثروت تھے۔ انھیں مکہ میں خاندانی لحاظ سے بڑا اثر و نفوذ حاصل تھا۔ ان کے علاوہ مکہ میں بہت بڑی تعداد لونڈیوں اور غلاموں کی بھی آباد تھی۔

Marfat.com

عرب میں لونڈی اور غلام کی حیثیت یا قدر و قیمت جانوروں سے بھی کم تھی۔ مکہ میں ان کا کوئی خاندانی، سیاسی یا معاشرتی وجود نہیں تھا۔ قانونی طور پر یہ اپنے آقاؤں کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ جب اور جس وقت چاہتے، قیدِ حیات سے ان کی جان چھڑا دیتے۔ ان کے قتل کا کوئی قصاص لیا جاتا، نہ دیا جاتا۔ یہاں تک کہ کسی غلام یا لونڈی کے قتل کا مقدمہ کسی پنچایت، جرگے یا عدالت میں درج ہوتا نہ سماعت ہوتا۔

الغرض غلاموں کی زندگی یکسر حیوانی زندگی کے مترادف تھی۔ معاشرے میں وہ اپنی مرضی سے جینے کے بنیادی حق سے محروم تھے۔

جب اسلام نے آقا و غلام کے تصور سے پاک انسانوں کی معاشرتی اور سیاسی برابری کا اعلان کیا تو غلاموں کے دلوں میں بھی زندگی کے حسین اور خودمختاری کے خوابوں نے انگڑائی لی اور مکہ کے موالی اعلان نبوت کے ساتھ ہی اسلام کی طرف کھچے چلے آئے۔

قارئین! مکہ کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کچھ ایسا موضوع ہے جو علیحدہ تصنیف کا متقاضی ہے، مگر یہاں بامر مجبوری چند واقعات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ چند افراد کے نام اور حالات بیان کئے دیتا ہوں جنھوں نے آگے چل کر اسلامی تاریخ میں درخشاں باب رقم کئے۔

(((الحمد للہ)))

Marfat.com

غلاموں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے

عرب میں غلاموں کی زندگی یکسر حیوانی زندگی کے مترادف تھی۔انھیں معاشرے میں اپنی مرضی سے جینے کا حق تک حاصل نہیں تھا۔ان کے تحفظ کے لیے کوئی عدالتی، اثالتی، پنچایتی اخلاقی یا معاشرتی قانون موجود نہ تھا۔غلاموں کی قدر و قیمت جانوروں جیسی بھی نہ تھی۔

عرب اپنے اونٹوں اور بکریوں کی حفاظت کے لئے کئی سال جنگ لڑ سکتے تھے،مگر غلاموں کی زندگی اور موت سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔لونڈیوں اور غلاموں کی قیمت اونٹ گھوڑے اور بکری کی ٹانگ کے برابر بھی نہ تھی۔عرب کی منڈیوں میں اونٹ گھوڑا بکری تلوار نیزہ اور گندم کی روٹی مہنگی اور لونڈی غلام سستا تھا۔

اب اسلام نے غلام اور آقا سے پاک انسانوں کی معاشرتی اور سیاسی برابری کا اعلان کیا تو زندگی کے بنیادی حقوق سے محروم طبقہ یعنی غلاموں اور لونڈیوں کے دلوں میں بھی زندگی کے حسین خوابوں نے انگڑائی لی۔وہ لاشعوری طور پر اسلام کے اس عادلانہ نظام کے حصار میں آتے چلے گئے۔کئی مرد و خواتین نے بغیر حیل و حجت کے پہلی آواز پر لبیک کہہ دی۔

مکہ کے سرداروں کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ان کے لیے نیچ ذاتوں کی معاشرتی و سیاسی برابری کا تصور ہی جان لیوا تھا۔ان کو اپنا معاشرتی اثر و نفوذ ختم ہوتا نظر آنے لگا۔اپنی بڑی بڑی خود ساختہ دستاریں خاک میں رلتی نظر آنے لگیں۔سیاسی و معاشرتی عہدے چھنتے دکھائی دینے لگے۔ گورے کالے کا فرق مٹتا محسوس ہونے لگا تو وہ تمام بربری سوچوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ تمام تر طاقت اور وسائل کے ساتھ اسلام قبول کرنے والے غلاموں کو کچلنے پر اتر آئے۔

———(((اللہ اکبر)))———

غلاموں میں حضرت زید بن حارثؓ[12] کے بعد حضرت بلال حبشیؓ دوسرے شخص تھے جو حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔آپؓ امیہ بن خلف کے غلام تھے۔امیہ بن خلف کے دل پر سانپ رینگنے

Marfat.com

لگے۔ اس نے آگ بگولا ہو کر حضرت بلالؓ کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا، مگر وہ ایمان پر ڈٹ گئے۔ امیہ حضرت بلالؓ کے گلے میں رسی ڈال کر شہر کے اوباش لڑکوں کو پکڑا دیتا۔ وہ اوباش انھیں مکہ کی دہکتی چٹانوں پر کھینچتے۔ وہ کھینچتے کھینچتے تھک جاتے، مگر آپؓ کے پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش نہ آتی۔ اگلے دن آپ کو پھر دہکتی ریت اور کوئلوں پر لٹا دیا جاتا۔ جسم کی چربی پگھل پگھل کر کوئلے بجھا دیتی۔ پھر اوپر پتھر رکھ دیے جاتے۔ امیہ بن خلف اوپر چڑھ کر کہتا: لات وعزیٰ کی پیروی میں پلٹ آؤ، مگر آفرین ہے تحریک اسلامی کا یہ کارکن ٹس سے مس نہ ہوتا اَحد اَحد پکارتا جاتا۔ اس پاداش میں کئی کئی دن بھوکا رکھا جاتا۔ پھر وہی عمل دہرایا جاتا۔ حضرت بلال پھر وہی الفاظ دہراتے جاتے۔ بالآخر ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے امیہ بن خلف کو کئی گنا قیمت ادا کر کے حضرت بلالؓ کو خرید کر آزاد کر دیا۔ یہی حضرت بلالؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن رہے۔

حضرت بلالؓ کی استقامت دیکھ کر حضرت عمر کی دو لونڈیاں "لبینہ" اور "زنیرہ" اسلام لے آئیں۔ حضرت عمرؓ انھیں کوڑے مارتے مارتے نڈھال ہو جاتے، مگر وہ ایمان پر مضبوط ہوتی گئیں۔ انھیں بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خرید کر آزاد کر دیا۔

یاد رہے ان دنوں حضرت عمر ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

ان کے بعد "غزیہ"[13] اسلام لائی۔ وہ کسی کی کنیزہ نہیں، بلکہ آزاد تھی وہ مکہ میں آ کر سرعام اسلام کی تبلیغ کرنے لگی۔ اہل قریش نے بڑا ڈرایا دھمکایا، مگر وہ خوف زدہ نہ ہوئیں۔ مشرکین نے دیکھا کہ حضرت غزیہ تبلیغ اسلام سے دستبردار ہونے کی نہیں تو انھیں اغوا کر کے مکہ کے باہر ایک قافلے کے پاس لے گئے۔ ایک اونٹ کے ساتھ رسیوں سے جکڑ دیا۔ قافلے والوں سے کہا اسے کوئی روٹی پانی نہ دینا جب یہ بھوک و پیاس سے مر جائے تو اونٹ سے اتار کر صحرا میں پھینک دینا تاکہ جنگلی جانوروں کا لقمہ بن جائے۔

حضرت غزیہ فرماتی ہیں کہ تین دن کی بھوک اور پیاس نے مجھے قریب المرگ کر دیا تھا، مگر چوتھے روز مجھے اپنے ہونٹوں پر ٹھنڈے پانی کی نمی محسوس ہونے لگی۔ میں نے نیم بے ہوشی کی حالت میں پانی پینا شروع کیا۔ اتنا سیر ہو کر پیا کہ واقعی میری پیاس ختم ہو گئی اور میں ہوش میں آ گئی۔ اہل قافلہ کا خیال تھا کہ میں ابھی تک مر چکی ہوں گی۔ وہ میرے پاس آئے۔ مجھے ہشاش بشاش دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئے۔ میں نے انھیں واقعہ سنایا تو ڈرنے لگے۔ میری رسیاں کھول کر معافی مانگی۔ ایک روایت کے مطابق حضرت غزیہ نے دعوت اسلام دی تو وہ سارا قافلہ مسلمان

Marfat.com

ہو گیا۔

حضرت عمار بن یاسر[14] کو لوہے کی گرم سلاخوں سے داغا جاتا۔ ان کے والد اذیتوں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کی والدہ کو ابوجہل نے اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا۔

حضرت خباب بن ارت[15] کا قرضہ عاص بن وائل کے ذمے تھا۔ اس نے قرضہ واپس کرنے سے انکار کر دیا انھوں نے تقاضا کیا تو اذیتوں کے پہاڑ توڑ دیے۔ انھیں دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیا جاتا۔ یہاں تک کہ جسم سے کھال پگھل کر کوئلوں کو بجھا دیتی، مگر آفرین صد آفرین اسلام کے وہ جاں نثار ذرہ برابر نہیں ڈولے۔

یہ چند واقعات ہیں۔ اصل میں کوئی مسلمان مشرکین کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں تھا۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

اسلام کی پہلی شہیدہ

حضرت سمیہؓ ابوجہل کی کنیز تھی۔ مکہ کی کنیزوں میں سے باشعور اور سمجھدار۔ آپ مکہ میں ''تقرہ'' یعنی لیڈی ہیلتھ وزٹر یا نگران زچہ و بچہ کا کام سرانجام دیتی تھیں۔

یادر ہے ''تقرہ'' کا کام ''دائیہ'' سے مختلف ہے ''دائیہ'' وضع حمل میں زچہ و بچہ کی مدد کرتی ہے جبکہ ''تقرہ'' حاملہ خاتون کی مسلسل نگرانی کرتی ہے خواتین کو مفید مشورے دیتی ہے جس طرح آج کل لیڈی ہیلتھ وزٹرز کام کرتی ہیں۔

حضرت سمیہؓ چونکہ ''تقرہ'' تھی۔ اس لیے ابوجہل کے گھر خصوصی طور پر اور مکہ میں عمومی طور پر ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انھوں نے اپنے بیٹے ''عمار'' اور خاوند یاسر کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تو انھیں بھی اسلام سے روکنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ ابوجہل نے بڑی سختی سے دینِ اسلام چھوڑنے کا حکم دیا۔ مگر آپؓ نے جواب دیا کہ میں اس دین کو نہیں چھوڑوں گی۔ ابوجہل نے کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ اتنا مارا اتنا مارا کہ آپ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئیں۔

سوئے اتفاق حضرت ابوبکر صدیق[16] کا گزر وہاں سے ہوا۔ وہ کیا دیکھتے ہیں کہ سمیہؓ مار پیٹ کی وجہ سے نڈھال پڑی ہیں۔ انھوں نے ابوجہل سے کہا کہ میں اس کنیز کو خریدنا چاہتا ہوں۔ ابوجہل نے بیچنے سے انکار کر دیا۔

حضرت ابوبکر نے کہا اگر تو اس کو بیچنے پر تیار ہو جائے تو میں تمھیں سو دینار دینے پر تیار ہوں ابوجہل نے پھر انکار کر دیا۔''

حضرت ابوبکرؓ نے قیمت اور بڑھا دی۔ ابوجہل اپنی ضد پر قائم رہا۔ حضرت ابوبکرؓ قیمت بڑھاتے رہے۔ ابوجہل انکار کرتا رہا یہاں تک حضرت ابوبکرؓ ''سمیہؓ'' کی قیمت ''ابل قاضیہ'' تک لے گئے، مگر وہ لعین ابل قاضیہ پر بھی رضامند نہ ہوا۔

''ابل قاضیہ'' دراصل عربوں کی قدیم مصالحتی یا ثالثی رسم تھی جس کے تحت مقتول کے ورثا کو ''دیت'' کی رقم خود تعین کرنے کا حق دے دیا جاتا۔ یوں وہ منہ مانگی رقم وصول کر لیتے۔

Marfat.com

قارئین آج جب میں مسلمان کو مسلمان کے درپے آزاد دیکھتا ہوں۔ مسلمان کے منہ سے مسلمان کو کافر کافر کہتے سنتا ہوں تو بے خود سا ہو جاتا ہوں۔ اس بے خودی کے عالم میں حضرت ابو بکر صدیقؓ میری فکر و روح میں سرایت کر جاتے ہیں۔ میں خود سے سوال کرتا ہوں۔ کیا مسلمان اتنا ارزاں ہے۔ کیا کلمہ گو کی یہی اہمیت اور قیمت ہے جو ہم لگا رہے ہیں۔ میرا رواں رواں چیخ اٹھتا ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں۔ اگر مسلمان کی قیمت کا تعین کرنا ہے تو ابو بکرؓ و عثمانؓ و عمرؓ و علیؓ سے پوچھو تمھیں کیا معلوم کہ دل میں ایمان رکھنے والا کتنا قیمتی ہے۔

حضرت سمیہؓ سے پہلے حضرت ابو بکرؓ چھ بُردوں کو خرید کر آزاد کر چکے تھے جن میں دو مرد اور چار عورتیں تھیں۔ مگر حضرت سمیہؓ کو آزاد کروانے میں ناکام رہے۔

حضرت سمیہؓ کی مکہ میں ہر دلعزیزی کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ مکہ کی سر آوردہ خواتین اکٹھی ہو کر ابوجہل کے پاس گئیں کہ اس بیچاری پر ظلم بند کر دو جس نے ایام حمل میں بے شمار قریشی عورتوں کی مدد کی۔ ابوجہل نے ان کی بات ماننے سے بھی انکار دیا۔

بعد ازاں ابوجہل اتنے کوڑے برساتا اتنے کوڑے مارتا کہ حضرت سمیہؓ کا جسم لہولہان ہو جاتا۔ اتنی اذیتوں کے بعد جب محمد ﷺ کے دین کے بارے میں پوچھا جاتا تو آپؓ صاف صاف کہہ دیتیں کہ قربان ہو جاؤں گی، مگر محمد ﷺ کا دین کبھی نہیں چھوڑوں گی۔

جب ابوجہل عاجز آ گیا تو سمیہؓ کے قتل کا فیصلہ کر لیا ایک دن انھیں حرم شریف میں لے جا کر عوام الناس کے سامنے پھر وہی سوال دہرایا۔ آپؓ نے پھر وہ اقرار کیا کہ رسول اللہؐ کے دین کو نہیں چھوڑ سکتی۔

ابوجہل نے طیش میں آ کر اتنی زور سے نیزہ مارا کہ اس محترم ہستی کے سینے سے پیٹھ تک آر پار ہو گیا اور یوں آپ نخلستانِ شہادت کا پہلا پودا بو گئیں جس کے بیج سے آج تک شہادت کے کھیت اگ رہے ہیں۔ فصلوں کی فصلیں کٹ رہی ہیں۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔

اسلام کی خاطر جان قربان کر دینے والی روایت حضرت سمیہؓ نے ڈالی۔ اس رسم کی بانی آپؓ ہیں۔ اسلام کی سب سے پہلی شہید آپؓ ہیں۔ اللہ آخرت کی تمام عزتیں آپؓ کے نام کر دے۔

آمین یارب العلمین!

———(((الحمد للہ)))———

مسلمانوں کے ہاتھ غلام فروخت کرنے پر قدغن

نفسیاتی لحاظ سے یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔خوف دل کے اندر چھپے وسوسے یا ڈر کا نام ہے اور ہر ڈرانے والا اندر سے ڈرا ہوا ہوتا ہے۔خوف دلانے کا مقصد ہی اپنے دل کے اندر چھپے ہوئے خطرے کو تسلی دینا ہے۔آجر، اجیر سے ڈرتا ہے۔کارخانہ دار مزدور سے ڈرتا ہے کہ کہیں اس کو اپنی قوت بازو کا اندازہ ہو گیا تو میرے لیے خون نچوڑنے والا کوئی نہیں رہے گا۔میری مل، میرا کارخانہ، میرا سرمایہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔سو وہ اجیر کو ڈراتا بھی ہے، بہلاتا بھی ہے، ورغلاتا بھی ہے کہ اس کا کام چلاتا رہے۔حاکم محکوم سے اس لیے ڈرتا ہے کہ اگر محکوم کو اس کی حاکمانہ چالوں کا ادراک ہو گیا تو میرا اقتدار و اختیار چھن جائے گا۔میں محکوم کی جگہ بیٹھنے پر مجبور کر دیا جاؤں گا۔اس لیے عوام کو اپنے زیر اطاعت رکھنے کے لیے خود ساختہ قوانین اور فرامین کے ذریعے ڈراتا دھمکاتا رہتا ہے۔لڑاتا بھڑاتا رہتا ہے۔

تحریکِ اسلامی کے خلاف سردارانِ مکہ کے پاس کوئی منشور یا ضابطہ تو تھا نہیں۔اس لیے وہ اپنی خاندانی اور قبائلی طاقت کے زُعم پر لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے اور پھسلاتے ورغلاتے تھے۔اسلام اور قرآن کے حلاوت آگیں اثرات بڑی تیزی سے عوام الناس کو متاثر کر رہے تھے۔خاص طور پر موالی اور غلام تو تیزی سے اسلام قبول کر رہے تھے۔سرداران مکہ اپنی تمام کوششیں ان کے خلاف بروئے کار لا رہے تھے۔

اب مسلمان جس مظلوم کو دیکھتے، اسے خرید کر آزاد کر دیتے۔غلامی سے نجات اور زندگی میں اپنی مرضی اور آزادی کا احساس ان لوگوں کو اس نئے انقلابی دین کی طرف لا رہا تھا۔

حضرت سمیہؓ کی شہادت کے بعد دارالندوہ یعنی مشرکین مکہ کی پارلیمنٹ کے چار اعلیٰ ممبران کی مجلس بیٹھی۔ولید بن مغیرہ، ابوسفیان، ابولہب اور ابولہب کی بیوی ام جمیلہ پر مشتمل ہنگامی

Marfat.com

سٹینڈنگ کمیٹی بنی۔ یہ جائزہ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ جو بھی غلام یا کنیز دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتی ہے وہ واپسی کا نام تک نہیں لیتی۔ ہمارا کوئی سلوک، کوئی تشدد ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اُوپر سے ابوبکر صدیقؓ ہر قیمت پر اسے خریدنے کو تیار کھڑے نظر آتے ہیں۔ یوں تمام لوگ دائرہ اسلام میں چلے جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ ہمارے لیے کوئی راستہ نہ رہے، مسلمانوں کے ہاتھوں غلاموں کی فروخت بند کر دو۔

اس جائزہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کوئی شخص کسی غلام یا لونڈی کو اس طرح اس حالت میں فروخت نہیں کرے گا کہ وہ اسلام کے ساتھ آزاد ہو جائے۔

یوں اپنی طرف سے انھوں نے کنیزوں اور غلاموں کے لیے اسلام کا راستہ بند کر دیا، لیکن معاشرے پر ان کی منطق کے منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ ان کی بے اصولیاں تحریکِ اسلامی کے لیے اچھے اثرات پیدا کر رہی تھیں۔ ان کے فیصلے کسی مقصد، منشور یا ضابطے کے تابع نہ تھے۔ یہ تو بس ان کی وحشت اور بربریت یا اندرونی اضطراب تھا، اس لیے سننے اور دیکھنے والے محسوس کر رہے تھے۔ یہ احساس صاحبِ شعور لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچ رہا تھا۔

اس قائمہ کمیٹی کے موجودہ فیصلہ کے بعد قریش کے چند نوجوان علانیہ اسلام کے حصار میں آ گئے۔ ان میں عثمانؓ بن عفان عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، طلحہؓ بن عبیداللہ اور سعدؓ بن عمر شامل تھے۔ بعدازاں ان اصحاب کی خدمات تاریخِ اسلامی کے سرورق بنیں۔ ان صحابہ کرامؓ کی جواں ہمتی نے اسلام کو دنیا کے طول و عرض پر پھیلا دیا۔ قیصر و کسریٰ جیسی سپر طاقتیں ان کی منصوبہ بندی کے سامنے ہوا کا بگولا ثابت ہوئیں۔ قارئین!! اس فیصلے کے بعد مشرکین نے حضور ﷺ کی ذات کو حرم شریف میں داخل ہونے سے روکنا شروع کر دیا۔ عام کارکنانِ تحریکِ اسلامی کے ساتھ ساتھ نبی اکرم ﷺ پر بھی تشدد بڑھا دیا۔ کوئی دن ایسا نہ ہوتا جس دن آپؐ پتھروں سے لہولہان نہ ہوتے۔

حرمِ کعبہ عربوں کی اپنی روایات کے مطابق اتنا مقدس تھا کہ دو جانی دشمن بھی وہاں ایک دوسرے پر ہاتھ نہ اٹھاتے، مگر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیروکاروں کو یہاں بھی معاف نہ کیا گیا۔ اسلام کی راہ میں پہلی خاتون حضرت سمیہؓ کو بھی حرم کے اندر شہید کیا گیا۔ اس کے بعد پہلے مرد کو بھی یہیں پر شہید کیا گیا۔ اس کو آگے بیان کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ

Marfat.com

خانہ کعبہ خاکدان، ارضی پر اللہ کا پہلا گھر ہے۔ اس کی بنیاد آدم علیہ السلام نے رکھی۔ اسے ابراہیمؑ اور اسماعیل علیہ السلام نے مکمل کیا۔ اس کعبے کی حرمت کی تکمیل لیے محمد ﷺ مبعوث ہوئے، لیکن آپ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کے خلاف پوری جاہلیت، پوری حیوانیت، پوری بربریت اپنی پوری شیطانی فکروں کے ساتھ یہیں اٹھ کھڑی ہوئی۔

نوٹ: یہ تمام واقعات سیرتؐ اور احادیث کی کتب سے لیے گئے۔

—(((الحمد للہ)))—

اسلام کے لیے پہلے مرد کی شہادت

سرکاردوعالمﷺ جب بھی گھر سے باہر نکلتے ان کی راہ میں کانٹے بچھا دیے جاتے۔اوباش نوجوانوں کے ذریعے گندگی پھینکی جاتی۔ پتھر برساتے جاتے، مگر لاکھوں درودوسلام آپﷺ پر کہ آپ انتہائی خطرناک حالات میں بھی جان کی پروا کیے بغیر خانہ خدا میں جانے سے غیر حاضری نہ کرتے۔مشرکین دشمنی میں اتنے آگے نکل گئے کہ انھوں نے احترام ''حرم'' کو بھی پس پشت ڈال دیا۔

ایک دن آپ سرکارؐ حرم سے گھر آ رہے تھے۔قریش کے لوگوں نے راستے میں شدید پتھراؤ کیا۔آپؐ اتنے زخمی ہوئے کہ بڑی مشکل سے گھر پہنچے۔گھر پہنچتے ہی نڈھال ہو کر گر پڑے۔اگلے دن تک زخموں کو سہلاتے رہے۔شدید تکلیف کی وجہ سے اگلے دن حرم شریف میں جانے سے محروم رہے۔صحابہ اکرامؓ نے جب آپؐ کو غیر حاضر دیکھا تو اپنے طور پر عبادت شروع کر دی۔ سارے صحابہ نماز ونوافل اور رکوع وسجود کی حالت میں چلے گئے۔

قریش مکہ نے چند اجرتی غنڈوں کے ذریعے اس جماعتِ مسلمین پر حملہ کر دیا۔کئی مسلمان شدید زخمی ہو گئے۔ان میں سے ایک مرد مجاہد، جس کا نام حارثؓ تھا، شدید زخمی ہو گئے اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چند لمحوں میں جان جانِ آفرین کو پیش کر دی۔ جنابِ حارثؓ بوقت شہادت سجدے کی حالت میں تھے۔

یوں جناب حارثؓ تحریک اسلامی کے وہ پہلے شہید کہلائے جنھوں نے مردوں میں سے سب سے پہلے نخل اسلامی کو اپنے خون سے سینچا۔غزل شہادت کا طرح مصرع جو حضرت سمیہؓ نے اپنے خون سے لکھا تھا، آپ اس طرح کا مصرع ثانی ہو گئے اور یوں مطلع مکمل کر گئے۔اللہ آپؓ پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے ''آمین''

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

یاد رہے حضرت حارث رضی اللہ عنہ حضرت خدیجہ کے پہلے خاوند کے بیٹے تھے۔یوں رسول

Marfat.com

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے بیٹے تھے۔

بعدازاں مشرکین نے حرم شریف کے راستوں کی مسلسل نگرانی شروع کر دی۔ جو مسلمان کسی بھی راستے پر مل جاتا، اس پر تشدد کر کے حرم شریف میں داخل ہونے سے روکا جاتا۔

جیسا کہ پہلے ابواب میں دارالارقم کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر حضور سرور کائناتؐ نے حضرت ارقم بن ابی ارقم کے گھر کو اسلام کے کی اشاعت و تبلیغ کے لیے مخصوص کیا جو مکہ سے قدرے باہر ایک گھاٹی کے درمیان واقع تھا۔

مشرکین کو اس پہلو بھی اطمینان نہیں آیا وہاں بھی انھوں نے سازشیں شروع کر دیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت کے مطابق ہماری وہاں پر بھی چوبیس گھنٹے نگرانی کی جانے لگی۔ دارالارقم میں داخل ہونے کے لیے طویل راستوں سے چھپ چھپ کر جانا پڑتا۔ اگر قرب و جوار والے دیکھ لیتے تو ہم پر ٹوٹ پڑتے۔ یہاں تک کہ ہمیں ہر روز نئی جگہ تلاش کرنی پڑتی۔ اگر کسی نئی جگہ ہم دو دن اکٹھے ہو جاتے تو مشرکین پتا چلا لیتے اور ہمیں مجبوراً جگہ تبدیل کرنا پڑتی۔

یوں ایک دن ہم ''ابوذوب'' نامی گھاٹی میں مصروف عبادت تھے کہ ابوسفیان کے ساتھ اخنس بن شریق جیسے باشعور لوگوں نے ہم پر نماز کی حالت میں حملہ کر دیا۔ مجبوراً ہمیں بھی اپنا دفاع کرنا پڑا۔ میرے قریب ایک اونٹ کی ہڈی پڑی تھی میں نے پکڑی اور ایک شخص کے دے ماری۔ اس حملہ آور کا سر پھٹ گیا اور وہ خون آلود چہرے کے ساتھ الٹے پاؤں دوڑ نکلا۔ یوں اسلام کی مخالفت کرنے والے کسی شخص کا خون بہانے والے پہلے فرد حضرت سعد بن ابی وقاص ٹھہرے۔

قارئین اس تشدد اور بربریت کا سلسلہ کافی طویل ہے سو ہم اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

—(((الحمد للہ)))—

ظلم کے اثرات ونتائج

دارالندوہ اسلام کے خلاف لڑی جانے والی اس سرد جنگ میں بڑی مضبوط، جامع، سخت اور مسلسل منصوبہ کرتا رہا، مگر ناکام وہ اس لیے کہ ان کے پاس نہ تو کوئی منشور تھا اور نہ ہی انسانیت کے لیے کوئی فلاحی واصلاحی ضابطہ۔ ساتھ ہی ان کی اپنی بدکردار اور بدمزاج شخصیتیں بھی ان کی ناکامیوں کا بہت بڑا سبب تھیں۔ اب جبکہ قرآن اور بانیٔ انقلابؐ نے انھیں ہر جگہ ناکام بنا دیا تو مخالفین نفسیاتی طور پر ہیجانی اور مخبوط الحواسی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ بدحواسی کے عالم میں غنڈہ گردی اور دہشت گردی پر اتر آئے۔ انھیں اپنا خاندانی اثر ونفوذ ہوا ہوتا نظر آنے لگا۔ غلاموں اور موالیوں کے ہاتھوں انھیں اپنی پگڑیاں اچھلتی نظر آنے لگیں۔ اس سارے عمل میں چونکہ ان کے اپنے بھائی بیٹے بھتیجے اور خواتین بھی شامل تھیں اس لیے وہ حواس باختگی میں اسلام لانے والوں پر ٹوٹ پڑتے۔ وہ اس برے انداز سے تشدد کرنے لگے کہ اپنے اعمال کے نتائج واثرات پر سوچ ہی نہ سکے۔

انھیں یہ سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا کہ جس تحریک کو وہ روکنا چاہتے ہیں، ان کی بھرپور اور پرتشدد مخالفت کی وجہ سے تیزی سے پھیل رہی ہے اور دن بدن وقت کی گرفت ان کے ہاتھوں سے نکل رہی ہے۔ ان کے اپنے پرائے بنتے جا رہے ہیں۔ ان کے زرخرید یعنی سائے بھی دشمن ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کی اپنی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں خیال ہی نہ رہا کہ ان کے ایجاد کردہ کرتوتوں کا نتیجہ بھی بالآخر انھیں خود ہی بھگتنا ہے۔

دہشت گردی یا تشدد اور جنگ کسی بھی تحریک کو روکنے کا آخری داؤ ہے۔ سرد جنگ کے ماہرین انتہائی ناگزیر حالات میں یہ تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو انتہائی خفیہ انداز میں تخریب کاری کا سہارا لے کر پُرتشدد کارروائیاں انجام دیتے رہتے ہیں اور مخالفین پر غیر محسوس انداز سے دباؤ بڑھاتے جاتے ہیں۔ لوگوں کے سامنے اپنے مقاصد کو سچے انداز میں بیان کر کے اپنی حمایت یا غیر جانبداری پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ کھلے تشدد یا جنگ کو آخری آپشن بنا کر محفوظ رکھتے ہیں۔

قارئین!! ظلم اور تشدد ایسی ناگوار چیز ہے جسے کوئی طبیعت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ ظلم اور تشدد ایسا رویہ ہے جو طبیعتوں میں ناگواری پیدا کرتا ہے۔ فطری طور پر انسان ناگوار ماحول کو پسند نہیں کرتا۔ عوام تو کیا خواص بھی ایسے ماحول سے کنی کترانے لگتے ہیں۔ ظلم ہمیشہ سچائی کے خلاف اور حقائق سے منافی راستوں پر چلتا ہے۔ اس لیے عموماً ظلم اور تشدد کے ذریعے اپنی بات منوانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ظلم ہمیشہ طاقت کے زُعم میں کیا جاتا ہے اور طاقت کا زُعم حماقتوں کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لیے آج ہم تاریخِ انسانی کے مطالعہ سے پتا چلا لیتے ہیں کہ ظالم ہمیشہ احمق رہے ہیں اور مظلوم ہمیشہ دانا و عقل مند۔ ظالم تمام تر طاقتوں کے باوجود ناکام ہوئے اور مظلوم کامیاب و کامران۔ ظالم کی فکر سلب ہو جاتی ہے۔ اسے اچھائیاں بھی برائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ اپنی برائیوں کو بھی اچھائیاں سمجھنے لگتا ہے۔ اس لیے دانشمندی اس کے نزدیک نہیں پھٹکتی۔ دوسروں کی تباہی کے فیصلے اس کی اپنی مکمل تباہیوں پر منتج ہو جاتے ہیں، مگر اس چیز کا ظالم کو آخری لمحے تک ادراک و شعور نصیب نہیں ہوتا۔

مشرکین مکہ بھی انھیں کیفیات سے دوچار تھے۔ وہ تحریکِ اسلامی کے اثرات کو سمجھنے کی بجائے دبانے کی تدبیریں کرتے رہے۔ ان کی پرتشدد کارروائیاں عوام الناس کو ناگوار گزرتی رہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ جوق در جوق اسلام کی طرف دوڑتے رہے۔ ان کا کوئی تشدد، کوئی ظلم لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے نہ روک سکا۔

حضرت سمیہؓ اور حضرت حارثؓ کی شہادتیں عوام الناس ہی نہیں، بلکہ خواص پر بھی شاق گزریں۔ ان حضرات کی اپنے ایمان پر استقامت نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہ دین ہے کیا چیز، جسے لوگ ایک دفعہ قبول کرنے کے بعد جان تو دے دیتے ہیں، مگر پیچھے نہیں ہٹتے۔ اس کو قریب سے دیکھا تو جائے۔ ایک دفعہ اس کے قریب ہونے میں حرج ہی کیا ہے۔ ذرا دیکھا تو جانا چاہیے نا۔

مشرکین کی ان کارروائیوں سے لوگوں میں پرتجسس ہیجان پیدا ہو جاتا۔ فطری مجبوری کے تحت جب لوگ آپ ﷺ کے قریب جاتے تو تمام سچائیاں ان کے رگ و پے اور ذہن و شعور میں سرایت کر جاتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ مکہ میں اسلام کی تشہیر و اشاعت مخالفین کی شدید مخالفت کی وجہ سے عرب کے طول و عرض میں پھیل گئی۔

اہلِ قریش کے پرتشدد انداز کی وجہ سے حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت عمرؓ جیسے افراد حلقہ

Marfat.com

بگوشِ اسلام ہوئے۔ حضرت عثمان بنؓ عفان، سعد بن ابیؓ وقاص، عبدالرحمٰنؓ بن عوف جیسے لوگ حضرت سمیہؓ کی شہادت دیکھ کر مسلمان ہوئے۔

ایک طرف مشرکین کی ناگوار حرکات اور دوسری طرف بانیٔ تحریک صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و کردار۔ تحریکی مقاصد سے لگن اور قرآن کے سحرآگین اثرات نے اس مشکل وقت میں بھی کارکنوں کے حوصلے بلند رکھے جو سختیاں اور تشدد برداشت کرنے میں لذت محسوس کرنے لگے، بلکہ تشدد کرنے والے تھک تھک کر اسلام کی طرف پلٹتے رہے۔

نفسیاتی طور پر ظلم اس وقت جنم لیتا ہے جب ظالم کے دل میں مظلوم کی طرف سے اَن جانا خوف جنم لیتا ہے۔ ظالم کے پاس اپنی بات منوانے کا کوئی حل موجود نہیں ہوتا۔ اپنی خود ساختہ شخصیت لوگوں میں ہر دل عزیز بنانے کا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا تو وہ ظلم پر اتر آتا ہے۔ ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے، خون جب گرتا ہے تو جم جاتا ہے۔

ظالم چاہے کتنا طاقتور اور خونخوار کیوں نہ، ہو دلوں کو مسخر کرنا اس کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ دلوں کو جیتنے کا ذریعہ صرف پیار اور محبت ہی ہے۔ دہشت اور جبر دلوں میں دوری پیدا کرنے والی چیزیں ہیں۔ ان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر نا کوئی جیتا ہے اور نا ہی جیت سکتا ہے۔

مشرکین مکہ بھی کچھ اس انداز سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنا چاہتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی جماعت کسی طور اپنے مشن سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھی۔ ہر سختی اور ہر نیا تشدد ان کی تحریکی وابستگی میں مضبوطی پیدا کر رہا تھا۔ کسمپرسی کے باوجود ان کی تعداد میں صبح و شام اضافہ ہو رہا تھا۔ جبر اور ظلم کے دنوں میں جو تحریکیں پنپتی رہتی ہیں، ان کو انقلاب برپا کرنے سے روکنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔

ایک اور پتے کی بات بتا تا جاؤں۔ اللہ کے خاص بندے ظالم کی بجائے مظلوم بننا پسند فرماتے ہیں، خواہ اپنے سے بہت زیادہ کمزور لوگوں کے مقابلے میں کیوں نہ ہوں۔ بے شک لوگ انھیں بزدلی کی علامت سمجھنے لگیں، حالانکہ وہ اپنے دور کے بہترین انسان ہوتے ہیں جو حق و باطل کی معرکہ آرائی میں سینے تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عام لوگوں کے ساتھ کمزوری دکھانے کی وجہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی یہ احتیاط ہوتی ہے۔ کہیں وہ ظالم نہ بن جائیں۔ سو اسلام کی اولین جماعت پر نظر ڈالیں تو بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے، مگر وہ لوگ بھی حق بات سے ذرا برابر پیچھے نہیں ہٹے۔ اسلام کے ابتدائی 13 سال ان مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

حواشی:

-1 ابن اہشام۔
-2 ابن اہشام جلد اول سیرت النبیؐ جلد دوم۔
-3 سورہ جن آیت نمبر 19
-4 سورۃ حجر آیات 93 تا 95
-5 سرورِ عالم جلد دوم۔
-6 ابن ہشام جلد اول۔
-7 ابن ہشام۔
-8 ابن ہشام۔ سیرت سرورِ عالمؐ۔
9، 10، 11۔ مسلم ابوداؤد، ترمذی۔
-12 ابن ہشام، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
13، 14، 15۔ سیرت ابن ہشام، سیرت النبیؐ، ابن سعد۔
-16 ابن ہشام۔

Marfat.com

باب: 11

سرد جنگ کا معاشی و معاشرتی محاذ

معاشی و معاشرتی محاذ

اقتصادی اور تجارتی ناکہ بندی ہر دور میں کسی ملک تنظیم گروپ یا نظریے کے خلاف بہت بڑے ہتھیار رہے ہیں۔ اکثر اوقات جو کارروائی بڑے سے بڑا ملک یا بڑے سے بڑی فوج نہیں کر سکی، سرد جنگ میں اقتصادی پابندیوں کا محاذ کھول کر یا جغرافیائی اور معاشرتی ناکہ بندی کر کے بغیر لڑے اور مادی وسائل آگ میں جھونکے بغیر بڑی سے بڑی کامیابی حاصل کی جاتی ہے۔

ہر دور میں ہر قوم، ہر نظریاتی انقلابی گروپ کو مخالف پروپیگنڈہ کا دفاع کرنے کے لیے اپنے تنظیمی اور تحریکی نظریات کی نشر و اشاعت کے لیے بے پناہ وسائل کی ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا جاتا رہا۔ اپنے حریفوں کو بے بس کرنے کے لیے سرد جنگوں میں اقتصادی و معاشرتی پابندیوں کو بڑی چابکدستی سے استعمال کیا جاتا رہا، مگر سرد جنگ میں دہشت گردی اور اقتصادی و تجارتی ناکہ بندی انتہائی اقدام ہیں۔ ان احوال سے گزرنے کے بعد کسی تحریک کو کھلی جنگوں کے ذریعہ بھی روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ روزی روٹی اور معاشرتی تحفظات انسان کی فطری کمزوریاں ہیں جو تحریک اپنے کارکنوں کو نظریاتی تربیت کے ذریعے ان بنیادی کمزوریوں سے مبرا کر دیتی ہے، انھیں جنگ کے ذریعے ختم کرنا یا روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کسی تحریک کا اس حالت سے گزر جانے کا سیدھا سیدھا مطلب ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے مقاصد رائج الوقت نظریات یا قواعد و ضوابط سے بہت بلند و بالا ہیں جو رائج الوقت نظاموں کے ماننے والوں کو مافوق الفطرت معلوم ہوتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر ان کو دبانے کی کوششیں کرنے والے خود غیر محسوس انداز میں دبتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دباؤ ان کے اندرونی خلفشار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اندرونی خلفشار ان کے اعصاب کو توڑ کے رکھ دیتا ہے۔ اس لیے وہ یا تو اعصاب شکنی کے ہاتھوں تنگ آ کر اسی تحریک کا

Marfat.com

حصہ بن جاتے ہیں یا پھر کسی میدان جنگ میں موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تدبیراتی لحاظ سے اقتصادی و معاشرتی ناکہ بندی کا جائزہ لینے سے یہ منطق سامنے آتی ہے۔ جس طرح ایک ماہر جرنیل یا ملٹری لیڈر اپنے حریف کو بے بس کرنے کے لیے اس کے ذرائع مواصلات رسد اور کمک کاٹنے کی کامیاب چال چلنے کی ہر ممکن سعی کرتا ہے، اسی طرح اپنی سالمیت اور بقا پر نظر رکھنے والی قومیں بھی اپنے مخالفین کے خلاف اقتصادی اور معاشرتی ناکہ بندی کی کانٹے دار تار بچھائے رکھتی ہیں۔

آج کے نکتہ ور میری اس بات سے یقینی اتفاق کریں گے کہ ہزاروں سال پہلے بھی اور آج بھی اور کل کے برس بھی وہ قوم ترقی کے تمام راستے پھلانگ کر گزر جاتی ہے جو بہترین سرمایہ کار ہو۔ جو معیار مقدار اور قیمت کے لحاظ سے بہترین مصنوعات کے ذریعے دنیا کی منڈیوں میں مخالفین پر اپنی چھاپ لگا دے۔ اس مخاصمت کا آج اور کل میں فرق صرف اتنا ہے کہ کل یہ نتائج ایماندارانہ تجارتی سرمایہ کاری سے حاصل کیے جاتے تھے اور آج تجارت کے ساتھ ذاتی ملکی مصنوعات کا معیاری ہونا بھی ضروری ہو گیا ہے آج محفوظ معاشی ذخائر میں بے پناہ اضافہ کے بغیر ترقی دیوانے کا خواب بن جاتی ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

تاریخ کا موازنہ کیا جائے تو ایران و روم کی صدیوں چلنے والی چپقلش کی وجوہات صرف اقتصادی اجارہ داری کا حصول ہی تھا اور آج تیسری دنیا کے ممالک خصوصاً مسلمان ملکوں کے خلاف امریکا یورپ اور دنیا کی یہودی لابی یہی ہتھیار استعمال کر رہی ہے تاکہ اقتصادی وسائل کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر اپنے نظریات کو مسلط رکھا جا سکے۔

پچھلے ابواب میں عرض کر چکا ہوں کہ حضور ﷺ نے نبوت ملنے سے پہلے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ مل کر ایماندارانہ تجارتی تدبر سے بہترین تجارتی سرمایہ کاری کر کے اپنی تجارتی و اقتصادی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا۔ یہ اس بات کی بہت بڑی دلیل تھی کہ آپ مستقبل قریب میں اقتصادی نظم و نسق سنبھالنے والے تھے اور بہترین صلاحیتوں سے سنبھالنے والے تھے۔

مخالفین اسلام کے پاس مسلمانوں کے مقابلے میں بے پناہ اقتصادی و مادی وسائل تھے۔ معاشرتی حوالے سے بھی وہ زیادہ اثر و نفوذ والے تھے۔ وہ اپنے وسائل و اختیارات تحریکِ ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف انتہائی مہارت اور اجتماعی مشاورتی انداز سے استعمال کر رہے تھے۔ زندگی کا ہر شعبہ کچھ تو ویسے کسی نہ کسی طرح ان کے قبضہ و اختیار میں تھا اور بنی ہاشم کے خلاف

Marfat.com

اجتماعی معاشی سیاسی اور مادی سوچ فکر اس میں اور جان ڈال دیتی تھی۔ بلاشبہ اس وقت تو وقت بھی ان سے پوچھ کر چلتا تھا۔ ایران و روما کے بڑے بڑے جنگی قافلے بھی ریگزارِ عرب میں اپنے راستے بھول جاتے تھے۔ گھوڑے اور شہسوار راستے بھول کر خانہ بدوش عربوں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ عجمی کارواں صحرائے نجد کی وسعتوں میں گم اور روم کے تجارتی قافلے یثرب کی گھاٹیوں اور جان لیوا موسم میں پھنس کر بدوی عربوں سے زندگی کی بھیک چلو بھر پانی کی صورت میں مانگ رہے ہوتے۔ وہ خانہ بدوش جسے چاہتے خشکی کے اس عمیق سمندر سے ساحلِ سمندر تک پہنچا دیتے، جسے چاہتے خشک گہرائیوں میں پیاسا مرنے کے لیے تڑپاتے رہتے۔

الغرض شاہانِ جابر یعنی قیصر و کسریٰ بھی یہاں آ کر ان کے جوتوں کی ٹھوکر پر ہوتے۔ اتنے طاقتور قبائلی سرداروں کے سامنے (نعوذ باللہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مفلس و ناتواں ساتھی کیا حیثیت رکھتے تھے۔ ان چند تحریکی جانثاروں کا ان سے کیا مقابلہ تھا۔

مگر قدرتِ خداوندی جو کرنا چاہتی ہے اسے ساری دنیا مل کر بھی روک نہیں سکتی۔ جو نہیں کرنا چاہتی، اسے ساری دنیا مل کر بھی کر نہیں سکتی۔ اس نے چاہا تو آدمؑ کو مٹی سے پیدا کر کے اشرف المخلوقات بنا دیا، کوئی اسے روک نہ سکا۔ ابراہیمؑ کو بت تراش کے گھر پروان چڑھا کر بت شکن بنا دیا۔ نمرود کی کوسوں لمبی چوڑی چتا میں اپنے خلیل کو سلامت رکھنا چاہا تو کوئی انھیں جلا نہ سکا۔ نمرود کو ایک معمولی لنگڑے مچھر سے مروانا چاہا تو کوئی بچا نہ سکا۔ فرعون کے گھر موسیٰ علیہ السلام کو پالنا چاہا تو کوئی انھیں نکال نہ سکا۔ فرعون کو غرقابِ نیل کرنا چاہا تو کوئی اسے سنبھال نہ سکا۔ تمام جہانوں کا مالک اللہ ہے اور تمام جہان اس کے حکم کے تابع ہیں۔ اس کا حکم ایسا ہے کہ مجال ہے کوئی اس کی مرضی کے بغیر آنکھ جھپک سکے، پر مار سکے یا سانس لے سکے۔ اس مالک کے خلاف کوئی طاقت طاقت نہیں۔ کوئی دانش دانش نہیں۔ کوئی تدبیر تدبیر نہیں کوئی دلیل دلیل نہیں کوئی فیصلہ فیصلہ نہیں کوئی حکم حکم نہیں کوئی مصلحت مصلحت نہیں۔ یہ اپنی خواہشوں کے پروردہ جھوٹی آناؤں کے اسیر مشرکینِ مکہ کیا چیز تھے۔ قدرتِ خداوندی کے مزاج میں جو تھا، اسے ہو کے رہنا تھا اور ہو کے رہا، مگر ہوا اس وقت جب کارکنانِ اسلام نے اپنے آپ کو مزاجِ خداوندی کے مطابق اللہ اور رسولؐ کی مرضی کے قابل ثابت کر دیا۔ تحریک کے مقاصد یعنی اللہ اور رسولؐ کے مشن کو پوری دنیا تک پہنچانے کے اہل ثابت کر دیا۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

ہجرت کرنے والی پہلی اسلامی جماعت (ہجرت حبشہ)

مخالفین اسلام مسلمانوں پر ہر قسم کے وار کر رہے تھے۔ ہر قسم کا تشدد، دھونس اور دھاندلی آزما رہے تھے۔ اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور حضرت حمزہؓ کے قبول اسلام کے بعد مسلمان اپنے آپ کو قدرے محفوظ اور مضبوط محسوس کرنے لگے، مگر مشرکین کی سازشوں میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ آ سکی۔ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کے بعد ان کا قبیلہ بنی عدی اسلام لے آیا تھا۔ یہ قبیلہ نواحِ مکہ کے مضبوط ترین قبائل میں شامل تھا۔ اس کی طاقت اور حیثیت کو چیلنج کرنا کافی مشکل تھا۔

اس کے باوجود مسلمانوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد مشرکین کو ہلکان کئے ہوئے تھی۔ اب انھوں نے ایک اور زاویے سے مسلمانوں کو تنگ کرنے کا سوچا۔ ایک نئے انداز سے مسلمانوں کو زچ کرنے کی۔ تدبیر اختیار کی وہ تدبیر مسلمانوں کا معاشرتی اور معاشی بائیکاٹ تھی۔ پنجابی زبان میں اسے حقہ پانی بند کر دینا کہتے ہیں۔ مشرکین نے مسلمانوں کے ساتھ لین دین اور خرید و فروخت پر پابندی لگا دی۔ لوگوں کو مسلمانوں سے رشتہ دینے اور لینے سے منع کر دیا گیا۔

عرب کی سرزمین جہاں ذریعہ معاش صرف تجارت ہو اور سماجی حیثیت کا تعین صرف قبیلہ ہی کرتا ہو، وہاں پر معاشی اور سماجی بائیکاٹ کا تصور ہی انسانی خیالات کو بے ترتیب کر دیتا ہے۔ اوپر سے اسلام اپنے ابتدائی سالوں میں تھا۔ لوگ اسلام میں نئے نئے داخل ہو رہے تھے۔ ان کے عقائد بھی اتنے راسخ نہ تھے۔ کاروبار اور سماج سے کٹ کر زندگی گزارنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی تھا۔ یہ نفسیاتی لحاظ سے مفلوج کر دینے والی کارروائی تھی۔ نوخیز مسلمانوں کا اس حالت میں قائم رہنا ایک معجزہ ہی تو تھا، ورنہ ایسی حالت میں بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ خاندانی سہارے کے بغیر بڑی بڑی مضبوط دیواریں گر کر ہیبت ناک منظر پیش کرنے لگتی ہیں۔ روزگار چھن جانے کے خوف سے بڑے بڑے خوددار اور انا پرست اپنے انتہائی مخالفین کے تلوے چاٹنے لگتے ہیں۔

Marfat.com

ایسی حالت میں قوموں، تنظیموں اور تحریکوں کا سہارا صرف ان کے راہنما ہی ہوتے ہیں۔ اچھے راہنما ایسی حالت میں بہترین اور انتہائی نظریاتی فیصلوں کے ذریعے قوموں، تحریکوں یا تنظیموں کو آسان راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔

اسلام کی تحریک اللہ کی اپنی تحریک تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس تحریک کو قیامت تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنی کائنات میں سے افضل ترین ہستی حضور ﷺ کو دی تھی۔ وہ ذات پاک ﷺ اللہ کی زمین پر اللہ کی تحریک کے لیے، اللہ کی مرضی کے عین مطابق فیصلے صادر فرما رہی تھی۔

اسلام اپنے ابتدائی ایام سے ہی شدید مخالفت کے گھیراؤ میں تھا، مگر لاکھوں کروڑوں درودو سلام محمد ﷺ پر جنھوں نے ہمیشہ اپنی ذات سے بالاتر ہو کر اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر ہمیشہ وہ افکار پیش کیے، وہ تدابیر اختیار کیں، جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔

اس بار بھی آپ ؐ نے وہ فیصلہ کیا جو آپ ؐ سے پہلے کسی نبی رسول یا دنیا کے کسی لیڈر سے نہ ہو پایا یعنی اپنے آپ کو دشمنوں کے گھیرے میں رکھ کر مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔

یاد رہے حبشہ مملکت روم کی اختیاری ریاست تھی جس کا مذہب عیسائیت تھا اور اس کا والی ان دنوں نجاشی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

آپ ؐ نے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو مکہ سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں نکالا تا کہ مخالفین کو پتا نہ چل سکے کہ مسلمان کس طرف جا رہے ہیں۔ مکہ میں سب سے پہلے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کی اہلیہ اسماؓ روانہ ہوئے۔ ان کے بعد حضرت عثمانؓ بن عفان، جو آپ ﷺ کے داماد یعنی حضرت رقیہؓ کے شوہر تھے۔ حضرت رقیہؓ ابولہب کے بیٹے سے طلاق کے بعد حضرت عثمانؓ کے نکاح میں آئیں۔

ان کے بعد حضرت زبیرؓ بن عوام، عبداللہ بن مسعودؓ، ابو حذیفہؓ۔ سہلہ دخترؓ سہیل بن عمر، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، عامرؓ بن ربیعہ اور ان کی زوجہ لیلیٰ بنتؓ ابوخیثمہ۔ سہیلؓ بن بیضا، حاطبؓ بن عمر مصعبؓ بن عمیر، ام سلمہؓ بنت امیہ، ابوسلمہؓ اور ان کی اہلیہ، اور عثمانؓ بن مظعون۔

پہلی ہجرت حبشہ کرنے والوں کی تعداد باختلاف روایات تقریباً ایک سو نو (109) ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت جعفرؓ اور ان کی اہلیہ اسماؓ دونوں کشتی کے ذریعے بحرِ قلزم کے راستے حبشہ پہنچے۔ اسی وجہ سے حضرت اسماؓ کو "بحریہ" یعنی "بحر پیا" کا لقب ملا۔ بعض روایات

Marfat.com

کہتی ہیں کہ حضرت جعفر اور ان کی اہلیہ دوسری جماعت کے ساتھ تھے۔ بہرحال ان تمام افراد نے تین یا چار جماعتوں کی شکل میں حبشہ کو ہجرت کی۔

حبشہ پہنچنے کے پہلے ہی روز حضرت اسماؓ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس لحاظ سے، ہجرت کرنے والوں کی کل تعداد (110) ایک سو دس بنتی ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ اسی دن شاہِ حبشہ کی بیوی نے بھی ایک بیٹے کو جنم دیا حضرت اسماؓ نے رضا کارانہ شاہِ حبشہ کے نومولود کو دودھ پلانے کی پیش کش کی جو قبول کرلی گئی۔ یوں حبشہ کے بادشاہ کا بیٹا اور حضرت جعفرؓ کا بیٹا رضاعی بھائی بن گئے۔

(((الحمد للہ)))

Marfat.com

مسلمان دربارِ نجاشی میں

نبی اکرم ﷺ نے جس خدشے کے پیش نظر مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم کر کے مکہ سے نکالا تھا، وہ خدشہ سچ ثابت ہوگیا۔ یہ نبی کی فراست کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس وقت مشرکین باخبر ہوئے، اس وقت تک مسلمان ان کی پہنچ سے باہر تھے۔ بالآخر انھوں نے عمرو بن العاص اور عمارۃ بن ولید کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ حبشہ جا کر نجاشی سے کہیں کہ وہ ان کے مفرور ان کے حوالے کر دے۔ اگر وہ مان لے تو تمام لوگوں کو واپس لے آئے عمرو بن العاص اپنے ساتھی عمارۃ بن ولید کے ہمراہ شاہِ حبشہ کے دربار میں حاضر ہو کر یوں مخاطب ہوا۔

''آداب سلام بادشاہ سلامت۔ آپ نے ہمارے جن افراد کو اپنی پناہ میں لے رکھا ہے، وہ ہمارے مفسدین ہیں۔ ہمارے باپ دادا کے دین سے پھرے ہوئے لوگ ہیں۔ وہ ہمارے آباؤ اجداد کو برا بھلا کہتے ہیں اور ہمارے عقائد کو جھوٹا اور باطل قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ آج اپنے آباؤ اجداد کو برا بھلا کہتے اور ان کے نظریات کو جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ ہمیں خدشہ ہے کہ تیری پناہ میں رہ کر وہ تیری عوام کے عقائد کو بھی تبدیل کر دیں گے۔ بادشاہ سلامت بہتری اسی میں ہے کہ آپ ان کو ہمارے حوالے کر دیں تا کہ ہم مکہ لے جا کر انھیں ان کے قبائل کے حوالے کر دیں۔ ان کے قبائل نے ہمیں آپ کے پاس اسی لیے بھیجا ہے۔''

مخالفینِ اسلام کی یہ بہت بڑی کارروائی تھی۔ اگر نجاشی کانوں کا کچا ہوتا تو اپنا کان دیکھنے کی بجائے کتے کے پیچھے دوڑ پڑتا۔ وہیں سے حکم دیتا کہ مسلمانوں کو ان کے حوالے کر دو، مگر وہ دانا، عقل مند اور انصاف پسند تھا۔ اس نے انصاف کا راستہ اختیار کرتے ہوئے مسلمانوں کو بھی سننے کا فیصلہ کیا۔ اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ ''پناہ گزین'' مسلمانوں کو پیش کیا جائے۔ حکم سنتے ہی پیادے دوڑ پڑے۔ اسی وقت مسلمانوں کو لا پیش کیا۔

جب مسلمان حاضر ہو گئے تو بادشاہ نے کہا ''یہ لوگ آپ کو خطا کار بتا رہے ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ آپ لوگوں کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ بقول ان کے تمھارے خاندان تمھاری

Marfat.com

واپسی چاہتے ہیں تمھارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ ہے"۔

بادشاہ کی یہ وضاحت سن کر حضرت جعفرؓ بن ابی طالب[1] آگے بڑھے اور یوں گویا ہوئے۔"اے والی حبشہ ان دونوں سے پوچھا جائے آیا ہم نے سرزمین مکہ میں کسی کو قتل کیا یا ڈاکا ڈالا۔ زنا کیا یا کسی کے گھر چوری کی یا کوئی اور قانونی یا اخلاقی جرم کیا۔"

شاہ حبشہ نے یہ سوال قریش کے ایلچیوں کے سامنے دہرایا تو انھوں نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں۔

حضرت جعفرؓ بن ابی طالب دوبارہ محوِ سخن ہوئے"اے شاہ حبشہ ہم لوگ مٹی پتھر اور لکڑی سے بنی مورتیاں اور بت پوجتے تھے۔" پرتعیش زندگی ہمارا نصب العین تھا۔ کمزوروں پر ظلم وستم ہماری عادت تھی۔ ہر برائی ہمارے نزدیک باعث فخر تھی۔ یوں ہم زندگی کے تاریک ترین اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان محمد ﷺ بن عبداللہ کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ انھوں نے ہمیں سیدھی راہ دکھلائی۔ توحید پرستی کی طرف بلایا بتوں کی پوجا ترک کرنے کا درس دیا۔ برے کاموں سے توبہ کرنے اور نیک کام سرانجام دینے کی تلقین کی۔ یتیموں مسکینوں پر ظلم وستم کی بجائے صلہ رحمی کرنے کا حکم دیا۔"

ہمارا گناہ صرف یہ ہے کہ ہم ان پر ایمان لے آئے۔ یہ لوگ بت پرستی پر ڈٹے رہے۔ اللہ کے نبی کی تعلیمات کو ٹھکرا دیا۔ نہ صرف ان کی تعلیمات کو ٹھکرایا، بلکہ اہل ایمان پر ظلم وستم کرنے لگے۔ اللہ کے نبیؐ کو گالی گلوچ دینے لگے۔ ہمارے نبیؐ پر سنگ باری کرتے اور دیگر اذیتیں پہنچاتے۔ الغرض ان لوگوں نے اہلِ ایمان کو ایذا رسانی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔"

شاہ حبشہ نے فریقین کو سننے کے بعد عمرو بن العاص اور عمارۃ بن ولید کے تحائف واپس دینے کا حکم دیا اور قریش کے سفیروں سے کہا کہ"جو لوگ میری پناہ میں ہیں، وہ میرے بہت زیادہ قریب ہیں، میرا ان کا خدا ایک ہے۔ میں کسی کو یہ اجازت نہیں دوں گا کہ کوئی میری پناہ میں آنے والوں کو اپنے ساتھ لے جا کر اذیت اور ایذا رسانی کا نشانہ بنائے۔"

یہ حکم سن کر قریش کے سفیر اپنا سا منہ لے کر کھسک گئے۔ بعدازاں شاہ حبشہ نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب سے استفسار کیا کہ وہ اسے محمد ﷺ کے متعلق مزید کچھ بتائیں۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ ان آیات میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کا ذکر تھا۔ نجاشی چونکہ خود مسیحی تھا، یہ آیات سن کر رو دیا۔ دربار میں موجود باقی افراد بھی رو دیے۔ بالآخر نجاشی نے ان الفاظ کے ساتھ دربار برخاست کیا کہ"تمھارا نبی سچا اور عظمت والا ہے۔ تم لوگ

جب تک چاہو، اس ملک میں قیام کرو تم سے کوئی تعرض نہیں کرے گا۔"

حبشہ میں مقیم مسلمان خوش وخرم رہنے لگے۔ انھیں مکہ کی طرح یہاں تکلیف پہنچانے والا کوئی نہ تھا۔ انھیں کسی سے کوئی خطرہ نہ تھا، لیکن یہاں انھیں اور طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ مکہ کی نسبت ملک حبشہ زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ یہاں کا طرز بود وباش اپنے وقت کی ترقی کی پوری آب وتاب اور رعنائیوں سے بھرپور تھا۔ مہاجرین میں سے دو افراد حبشہ کے کلیساؤں کی شان و شوکت سے مرعوب ہو کر اسلام سے پھسل گئے یعنی مسیحیت میں داخل ہو گئے۔ وہ دو اشخاص[3] عبیداللہ بن جحش اور سکران بن عمر تھے۔ عبیداللہ بن جحش قبول اسلام سے پہلے "حنیف" لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ حنیف ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو اسلام سے پہلے حقیقت کی تلاش میں تھے۔ اس نے بھی اپنی پہلی زندگی حقیقت کی جستجو میں صرف کی۔ اعلانِ نبوت کے بعد اسلام میں آ گیا۔ اپنی زوجہ امِ حبیبہ کے ساتھ ہجرت حبشہ کرنے والی جماعت میں شامل ہوا، لیکن حبشہ پہنچ کر اسلام سے دستبردار ہو گیا۔

دوسرا شخص سکران بن عمر اپنی بیوی حضرت سودہؓ کے ساتھ ہجرتِ حبشہ کرنے والی جماعت میں شامل ہوا اور کچھ عرصہ بعد مرتد ہو گیا۔ اس کی بیوی حضرت سودہ حبشہ سے مکہ چلی آئیں۔

(((اللہ اکبر)))

مشرکین مکہ کے لیے پہلی بری خبر "مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کا حبشہ کی طرف نکل جانا تھا، دوسری اس سے بھی بری خبر "ان کی سفارت کا نجاشی کے دربار سے ناکام لوٹنا تھا۔"

ظاہر ہے ان خبروں نے ان کے دماغ ابال کر رکھ دیے ہوں گے۔ ان کے سینے شق کر دیے ہوں گے۔ یہ خبریں سن کر ان کے دیدے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ان کے لیے تو یہ ان ہونی تھی جو ہو گئی۔ اس ان ہونی کو دیکھ کر وہ نہ تو تائب ہوئے اور نہ ہی اللہ کے حضور گڑگڑا کر اپنے پچھلے کیے پر پچھتائے، بلکہ ایک نئے ہَرُوش کے ساتھ ظلم وستم پر اتر آئے۔ مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا۔

ابوجہل کو تو ان خبروں نے باؤلا کر دیا۔ وہ ہلکا ہو گیا ہلکا وہ پاگلوں کی طرح ایک ایک مسلمان سے مل کر انھیں لتاڑنے لگا۔ ایک ایک کے گھر جا کر کہتا تجھے شرم نہیں آتی، اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑتے ہوئے۔ اے فلاں تو اپنے اجداد کے عقیدے کو باطل قرار دیتا ہے تو تجھے کیا حق ہے اس سرزمین پر رہنے کا۔ بول بولتا کیوں نہیں، ہیں میں کیا کہتا ہوں۔ بول بولتا کیوں نہیں کیا تیرے باپ دادا "لات" "منات" "عزیٰ" کی پیروی کرتے ہوئے نہیں مرے۔ بول بولتا

Marfat.com

کیوں نہیں۔اس کو تو جیسے کسی پاگل کتے نے کاٹ لیا تھا اور وہ باؤلا ہو گیا تھا باؤلا۔

ان لوگوں نے مسلمانوں سے لین دین یکسر بند کر دیا۔مسلمانوں کا قرض واپس کرنے سے انکار کر دیا۔اگر ملنے والا مسلمان عوام الناس میں سے ہوتا تو ابوجہل تب تک اس پر کوڑے برساتا رہتا جب تک وہ تھک نہ جاتا یا بیچارے مسلمان بیہوش نہ ہو جاتے۔

قارئین! مخالفین اسلام نے مسلمانوں کے سارے کھاتے (Credits) بند کر دے اور ان کی ''ہنڈی'' (Bill of Exchange) روک لی،لیکن آفرین ہے ان جانثاروں نے کسی نقصان کی پروا نہ کی۔کسی رعب اور سختی کو خیال میں نہ لائے۔کوئی سزا انھیں اسلام سے غفلت پر آمادہ نہ کر سکی۔مسلمانوں کو جتنا دبانے کی کوششیں کی گئیں،اسلام اتنی تیزی سے پھیلتا گیا۔حبشہ تک اسلام کی آواز انتہائی مخالفت کی وجہ سے ہی پہنچی تھی۔مسلمانوں کو مجبوراً ہجرت کرنا پڑی۔مخالفین وہاں بھی انھیں شاہ حبشہ کے دربار تک لے گئے اور یوں شاہِ حبشہ کے کانوں تک قرآن کی تلاوت پہنچی تو اسے کہنا پڑا کہ تمھارا نبی سچا اور عظمتوں والا ہے۔

مخالفین عقل مند ہوتے تو اب ہی سچائی کو بھانپ لیتے لیکن فراست ان کے قریب سے بھی نہ گزری تھی۔ان کے دماغوں کو ادراک و شعور کی ہوا تک نہ لگی تھی۔اندھی مخالفت برائے مخالفت ان کے ذہنوں سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر چکی تھی ان کی سویاں بس اسلام کو ختم کر دینے پر اَڑی ہوئیں تھیں اسلام اللہ کا دین ہے اُسے ختم کر دینا ان کے بس سے باہر تھا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ناممکن تھا یہ بات ان کی سمجھ سے بالا تھی سو وہ اپنی سی کرتے رہے اور سمجھنے والے راہ ہدایت پاتے رہے۔

حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار تک مسلمانوں کا پیچھا کیا گیا وہاں بھی ناکامی نے ان کا منہ چڑایا تو یہ غلط خبر (Disinformation) پھیلا دی گئی کہ تمام اہلِ مکہ مسلمان ہو گئے یہ افواہ مکہ میں نہیں حبشہ میں مشتہر کی گئی تاکہ ہجرتِ حبشہ کرنے والے خود بخود واپس آ جائیں۔

سرد جنگ کے حوالے سے یہ جھوٹی خبر سیاہ پروپیگنڈہ (Black Propaganda) کے زمرے میں آتی ہے اس میں سچائی ذرہ برابر شامل نہیں ہوتی کورا جھوٹ ہوتا ہے مگر یہ جھوٹ بنانے والے خوب سوچ سمجھ کر بناتے ہیں تاکہ سننے والا سنتے ہی سر دھننے لگے کہ واہ کیا خوب سچ ہے۔ موجودہ دور میں ''سی آئی اے'' ''موساد'' اور ''را'' سی این این اور بی بی سی کے ذریعہ ایسی جھوٹی خبریں خوب سچائی کے لبادے میں لپیٹ کر مشتہر کی جاتی ہیں۔

Marfat.com

بہرحال!! جب حبشہ جانے والے مسلمانوں نے یہ جھوٹی خبر سنی تو ان میں سے بیشتر سچ سمجھ کر واپس مکہ آ گئے۔ اس جھوٹی خبر پھیلانے کا مقصد حبشہ میں اسلام کے پھیلاؤ کو روکنا تھا۔ ظاہر ہے مسلمانوں کا وہاں مستقل قیام دوسرے ملک میں اسلامی نظریات منتقل کر سکتا تھا جس سے تحریکِ اسلامی تقویت حاصل کر سکتی تھی۔ مشرکین نے سفارت کے ذریعے کھویا ہوا مشن افواہ (Disinformation) کے ذریعہ حاصل کر لیا۔

گو اس میں تحریکِ اسلامی کو کچھ نقصان ضرور ہوا لیکن بانیٔ تحریک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشکل کو بھی بحسن وخوبی سنبھال لیا۔ یہاں بھی اللہ کی مدد مسلمانوں کے شامل حال رہی واپس آنے والے لوگ جانی نقصان سے محفوظ رہے۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

سخت معاشی و معاشرتی ناکہ بندی
(شعب ابی طالب میں محصوری)

ایوان دارالندوہ[4] نے ایک بل پاس کیا۔ اس کے تحت مسلمانوں کا معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کر دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں معاشی و معاشرتی قتل عام شروع کر دیا گیا۔

حضرت خالدؓ بن سعید اس دور کے اسلحہ سازی کے بہترین انجینئر تھے۔ ان کا بنایا ہوا سامانِ حرب و ضرب ایران و روم کی منڈیوں میں بھی مانگا جاتا تھا۔ مکہ کے سوداگر اُدھار تلواریں نیزے اور دوسرا سامان جنگ بنوا کر دنیا کی منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔ سامان کی قیمت مہینوں نہیں سالوں بعد ادا کی جاتی۔ اسی طرح ایک اور کاریگر حضرت خبابؓ بن الارت تھے۔ ان سے بھی سامانِ حرب و ضرب بنوایا جاتا۔ قیمت سالوں بعد ادا کی جاتی۔ نئی قانون سازی کے بعد ان کا قرض ادا کرنے سے صاف انکار کر دیا گیا۔

عاص بن وائل کے ذمہ حضرت خبابؓ[5] کا بہت زیادہ قرضہ واجب الادا تھا۔ حضرت خبابؓ تقاضا کرتے تو عاص بن وائل کہتا: ''تیرا صاحب یہ جو کہتا ہے کہ جنت میں سونا چاندی، کپڑے اور خدمت گار ہیں۔ وہاں جا کر مجھ سے لے لینا کیونکہ وہاں تیری پوزیشن مجھ سے زیادہ مضبوط ہوگی۔'' صرف اس جواب پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ انھیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جاتا یہاں تک کہ جسم کی چربی پگھل کر ان کوئلوں کو بجھا دیتی۔

حضرت خالدؓ بن سعید کے والد نے انھیں گھر سے نکال دیا۔ آپؓ نے والد سے دوٹوک کہہ دیا: ''جا تو میرا رزق بند کر لے۔ میرا خدا مجھے رزق دینے والا ہے اور وہ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر رہنے لگے۔

اقتصادی ناکہ بندی کی یہ ابتدائی مشقیں تھیں جو تمام مسلمانوں پر نافذ تھیں۔ اسی وجہ سے نبوت کے پانچویں سال 83 مردوں اور 20 عورتوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔

———(((اللہ اکبر)))———

Marfat.com

اب دارالندوہ نے پہلے سے پاس شدہ بل غور وفکر اور ترمیم واضافہ کے لیے دوبارہ ایوان میں پیش کیا۔ غور وفکر کے بعد اسے تحریری شکل دی گئی۔ اس تحریری بل کو قانونی ضابطے کی طرح مسلمانوں کے مقاطعے کے لیے نافذ کر دیا گیا۔ اسے ایک ''صحیفہ'' کی طرح لکھ کر حرم شریف کی دیوار پر لٹکا دیا گیا۔

یاد رہے ''صحیفہ'' عربی میں اس تحریری عبارت کو کہتے ہیں جو کسی حکم، فرمان یا قانونی ومذہبی اعلان کو مشتہر کرتی ہو۔ مذکورہ بالا اشتہار پر جو فرمان لکھا گیا، اس کی جزئیات کچھ یوں تھیں:

1. ''محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ[6] میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔''
2. مکہ کے کسی شہری کو مسلمانوں سے گفتگو کرنے کی اجازت نہیں۔
3. مکہ کا کوئی شہری کسی مسلمان سے مصافحہ نہیں کرے گا۔
4. مکہ کا کوئی شہری مسلمانوں سے کسی قسم کی خرید وفروخت یا لین دین مت کرے۔
5. تمام اہل مکہ کو مسلمانوں سے رشتہ لینے اور دینے کی سخت ممانعت ہے۔
6. اگر کوئی شخص کسی مسلمان کا مقروض ہے تو صاف انکار کر دے۔
7. بالا احکامات اس وقت تک نافذ العمل ہیں جب تک محمد ﷺ اپنے دین سے تائب نہیں ہو جاتے یا بنو ہاشم ان کی حمایت سے دستبردار نہیں ہو جاتے یعنی (نعوذ باللہ) انھیں قتل کے لیے ہمارے حوالے نہیں کر دیتے۔''

یہ فرمان حرم شریف کی دیواروں پر لکھ دیا گیا یا لکھ کر لٹکا دیا گیا۔ دارالندوہ کی طاقت اور اس کے فرامین کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ 616 سن عیسوی میں یعنی نبوت کے ساتویں سال حضور ﷺ تمام بنی ہاشم اور تمام اہل ایمان کا مقاطعہ کر دیا گیا۔ اس حکم کے سامنے تمام بنی ہاشم کی ایک نہ چلی۔ نہ صرف سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم، بلکہ ان کی سرپرستی کرنے والے غیر مسلم بنی ہاشم کا بھی ہر طرح سے بائیکاٹ کر دیا گیا۔ بنو ہاشم کی خاندانی غیرت نے بھی یہ گوارا نہ کیا کہ اس مشکل گھڑی میں محمد ﷺ کو تنہا چھوڑ دیا جائے۔ پیر سالہ سردار قبیلہ ابو طالب بھی موجود تھے۔ اگر وہ چاہتے تو مذکورہ فرمان کی حمایت کر کے حضور ﷺ کے سوا باقی بنو ہاشم کو اس مشکل سے نکال سکتے تھے۔ بنی ہاشم میں صرف ابولہب ایسا تھا جس نے قبیلے کا ساتھ نہیں دیا۔ باقی سارا خاندان ہاشمی حضور ﷺ کے ساتھ مکہ سے باہر ایک گھاٹی شعب ابی طالب میں چلا گیا۔

شعب عربی میں اس شگاف کو کہتے ہیں جو پہاڑوں میں قدرتی طور پر بنا ہو، مگر غار یا درّے سے بڑا ہو۔ اصطلاحاً شعب اس گھاٹی کو کہا جاتا ہے جو وادی کی طرح پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا

ہو مگر طول و عرض یا جسامت میں وادی سے چھوٹا ہو۔

مکہ میں موجود دس قبائل کے ناموں سے منسوب ایسی دس گھاٹیاں تھیں جو ان کی ملکیت تھیں۔ اگر کوئی درماندہ شخص کسی قبیلہ سے سیاسی و اخلاقی پناہ مانگتا تو اہلِ مکہ نہ صرف پناہ دیتے، بلکہ اس کی ہر طرح مدد و اعانت بھی کرتے، لیکن اس پناہ گزین کو اہلِ خانہ کے ساتھ رکھنے کی بجائے اپنی مخصوص خاندانی گھاٹی میں بھیج دیا جاتا۔

شعبِ ابی طالب ذاتی طور پر ابو طالب کی ملکیت اور اجتماعی طور پر پورے بنو ہاشم کے مصرف میں تھی۔ یہ گھاٹی تو صرف درماندہ، مفلوک الحال اور بے وطن لوگوں کے لیے مختص تھی۔ انھیں کیا معلوم کہ تقدیر انھیں بھی کسی دن بے خانماں کر کے اس میں چھپنے پر مجبور کر دے گی۔ یہ تو اتنی بڑی نہ تھی کہ اتنے بڑے قبیلے کو سما سکے۔ یہ تو صرف چند مجبور و مقہور نفوس کے لیے مخصوص کی گئی تھی، مگر تقدیر کے انداز بہت نرالے ہیں۔

آج بھی اگر سعودی عرب میں جائیں تو مکہ شہر سے باہر نکل کر پتا چلتا ہے کہ سنگلاخ اور بے آب و گیاہ چٹائیں کتنی دریدہ دلیری سے زندگی کا منہ چڑا رہی ہیں۔ یہ تو آج کا حال ہے جبکہ دولت کی کثرت کے بل حکومت نے پانی کی بڑی بڑی پائپ لائنوں سے انگارہ نما وادیوں کو خوش نما بنا دیا ہے۔ آج سے چودہ صدیاں قبل اس موسمی شدت میں زندگی کا مقابلہ کرنا کتنا کٹھن ہوگا۔

———(((اللہ اکبر)))———

اس اقتصادی اور معاشرتی بائیکاٹ کے بعد مسلمان صرف دو صورتوں میں یہاں قیام کر سکتے تھے۔ پہلی صورت یہ تھی کہ وہ اپنے مذہب سے پھر جاتے۔ یہ ناممکن تھا۔ یہ تو تحریکی تنظیمی اور معاشرتی لحاظ سے اپنے (Blank Warront) پھانسی کے حکم نامے پر دستخط کرنے کے مترادف تھا۔ دنیا کا کوئی بھی انقلابی کارکن اپنی موت تو قبول کر سکتا ہے، لیکن اس طرح کی تدبیر (Option) اختیار نہیں کر سکتا۔

دوسری صورت جنگ کی تھی۔ جنگ کی صورت میں اکیلے بنی ہاشم کو مکہ کے نو قبائل سے مقابلہ کرنا پڑتا۔ اسلامی تحریک ابھی اپنے پرائمری دورانیئے میں تھی۔ ابھی تو شاید تحریک کا پورا منشور یا اساسی ضابطہ بھی نامکمل تھا۔ تنظیم کی جنگی پیمانے پر معمولی تربیت بھی نہ ہونے پائی تھی۔ مکہ کے باقی نو قبائل کے مقابل مادی اور افرادی وسائل بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ دوسرا آپشن بھی خودکشی کے مترادف تھا اور پھر حضور ﷺ جیسے راہنما سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ آپ کوئی ایسا فیصلہ جو تنظیم کو ختم کر دینے کے مترادف ہو، صادر فرمائیں گے۔ چونکہ آپ ﷺ تو پوری کی پوری

انسانیت کے ہادی تھے ہیں اور رہیں گے، نہ صرف انسان، بلکہ تمام کی تمام مخلوقات، نہ صرف اس کائنات ارضی، بلکہ اس دنیا کے بعد کی راہنمائی بھی آپؐ ہی کو کرنا تھی۔ آپؐ کے فیصلوں کے اثرات بھی آپؐ کی قائدانہ عظمتوں کی طرح عظیم وسلیم رس تھے۔ اس لیے یہاں بھی آپؐ نے وہ فیصلہ کیا جو اثر آفرین اور تنظیم کی تحریکی تربیت و اصلاح کے لیے بہترین تھا۔ آپؐ نے پہلے دو آپشن کی بجائے تیسرا انتہائی آپشن لیا یعنی ''شعبِ ابی طالب میں محصوری۔''

مسلمان آناً فاناً حضور ﷺ کے ساتھ مکہ سے نکل پڑے۔ انھوں نے مکہ سے خروج انتہائی تیزی سے کیا۔ اس لیے وہ سامان خوردونوش کی مناسب مقدار اپنے ساتھ نہ لے جاسکے۔ اگر وہ غلہ وغیرہ کی مناسب مقدار لے بھی جاتے تو زیادہ سے زیادہ کتنی دیر چلتا۔ ہفتہ دو ہفتے یا مہینہ دو مہینے، مگر یہ محصوری تو تقریباً 616 سن عیسوی سے 619 سن عیسوی تک محیط تھی یعنی نبوت کے پانچویں سال کے اوائل سے نبوت کے آٹھویں سال کی ابتداء تک تین سال تک جاری رہی۔ مسلسل تین سال تو انتہائی بڑا ذخیرہ بھی وفا نہ کرتا۔

قریش نے مسلمانوں کے ساتھ خرید وفروخت کرنے کی سخت نگرانی کی۔ محل وقوع کے لحاظ سے شعبِ ابی طالب ایسی جگہ واقع تھی جہاں مکہ کی طرف آنے جانے والے قافلوں کی گرد بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اگر کوئی قافلہ زیادہ منافع کی غرض سے اِدھر رخ کرنے کی کوشش کرتا تو اسے سختی سے روک لیا جاتا۔

یہ انتہائی درد وکرب ناک وقت تھا جو فدایانِ رسول اللہ ﷺ نے شعب ابی طالب میں گزارا۔ یہ صرف ان حضراتِ صحابہؓ ہی کا حوصلہ تھا جو اس حالت میں بھی زندگی کے اعلیٰ وارفع مقاصد کی پاسبانی پر ڈٹے رہے۔ اگر حریص واقتدار پرست جھوٹی پھوں پھاں رکھنے والے یا مداح وستائش کے پروردہ ہوتے تو کبھی کے تائب ہوکر پرسکون زندگی کا رخ اختیار کر لیتے۔ حالات کے ساتھ مصالحت کر کے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے، مگر ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا عشق سرائیت کر چکا تھا۔ وہ جان چکے تھے کہ یہی راستہ نجات کا راستہ ہے۔ یہی کام اس دنیا کا اعلیٰ وارفع کام ہے۔ زندگی کی یہ مشکلات بہت عارضی ہیں۔ ان مشکلات کا معاوضہ اس ساری دنیا سے عظیم ہے۔ ہمارا عقیدہ اور یقین ایسا ہے اگر ہم اس پر مستحکم رہے تو موت بھی ہمیں فنا نہ کر پائے گی۔ اگر ہم اس راستے میں فنا ہو جائیں تو یہ ہماری عظمت اور بقا پر منتج ہوگی۔

عرب کی تاریخ میں ماہِ حرام کے چار مہینوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان مہینوں میں کشت وخون، جنگ وجدل اور جھگڑے فساد کو حرام سمجھا جاتا رہا ہے۔ محصوری کے زمانہ میں مسلمان اس

Marfat.com

رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر آ کر سامانِ خورد و نوش خرید کر لے جاتے۔ چونکہ ان کے پاس وسائل بہت کم تھے۔ تاجر اور کاروباری حضرات بھی تو قید میں پڑے تھے۔ ان کے کاروبار ختم ہو چکے تھے اس لیے سوکھا چمڑا اور کھالیں بھی خرید کر لے جاتے تھے۔ جنھیں پورا سال اُبال اُبال کر کھایا جاتا۔

ایوان ندوہ کے کسی بھی نمائندہ کو خاص طور پر ابو جہل یا ابولہب وغیرہ کو پتا چل جاتا تو وہ موقع پر پہنچ کر مال کی بولی اتنی دے دیتے کہ مسلمان اس قیمت پر خریداری کرنے سے عاجز آ جاتے۔ ابولہب مکہ آنے والے ہر تاجر سے کہتا، وہ مسلمانوں سے اپنے مال کی اتنی قیمت مانگے کہ کوئی مسلمان خرید نہ سکے۔ اگر کسی کا مال ضائع ہو گیا تو میں[7] اس کی قیمت ادا کر دوں گا۔ یوں اکثر اوقات قیمت پہنچ سے باہر ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو خالی ہاتھ واپس جانا پڑتا۔

اس کسمپرسی کے عالم میں جب بچوں کے پاس خالی ہاتھ لوٹتے تو دل میں تنگی محسوس کرتے۔ اپنے اہل خانہ سے کہتے کہ ہانڈیاں پانی سے بھر کر چولہے پر چڑھا دیں۔ یوں پانی سے بھری ہانڈی چولہے پر اُبلتی تو بچے سمجھتے کہ کھانا پک رہا ہے، مگر ہنڈیا میں کھانا تھا اور نہ پکا، لیکن وہ معصوم پکنے کی امید پر انتظار کرتے کرتے سو جاتے۔

غربت ہم لوگوں میں سے اکثر نے سنی اور دیکھی ہوگی، مگر اس قسم کی غربت کا تصور بھی محال ہے کہ بچے والدین کے ہوتے ہوئے ان کی آنکھوں کے سامنے کھانا پکنے کے انتظار میں سو جائیں۔ آفرین ہے ان ماؤں پر جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی خاطر اپنی ممتا کو بھی جلتی چتا پر چڑھا دیا۔ صد آفرین ان باپوں پر جنھوں نے دین اور ایمان کی خاطر ایسی لازوال تاریخ رقم کی جس کی مثال رہتی دنیا تک پیش کرنا ناممکن ہے۔ اللہ ان اصحابِ رسول ؐ پر اربوں کھربوں رحمتیں نازل فرمائے۔

انسانی تاریخ کے کسی موڑ پر کسی قوم کے خلاف ایسی معاشی و معاشرتی ناکہ بندی نظر نہیں آتی اور نہ ہی تاریخ میں کسی قوم تنظیم یا تحریک کے کارکنوں میں ایسا عزم و حوصلہ ملتا ہے۔ پرسکون اور عیش و عشرت سے بھرپور زندگی کو لات مار کر بھوک اور افلاس کو قبول کرنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔ بے یقین اور مصلحت کوش تو چند گھنٹے ایسی تحریک کے ساتھ نباہ نہیں کر پاتے۔ کتنے آہنی عزم پوش تھے یہ حضراتِ صحابہؓ جو مکہ کی سرد جنگ کے اس گھمسانی رن میں بھی مشکلاتِ زیست اور کرب ناک مصائب کا یوں مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں جیسے قسمت کو چیخ چیخ کر کہہ رہے ہوں: اپنی تمام خوف ناک حالتوں کے ذریعے ہماری برداشت، صبر، عزم، حوصلے اور ایمان کو آزما لے۔ کر لے وہ سب کچھ جو تیرے پاس ہے۔ ہمارے ہم وطنوں کا جبر کیا چیز ہے۔ پوری کی پوری کائنات مل کر بھی

ہمارے ایمان کو ذرہ برابر جنبش نہیں دے سکتی۔

ایسے ناقابل تسخیر انقلابیوں کو تسخیر کرنے کی سوچنے والے احمقوں کی جنت میں رہ رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر فتح پانا ناممکن ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو ختم کرنے کی سوچنے والا دیوانگی کے خوابوں میں پلا بڑھا ہوتا ہے۔ یقیناً مخالفینِ اسلام بھی دیوانوں سے کم نہیں ہوتے۔ اسلام اللہ کا دین ہے۔ اس دین کو ختم کرنا اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرنے کے مترادف ہے اور اللہ سے مقابلہ دیوانے کے خواب سے کیا کم ہے؟

(((اللہ اکبر)))

انھیں دنوں کی بات ہے، حضرت خدیجہؓ[8] کے بھتیجے حکیم بن حزامؓ اپنی پھوپھی جان کے لیے کچھ سامانِ خورد و نوش لے کر شعبِ ابی طالب کی طرف چلے۔ قریش نے علاقے کی مکمل ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ ان کی کسی گارڈ یا پٹرول کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان سے نہ صرف سامان[9] ضبط کر لیا گیا، بلکہ اتنا مارا پیٹا گیا کہ وہ تین دن تک خطرے کی حالت میں رہے۔

یہ محاصرہ سن 10 نبوی تک جاری رہا آخر ہشام، عبدالمطلب کے نواسے۔ ابو طالب کے بھانجے حضور ﷺ کے پھوپھی زاد زہیر، زمعہ بن اسود اور کئی دوسرے مصلحین نے مل کر اس بائیکاٹ کو ختم کر دیا۔ یہ حضرات ہتھیار باندھ کر محصورین کے پاس گئے اور انھیں واپس مکہ لے آئے، لیکن کچھ روایتوں کے مطابق یہ تمام اکٹھے ہو کر ایوانِ ندوہ کے سامنے پیش ہوئے اور خاندانِ بنو ہاشم کو واپس مکہ لانے کی درخواست کی، مگر مشرکین نے وہی پرانا جواب دہرایا کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین سے دستبردار ہو جائیں تو واپس آ سکتے ہیں ورنہ وہیں (نعوذ باللہ) اپنی موت کا انتظار کریں۔ ہم انھیں مکہ کی طرف دیکھنے بھی نہیں دیں گے۔ نبیٔ برحقؐ اقتدار پرست ہوتے تو مصائب سے گھبرا کر دین سے چشم پوشی کر لیتے یا کم از کم مصلحت پسندی سے کام لے کر وقتی طور پر یہ مطالبہ مان لیتے۔ عارضی یا دکھاوے کے طور پر ہی تبلیغ کا سلسلہ روک کر اپنے آپ کو اور اپنے تحریکی کارکنوں کو حالات کی کج روی سے بچانے کی تدبیر اختیار کر لیتے اور بہتر حالات میسر آنے پر دین کی نشر و اشاعت دوبارہ شروع کر دیتے۔

مگر آپ ﷺ تو قیامت تک آنے والی نسل انسانی کے قائد تھے۔ مصلحت پسندی ان کی لغت سے خارج تھی۔ انھیں اللہ کی حقانیت اور اپنی رسالت کا پورا پورا یقین تھا۔ اس قسم کی عارضی مصلحت پسندی اختیار کرنا خود آپ اپنی رسالت کی نفی کرنے کے مترادف تھا۔ سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن سات نبوی سے سن دس نبوی تک مسلسل تین سال بھوک اور مفلسی کو گلے لگانا پسند

Marfat.com

فرمایا۔ چمڑا اور کھالیں ابال ابال کر کھاتے رہے، مگر مجال ہے ذرہ برابر جھول دکھائی ہو۔"

یہ تین سال تمام بنی ہاشم کے لیے کڑی آزمائش تھے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی اس کڑی آزمائش پر بحسن وخوبی پورے اترے۔ بھوک۔ پیاس اور دوسرے آلام ومصائب نے تحریک کو اور مضبوط کر دیا۔ کارکنان کے عزم اور مضبوط کر دیے۔ جذبے اور دوبالا کر دیے۔ ان کا اپنے اوپر اعتماد ویقین اور بڑھ گیا۔ اب کم ازکم مسلمانوں کے متعلق یہ سوچا جاسکتا تھا کہ ایسے باہمت جان نثاروں کی معیت میں تحریک اسلامی ہر قسم کے تھر، جنگل، بیلے اور سمندر عبور کر سکتی ہے۔ ان کے جذبات کسی لالچ، طمع، دہشت، دباؤ، مشکل یا دھونس دھاندلی سے کم نہیں کیے جاسکتے۔

مشرکین مکہ نے یہ انتہائی کارروائی اس زُعم میں کی تھی کہ مسلمان اب کے جم نہیں سکیں گے۔ اتنے مشکل حالات کا مقابلہ کرنا انسانی بس سے باہر ہے۔ برعکس اس کے مسلمان نہ صرف عزم و حوصلے کی آہنی دیوار ثابت ہوئے، بلکہ خود انھیں اپنے عزم وہمت نے خوداعتمادی کے بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ عام حالات میں شاید وہ اپنے متعلق اس قسم کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہ اٹل حقیقت ہے کہ نفع ونقصان قادرِ مطلق کے اختیار وتصرف میں ہے۔ اس کائنات کو بنانے والا اسے چلانا بھی جانتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ کائنات کے لئے کون کون سے عوامل ضروری ہیں اور اسے قیامت کے دن تک پہنچانے کے لئے کس کس عروج وزوال کی ضرورت ہے۔ کن کن ارتقائی عوامل کے نشیب وفراز سے ہمکنار کرنا ضروری ہے۔ انسان ہمیشہ اپنی ذاتی خواہشات ومفادات کے تابع فکر وعمل کرتا ہے۔ اللہ بزرگ وبرتر اپنی مخلوقات کے لئے فیصلے صادر فرماتا ہے۔ انسان اپنی رائے میں کسی کو ختم کرنے کی تدبیر کر رہا ہوتا ہے۔ اللہ کی مرضی اس تدبیر کے شاملِ نہ ہو تو وہ اسی انسانی تدبیر کو اس کے ہدف کے لئے عزت وشرف اور عروج وترقی کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ اللہ والے ایسے مواقع پیدا ہی نہیں ہونے دیتے جس میں اللہ کی مرضی ان کے خلاف متحرک ہو یعنی اللہ کے بندے اللہ کی مخلوقات کے نقصان کا سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

شعبِ ابی طالب میں تین سالہ محصوری مسلمانوں کے لیے اعلیٰ مکتبی تربیت (Accadamic Training) کا درجہ رکھتی ہے۔ دنیا کی ہر عسکری درسگاہ (Millitary Accademy) میں تربیت کنندگان (Caddets) کو مختلف مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ تربیت کنندگان کے اجسام اور دماغ بالکل صاف (Raw) کرنے کے بعد نئی فکر وقوت کی عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سختیوں کی بھٹی میں رکھ کر بہتا ہوا لاوا بنا کر عسکری قائدانہ اصول و ضوابط کے نقش ونگار کے مطابق تعمیر نو کی جاتی ہے۔ سخت مراحل سے گزارنے کا مقصد آئندہ

Marfat.com

متوقع پیش آمدہ کٹھن مراحل کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے۔اب ہم تاریخ کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں کہ وہ محصورین آگے چل کر نہ صرف بہترین حکمران اور بہترین جرنیل بھی ثابت ہوئے۔اس لیے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ قدرتِ خداوندی اس جماعتِ صحابہؓ کو شاید اس لیے ایسی مشکلات سے گزار رہی تھی کہ وہ آئیندہ پیش آنے والی مشکلات میں ثابت قدم رہ سکیں۔زندگی کے کٹھن ترین مراحل میں بہترین فیصلے کرسکیں۔

گو سرد جنگ کا یہ مرحلہ مسلمانوں کے لیے انتہائی اعصاب شکن اور تباہ کن تھا،مگر مسلمان اس سے کامران لوٹے،فتح یاب ہوئے۔وقتی طور پر مسلط معاشی و معاشرتی بدحالی نے انھیں نئے تجربات دیے،جن کی روشنی میں ان کے لیے آئیندہ زندگی میں فیصلے کرنا آسان ہو گئے۔اسلام کی خاطر اپنے اُن قریبی رشتہ داروں کو چھوڑنا آسان ہو گیا۔

———(((اللہ اکبر)))———

سن 10 نبویؐ یعنی محصوری کے تیسرے سال حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتی لحاظ سے شدید صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ایک تو حضرت خدیجہؓ کی وفات اور دوسرے غم گسار اور انتہائی ہمدرد چچا ابو طالب کی وفات۔آپ ﷺ نے اس سال کو ”عام الحزن“ یعنی سال غم قرار دیا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زندگی کو خیر باد کہا تو ان کی عمر 65 برس تھی۔یہ حادثہ جانکاہ شعب ابی طالب میں محصوری کے آخری سال پیش آیا۔اگر میں مارکسزم کے نظریہ حیات کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات جیسے واقعات شعبِ ابی طالب میں بھوک پیاس پریشانی اور غم کی وجہ سے پیش آئے،مگر ہم خدا پر ایمان رکھنے والے اس عقیدہ پر کاربند ہیں کہ زندگی اور موت،خوشی اور غم،رزق اور افلاس عزت و ذلت سب اللہ بزرگ و برتر کے اختیار میں ہے۔ساری دنیا مل کر کسی کا ایک سانس بڑھانا چاہے تو بڑھا نہیں سکتی۔تمام مخلوقات مل کر کسی ذی نفس کی زندگی کے چند سانس کم کرنا چاہیں تو وہ کر نہیں سکتیں۔ہمارے نزدیک ہر تدبیر تقدیر کی محتاج ہے اور تقدیر کا مقرر کرنے والا یا کاتبِ تقدیر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے جو مخلوقات کی ہئیت و وضع اور عقل و ظرف کے مطابق ان کی تقدیر لکھتا ہے۔مثلاً چیونٹی کی تقدیر اس کی وضع قطع کے مطابق مچھلی سے مختلف ہے۔شیر کا رزق اس کی قطع و برید کے مطابق،ہرنی یا بکری سے مختلف ہے۔انسان کی تقدیر اس کی عقل و شرف کے مطابق،حشرات الارض،جانوروں اور حیوانوں حتیٰ کہ جنات اور فرشتوں سے مختلف ہے۔اسی طرح ہر انسان عقل،شکل،قسمت و تقدیر اور ظرف میں دوسرے سے مختلف ہے۔بہرحال اتنا ضرور ہے کہ محصوری کے آلائم و مصائب نے مسلمانوں کے

جسمانی مدافعتی نظام کو کمزور ضرور کیا ہوگا۔ بھوک، پیاس اور پریشانیاں ان دو شخصیات کی مرض الموت ضرور بنی ہوں گی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ کسی راوی نے ان دو شخصیات کی امراض کا ذکر نہیں کیا جو وجۂ اموات بنی۔ اس لیے ہم نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ شعب ابی طالب کی سختیوں کی وجہ سے حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی اموات وقوع پذیر ہوئیں۔

حضور ﷺ کا اپنی وفا شعار بیوی سے محبت کا یہ عالم تھا کہ حضرت خدیجہؓ کی رحلت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل دو دن تک روتے رہے پھر زندگی بھر جب آپؐ کو حضرت خدیجہؓ کی یاد آ جاتی تو آنکھیں چھم چھم برسنے لگتیں۔

میرے خیال میں دنیا میں کوئی اور ایسی مثال نہیں ملتی کہ کوئی مرد ایسی بیوی کو اس قدر چاہے جو عمر میں ان سے پندرہ (15) سال بڑی ہو۔ ان سے منسلک ہونے سے پہلے بیوہ ہو۔ اسے اس قدر چاہے کہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک اس جذباتی انداز میں منسلک رہے کہ یاد آنے پر بے اختیار رو پڑتے۔

نبی اکرم ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کی عمروں میں بہت بُعد تھا، لیکن ازدواجی زندگی کے پہلے دن سے لے کر آخری لمحے تک کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ حضرت خدیجہؓ جس دن آپؐ سے منسلک ہوئیں تو مکہ کی مالدار ترین خاتون تھیں۔ ان دنوں حضور ﷺ کے ہاتھ خالی تھے۔ ان کی مالی اعانت اور مدد نے خفیہ تبلیغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ پھر علانیہ تبلیغ کے بعد جب مخالفین نے آپؐ پر سختیوں کے پہاڑ توڑ دیے۔ یہ حضرت خدیجہؓ ہی تھیں جن کے پاس آ کر آپؐ کو حوصلہ اور سکون ملتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے ہمت بڑھانے سے آپؐ سب کچھ بھول کر نئے عزم و حوصلے سے دوبارہ دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔

نواحِ مکہ کی مالدار ترین ہستی جب ابدی جہان کی طرف روانہ ہوئیں تو ایک پائی نقد نہ تھی، یہاں تک کہ کفن کے لیے کپڑا بھی موجود نہ تھا۔ اوپر اوڑھنے والا صرف ایک صوقعہ تھا صرف صوقعہ۔ وہ شاید بامر مجبوری بچا چونکہ اس کے بغیر گزارا نہ تھا۔

صوقعہ دراصل اس چادر کو کہتے ہیں جو اتنی بڑی ہو کہ عورت اوڑھ کر پردے میں اتر جائے۔

سو اسی چادر سے دنیا کی خاتونِ اول کو کفن دے کر دفنا دیا گیا۔

اس واقعہ کے دو دن بعد ابو طالب کی وفات کا واقعہ پیش آیا جسے اگلے باب میں بیان کیا جاتا ہے۔

انا للہِ و انا الیہِ راجعون.

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

شرارِ بولہبی

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کی رحلت کے دو دن بعد حضور ﷺ کے غم گسار اور انتہائی ہمدرد چچا ابو طالب بھی انتقال فرما گئے۔ اس روایت میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ بعض راویوں کے نزدیک ابو طالب پہلے فوت ہوئے۔ بعض کے نزدیک حضرت خدیجہؓ نے پہلے وفات پائی۔ بہر حال اس اختلاف سے واقعات کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دو دن کے وقفے سے دونوں کی وفات ثابت ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ابو طالب نے اگرچہ کلمہ حق تسلیم نہیں کیا۔ اس کے باوجود عمر بھر ہر دکھ ہر تکلیف میں حضور ﷺ پر تن من دھن نثار کیا۔ ہر گھڑی ہر مشکل میں ساتھ دیا۔

وفات کے وقت ابو طالب کی عمر چھیاسی برس تھی۔ ان کی مرض الموت بھی محصوری میں بھوک پیاس اور دردناک پریشانیاں تھیں۔ ابو طالب چونکہ بنی ہاشم کے سردار تھے۔ جان کندنی کے وقت ابوجہل، عبداللہ بن امیہ، عباس بن عبدالمطلب اور ابولہب وغیرہ ان کے پاس کھڑے تھے۔

حضور ﷺ نے محترم و مکرم بزرگ و مشرف چچا سے فرمایا: ''چچا موت سے پہلے لا الہ الا اللہ کہہ لیجیے تاکہ میں خدا کے ہاں آپ کی شہادت اور گواہی دے سکوں۔'' پاس کھڑے ابوجہل اور ابن ابی امیہ نے کہا: ''کیا تم اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ دو گے ابو طالب نے کہا میں اپنے باپ دادا کے دین پر مروں گا۔'' پھر اپنے پیارے بھتیجے آنحضرت ﷺ کی طرف متوجہ ہوئے: ''میں وہ کلمہ ضرور پڑھ لیتا، لیکن قریش کیا کہیں گے؟ کہ موت سے [11] ڈر گیا ہو۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں اس وقت تک آپ کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا جب تک اللہ مجھے منع نہیں فرما دیتا۔''

مگر ایک اور روایت سے [12] پتا چلتا ہے کہ موت کے وقت ابو طالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب نے کان لگا کر سنا تو انھوں نے حضور ﷺ سے کہا، جو کلمہ آپ کہہ رہے تھے ابو طالب وہی پڑھ رہے ہیں۔

Marfat.com

یاد رہے حضرت عباسؓ اس وقت تک ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ویسے بھی یہ روایت اصول روایت وروائت پر پوری نہیں اترتی۔ اس لیے زیادہ ممکن یہی ہے کہ ابو طالب کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوا۔ آگے اللہ بہتر جانتا ہے اس لیے یہ معاملہ اللہ پر ہی چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں حضرت خدیجہؓ کی طرح ابو طالب کی مرض الموت بھی شعب ابو طالب کی محصوری ہی میں ہوئی تھی۔

حضرت خدیجہؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایثار اور قربانی تو اتنی حیران کن نہیں۔ وہ حضورؐ کے بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم المرتبت پیغمبر کی بھی بیوی تھیں۔ انھیں تو اپنے خاوندؐ اور پیغمبر کی زوجہ ہونے کے ناتے سب کچھ کرنا ہی تھا۔ اگر نہ کرتیں تو نوح علیہ السلام کے گھر والوں کی طرح نافرمانوں میں شمار ہوتیں۔

مگر ابو طالب کی قربانیاں بڑی حیرت انگیز اور قابل داد ہیں۔ وہ نہ تو محمد ﷺ کو نبی جانتے تھے اور نہ ہی ان کے دین کو سچا سمجھتے تھے۔ اس فکری اختلاف کے باوجود عمر بھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زندگی کے کسی معاملے میں اختلاف کیا، نہ لمحہ بھر کے لیے ساتھ چھوڑا۔ اس پیرانہ سالی میں شعبِ ابی طالب میں قید نہ بھی ہوتے تو قبیلے کا سردار ہونے کے ناتے انھیں مکہ سے نکالنے والا کوئی نہ تھا اور مذہبی معاملے میں اہلِ شرک کے ساتھ ان کی ہم آہنگی بھی تھی۔ چونکہ وہ محمد ﷺ کی وجہ سے اسلام کے مخالف نہ سہی اسلام کو قبول بھی نہ کرتے تھے۔ اس حوالہ سے بھی انھیں مکہ سے نکالنے والا کوئی نہ تھا، مگر ان کی خاندانی غیرت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ آپؐ کے ساتھ ضعیف العمری میں قید و بند کی صعوبتوں کو گوارا کر لیا۔ یقیناً امت پر ابو طالب کے بہت بڑے احسانات ہیں۔ مگر فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے اور اللہ بہتر فیصلے کرنے والا ہے۔

———((اللہ اکبر))———

ایک دن کسی نے اس اشتہار یا اعلامیے کو پڑھنے کی کوشش کی جس پر مسلمانوں کے خلاف اقتصادی اور سماجی بائیکاٹ کے نکات لکھے ہوئے تھے پڑھنے والے کو دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ماسوا ان الفاظ کے "تیرے نام سے اے اس گھر کے مالک" باقی تمام الفاظ دیمک نے چاٹ لیے ہیں۔ یہ دیکھنا تھا کہ اس نے بھاگم بھاگ باقی لوگوں کو بتایا۔ ایک ایک کر کے سب نے دیکھا۔ جو جو دیکھتا گیا، اس کے دل میں ایک ان جانا خوف داخل ہوتا گیا۔ سوئے اتفاق یہ واقعہ ان دنوں پیش آیا جب ابو طالب دارِ فانی کو سدھار گئے اور قبیلہ بنی ہاشم کی پگ ابولہب کے سر پر رکھی جانے والی تھی۔

فرمانِ قریش کو دیمک نے کھا لیا تو قریش کے چند جوانوں نے مسلمانوں کے واپس آنے

Marfat.com

کی تحریک پیدا کی اور ساتھ ہی ساتھ ابوطالب کی وفات کے اثرات تھے چونکہ بنی ہاشم کی سرداری کے لیے بھی فیصلہ ہونا تھا۔ ان وجوہات نے مسلمانوں کو مکہ بلانے پر مجبور کر دیا۔

تین سال بعد جب مسلمان واپس مکہ آئے تو ان کی حالت انتہائی قابل رحم تھی۔ کسی کے پاس کپڑا نہیں ہے تو کسی کے پاس جوتا نہیں۔ بڑے بڑے امیر کبیر لوگ بالکل قلاش ہو چکے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسے رئیسِ مکہ جن کو دولت کے لحاظ سے نواح مکہ کا امیر ترین شخص کہا جاتا تھا۔ انھوں نے اسلام پر بے دریغ خرچ کیا۔ درجنوں غلام اور لونڈیاں خرید کر آزاد کیے۔ پانی کے کئی کنویں خرید کر عوام الناس کے مصرف میں دے دیے۔ ملکِ حبشہ کو ہجرت کرنے والوں کا خرچ اپنی جیب سے ادا کیا۔ جب مکہ واپس آئے تو ان کے پاس صرف پانچ ہزار درہم باقی تھے۔ صرف پانچ ہزار درہم باقی غریب اور نادار مسلمانوں کی حالت کا خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے۔

بہرکیف!!! ابوطالب کی وفات سے خاندانِ بنی ہاشم میں ایک اعلیٰ سیاسی عہدہ خالی ہو گیا۔ اس عہدے پر کسی بزرگ کا انتخاب ضروری تھا۔ مگر بدقسمتی سے عرب کے عام دستور کے مطابق سرداری کی پگ صرف ابولہب کے سر رکھی جا سکتی تھی۔ یاد رہے ابولہب وہی شخص ہے جو اسلام کا دیرینہ اور زہریلا دشمن تھا۔ علانیہ تبلیغ کے ابتدائی سالوں میں جتنی مخالفت اس نے کی، شاید ہی کوئی اس کے برابر ہو۔ یہ واقعہ نوٹ کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ چراغِ مصطفویؐ کے مقابلے میں شرارِ بولہبی ایک علامت ہے اور یہ علامت سرد جنگ میں بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ابولہب کے سر پر قبیلے کی سرداری کی دستار رکھ دی گئی۔ وہ سردارِ بنی ہاشم بن گیا تو اس کی پہلی فکر یہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح محمد ﷺ کو قبیلہ بدر کیا جائے۔

چند روزہ سوچ بچار کے بعد اس نے تمام بنی ہاشم کو اپنے گھر دعوت پر بلایا۔ جب تمام لوگ آ گئے تو وہ آپ ﷺ سے یوں مخاطب ہوا کہ "میں اس بات کی وضاحت چاہتا ہوں یہ جو آپ کہتے ہیں کہ تمام مشرک جہنم میں ڈالے جائیں گے، تمھارا کیا خیال ہے تمھارے دادا عبدالمطلب جہنم میں ہیں یا جنت میں۔"

ظالم نے بہت بڑی چال چلی تھی۔ اپنی طرف سے جلا کر بھسم کر دینے والا کوئلہ پھینکا تھا۔ شرارِ بولہبی کا خطرناک ترین کارڈ کھیلا تھا جو جیتی ہوئے کھیل کو ہرا سکتا تھا۔ ظالم نے حضور ﷺ کو بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اگر کوئی مصلحت کوش ہوتا تو بل پہ منڈا منڈا ڈال کر بات گول مول کر جاتا، مگر ایسے معاملات میں مصلحت اختیار کرنا رسالت مآب ﷺ کے لیے خود اپنے مشن کی نفی کرنے کے مترادف تھا۔ آپؐ نے جواب میں سورہ توبہ کی یہ آیات تلاوت فرمائیں جن کا

Marfat.com

مفہوم درج ذیل ہے:[13]

''اللہ کے بندے اور وہ لوگ جو اہلِ ایمان ہیں، خدا سے مشرکوں کے لیے مغفرت طلب نہ کریں، چاہے وہ ان کے قریبی رشتہ ہی کیوں نہ ہوں۔''

پھر اس نے ابو طالب کے متعلق پوچھا تو حضورؐ نے جواب دیا ''انھوں نے اپنے اجداد کا دین نہیں چھوڑا۔ اس لیے ان کا معاملہ خدا کی مرضی پر ہے۔''

پھر اور بزرگوں کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے مختصر کرتے ہوئے کہا ''خدا کا حکم قطعی ہے اس میں کانٹ چھانٹ یا رورعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

عربوں کی عام روایت کے مطابق اپنے اجداد کو تنقید کا نشانہ بنانا نہ صرف قبیلے کی توہین، بلکہ قبائلی رسومات و قواعد سے بغاوت کے مترادف تھا۔ حضور ﷺ نے اس سے قبل نام لے کر کبھی اپنے بزرگوں سے متعلق اس قسم کی بات نہ کی تھی۔ اب چونکہ ابولہب شرارتاً نام لے رہا تھا تو آپ ﷺ کو بھی وضاحت کرنا پڑی۔ یہ وضاحت ابولہب کی منشاء کے عین مطابق تھی۔ یہ الفاظ سن کر تمام سامعین پر سناٹا طاری ہو گیا۔ سب متحیر ہو کر حضورؐ کو دیکھ رہے تھے۔

ابولہب یہی حالات پیدا کرنا چاہتا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اگر صاف صاف کہنے والے نہ ہوتے تو اتنی تکلیفیں کیوں اٹھاتے۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابولہب نے اہلِ قبیلہ سے کہا۔ کیا مجھے حق نہیں کہ محمد ﷺ کو قبیلہ سے نکال دوں۔ ان کا جرم ایسا نہیں جسے معاف کیا جا سکے۔ تمام اہل قبیلہ نے ابولہب کی تائید کی۔

اس نے اعلان کیا: ''میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قبیلہ بدر کیا۔ آج کے بعد ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں۔'' اس کے بعد مجلس برخواست کر دی۔

پہلی دفعہ جب اہل مکہ نے حضور ﷺ کو شہر سے نکالا تو اس وقت تمام بنی ہاشم (ماسوا ابولہب کے) اپنے سردار ابو طالب سمیت آپؐ کے دکھ درد میں برابر کے شریک تھے۔ پہلا سردار بھی سگا چچا تھا۔ یہ بھی چچا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ وہ بھتیجے کی خاطر جان دینے کے لیے تیار تھا اور یہ جان لینے پر تلا ہوا ہے۔ اُس دن بیابان میں چچا اپنے قبیلہ کے ساتھ آپؐ کی حفاظت پر کھڑا تھا اور آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالکل تنہا ہیں۔ صرف اللہ کی ذات پر بھروسا ہے۔

ماضی میں جسمانی یا روحانی تکالیف سے چور گھر آتے تو وفا کی پیکر زوجہ محترمہ سکون بخش باتوں سے تمام روحانی کلفتیں دور کر دیتیں اور جسمانی زخموں پر مرہم پٹی کر کے تازہ دم کر دیتیں۔ ساتھ ہی بزرگ چچا ہمیشہ باپ کی طرح دلداری کرتے جس سے امید بندھ جاتی۔ آج نہ شفیق چچا

Marfat.com

ہیں، نہ وفا شعار بیوی۔ ان دونوں کی موت بھی آج صحیح معنوں میں یاد آئی تھی۔ آج تو حالِ دل سنانے کے لیے بھی کوئی موجود نہ تھا۔ آپ ﷺ تنہا تھے اور کافی دیر تنہائیوں میں کھوئے رہے۔ بالآخر تنہا فکروں سے نکل کر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ مغفرت طلب کی۔ مدد مانگی تو اللہ تبارک تعالیٰ نے بھی مدد کی انتہا کر دی۔ نوازشوں کے تمام دروازے کھول دیے۔ اپنے محبوب کی دلجوئی کے لیے فرش سے عرش پر بلا لیا۔ فرش سے عرش پر بلانے کو معراج النبیؐ سے تعبیر کیا۔ معراج آپؐ کے تمام دکھوں کا مداوا تھی جسے ہم آئندہ صفحات میں تفصیلاً بیان کرنے چلتے ہیں۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

—(((الحمد للہ)))—

حواشی:

1- ابن ہشام، سیرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔
2- تفہیم القرآن، تفسیر ابن کثیر۔
3- ابن ہشام، سیرت النبی۔
4،5- ابن ہشام، ابن سعد، سیرت النبیؐ، مسلم شریف، بخاری شریف۔
6- مسند احمد جلد اول، ابن ہشام جلد اول تاریخ اسلام، سریت النبیؐ سیرت سرورِ عالمؐ۔
7- تاریخ ابن۔ ابن ہشام، ابن سعد، بخاری، مسلم، سیرت النبیؐ، سیرت سرورِ عالمؐ۔
8- ابن ہشام، مسند احمد بن حنبل، سیرت النبیؐ۔
9- ابن ہشام۔ ابن سعد، سیرت النبیؐ۔ سیرت سرورِ عالمؐ۔
10- ابن ہشام، تاریخ اسلام، سیرت محمدؐ، سیرت النبیؐ۔
11- بخاری باب الطنائز، مسلم شریف، سیرت النبیؐ۔
12- سیرت النبی جلد اول، ابن ہشام مطبوعہ مصر۔
13- سورۃ توبہ آیۃ:114

Marfat.com

باب:12

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تاریخی پس منظر

تحریک اسلامی کو اثرات مرتب کرتے ہوئے دس گیارہ سال گزر چکے تھے۔ بانی تحریک اس دشت کی سیاہی میں زندگی کی باون (52) بہاریں گزار چکے تھے۔ غالب خیال یہی ہے کہ 628 سن عیسوی اور دس یا گیارہ سن نبوی کا زمانہ تھا۔

تحریکی کارکن انتہائی جبر وتشدد کا انتہائی پامردی سے مقابلہ کر رہے تھے۔ انتہائی مخالفت کے باوجود تحریکی اثر ونفوذ عوام میں سرائیت کر رہا تھا۔ تنظیمی ڈھانچہ دن بدن مضبوط ہو رہا تھا۔ جہاں مخالفین نت نئے قوانین جکڑ بیچ کے لیے نافذ کر رہے تھے، وہاں عوامی اکثریت کے دل خود بخود اسلامی نظریات کی طرف ہو رہے تھے۔

نواحِ مکہ میں ولولہ انگیز کارکنوں کی ایک ایسی جماعت تربیت پا چکی تھی جو جانوں پر کھیل جانے کو ہمہ وقت تیار تھی۔ علاوہ ازیں مدینہ کے بڑے قبائل اوس اور خزرج کی اکثریت حلقہ بگوش اسلام ہو چکی تھی۔

الغرض حالات پوری شدت سے تقاضا کر رہے تھے کہ اسلام کی اشاعت وتبلیغ کے لیے کوئی مضبوط ومحفوظ مستقر ہونا چاہیے۔ کسی آزاد اور خود مختار علاقے کا ہونا ضروری ہے۔ مکہ کے اندر رہ کر تحریک کا مزید زندہ رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ سنگینیٔ حالات کی طوالت کہیں کارکنوں میں مایوسی اور بددلی نہ پھیلا دے۔ کہیں کارکن معاشی، معاشرتی اور خاندانی مشکلات کے سامنے ڈھیر نہ ہو جائیں کہیں۔ دباؤ کا تسلسل ان کے اعصاب شل نہ کر دے۔

نفسیات کے ماہرین ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ انسانی اعصاب کی مضبوطی جذبوں کی محتاج ہے اور جذبے کسی خاص نظریے یا مقصد کے تابع ہیں۔ نظریے یا مقاصد امید و

یاس کے تابع ہوتے ہیں اور امید و بیم کے ساتھ انسان مخصوص وقت تک ہی چلتا ہے۔ اگر امیدیں لمبی ہو جائیں۔ امیدوں کے برآنے کا وقت طویل ہو جائے تو انسانی اعصاب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر اچھے بھلے انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضائع کر دیتے ہیں۔ وہی انسان جو پُر امید حالات میں ناقابل تسخیر نظر آتا ہے۔ امیدیں ٹوٹنے پر ریت کی دیوار کے مانند خس و خاشاک کی طرح ہوا ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی خطرہ تحریکِ اسلامی کو لاحق تھا۔ محفوظ اور آزاد مقام کے بغیر تحریک کو مزید تقویت دینا ناممکن ہو چلا تھا۔

شاید حالات و واقعات کے تناظر میں ''اسرا'' اور ''معراج'' کا وہ واقعہ پیش آیا جس نے زمانے کی رفتار بدل کے رکھ دی۔ قیامت تک آنے والی انسانیت کو ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا جہاں کھڑا ہر شخص انگشت بدنداں نظر آنے لگا۔ یہ انسانی زندگی کا بہت بڑا واقعہ تھا اور عقل کا بہت بڑا امتحان تھا۔ قلت فکر کا شکار اور معرفتِ عقل و دل سے عاری لوگ آج تک خدا کا غضب وقہر، دنیا و آخرت کے لیے اپنے اوپر مسلط کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ کائنات تو بڑی وسیع و عریض ہے۔ اس کے پورے پورے اسرار و رموز آج تک انسانیت سے مخفی ہیں۔ کسی کے سامنے پیش نہیں کیے گئے۔ پیغمبروں کو بھی چند ایک سے آگہی دی جاتی رہی جو انتہائی ضروری ہوتے اور وہ عام انسانی عقل و فکر سے ماورا تھے۔ عام انسانوں تک ان اسرار و رموز کا علم انھیں کے ذریعہ پہنچا۔ تسلی کے لیے چند ایک قرآنی دلائل اشارتاً قارئین کے حوالے کرتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان ہیں جو پہلے جنت میں اور بعدازاں زمین پر بسائے گئے۔ ان کو جنت اور زمین کی نعمتوں سے براہ راست فائدہ اٹھانے کا موقع ملا نہیں، بلکہ موقع دیا گیا تاکہ آنے والی انسانیت کی راہنمائی کر سکیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام[1] کو زمین اور آسمان کے اندرونی انتظامات کا مشاہدہ کروایا گیا اور مردوں کے زندہ کرنے کا عمل دکھایا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام[2] کو طور پر جلوہ ربانی دکھایا گیا اور دنیا کے[3] نظام و انصرام کا تکوینی لحاظ سے جائزہ لینے کے لیے ایک خاص مدت تک حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ سفر کروایا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک انتہائی اور غیر فطری کرشمہ سازی کی۔ ایسے ہی کچھ علامات و جلوے حضور ﷺ کے لیے تھے۔ آپ[4] کبھی جبریل علیہ السلام کو آسمان پر پورے وجود کے ساتھ دیکھتے ہیں اور کبھی وہی مقدس فرشتہ اتنا قریب آجاتا ہے کہ درمیانی فاصلہ[5] دو کمانوں سے بھی کم رہ جاتا ہے اور کبھی وہی مقدس روح[6] سدرۃ المنتہیٰ پر ملتی

Marfat.com

ہے۔

یوں اللہ تعالیٰ کی ذات انبیاء علیم اسلام پر اپنی تخلیقات کے اسرار ورموز کھول کر عام انسانوں کو نبیوں کے ذریعہ آگہی دیتی ہے۔ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ عام انسانوں کو کیوں نہیں؟ جواب یہ ہوا بنی اسرائیل نے ضد کی، وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے توسط سے "یارب ارنی" کہا تو حکم ہوا "لن ترانی" کا جواب ملا۔ بار بار ضد کرنے پر تھوڑی سی جھلک دکھائی گئی تو سمیت موسیٰ علیہ السلام کوئی ایک بھی متحمل نہ ہو سکا۔ سو معلوم ہوا عام انسان کی فکر او روجود اس اہل نہیں جو نبیوں کو دکھایا جائے، ایسا ہی ہر کس و ناکس پر بھی کھول دیا جائے۔

بہر حال معراج النبی ﷺ اس عام سے فہم و شعور سے بالاتر تھی۔ چونکہ عنقریب تحریکِ اسلامی ایک اہم موڑ مڑنے والی تھی۔ مستقبل قریب میں ان کے بانی محمد ﷺ کو ریاستی وحکومتی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ مکہ کے پُر تشدد حالات میں کارکنوں کا مزید رہنا نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے تحریک و تنظیم کو مزید آگے چلانے کے لیے کسی آزاد و خود مختار ریاست وحکومت کی ضرورت تھی۔ اس ریاست اور حکومت کے لیے کوئی دستور یا ضابطہ چاہیے تھا اس اساسی دستور کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو اپنے پاس آسمانوں پر بلا لیا جسے آج ہم معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ معراج تو بہت سارے انبیاء کو نصیب ہوئی، لیکن معراج النبیؐ ان سب سے مختلف بھی ہے اور اہم بھی۔ اس نے قیامت تک آنے والی خلقت کا رخ موڑ کر رکھ دیا۔ یہ آج بھی اسلام میں "اساسی دستور" کا درجہ رکھتی ہے۔

یہ تو تھا اس واقعہ کا تاریخی پس منظر۔ آئیے اس سفر کی جزئیات کی طرف چلتے ہیں۔ آسانی کے لیے اسے تین حصوں میں بیان کیا جائے گا۔ نمبر 1 مکہ سے اقصیٰ تک نمبر 2 اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک نمبر 3 سدرۃ المنتہیٰ سے واپس مکہ تک اور اس کا لوگوں سے ذکر اور لوگوں کا ردعمل۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

کائناتِ انسانی کا پہلا آسمانی سفر

آج جب چاند مشتری اور زہرہ کی طرف خلائی شٹلو بھیجی جاتی ہیں تو برقیاتی ریڈیائی میڈیاز پر روانگی کی تصاویر دکھائی جاتی ہیں۔ ایسے مشن بھیجنے والے ممالک اپنی عملی تحقیقات کا خوب پرچار کرتے ہیں۔ اپنے ان نئے کارناموں کی خوب تشہیر کرتے ہیں۔ اس تشہیر میں خوب رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ سننے اور دیکھنے والے خوب متاثر ہوتے ہیں۔ یقیناً اسلام سے ناواقف لوگوں کے لیے یہ بہت بڑا حیران کن کارنامہ ہوتا ہے۔ اگر انھیں لوگوں کو آج سے چودہ صدیاں قبل آسمانوں کی طرف کیے جانے والے دنیا کے پہلے آسمانی سفر کی تفصیلات پیش کر دی جائیں تو شاید انھیں ذرہ برابر حیرانی نہ ہو کیونکہ موجودہ فضائی یا آسمانی تسخیرات مشینی اور فضائی ٹیکنالوجی کی محتاج ہیں جب کہ معراج النبی ﷺ کی آسمانی تسخیرات اللہ عظیم وکبیر کے حکم سے وقوع پذیر ہوئیں۔

اس سے قبل بھی چند انبیاء اکرام نے آسمانی سفر کیا، لیکن انھیں واپس نہیں بھیجا گیا یہ اعزاز صرف محمدؐ رسول عربی ﷺ کو ملا کہ آپؐ واپس آئے اور سفر کی تفصیلات سے انسانوں کو آگاہ کیا۔ اس لیے ہم اس کو" دنیا کا پہلا آسمانی سفر گردانتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سفر کسی خلائی شٹل کا محتاج نہیں تھا۔ یہی چیز شقی القلب لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالتی ہے کہ کروڑوں نوری سالوں کی منزل رات کے ایک تہائی حصہ میں کیسے طے ہوئی؟"

بات صرف اتنی ہے عقل دلیل مانگتی ہے اگر دلیل سمجھ میں نہ آئے تو مانتی نہیں، حالانکہ حقائق روزِ روشن کی طرح واضح ہیں۔ مثلاً خدا کو کسی نے نہیں دیکھا مگر وہ ہے اپنی تمام قدرتوں کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی قدرتیں جا بجا نظر آ رہی ہیں۔ ماننے والے بن دیکھے ہی مانے جاتے ہیں جنھوں نے نہیں مانا وہ ہم نا مانے ہی کہے جاتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی دلیل، کوئی منطق کوئی مثال کارگر نہیں۔ ان کا انکار دراصل نجی اور ذاتی انکار ہے جسے ان کے اندرونی خلفشار کا ہی نام دیا جا سکتا ہے۔ اندرونی خلفشار شیطانی عمل ہے اور شیطان کے لیے کوئی دلیل وجۂ اقرار نہیں ہو سکتی۔

Marfat.com

اس نے اللہ کی قدرتوں کو جتنا قریب سے دیکھا، شاید ہی کسی اور منکر نے دیکھا ہو۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کائنات ارضی کا پورا نظام صرف ''کن'' کہنے سے عمل میں آ گیا وہ اللہ کو اس کی تمام ربوبیتوں کے حوالے سے جانتا اور مانتا تھا۔ پھر بھی منکر ہو گیا صرف اس وجہ سے کہ آدمؑ علیہ السلام کو اپنا حریف سمجھ بیٹھا۔ چونکہ اسے مخلوقات کا بزرگ بنا دیا گیا اور اس کی نسلوں کو اشرف المخلوقات۔ یہ حریفانہ تعصب ہی ذاتی خلفشار تھا جس نے شیطان کے دل میں انتشار پیدا کیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انکاری ہو گیا، حالانکہ وہ خدا کو جانتا بھی تھا اور مانتا بھی تھا۔ اس ایک انکار نے اسے خدا سے دور کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے ماننے والوں کے نزدیک شیطان لعین اور دھتکارا ہوا ٹھہرا جو آج بھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ اس باغیانہ حکم عدولی کی تعزیر اس سے کہیں زیادہ سخت تھی، مگر خدائے وحدہٗ لاشریک نے اپنی حکمتوں کے مطابق سزا دی یعنی انسان کو جانچنے کے لیے مثبت اور منفی رجحانات سے رنگ بھرا۔ منفی رجحانات شیطان سے منسوب کر دیے اور مثبت رجحانات اپنے قرب کا ذریعہ ٹھہرائے۔ یوں حضرت ابنِ آدم کی پڑتال بھی ہوتی چلی گئی۔

یہی رجحانات محمد رسول اللہؐ کے دور میں بھی موجود تھے۔ انھیں کے تابع مکہ میں دو جماعتیں نمایاں ہوئیں۔ پہلی جماعت حزب اللہ یعنی اللہ اور رسول کے ماننے والے۔ دوسری جماعت منکرین توحید و رسالت یعنی حزب الشیطان یا شیطان کی طرح منفی رجحانات کے تابع چلنے والے۔

دوسری جماعت مکہ کے اندر قدرے مضبوط، طاقتور اور مکہ کی اکثریت پر مشتمل تھی۔ اس جماعت نے مسلمانوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ نبی مکرم کا جینا دوبھر کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر خصوصی عنایت فرمائی یعنی انھیں آسمانوں پر بلا لیا۔ اپنی قدرتوں کے تمثیلی خاکے دکھانے کے بعد چند نئے احکامات کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ یقیناً وہ احکامات تحائفِ معراج کہلانے کے قابل ہیں۔

بہرحال جب یہ واقعہ منکرین کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے شیطانی روایت کے عین مطابق ماننے سے صاف انکار کر دیا، جبکہ مطمئن دلوں والے اصحابِ رسولؐ نے من و عن تسلیم کر لیا۔ انھوں نے کوئی بُرہان طلب نہیں کی۔ ان کے لیے یہی کافی تھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں۔ شقی القلب لوگوں کو منطقی اور عقلی دلائل بھی راہ راست پر نہ لا سکے جنھیں ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں۔ ہدایت تو طلبگاروں کا نصیب ہے۔ جس دل میں خلفشار ہو، اسے تو انکار ہی ملتا ہے، اقرار نہیں۔

ہم اطمینانِ قلوب کے لیے اسے عقلی اور منطقی لحاظ سے آخر میں پیش کر دیں گے تا کہ کوئی حجت باقی نہ رہے، ورنہ ضرورت نہیں۔ آیئے معراج النبی کی تفصیلات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں:

ہم قارئین کی آسانی کے لیے سفر معراج تین ذیلی مرحلوں میں بیان کریں گے:

1- مکہ سے اقصیٰ تک

2-اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک

3-سدرۃ المنتہیٰ سے واپس مکہ تک

---(((الحمد للہ)))---

Marfat.com

مکہ سے اقصیٰ تک

حضور ﷺ بعض روایات کے مطابق حرم شریف مقامِ حطیم میں، بعض روایات کے مطابق اپنے گھر میں سو رہے تھے۔ جبریلِ امین آپؐ کے پاس آئے اور تین بار آہستگی سے دایاں پاؤں دبایا۔ تیسری بار نیم بیداری[7] کی حالت میں آپ کو لے کر چاہِ زم زم کے پاس گئے۔ آپ کا سینہ چاک کیا۔ آبِ زم زم سے دھویا۔ محدثین کے بقول علم و حکمت اور ایمان و یقین سے بھرا اور بند کر دیا۔ اسے تاریخ و سیرت میں ''شقِ صدر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپؐ کے ساتھ ایسا عمل زندگی میں تیسری دفعہ کیا گیا۔

یاد رہے عربی زبان و ادب میں شقِ صدر کے معنی سینہ چاک کرنے کے ہیں۔ موجودہ دور میں یہ عمل بائی پاس یا ہارٹ سرجری کے لیے کیا جاتا ہے، مگر شقِ صدر اور موجودہ سرجری میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ عام آدمی اور نبی یا رسول میں فرق ہوتا ہے۔ اس لیے ''شقِ صدر'' بھی علامت کے طور پر صرف حضور ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے۔ شقِ صدر کسی اور کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بھی عام آدمی کا سینہ کسی بیماری کے علاج کے تابع کھولا جاتا ہے جبکہ آپؐ (نعوذ باللہ) نہ بیمار تھے نہ ہی کسی علاج کے محتاج۔ آپؐ کے ساتھ تو خدائے بزرگ و برتر کی خاص حکمتوں کے تابع ایسا ہوتا رہا۔ خدا کی ان حکمتوں کے متعلق وثوق کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، محض قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاید انسان میں خدا کی تجلیات براہِ راست دیکھنے کی سکت نہیں یا وہ دیکھ کر دل و دماغ میں محفوظ نہیں رکھ سکتا یا آپ کو یہ جو نو کھانیا اور دنیا میں یکتا سفر درپیش تھا اس شقِ صدر (آپریشن) کے بغیر اس کا متحمل ہونا ناممکن تھا۔ اس لیے یہ سب کچھ کیا گیا۔

ہمارے اس قیاس کی بنیاد بھی کچھ پرانی ہے۔ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم نے اللہ سے آرزو کی۔ یاربّ ارنی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ''لن ترانی''۔ انھوں نے بار بار اللہ کو دیکھنے کی ضد کی تو اللہ نے اپنے جلوؤں میں سے معمولی بہت معمولی سی جھلک دکھائی تو ساری قوم یک لخت بیہوش ہوگئی یعنی بنی اسرائیل اللہ کے جلوؤں کی معمولی جھلک دیکھنے کی بھی متحمل نہ ہو سکی۔

ہمارے قیاس کی بنیاد بھی یہی ہے۔ چونکہ آپؐ کو چند گھڑیوں بعد اللہ عظیم و کبیر کے روبرو حاضر ہونا تھا۔ شاید اس لیے "شقِ صدر" کیا گیا تاکہ پیش آنے والی تجلیات کے متحمل ہو سکیں۔ ویسے اللہ علیم وخبیر ہے۔ ہمیں تو اس قیاس کا بھی حق نہیں۔ محض دل کی بات زبانِ قلم پر آ گئی، ورنہ، اللہ تو اللہ ہے، اسے جاننے کی نہیں ماننے کی ضرورت ہے اس کو ماننا ہی انسان کی پہچان ہے اللہ ہمیں ماننے والا بنائے اللہ کو جاننے کی ضرورت نہیں ماننے کی ہے جو مان لیتا ہے اسے پہچان خود بخود ہو جاتی ہے۔

بہرحال!! شقِ صدر کے بعد آپؐ کے سامنے ایک چوپایہ[8] پیش کیا گیا۔ جو قد کے لحاظ سے خچر اور گدھے کے درمیان قد کا تھا۔ اس کا رنگ سفید اور نام "براق" تھا۔ اپنی نظر کی حد تک قدم رکھتا تھا یعنی برق رفتاری سے چلتا تھا۔ شاید اس کا نام بھی اس کی برق رفتاری کی وجہ سے براق ہوا۔

اس سے قبل چند انبیاء اکرام[9] اس پر سفر کر چکے تھے۔ اس کی رانوں پر دو پر تھے جسے وہ پاؤں سے کھجا رہا تھا۔ حضورﷺ سے کہا گیا کہ اس پر سوار ہو جائیں۔ آپؐ سوار ہونے لگے تو وہ شوخی کرنے لگا۔ جبریل علیہ السلام نے اس کی ایال پر ہاتھ رکھ کر کہا اے براق جو کچھ تو کر رہا ہے اس سے تجھے شرم نہیں آتی۔ خدا کی قسم! اس سے پہلے تجھ پر کوئی ایسی شخصیت نہیں بیٹھی جس کی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے ہاں محمدﷺ سے زیادہ ہو۔ یہ الفاظ سن کر اس کے پسینے چھوٹ گئے اور وہ سکون سے کھڑا ہو گیا۔

اور حضور خاتم النبیینﷺ اس پر سوار ہو گئے۔ جبریل علیہ السلام بھی آپؐ کے ساتھ اسی سواری پر عازمِ سفر ہوئے۔ سفر کی شروعات مکہ سے شمال کی جانب ہوئیں۔ پہلی منزل مدینہ تھی جہاں آپؐ نے اتر کر نماز پڑھی۔

یاد رہے منزل عربی میں میلوں کی پیائش کا پیمانہ ہے دس (10) میل کا فاصلہ ایک منزل کے برابر ہوتا ہے، مگر یہاں ہم آسانی کے لیے لفظ منزل رکنے (Stop) کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں۔

جبریل علیہ السلام نے آپؐ کو بتایا کہ یہاں آپؐ عنقریب ہجرت کر کے آنے والے ہیں۔ یہاں سے آپؐ نے کوہِ طور کا رخ کیا۔ طور سینا پہنچ کر بتایا گیا کہ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا سے ہمکلام ہوتے رہے۔

تیسری منزل جبرون تھی جہاں آپؐ کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر تھی۔ اس جگہ حضورﷺ اترے فاتحہ خوانی کی اور چل دیے۔

بعدازاں بیت اللحم کا رخ کیا یہ وہ جگہ تھی جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ یہ بھی مافوق الفطرت واقعہ تھا یعنی عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے معجزاتی طور پر پیدا ہوئے، اس لیے وہ مقام اور جگہ بھی آپؐ کو دکھائی گئی۔

زمینی سفر کی پانچویں اور آخری منزل ''ایلیا'' یعنی بیت المقدس تھی۔ ''ایلیا'' موجودہ اسرائیل کی بندرگاہ ایلات کا پرانا نام تھا جسے ''بیت المقدس'' بھی کہتے ہیں اور اسی کو تاریخ میں یروشلم بھی کہا جاتا رہا۔ بیت عربی میں گھر کو کہتے ہیں، مقدس کے معنی پاک کے ہیں۔ مسجد اقصیٰ چونکہ حرم مکہ کی طرح اللہ کا گھر ہے اس لیے اسے بیت المقدس کہا جاتا ہے اور اسی نسبت سے ایلات شہر کو بیت المقدس کہا جاتا ہے۔

یہاں آپؐ براق سے اتر گئے۔ پہلے انبیاءؑ اکرام ہیکلِ سلیمانی [10] کے ساتھ براق باندھا کرتے تھے۔ اس جگہ رومی شہنشاہ جسٹینین نے گرجا تعمیر کر دیا تھا۔ اس لیے جبریلؑ نے ایک چٹان یا پتھر میں انگلی گھما کر ایک سوراخ کیا اور اس کے ساتھ براق باندھ دیا۔

آدمؑ علیہ السلام سے لے کر اب تک مبعوث ہونے والے تمام انبیاء اکرام [11] وہاں استقبال کے لیے موجود تھے انھوں نے خوب گرم جوشی سے استقبال کیا اور تمام کے تمام نماز کے لیے صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر امامت کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھا گیا۔ آخرکار حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو پکڑ کر امامت کے لیے آگے کر دیا۔ آپؐ نے تمام انبیاء اور مرسلینؑ کو نماز پڑھائی۔

بعدازاں میزبانی کا دور شروع ہوا۔ آپؐ کو دو پیالے پیش کیے گئے۔ ایک میں دودھ اور دوسرے میں شراب تھی۔ بعض مبہم روایات کے مطابق تین پیالے پیش کیے گئے۔ ایک میں دودھ، دوسرے میں شراب اور تیسرے میں پانی تھا۔ بہرکیف آپ سرکار ﷺ نے دودھ [12] کا پیالہ اٹھایا اور بسم اللہ پڑھ کر پی لیا۔

جبریل علیہ السلام نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ آپؐ کی امت نے بھی فطرت کی راہ پالی اور آپؐ نے بھی۔ بعض مفسرین نے وضاحت کی کہ فطرت کی راہ یہی تھی، اگر آپؐ شراب پی لیتے تو آپ کی امت لہو ولعب میں پڑ جاتی۔ دودھ صالحیت کی مثال ہے۔

علاوہ ازیں دورانِ سفر میں کسی پکارنے والے [13] نے پکارا، ادھر آؤ۔ آپؐ نے سنی ان سنی کر دی۔ جبریلؑ نے کہا: ''یہ یہودیت کا داعی ہے''۔ دوسری طرف سے آواز آئی، ادھر آؤ۔ آپؐ متوجہ نہ ہوئے۔ جبریل نے بتایا: ''یہ عیسائیت کی طرف بلا رہا ہے۔'' پھر ایک خوبصورت عورت

Marfat.com

نے اپنی طرف بلایا۔آپؐ ملتفت نہ ہوئے۔جبریلؑ نے کہا: ''یہ دنیا تھی''۔بعدازاں ایک بوڑھی عورت نے آواز دی تو آپؐ نے نظریں پھیرلیں۔جبریلؑ نے کہا: ''باقی ماندہ زندگی کا اندازہ اس عورت کی باقی ماندہ زندگی سے کرلیجئے۔آخر میں ایک باریش شخص نے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔اس کو بھی آپ سرکار ﷺ نے نظر انداز کردیا تو جبریلؑ نے وضاحت فرمائی۔یہ شیطان تھا جو آپؐ کو صراطِ مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے۔''

قارئین یہ واقعات پورے سفرِ معراج کے دوران پیش آئے ہم نے پڑھنے، سمجھنے، سننے، سنانے والوں کی آسانی کے لیے ایک ہی جگہ بیان کردیے۔اللہ کمی بیشی معاف فرمائے۔

سفر کا پہلا حصہ ختم ہوا۔آیئے دوسرے مرحلے سے استفادہ کرنے کی کوشش کریں۔شاید اسی بہانے شفاعت نصیب ہوجائے۔

—(((الحمد للہ)))—

Marfat.com

اقصیٰ سے پہلے آسمان تک

دراصل پہلا حصہ زمین سے زمین تک سفر کا ہے۔ دوسرا حصہ زمین سے آسمان اور آسمانوں سے بھی آگے سدرۃ المنتہیٰ تک کا ہے۔ بیت المقدس جسے مسجدِ اقصیٰ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں پر نبیوں سے ملاقات اور نماز و امامت کے بعد آسمانوں کی طرف روانگی ہوئی۔ وہاں ایک شاندار سیڑھی تن دی گئی۔

یہاں ایک مقام ہے جسے قبۃ الصخرۃ[14] یعنی پتھروں کا گنبد کہا جاتا ہے۔ وہاں سے آپؐ سوئے آسمان روانہ ہوئے۔ اس جگہ آپؐ نے قدموں کے نشان چھوڑے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑے تھے۔ حج کی سعادت حاصل کرنے والے حجاجِ اکرام مقامِ ابراہیم کی زیارت سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں "میں نے اس[15] سیڑھی سے بہتر کبھی کوئی چیز نہیں دیکھی اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف مرنے والے موت کے وقت ٹکٹکی لگا کر دیکھتے ہیں۔ معراج عربی میں سیڑھی کو کہتے ہیں۔ اسی لیے اس سفر کو معراج کہا گیا۔

یہاں بھی جبریلؑ آپؐ کے ساتھ عازمِ سفر تھے۔ بعض روایات کے مطابق جبریلؑ نے آپؐ سرکار کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے، مگر خلافِ قیاس نہیں۔ کسی بھی نئے اور اجنبی سفر کے لیے انسان کو کسی نہ کسی راہنما (Guide) کی ضرورت ہوتی ہے، یقیناً نئے سفر کی نئی چیزوں کو جاننے اور نئی باتوں کو سمجھنے کے لیے کسی جاننے والے کی ضرورت تھی جبریلؑ اس کام کے لیے اللہ کے حکم سے مقرر تھے۔ بلاشبہ جبریلؑ نے ان سفری ضرورتوں کو خوب نبھایا۔

آسمانِ اول:

اقصیٰ سے چل کر آسمانِ اول پر پہلی منزل ہوئی۔ جبریل کی معیت میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم آسمانِ اول کے دروازے پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ اس دروازے کا نام "باب الحفظہ" یعنی

نگہبانوں (Guards) کا دروازہ تھا۔ یہاں پر موجود گارڈ کمانڈر کا نام "اسماعیل"[16] تھا جو فرشتوں میں سے تھا۔ اس کے زیرِ کمان بارہ ہزار کمانڈر تھے۔ ان بارہ ہزار کمانڈروں میں ہر ایک کے زیرِ کمان بارہ ہزار فرشتے تھے۔ یوں اسماعیلؑ کے زیرِ کمان کل فورسز کی تعداد تقریباً دو کروڑ چالیس لاکھ تھی۔

قارئین!! اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کا اندازہ لگائیے کہ نظامِ کائنات کیسا عظیم الشان ہوگا۔ اتنی بھاری فورس صرف ایک دروازے کی محافظ گارڈ ہے۔ نظامہائے دنیا و آخرت کے لیے کیسی کیسی افواج ہوں گی۔

حضور سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں: "پروردگار[17] عالم کے اس لشکر کو میرے سوا کسی اور انسان نے نہیں دیکھا۔" دستک دینے پر اسماعیلؑ نے پوچھا: اے جبریلؑ یہ کون ہیں؟ جبریلؑ نے کہا: "محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں"۔ اُس نے پوچھا کیا بلوائے گئے ہیں۔ جبریلؑ نے جواب دیا: "ہاں" اس نے خوشی سے دروازہ کھول دیا اور گرمجوشی سے استقبال کیا۔ وہاں پر موجود تمام فرشتوں سے حضور انور ﷺ کا تعارف کروایا گیا۔ اسماعیلؑ اور اس کی محافظ گارڈ سے ملنے کے بعد آپ آگے بڑھے تو اور فرشتے بھی استقبال کے لیے کھڑے تھے جن کے نام تو روایات میں موجود نہیں۔ ہر فرشتے کا ہنس ہنس کر ملنا اچھی بات کرنا اور دعا دینا متفق علیہ ہے۔

آدم علیہ السلام:

آپؐ یوں ملتے ملاتے سلام دعا کرتے آگے بڑھ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک انسانی شکل کے بزرگ بیٹھے ہیں۔ ان کے دائیں اور بائیں سے بہت سی انسانی روحیں گزر رہی ہیں۔ وہ دائیں دیکھ کر ہنستے اور بائیں دیکھ کر رو دیتے ہیں۔ عجیب ماجرا ہے۔ پوچھا جبریلؑ یہ حضرت کون ہیں؟ جواب ملا حضورؐ یہ آپ کے جدِّ امجد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ پوچھا یہ ماجرا کیا ہے؟ جواب ملا ان کے دائیں سے نیک روحیں گزاری جاتیں ہیں تو ہنس کر کہتے ہیں۔ نیک روح ہے جو نیک جسم سے نکلی، مگر بائیں سے گزرنے والی بدکردار اور گناہ گار ارواح ہیں۔ انھیں دیکھ کر دکھ محسوس کر کے رو دیتے ہیں اور کہتے ہیں خبیث روح ہے جو خبیث جسم سے نکلی۔

اللہ کی راہ میں لڑنے والے:

اس کے بعد دیکھا ایک جگہ بہت سے لوگ فصل کاٹ رہے ہیں حیرانی کی بات تھی کہ جتنی فصل کٹ جاتی، اتنی پھر اُگ آتی۔ پوچھا جبریلؑ یہ کون لوگ؟ جواب ملا یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی

Marfat.com

راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرتے رہے۔

نماز چھوڑنے والے:

آگے چلے تو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ منظر بڑا عجیب وغریب تھا۔ انسانوں کے سر کچلے جا رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ عرض کیا حضورؐ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی انھیں نماز سے روکے رہی۔

قارئین نماز مومن کی پہچان ہے۔ مومن اور کافر کے درمیان فرق کرنے والی چیز ہے۔ اقرارِ حق کے بعد اہم ترین فرض ہے۔ بندے اور خالق کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے۔ مومن پر خالق کا انعام ہے کہ اس نے ایک عام آدمی کو نماز کے ذریعے اپنے آپ سے ہمکلام کر لیا۔ اس لیے اسے مومن کی معراج کہا گیا۔ یہ جنت کی چابی ہے۔ قبر میں کیے جانے والے سوالوں میں سے ایک سوال ہے۔ یہ کسی حالت میں معاف نہیں ماسوا جنون یا بیہوشی کے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یہ معراج النبی ﷺ کے تحفوں میں سے ایک تحفہ ہے۔ اس کی ادائیگی نہ تو مشکل ہے اور نہ ہی ناممکن۔ انسان کو اللہ نے مشکل کو آسان اور ناممکن کو ممکن بنانے کے وصف سے نوازا ہے۔ پھر انسان اسے مشکل اور ناممکن کیوں بنا لیتا ہے۔ اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی ترجیحات بدل لیں۔ خالق کی عظمت دل سے نکال دی۔ نبیؐ کی محبت سے دل ناآشنا ہو گیا اور اللہ سے ہمکلامی کی اہمیت کھو بیٹھا، ورنہ نماز کا قائم کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اللہ ہم سب کو اپنے ہدایت یافتہ تابع فرمان بندے بنائے ''آمین''۔

زکوۃ نہ دینے والے:

بعد ازاں ایسے لوگوں پر نظر پڑی جن کے کپڑوں کو پیوند لگے ہوئے تھے اور جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا یہ کون؟ عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے مال سے زکوۃ اور خیرات سے مال کم ہونے کا ڈر تھا۔

امانتیں ہڑپ کرنے والے:

اس سے آگے ایک ایسا شخص دیکھا جو لکڑیوں کا ایک گٹھا باندھ کر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر گٹھا اٹھتا نہیں۔ وہ بجائے کم کرنے کے اور ڈال لیتا ہے۔ فرمایا جبریلؑ یہ احمق کون ہے۔ جواب

آیا یہ وہ آدمی ہے جو ذمہ داریوں اور امانتوں کا زیادہ بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھا، لیکن یہ کم کرنے کے بجائے اپنا بوجھ بڑھاتا چلا گیا۔

فتنہ پرداز مقرر:

اس کے بعد تو بڑا ہی عجیب منظر دیکھنے کو ملا۔ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچی سے کترے جا رہے تھے۔ پوچھا یہ کیا؟ عرض کیا یہ وہ مقرر ہیں جن کی زبانوں سے ادا ہونے والے غیر ذمہ دارانہ الفاظ فتنے برپا کر دیا کرتے ہیں۔

یتیموں کا مال کھانے والے:

اس سے آگے چند ایسے لوگ کھڑے تھے جن کے ہونٹ اونٹوں جیسے تھے اور گول پتھروں جیسے انگارے ہاتھوں میں تھے۔ ان انگاروں کو نگل رہے تھے اور انگارے نگلتے ہی ان کی پشتوں سے باہر نکل جاتے۔ کہا جبریلؑ یہ کیا چیز ہیں؟ عرض کیا یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں پر ظلم کرتے اور ان کے مال کھا جاتے ہیں۔

سود کھانے والے:

ان سے چند قدم کے فاصلے پر ایسے لوگ پھر رہے تھے جن کے پیٹ بڑھے ہوئے اور پیٹوں میں سانپ بھرے ہوئے تھے۔ دوزخ کے عذاب میں دوڑنے والے انھیں روند دیتے، مگر بھاری بھرکم پیٹوں کی وجہ سے ان میں اپنے آپ کو بچانے کی ہمت نہ تھی!! جبریلؑ یہ کون؟ کہا حضورؐ یہ سود خور ہیں۔

فتنہ انگیز بات کرنے والا:

پھر ایک پتھر میں سوراخ ہوا۔ اس میں سے ایک موٹا تازہ بیل نکل آیا۔ نکلنے کے بعد اس بیل نے واپس جانے کی کوشش کی، مگر سوراخ کی تنگی نے اسے واپس جانے سے روکے رکھا۔ جبریل یہ کیا؟ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ اس غیر ذمہ دار شخص کی بدترین مثال ہے جو بغیر سوچے سمجھے فتنہ انگیز بات کر جاتا ہے، بعد ازاں ضمیر کے ستانے پر تلافی کرنا چاہتا ہے، مگر کر نہیں سکتا۔

Marfat.com

الزام لگانے والے:

آگے چند لوگ اپنا گوشت کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ شخصیات کون ہیں؟ فرمایا یہ دوسروں پر طعن وتہمت اور الزام باندھنے والے حضرات ہیں۔

چغل خور:

اپنا گوشت نوچنے والوں کے قریب ہی تانبے کے بڑے بڑے ناخنوں والی شخصیات کھڑی تھیں۔ یہ حضرات اپنے ناخنوں سے اپنا منہ نوچ رہے تھے۔ اے جبریلؑ یہ حضرات؟ عرض کیا یا حضرت! یہ دوسروں کی عزت پر حملہ کرنے والے اور پیٹھ پیچھے برائیاں کرنے والے ہیں۔

زانی مرد وخواتین:

چغل خوروں کے بعد چند اور احمق مرد وخواتین نظر پڑے۔ ان کے ایک طرف تازہ گوشت پڑا تھا اور دوسری طرف باسی و بدبودار گوشت بدبو افشانی کر رہا تھا۔ وہ احمقین تازہ گوشت چھوڑ کر متعفن اور باسی بڑے مزے مزے سے کھا رہے تھے۔ سوال کیا یا جبریلؑ یہ کیا؟ کہا یہ وہ مرد اور زنانیاں ہیں جنھوں نے منکوحہ وحلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے ہوئے غیر منکوحہ عورتوں اور مردوں سے حرام کاری کی۔

حرام زادے پیدا کرنے والی عورتیں:

اب کہ ایسی پردہ دار نظر[18] آئیں جن کی چھاتیاں سنبوں میں پرو کر لٹکا دیا گیا تھا (قارئین پردہ دار کہنے پر فتویٰ نہ آجائے عورت کے لیے پردہ اسلام میں واجب ہے، لیکن بیان کردہ واقعہ بھی پردہ داروں کا ہی ہے) دریافت کیا یہ کیا معاملہ ہے؟ کہا حضورؐ یہ وہ معزز پردہ دار ہیں جن کے شوہران پر اعتماد کرتے رہے، مگر ان معزز بیگمات نے ایسے بیٹے پیدا کئے جو شوہروں کے علاوہ غیروں کے تھے۔ اس کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کا غضب اس عورت پر بہت سخت ہوگیا۔ جس نے کسی خاندان میں ایسے بچے کو داخل کر دیا جو کسی غیر کے نطفے سے پیدا ہوا یعنی اپنے اصل شوہر کا نہ تھا اور پھر اس بچے نے اس خاندان کا مال معیشت کھا لیا اور وارث بن گیا۔ ان کی چیزیں دیکھ لیں یعنی محرم ہوگیا۔''

Marfat.com

دوزخ کا داروغہ:

غالب خیال یہی ہے کہ یہ تمام مشاہدایت تمثیلی قسم کے تھے۔ ان کی تفصیلات دیکھتے دیکھتے ایک فرشتہ سے ملاقات ہوئی جو تمام فرشتوں کے مزاج کے خلاف نہ مسکرایا اور نہ ہی اس کے چہرے پر تھی وہ قدرے ترش روئی سے پیش آیا۔ باتیں تو اس نے بھی اپنائیت کے انداز میں کیں، مگر چہرے مُہرے اور خدوخال سے خشک مزاجی مترشح تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خشک مزاجی کا سبب دریافت کیا۔ تو پتا چلا کہ یہ تو دوزخ کے منتظم ہیں جن کا نام "مالک" ہے۔

جبریل علیہ السلام نے تفصیلات میں بتایا کہ اس نے آج تک کسی سے خوش روئی سے بات نہیں کی اور نہ ہی آئندہ کسی سے کرے گا۔ یہ سن کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوزخ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جبریل نے کہا "مالک" محمد ﷺ دوزخ دیکھنا چاہتے ہیں۔" فرمایا اس کے بعد تو اس نے دوزخ کا ڈھکنا اٹھادیا اور کیا دیکھا کہ دوزخ جوش میں ابل رہا ہے اور شعلے انتہائی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ حضورؐ فرماتے ہیں مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے جو کچھ دیکھا ہے سب کچھ دوزخ کی لپیٹ میں آجائے گا۔ آپؐ نے جبریلؑ سے کہا مالک کو حکم دو کہ بند کر دے۔ اس نے دوزخ سے کہا خاموش ہو جا اور وہ خاموش ہو گیا۔ شعلے جہاں سے نکلے تھے، وہیں ختم ہو گئے اور "مالک" نے وہی ڈھکنا رکھ دیا جو اٹھایا تھا۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

پہلے آسمان سے سدرۃ المنتہیٰ تک

مذکورہ بالا نظارے پہلے آسمان کے تھے۔ ابھی تو ابتدائے عشق تھا۔ انتہائی نظاروں کا دیکھنا باقی تھا۔ بہرحال سفر جاری تھا پہلے آسمان کے بعد آپ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں بھی محافظ فوج نے استقبال کیا۔ تعداد ان کی بھی پہلے آسمان جتنی تھی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے سپہ سالار نے جبریلؑ سے [19] پوچھا، ساتھ کون؟ جبریلؑ نے کہا محمدﷺ ہیں۔ اس نے مزید پوچھا کہ کیا کیا بلوائے گئے ہیں۔ جواب ملا: ''ہاں'' تب اس نے اندر آنے کی اجازت دی۔ سلام دعا تعارف اور علیک سلیک ہوئی۔

(Security) محافظ افواج [20] سے ملنے کے بعد آپ آگے بڑھے۔ ایک جگہ حضرت عیسیٰ بن مریم اور یحییٰ بن ذکریا علیہ السلام بیٹھے تھے ۔ یاد رہے یہ دونوں نبی سگے خالہ زاد تھے۔ ان سے سلام دعا کے بعد آپ نے جبریلؑ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں: جواب آیا یہ آپ کے بھائی یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

تیسرے آسمان پر:

یہاں بھی محافظ افواج کے سپہ سالار نے شناخت کے بعد دروازہ کھولا اور خوش آمدید کے ساتھ اندر بلایا۔

یہاں ایک انتہائی خوبصورت شخصیت بیٹھی تھی۔ ان کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح صاف وشفاف اور منور تھا۔ پوچھا جبریلؑ یہ کون؟ (قارئین یہ بھلا کون ہو سکتے تھے؟ جی ہاں! یہ یوسف علیہ السلام ہی تھے) جبریل نے عرض کیا یہ یوسف بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ ہیں۔

چوتھے آسمان پر:

پھر شناخت اور استقبال کے بعد آپ آسمانِ چہارم پر پہنچے تو وہاں حضرت ادریس علیہ

Marfat.com

السلام سے ملاقات ہوگئی۔ راوی[21] مزید لکھتا ہے کہ نبیؐ نے فرمایا یہ جو قرآن میں ''وَرَفَعْنَا مَكَانًا عَلِيًّا'' یعنی ہم نے اسے بلند مقام پر بٹھایا، اس سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام کا ہی رتبہ اور مقام ہے جو انھیں چوتھے آسمان پر بٹھا دیا گیا۔''

پانچویں آسمان پر:

پانچویں آسمان پر آپ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک درمیانی عمر کا شخص بیٹھا ہے۔ حضور علیہ السلام نے درمیانی عمر کا اتنا خوبصورت آدمی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سر پر سفید عمامہ، سفید داڑھی اور سرخ و سفید چہرے کا سفید عمامہ اور سفید داڑھی مبارک سے کیا خوبصورت ملاپ (Contrast) تھا۔ دریافت کیا: یہ کون؟ کہا یہ اپنی قوم کے محبوب ہارونؑ بن عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہیں۔

قارئین یاد رہے ہر آسمان پر فرشتوں کی محافظ گارڈ ایک ہی تعداد میں استقبال کرتی رہی۔

چھٹے آسمان پر:

شناخت اور تصدیق کے بعد آپ چھٹے آسمان میں داخل ہوئے تو وہاں تو ایک بلند قامت بڑی بڑی آنکھوں اور گندمی رنگ والے شخص کو پایا۔ پوچھا: یہ کون؟ جواب آیا: یہ آپ کے بھائی حضرت موسیٰ بن عمران ہیں۔ یاد رہے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں سگے بھائی تھے۔ دونوں ہی نبی تھے، مگر صاحب شریعت و کتاب صرف موسیٰ ہی تھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام شریعت موسوی کے مقلد تھے۔ موسیٰ علیہ السلام پر ''تورات'' اتاری گئی۔

ساتویں آسمان پر:

یہاں بھی تصدیق کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ تصدیق اور تعارف کے بعد آپ آگے بڑھے تو ایک جگہ درمیانی عمر کا ایک انتہائی ذی وقار و ذی وجاہت شخص بیت المعمور کے سامنے انتہائی پروقار انداز میں ایک کرسی پر براجمان تھا۔

قارئین بیت عربی میں گھر کو کہتے ہیں اور معمور کا لفظ عظیم الشان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ بیت المعمور کے معنی عظیم الشان گھر کے ہوئے۔ جس طرح حرم کعبہ کو بیت اللہ یعنی اللہ کا گھر کہا جاتا ہے۔ کائنات ارضی پر یہ سب سے عظمت والی جگہ ہے۔ یہاں انسان اور نہ جانے

Marfat.com

کتنی زمینی مخلوقات روزانہ طواف وزیارت وعبادت کرتی ہیں۔ اسلامی اصول وشریعت کے مطابق اس کی زیارت کرنے والوں کا فریضہ حج ادا ہو جاتا ہے۔ اسلام میں یہ فرض عبادت ہے اور دین اور اہم رکن ہے۔ ثواب کے لحاظ سے یہ تمام عبادتوں سے افضل ہے بالکل اسی طرح آسمانوں پر بیت المعمور ہے جہاں آسمانی مخلوقات یعنی فرشتے طواف وعبادت کرتے ہیں۔ روایات میں ہے، یہاں سے روزانہ ستر ہزار فرشتے عبادت کی غرض سے آتے جاتے ہیں اور جو فرشتہ یہاں سے ایک دفعہ گزر جاتا ہے، قیامت تک پھر اس کی باری نہیں آئے گی۔

بیت المعمور کے سامنے جو حضرت براجمان تھے، ان کے متعلق پوچھا: ''اے جبریل یہ حضرت کون ہیں؟'' عرض کیا اے اللہ کے نبیؐ یہ آپ کے پردادا حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام ہیں۔''

حضور ﷺ فرماتے ہیں[22]: ''تمھارے محمدؐ سے قریب ترین مشابہت ان سے زیادہ کوئی اور نہیں رکھتا۔''

چونکہ تعمیر کعبہ حضرت ابراہیم اور ان کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کے ہاتھوں ہوئی، شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں آسمانی بیت اللہ کے سامنے بیٹھنے کا اعزاز بخشا۔ ویسے بھی یہ کہا جاتا ہے کہ بیت اللہ سے نوے ڈگری پر یعنی عین خانہ کعبہ کے اوپر آسمان پر بیت المعمور واقع ہے۔ ہر حالت اور ہر گھڑی فرشتے آسمانوں سے بیت اللہ پر اترتے رہتے ہیں۔

سدرۃ المنتہیٰ:

آسمانوں سے آگے مزید ارتقاء جاری تھا۔ اب آپؐ سفرِ معراج کی آخری منزل سدرۃ المنتہیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ وہ مقام ہے جو خالق ومخلوق کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کلی مجہولِ مطلق ہے (Absolutely Unknown) اس کو اللہ کی ذات کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ سادہ الفاظ میں یہی کہنا کافی ہے کہ یہ پیش گاہِ ربِ عرش العظیم ہے۔ یہاں تک مخلوقات کے علوم ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سے آگے جو بھی ہے، وہ سربستہ راز ہے۔ اس سے آگے کا علم نہ کسی فرشتے کو بتایا گیا اور نہ ہی کسی نبی کے ذہن میں ڈالا گیا۔ احکامات کی بجا آوری کے سلسلہ میں نیچے سے جو کچھ جاتا ہے، وہ یہاں وصول کر لیا جاتا ہے اور اللہ کی طرف سے دیے جانے والے احکامات یہاں سے جاری کر دیے جاتے ہیں۔

Marfat.com

جنت کی سیر:

جنت ایک تصور نہیں، اخروی حقائق میں سے ایک حقیقت ہے۔ یہ صرف مومنین وصالحین کے لیے ہے۔ اس پر ایمان لانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا توحید و رسالت اور فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ کے فضل و رحمت سے تمام مسلمین اس کے نظاروں سے مستفید ہونے والے ہیں۔

سدرۃ المنتہیٰ کے قریب سے آپؐ کو جنت کا نظارہ دکھایا گیا۔ سیر کرتے کرتے آپ نے ایک جگہ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی دیکھی جسے ہم اپنی رومانوی زبان میں "حور" کہتے ہیں۔ رسالتمآب ﷺ نے اس حور سے پوچھا: "وہ کون ہے؟" اس نے جواب دیا: "میں زیدؓ بن حارثہ کی لونڈی ہوں۔ آپؐ نے واپسی پر زیدؓ کو یہ خوش خبری سنا دی۔"

قارئین جنت کا ذکر بڑا دلچسپ اور رومانوی ہے۔ اس کی تفصیلات کا بیان انتہائی خوبصورت بیان ہے جسے علما اکرام مزے مزے سے بیان کرتے ہیں اور سننے والے مسحور کن انداز میں سنتے ہیں۔ کچھ مستغرقین نما مسلمان اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ علما حضرات جنت کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور نوجوانوں میں رومانوی ہلچل مچا دیتے ہیں۔ خیر ہر بندے کا اپنا اندازِ فکر ہے، لیکن میرے خیال میں جنت ایسی جگہ ہے جس کی خوبصورتی، جس کے حُسن، جس کے نظارے، جس کے رومانوں کو لفظوں میں تراشنا، جملوں میں سجانا، ترکیبوں، تلمیحوں سے حلاوت آگیں بنانا ممکن نہیں۔

کسی چیز کا بڑھا چڑھا کر بیان کرنا تو وہ ہوتا ہے جو اصل سے زیادہ بیان کیا جائے۔ جو بیان اصل سے عشرِ عشیر بھی نہ ہو، اس کا بڑھانا چڑھانا چہ معنی دارد۔ بس کچھ لوگوں کا تو وتیرہ ہی یہی ہے کہ اپنی برائیوں، کوتاہیوں اور تقصیروں پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسروں میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں۔ علماء کرام چونکہ ان کو سیدھی راہ کی طرف بلاتے رہتے ہیں، اس لیے وہ ان کی بات بات پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔

بہرحال جنت کے حسن و زیبائش، عشق و رومان، رنگ و لذائذ کا بیان کرنا یقین و ایمان کی دلیل اور نیکی کا باعث ہے اس کے بیان سے دلوں کو خوشی اور ایمان کی تازگی ملتی ہے، اس کو الفاظ کی حریری و اطلسی چادریں لپیٹ کر خوب مزے مزے سے بیان کرنا چاہیے تاکہ سننے والے کے دل میں اس کا حصول جنون کی حد تک بڑھ جائے اور وہ اس کے حصول کے لیے اللہ اور رسول کی محبت

میں پاگل ہو جائے۔ رہا مسئلہ باتیں بنانے والوں، ان کا تو کام ہی یہی ہے انھیں اپنا کام کرنے دو۔ تم اپنا کام کرتے رہو۔ ان کے کام کا صلہ ان کے لیے، تمھارے کام کا صلہ تمھارے لیے۔ ایک بات تمام کے تمام مسلمان بھائی یاد رکھیں۔ جنت کی ساری کی ساری تصویر کشی بذریعہ قرآن ہوئی یا پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بیان ہوئی، اس لیے اس کے بیان پر سر دھننا ایمان کی علامت اور اس کے بیان سے کراہت محسوس کرنا غربتِ ایمان کی علامت ہے۔ اس لیے احتیاط ضروری ہے۔ ویسے میں کوئی مولوی نہیں ہوں جو مولویوں کی حمایت کرتا پھروں۔ میں تو احتیاطاً اپنے تنقید نگار بھائیوں سے دین کے معاملات میں احتیاط برتنے کی گزارش کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کی تمام امت کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔" آمین۔"

—(((اللہ اکبر)))—

آیئے ذرا موضوع کی طرف!!! سدرۃ عربی میں بیری کے درخت یا بیری نما درخت کو کہتے ہیں اور منتہا انتہا سے ہے اس کے لغوی معنی ہیں انتہائی کنارہ۔ یہ مقام چونکہ زمین و آسمان کے آخری کنارے پہ واقع ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا درخت جو بیری سے مشابہہ ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ زمین و آسمان کے طول و ارض اور وسعتوں سے بھی بڑا ہے۔

چونکہ مخلوقِ خدا اللہ عظیم و برتر کی تجلیات کو براہِ راست دیکھنے کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس لیے خیال یہی ہے یہاں سے نور اور روشنیاں پتوں سے چھن چھن کر آتی ہیں۔

مثال کے طور پر گرمیوں کی دھوپ میں کھڑے ہو کر دھوپ کو برداشت کرنا کتنا کٹھن ہوتا ہے جبکہ کسی گھنے درخت کے سائے میں چلے جانے سے سورج کی تلخ دھوپ بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہے، ورنہ اللہ کا نور تو اللہ کا نور ہے۔ بنی اسرائیل نے اللہ کے نور کو دیکھنے کی ضد کی۔ اللہ نے منع فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بار بار درخواست کرنے پر معمولی سی روشنی ڈالی تو پوری کی پوری بنی اسرائیلی قوم ایک جھلک نہ دیکھ سکی۔ بے ہوش ہو گئی۔

بہر حال جبریلِ امین[23] سدرۃ المنتہیٰ سے پہلے ٹھہر گئے۔ انھوں نے عرض کیا: "مجھ میں اس سے آگے جانے کی سکت نہیں۔"

سرکار دو عالم ﷺ آگے بڑھے تو ایک اور بلند مقام تھا۔ یہاں طالب و مطلوب آمنے سامنے تھے۔ یہاں آپؐ سے گفتار و کلام[24] ہوا۔

قارئین خدا سے ملاقات کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ ہمیں اس اختلاف سے سروکار نہیں۔ ہمارا تعلق تو فضائلِ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ ویسے بھی اللہ سے ملاقات

Marfat.com

والی روایت بیان کرنے سے اللہ کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اللہ تو اللہ ہے اور نبی نبی ہے اور وہ اللہ کا مقرر کیا ہوا۔ ملاقات ہوئی یا نہیں۔ اس کے تسلیم کرنے یا نہ تسلیم کرنے سے ایمان و یقین میں فرق کا اندیشہ نہیں، سو ہم نے بھی حضورؐ کی فضیلت والی روایت کی پیروی کی۔ اللہ کمی بیشی معاف فرمائے۔

دراصل سرکار دو عالم ﷺ کو یہ اعزاز اس لیے بخشا گیا کہ آپؐ کو عنقریب حرم کعبہ کو خدا حافظ کہنا تھا۔ اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا تھا۔ اس کے رسولؐ نے اس کی واحدانیت کی خاطر کتنے مصائب جھیلے۔ ان کے خاندان تک نے انھیں ترک دیا۔ کس غم واندوہ اور کسمپرسی میں بسر اوقات کررہے ہیں۔ شدائد کے گھپ اندھیرے ان کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ یہ موقع ایک طرح سے تسلی وتشفی اور دلجوئی کے لیے فراہم کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہمت بڑھانے کے لیے یہ بتانا مقصود تھا کہ آپؐ سے پہلے بھی ایسے نبی گزر چکے ہیں جنھوں نے بڑے 25 بڑے مصائب دیکھے۔ بعض نے تو اپنی جانیں تک قربان کردیں۔ اکثر و بیشتر نے اپنا مال و متاع اور عزیز واقارب چھوڑ چھاڑ کر اپنے چند پیروکاروں کے ساتھ خدا کی راہ میں ہجرت کی۔ اب آپؐ کو بھی ہجرت کرکے مدینہ جانا ہے۔ اس لیے پرانی یعنی مکی زندگی کی تکالیف پر دلجوئی اور آئندہ مدنی زندگی کے لیے ایک لائحہ عمل دیا گیا۔

جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے ہجرت کی، اسی طرح آپؐ کو بھی صحابہ اکرامؓ کے ساتھ مکہ سے ہجرت کرنا تھی۔ شاید پیغمبروں کے ساتھ ملوانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ ارادوں میں مزید مستقل مزاجی اور پائیداری کو پختہ کیا جائے تا کہ آئندہ پیش آنے والی سیاسی سماجی معاشی اور ریاستی ذمہ داریوں کو مستقل مزاجی سے نبھا سکیں۔

ریاستی امور کے لیے چند نئے احکام دیے گئے جن کو آپؐ نے انسانیت تک عملی حالت میں پہنچانا تھا۔ یہ احکام سب سے پہلی اسلامی ریاست وحکومت کے لیے بنیادی و اساسی دستور کی حیثیت رکھتے تھے۔

جس طرح پاکستانی آئین میں قرارداد مقاصد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گو قانون سازی کرتے وقت کسی پاکستانی حکومت نے اس بنیادی مقصد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قانون کی اساسی شقوں کو نہ صرف عملی طور پر نافذ کیا، بلکہ اس اساسی دستور کو مدنظر رکھتے ہوئے پوری کی پوری قانون سازی کی۔ ہمارے خیال کے مطابق خدا کی طرف سے یہی آپ کی ذمہ داری تھی جو آپؐ نے کماحقہ، نبھائی۔ ان احکام کا خاکہ

Marfat.com

حسب ذیل ہے:

1۔ ہر روز پچاس نمازیں فرض ہوئیں جن کی تخفیف[26] ہوتے ہوتے یہ پانچ رہ گئیں۔
سورۃ بقرہ کی آخری دو آیات تعلیم کی گئیں بعض مفسرین کے بقول یہ دونوں آیات[27] ایمان کا حصہ ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ آیت اول:

آیت نمبر 284 ''رسول اللہ ﷺ اور مومنین ان آیات پر ایمان رکھتے ہیں جو رسول اللہؐ کے رب کی طرف سے ان پر اتاری گئیں۔ ان میں سے ہر ایک ایمان لایا اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ یہ کہتے ہوئے تمام کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے کہ ہم انبیاء کے درمیان ایمانی تفریق نہیں کرتے اور انھوں نے کہا ہم نے آپ کا فرمان سنا اور ہم نے آپ کا حکم مانا۔ ہم تجھ سے بخشش مانگتے ہیں۔ اے ہمارے ربّ مرنے کے بعد تیری طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

آیت دوم آیت نمبر 285

''اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا، مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے جو نیکی جو نفس کرے گا اس کا فائدہ اسی کو ملے گا اور جو بدی کرے گا اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا۔ یعنی تم کہو کہ اے ہمارے ربّ ہم سے مواخذہ نہ کرنا۔ ہم کو سزا نہ دینا اگر ہم یاد نہ رہنے کی وجہ سے کسی واجب کو ترک کر دیں یا بے پروائی کی وجہ سے کسی کام کو درست طور پر نہ کر پائیں۔ اے ہمارے رب نہ لاد ہم پر بھاری بوجھ۔ جیسا کہ تو نے ہم سے پہلوں پر لاد دیا تھا۔ اے ہمارے رب اور ہم پر نہ ڈال ایسا بار جس کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہمارے گناہوں کی سزا سے درگزر فرما اور ہمارے گناہوں پر پردہ ڈال دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا رب ہے، لہٰذا ہمیں کو کافر قوم پر فتح یاب کر۔''

قارئین یہ آیات مومنین کے لیے معراج کا تحفہ ہیں۔ یہ آیات ہر مسلمان کے دل و دماغ پر نقش ہونی چاہئیں۔ یہ عقائد اور ایمان کا حصہ بھی ہیں اور اپنی زبان و دل سے اقرار بھی۔ ان آیات کی تلاوت اور ورد کے انسانی نفس پر بڑے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان آیات کے الفاظ بڑی اچھی دعا ہیں۔ یہ مفصل بھی ہے اور جامع بھی۔

2۔ شرک کے سوا تمام گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔[28]

3۔ نیکی کا ارادہ کرنے پر ایک نیکی اور نیکی کرنے پر دس کا ثواب دینے کا مژدہ سنایا گیا، برعکس اس کے گناہ کے ارادے پر قدغن نہیں لگی، جب تک گناہ سرزد نہ ہو جائے۔

4۔ والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم ہوا اور دوسروں اعزہ کے ساتھ صلہ رحمی کی تلقین

ہوئی۔

5- غریبوں، مسکینوں، پناہ گزینوں اور مسافروں کی دستگیری کرنے کا حکم ملا۔

6- فضول خرچی اور اسراف سے پرہیز کرنے کی وعید سنائی گئی۔ کنجوسی سے بچنے کو کہا گیا۔

7- زنا سے سخت ممانعت کی گئی۔

8- انسانی جان کے قتل سے روک دیا گیا۔ ماسوا شرعی حق کے۔

9- یتیموں اور دوسرے انسانوں سے غصب کئے ہوئے مال کو حرام ٹھہرایا گیا۔

10- ناپ تول میں ایمانداری اختیار کرنے کا حکم ملا۔

11- تکبر اور غرور سے نفرت کا حکم ملا۔

12- خلاف عقل کاموں سے پرہیز اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔

ان احکام کے ساتھ ہی ملاقات کا سلسلہ ختم کر دیا گیا اور یہ سلسلہ ایسا ختم ہوا کہ قیامت تک کوئی بھی انسان اس شرف سے باریاب نہ ہو سکے گا۔

---(((الحمد للہ)))---

Marfat.com

سفرِ معراج سے واپسی

بارگاہ رب العزت سے ملاقات کے بعد واپسی کا مرحلہ شروع ہوا۔ آپؐ احکام کی وصولی کے ساتھ نیچے اترے تو چھٹے آسمان پر موسیٰ علیہ السلام سے دوبارہ سلام دعا ہوئی۔ انھوں نے معراج کی روداد پوچھی آپؐ نے تفصیلات بتائیں تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا باقی سب ٹھیک ہے۔ نمازوں کے معاملہ میں میرے سامنے میری قوم بنواسرائیل کا تلخ تجربہ 29 موجود ہے۔ نماز بڑی بوجھل (نعوذ باللہ) چیز ہے۔ آپؐ کی امت یہ ذمہ داری بجا طور پر نبھانے سے قاصر رہے گی واپس جائیے اور ان میں کمی کی گزارش کیجئے۔ نبی اکرمؐ نے واپس جا کر ان میں کمی کی درخواست کی تو دس کم ہوگئیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو انھوں نے پھر وہی بات دہرائی۔ حضورؐ نے پھر درخواست کی تو دس اور کم ہوگئیں، حتیٰ کہ بار بار درخواست کرنے پر تخفیف ہوتے ہوتے پانچ کی فرضیت واجب ہوگئی، مگر ثواب پچاس کے برابر رہا۔

موسیٰ علیہ السلام نے مزید التماس کے لیے کہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا، اب مجھے شرم آتی ہے۔ اب میں نہیں جاؤں گا۔

قارئین!! منکرینِ حدیث معراج یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اگر پانچ کا ثواب پچاس کے برابر دینا تھا تو بار بار بلوا کے سودے بازی کی کیا ضرورت تھی۔ دراصل شقی القلب لوگوں کے شکوک دور کرنا کافی پیچیدہ معاملہ ہے۔ یہ اللہ اور اس کے لاڈلے رسول کا معاملہ تھا۔ ہمارے خیال میں اللہ کے ساتھ یہ ایمان اور یقین رکھنا کہ اس کو کائنات کی تخلیق سے پہلے قیامت تک ہونے والے ایک ایک واقعہ کا علم ہے اللہ کے اس علم پر یقین رکھنا انسان کے اپنے یقین و ایمان کا حصہ ہے، اس لیے رسول اللہ کی ہر بات کو من وعن قبول کیا جانا ہی اصل ایمان ہے۔

رہا مسئلہ اعتراض کرنے والوں کا تو ان کا مقصد اعتراضات کے ذریعے ایمان کی تجدید یا تقویت نہیں، بلکہ ان کا مقصد تو صرف اور صرف اسلام کی حقانیت کو اعتراضات کے پردے میں لپیٹنا ہوتا ہے تاکہ کمزور عقیدہ لوگ ابہام کا شکار ہو کر اسلام سے دور ہو جائیں۔

Marfat.com

ان لوگوں کی تسلی کے لیے عرض کردینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح فرمایا کہ "میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔" اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ زندگی کے جو مقاصد ہم نے استوار کر رکھے ہیں، اللہ کے ہاں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ خدا کی عطاؤں کا بدل تو شاید یہی ہو کہ انسان ہمہ وقت ہر سانس، ہر لحہ اللہ کی مرضی کے مطابق سرنگوں رہے۔ اس کی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینا ہی شکرانِ نعمت ہے۔ مگر اللہ تو اللہ ہے۔ وہ خالق ہے۔ مخلوقات تخلیق کرنے والا تخلیق کار کی حیثیت سے اپنی مخلوق کی بنیادی کمزوریوں کو خوب جاننے والا ہے۔ ان کمزوریوں کی وجہ سے رحم کرتے ہوئے اس نے واضح کردیا ہے کہ اگر تمھارے اوپر پچاس نمازوں کی ذمہ داری ڈال دی جاتی تو تم کیا کرتے۔ یہ تمھارے اوپر تمھارے پیغمبرؐ کے ذریعے احسان کیا گیا۔ تم صرف پانچ پڑھو۔ میرے پاس ثواب کی کمی نہیں۔ ثواب پچاس کا دوں گا یعنی یہ تھوڑی سی عبادت چوبیس گھنٹے کی عبادت کے برابر ہوگی بشرطے کہ نجی کاموں میں اللہ کی مرضی شامل حال رکھو اور معاشی و معاشرتی معاملات بھی منشاءِ خداوندی کے مطابق ادا کرو۔

اب اس کرم اور مہربانی کا عوض یہی ہے کہ مسلمان پانچ تو خوب دل جمی، باقاعدگی اور خشوع وخضوع سے ادا کریں۔ اللہ ہمیں اپنی اطاعت میں قبول فرمائے۔ متقی پرہیزگار اور نماز قائم کرنے والا بنائے۔ "آمین"

بہرحال بعدازاں اسی سیڑھی کے ذریعہ واپس بیت المقدس لایا گیا۔ وہاں ابھی تمام انبیاء کرام موجود تھے۔ انھیں پھر نماز پڑھائی اور براق پر سوار ہو گئے۔

راستے میں مکہ سے 25 میل دور مقام ضجنان کے قریب ایک مسافر قافلہ سویا ہوا تھا انھوں نے پانی سے بھرا ہوا ایک برتن ڈھانک رکھا تھا۔ آپؐ نے ڈھکنا اٹھایا اور پانی پی لیا۔ اس کے چند ساعت بعد وہ قافلہ بھی مکہ کی طرف چل دیا۔ آپ بھی گھر آ گئے اور براق واپس چلا گیا۔ آپؐ جب گھر پہنچے تو صبح ہو رہی تھی آپؐ کے گھر کے دروازے کی کنڈی بدستور ہل رہی تھی۔

———((الحمد للہ))———

واقعہ معراج کا ذکر اور لوگوں کا ردعمل

گھر میں آپؐ[30] کی ملاقات اُم ہانی سے ہوئی۔ صبح ہو رہی تھی آپؐ نے یہ واقعہ اُم ہانی کو سنایا اور روایتی اہتمام کے مطابق آپؐ سوئے حرم چلنے لگے تو اُم ہانی نے پلو پکڑ کر درخواست کی کہ یہ واقعہ لوگوں کو نہ سنایئے گا۔ یہ واقعہ سن کر مخالفین خوب اچھالیں گے۔ آپؐ کے خلاف بولنے کا موقع مل جائے گا۔

اُم ہانی کی اس بات پر آپؐ یہ کہتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے: ''میں یہ واقعہ ضرور بیان کروں گا۔''

یہ آپؐ کی شخصیت کا اعجاز تھا یا اللہ کے کلام کی تاثیر۔ آپؐ کے سخت مخالفین بھی نئی باتیں سننے کے منتظر رہتے تھے۔ آپؐ حرم شریف میں پہنچے تو سب سے پہلے ابوجہل[31] ملا۔ اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا کوئی نئی بات یا خبر؟'' فرمایا: ''ہاں ہے۔'' پوچھا کیا؟ فرمایا: ''آج رات میں بیت المقدس گیا۔'' حیرانی سے بات اچکتے ہوئے کہنے لگا۔ راتوں رات گئے اور صبح یہاں موجود ہو۔ فرمایا: ''ہاں''۔ کہنے لگا قوم کو بلاؤں۔ ان کے سامنے یہی بات کہو گے فرمایا: ''ضرور کہوں گا۔''

تب ابوجہل نے آوازیں لگا لگا اہل مکہ کو جمع کیا اور کہا لو اب سب کے سامنے وہی بات کہو جو مجھے سنائی۔

آپؐ نے سفرِ معراج کے تمام واقعات اللہ تعالیٰ سے گفتگو اور سولہ احکام کی وصولی تک بیان کر دیے۔

لوگ بڑے مسحور کن انداز میں سنتے رہے۔ مجمع ایسے تھا جیسے واقعات کے تاثر میں کھو گیا ہو۔ تمام لوگوں نے خوب انہماک سے واقعات سنے۔ عوام الناس کے لیے تو یہ ایک اچھی اور نئی خبر تھی۔ یہ نشریہ حسن وخوبصورتی اور واقعاتی تاثر سے بھرپور تھا، مگر مکہ کے چودھریوں کے دلوں پر سانپ لیٹ رہے تھے۔ انھیں اس خبر سے اپنی سرداریاں چھنتی نظر آ رہی تھیں۔ اپنا خاندانی اثر ونفوذ مکہ کی گلیوں میں رُلتا نظر آ رہا تھا۔ ان کی تڑپ قومی یا ملکی نہیں تھی۔ ان کی پریشانی ذاتی اور سیاسی

Marfat.com

تھی، حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ محمد ﷺ جھوٹے نہیں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ محمد ﷺ نے عمر بھر جھوٹ نہیں بولا، لیکن انھیں یہ دکھ تھا کہ رسالت والی پگ محمد ﷺ کے سر پر کیوں ٹکی (نعوذ باللہ) اسی حسد اور بغض نے انھیں نہ دین کا چھوڑا اور نہ دنیا کا۔ وہ دین و دُنیا دونوں سے ہی گئے۔

آپ نے جونہی بات ختم کی، کسی آدمی نے سر پر ہاتھ رکھ لیا اور کوئی مذاق میں تالیاں پیٹنے لگا۔ کوئی کہتا مکہ سے اتنے ہفتوں کا سفر ایک رات کے تہائی حصہ میں کیسے ختم ہو گیا۔ اب پتا چلا محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی دیوانے[32] ہیں (نعوذ باللہ)

واقعہ تو واقعی چونکا دینے والا تھا۔ اس سے پہلے اس قسم کا واقعہ ہوا ہوتا یا کسی نے دیکھا یا سنا ہوتا۔ اس سے قبل تو کسی سائنسدان نے بھی آسمانوں کی تحقیق نہ کی تھی اور مکہ والوں کے پاس تو کوئی سکول یا کالج یا ایسا ادارہ بھی نہ تھا جو انھیں اس علم کی سوجھ بوجھ دے دیتا۔ یہ تو دنیا کا پہلا اور انوکھا واقعہ تھا۔ انھوں نے تو بکریوں، گھوڑوں اور اونٹوں کے سوا کچھ دیکھا بھی نہ تھا۔ مشرکینِ مکہ کی سرداریوں پر تو براہ راست زد پڑ رہی تھی انھوں نے تو ایسا کرنا ہی تھا۔ موجودہ دور کے جدید ٹیکنالوجی سے وابستہ یہودیت کے پروردہ منکرینِ حدیث و سنت بھی اس واقعہ کے عقلی دلائل طلب کر رہے ہیں۔

بہر حال مخالفین نے یہ خبر آناً فاناً پھیلا دی اور کئی کمزور عقیدہ مسلمان[33] بھی گومگو کا شکار ہو گئے۔

حضرت ابوبکرؓ کی تصدیق:

ایک گروہ دوڑتا ہوا حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بھی انکار کر دیں گے اور ان کا انکار تحریکِ اسلامی پر کاری ضرب ثابت ہوگا۔ جب محمد ﷺ کے دستِ راست پھر جائیں گے تو تحریک کی جان میں جان نہیں رہے گی۔ اس لیے انھوں نے خوب نمک مرچ لگا کر واقعہ سنایا۔

حضرت نے تمام واقعات بغور سننے کے بعد پوچھا "کیا یہ[34] واقعی محمد ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔" جواب ملا ہاں ہاں محمد ﷺ ہی نے فرمایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بغیر کسی حیرانی کے کہا: "تو اس میں حیرانی کی کونسی بات ہے۔ میں تو یہ بھی جانتا ہوں رسول اللہؐ کے پاس خدا کی طرف سے اکثر وحی آتی ہے اور میں اس کی روزانہ تصدیق کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر حضرت ابوبکر بھی حرم میں تشریف لے گئے۔ اپنے آقا ﷺ سے دریافت کیا، کیا واقعی ایسا ہوا ہے۔ سرکار مکی و مدنیؐ نے

جواب دیا: ''ہاں واقعی ایسا ہوا ہے۔''

حرم میں تماش بینوں کا مجمع آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم پر پھبتیاں کس رہا تھا۔ کوئی دیوانہ، کوئی سر پھرا (نعوذ باللہ) کوئی کچھ اور کوئی کچھ اور بک رہا تھا۔ لوگ طرح طرح کی چھوڑ رہے تھے۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

حضرت ابوبکرؓ کو ایک منطقی ترکیب سوجھی۔ انھوں نے لچوں لفنگوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے ان کو متوجہ کرتے ہوئے کہا جیسا کہ تم سب لوگ جانتے ہو۔ میں تجارت کی غرض سے بیت المقدس کئی بار جا چکا ہوں۔ ہم ابھی وہاں کی چیزوں کے متعلق پوچھ لیتے ہیں۔ لوگوں کو ترکیب پسند آئی۔

تب حضور ﷺ سے عرض کیا مسجد اقصیٰ کا نقشہ [35] بیان فرما دیجئے۔ آپؐ نے ایک ایک چیز کھول کر بیان کر دی یعنی زبان مبارک نے اقصیٰ کے نقشے کھول کر رکھ دیے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک ایک نقش ایک ایک چیز دیکھ دیکھ کر بیان فرما رہے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کی اس تدبیر سے مخالفین نے چپ سادھ لی۔ سننے کے بعد ان کی زبانوں پر تالے پڑ گئے۔ وہ سب اچھی طرح جانتے تھے کہ محمد ﷺ آج تک اقصیٰ نہیں گئے۔ اس مجمع میں اکثر لوگ ایسے تھے جو کئی بار اقصیٰ دیکھ چکے تھے۔ سو وہ اپنا سا منہ لیکر ایک ایک کر کے کھسک گئے۔ چند لمحے پہلے بڑبڑ کرنے والے اکیلے اکیلے نیویں نیویں ہو کر نکل گئے۔

سننے والوں میں سے کچھ واقعاتی تجسس کے حصار میں پھنس گئے۔ وہ دل سے تو قائل ہو چکے تھے، مگر مزید تصدیق کے لئے چند اور نشانات دریافت کرنے لگے تو آپؐ نے ایک تو سفر کے پہلے مرحلے والا وہ واقعہ بیان فرمایا جس [36] میں ایک قافلے کا اونٹ براق کی آواز سے بدک کر کھو گیا تھا اور قافلہ والے اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ آپؐ نے دیکھا تو اونٹ ان تک پہنچا دیا۔

دوسرا واقعہ مقام ضجنان میں ٹھہرنے والے قافلہ کا بیان کیا۔ ان کے مٹکے سے آپؐ نے پانی پی کر خالی کر دیا تھا۔ اس قافلے کے متعلق مزید فرمایا، اب تک ''مقام بیضا'' کے کوہ تنعیم پر سے اتر چکا ہے۔ اس قافلے کے آگے ایک بھورا سیاہی مائل اونٹ ہے۔ اس کے اوپر دو تھیلے ہیں جن میں سے ایک سیاہ رنگ کا اور دوسرا مختلف رنگوں کا ہے۔

یاد رہے کوہِ تنعیم کے مقام پر آج کل مسجد عائشہ صدیقہ واقع ہے یہ مقام مدینہ کی طرف سے آنے والوں کا میقات ہے اور میقات اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے احرام کی نیت کر کے پاک و صاف ہو کر احرام باندھا جاتا ہے یہ احرام عمرہ کرنے کے بعد اتارا جاتا ہے۔

لوگ سنتے ہی تنعیم کی طرف تصدیق کے لیے دوڑ پڑے۔ یہ جگہ حدودِ حرم میں شامل ہے۔ چنانچہ وہ قافلہ مکہ میں داخل ہو رہا تھا۔

قارئین اونٹ کے گم ہونے کا واقعہ بھی۔ اسی قافلہ کو پیش آیا اور پانی بھی اسی قافلہ کے برتن سے پیا گیا، لہٰذا لوگوں نے یہ دونوں واقعات تصدیق کر لیے اور ایمان لانے یا نہ لانے کے تذبذب میں مبتلا افراد اس تصدیق کے بعد ایمان لے آئے۔

حضرت ابوبکرؓ کے نام کے ساتھ اس دن سے صدیق اکبرؓ کے لقب کا اضافہ کر دیا گیا انھوں نے سنتے ہی کہا تھا کہ اگر یہ بات محمد ﷺ فرماتے ہیں تو بالکل درست ہے، اس لیے اس کے بعد وہ صدیق اکبر یعنی سب سے بڑے تصدیق کرنے والے ہو گئے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں بھی انھیں کی طرح دین کے خادم بنائے۔ ''آمین''

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

اسلام کا پہلا بنیادی دستور یا قراردادِ مقاصد

آسانی کے لیے اس مضمون کو دو حصوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلا حصہ معراج سے پہلے معراج کے فوراً بعد اور معراج کے دوران وصول ہونے والے احکام کی وضاحت پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ بنیادی آئین اور اس کے جائزہ سے متعلق ہے۔

چونکہ اسلام سے پہلے دنیا کے تمام نظام اور مذہبی ضابطے اپنی افادیت کھو چکے تھے۔ پوری دنیا ہوس پرستوں کے ہاتھ میں تھی۔ ہر طرف مارا ماری کا عالم تھا۔ زندگی ظلم، ناانصافی اور سیاسی ہوس پرستی کی فصیل میں قید تھی۔ اسلام کا مقصد چونکہ پوری دنیا کی اصلاح کر کے قیامت تک آنے والی نسلِ انسانی کو راہنما اصول و قوانین مہیا کرنا تھا۔ اس لیے واقعہ معراج سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی پند و نصائح سے نوازا گیا۔ وہ نصیحتیں بھی آگے چل کر جب مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہو گئی تو اسلام کے بنیادی آئین میں شامل ہو گئیں۔ اگرچہ انھیں اخلاقی اصول و ضوابط کے تحت ہی نافذ کیا گیا۔ وہ نصیحتیں عبادات کی شکل میں بھی ہیں اور اخلاق و کردار کو مرتب کرنے کی شکل میں بھی۔ ان کے ذریعے افراد کی انفرادی زندگی بھی ارتقائی منازل طے کرتی رہی اور تمدنی زندگی بھی شاہراہِ ترقی پر آگے بڑھتی رہی، لہٰذا پہلے ہم ان پند و نصائح پر بحث کرتے ہیں بعد میں بنیادی آئین کو زیرِ مطالعہ میں لائیں گے۔

واقعہ معراج کے اگلے دن سے مسلسل دو[37] دن تک حضرت جبرائیلؑ مسلسل تشریف لاتے رہے۔ پنجگانہ نماز کی ترتیب اور اوقات بتاتے رہے۔ پہلے دن نماز کے کم از کم اور دوسرے دن نماز کے زیادہ سے اوقات کی تعلیم کرتے رہے۔

توحید کے بعد نماز اہم ترین فرض ہے۔ اگرچہ فرائض کا اجر انفرادی ہے، مگر اس کے مظاہر معاشرتی زندگی میں اخوت و بھائی چارہ پیدا کرتے ہیں۔

تعصب اور بے راہ روی ختم کرتے ہیں امت کو ذات پات اور اونچ نیچ سے پاک کر کے نظم و ضبط میں لے آتے ہیں اور محمود و ایاز کو ایک صف میں لا کھڑا کر دیتے ہیں۔

واقعہ معراج کے فوراً بعد سورۃ بنی اسرائیل نازل ہوئی۔ اس لیے لوگوں کو معراج کے احکامات کی تعلیم کے ساتھ اس سورۃ میں موجود نصیحتیں بھی بیان فرمائی گئیں۔ تعلیم کی جانے والی پہلی انتالیس آیات ہیں پہلی آیت کے سوا باقی ساری کی ساری عبرت و نصیحت پر مبنی ہیں۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ یعنی "پاک ہے وہ ذات جو لے گیا اپنے بندے کو" کے علاوہ اس سورۃ میں کہیں معراج کا ذکر نہیں۔ اس کے بعد کی آیات میں قومِ بنی اسرائیل کا وہ باب کھلتا ہے جس میں وہ مصریوں کی غلامی سے نکل کر آزادانہ زندگی کے مالک و مختار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا، مگر تاکید صرف یہ تھی کہ تورات سے راہنمائی حاصل کریں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، مگر وہ انقیاد کے بجائے مفسد اور خدا کے سرکش ہو گئے۔ سو پہلے ان پر اہلِ بابل اور پھر مصریوں کو مسلط کر دیا گیا۔

ان آیات کے مخاطب صرف مسلمان ہی نہ تھے، پوری عرب قوم اور بعد ازاں پوری دنیا تھی۔ عرب میں چونکہ یہودی اور عیسائی بھی موجود تھے اس لیے انھیں ان کی اپنی تاریخ سے عبرت دلائی گئی۔ پیش بندی کے طور پر مسلمانوں کی تربیت کی جا رہی تھی۔ یہ کارکنان تحریکِ اسلامی کے لیے تنبیہہ بھی تھی کہ اللہ کے ہر حکم کے لیے کمر ہمت باندھے رکھو۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ہجرت کے لیے تیار رہنے کا اشارہ (Red Alert) بھی تھا اور مسلمانوں کے لیے دنیا و آخرت میں انعامات کی نوید بھی۔

معراج کی ہدایات کے ماخذوں پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ تحریکِ اسلامی عنقریب بہت اہم موڑ مڑنے والی ہے۔ بہت جلد اسلامی ریاست وجود میں آنے والی ہے۔ اس ریاست میں اللہ کے رسولؐ اور اصحابِؓ رسولؐ ہی سب کچھ ہوں گے۔ اس لیے انھیں پیش آمدہ ذمہ داریوں اور حالات کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔

قارئین یہ کسی بھی انقلابی تحریک کا بہت بڑا راز ہے کہ ہر لحہ، ہر گھڑی نظم و ضبط قائم رکھا جائے۔ اچانک واقعات اور ہنگامی حالات بھی تنظیم کو بے ترتیب نہ کر پائیں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہر کارکن کو ربط و فرائض کا علم نہ ہو۔ آئندہ سرانجام دیے جانے والے کاموں (Task) کا پتا نہ ہو۔ یہ ساری کی ساری پیش بندی غیر محسوس انداز سے شاید اسی لیے کی جا رہی تھی۔ اشارے کنائے میں ہر کارکن کو کام بانٹے جا رہے تھے۔ ہر آدمی کو اعمال و کردار کے لحاظ سے خود ذمہ دار قرار دے دیا گیا یعنی اگر وہ سیدھا چلے گا تو اس میں اس کی اپنی بھلائی ہو گی۔

Marfat.com

غلطیاں کرنے پر اپنا ہی نقصان کرے گا۔

سورۃ بقرہ کی آخری دو آیات جو معراج میں تعلیم ہوئیں، ہماری اس بحث کا مفصل اور جامع ثبوت ہیں۔ انفرادی اور شخصی ذمہ داریاں عائد کر کے معاشرے کو مربوط ارتقائی منازل سے شناسا کروادیا گیا۔ یوں ہر فرد رضا کارانہ اپنی ذمہ داریاں (Dutties) نبھانے لگ گیا۔ ہر شخص دوسروں پر تنقید کرنے کی بجائے اپنے اعمال میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ یوسف اور قرآن کے مختلف حصوں میں اقوامِ کہن کے انجام بتا کر تنبیہہ کی گئی کہ جس قوم کے بڑے لوگ فحاشی ناانصافی اور بے حیائی کے دلدادہ ہو گئے، ان سے اقتدار و مراتب چھین لئے گئے۔ انھیں آزادی کے بجائے صدیوں پر محیط قید غلامی میں دے دیا گیا۔

کارکنوں کے لیے یہ بڑے واضح اشارے تھے۔ گو اس وقت صاحبِ ادراک ہی ان اشاروں کو سمجھ سکتے تھے۔ ایسی باتوں نے کارکنوں کو خوش خبریاں بھی دیں اور تنبیہات بھی کیں۔ خوش خبریاں اس طرح کہ بنی اسرئیل کو مصریوں کی قید سے چھڑا کر اقتدار کی مسندوں تک پہنچا دینا خوش تھے۔ چونکہ مسلمان بھی عنقریب ہجرت کر کے مشرکین مکہ کی سازشوں سے محفوظ ہونے والے تھے اور انھیں بھی اقتدار ملنے والا تھا۔ تنبیہات یوں کہ کل جب اقتدار تمھارے پاس ہوگا، دنیا کے سیاہ و سفید کے مالک تم ہو گے، زندگی کے سورج تمھاری مرضی سے طلوع ہوں گے، وقت تم سے پوچھ کر چلے گا، اس وقت کہیں تم بھی پچھلی قوموں کی طرح کفرانِ نعمت نہ کرنا۔ بے حیائی ناانصافی اور ظلم اختیار کر کے خدا کے غضب کے حقدار نہ بن جانا۔ یہ چیزیں بربادی ہی لاتی ہیں۔ تم آج مظلوم ہو۔ اقتدار اور خوش حالی بڑی ظالم چیزیں ہیں۔ یہ خدا کو بھلا دیتی ہیں۔

آج کے مظلوم کل تم ہی ریاستی، معاشرتی اور عدالتی مہروں کو چلانے والے ہو گے۔ اپنے اندر ایسے گھٹیا اور سفلی جذبات و خیالات کو پیدا نہ ہونے دینا۔

اِن تنبیہات کے علاوہ عقیدۂ آخرت کے ذریعہ بھی جنت یا دوزخ کی شکل میں جزا و سزا کی خوش خبریاں اور مایوسیاں تعلیم کی گئیں۔ مسلمانوں میں مستقل مزاجی اور قوت برداشت پیدا کرنے کے لیے تعلیم کیا گیا کہ تمھاری نظر میں شاید دنیا اور اس کی کامیابیاں ہی اہم ہوں۔ اگر یہ سوچ ہے تو پھر سراسر غلطی پر ہو۔ اصل کامیابیاں تو آخرت کی ہیں جہاں تمھیں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب تم ایک ایک سانس اللہ کے احکام کی بجا آوری اور رسول اللہ کی اِتباع میں صرف کرو

Marfat.com

گے۔دنیا پرستوں کی خوشحالی بظاہر خوش حالی ہے۔صرف دنیا کا تصور رکھنا اخلاقی برتری، بلند ظرفی، حیا داری اور انصاف جیسے اوصاف سے محروم کر دیتا ہے۔یوں دنیا بھی بے سکون رہتی ہے اور آخرت بھی۔آخرت کے انجام کو مدنظر رکھ کر چلو گے تو دنیا و آخرت دونوں جہانوں کی کامیابیاں تمھارے قدم بقدم ہوں گی۔آخرت کو بھول گئے تو خدا اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین کو بھی بھول جاؤ گے اور اقوام عاد و ثمود اور بنی اسرائیل کی طرح دونوں جگہ ناکامیاں پاؤ گے۔

یہ تھیں بنیادی دستور یا قرار دادِ مقاصد کے لیے تمہیدی نصیحتیں جنھیں ہجرت کے بعد بنیادی دستور یعنی میثاقِ مدینہ میں شامل کر لیا گیا۔اس لیے ہم معراج شریف میں وصول ہونے والے احکام کے ساتھ ساتھ بعد میں ملنے والے احکامات کو بھی بنیادی آئین میں بحث کریں گے۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

جائزہ بنیادی دستور

آیئے اسلامی دستور کے بنیادی نکات کا جائزہ ہو جائے جن پر آئندہ اسلامی ریاست کو استوار ہونا تھا۔ یہ نکات دراصل وہ احکام ہیں جو معراج کے وقت یا اس کے بعد موصول ہوئے۔ ان کا سطحی سا علمی و منطقی جائزہ حسب ذیل ہے:

1۔ توحید:

سورۃ بقرہ کی دوسری آخری (Second last) آیت میں اللہ پر ایمان، رسولوں پر ایمان فرشتوں پر ایمان، کتابوں پر ایمان اور قرآن مجید فرقانِ حمید کی حقانیت پر یقین کی تلقین فرمائی گئی۔ توحید دراصل عقائد باطلہ کی نفی اور اللہ کے اللہ ماننے کا یقین ہے۔ اگر یہ عقیدہ دل میں سرایت نہ کرے تو باقی تمام عقائد بے معنی ہیں۔

پوری کی پوری کائناتوں کا مالک و خالق صرف خدا ہی ہے اور ہر ملکیت اپنے مالک کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ کسی مالک کی ملکیت غیر مالک کی طرف منسوب کرنا اصل مالک کی ملکیت غصب کرنے کے مترادف ہے۔ اللہ تو اللہ ہے وہ ہر چیز کا بلاشرکتِ غیر مالک و مختار ہے۔ اس لئے ریاست و حکومت میں توحید کو فرض کر دیا گیا۔ اسلامی آئین کی بنیاد ہی اس عقیدے پر استوار ہوئی۔ ریاست کے تمام قوانین توحید کے تابع کر دیے گئے۔ اگر اس عقیدے سے ماورا قوانین بنے تو وہ ریاست قطعاً اسلامی ریاست نہیں اور وہاں کی حکومت سراسر غیر اسلامی حکومت ہے، اس لیے اسلام کے بنیادی دستور میں اس عقیدے کو فرض کر دیا گیا۔ خدا کے بتائے ہوئے توحیدی نظام کے علاوہ کسی ریاست کو اسلامی قرار دینا اللہ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں اسلامی ریاست کی تمام کی تمام مشینری، تمام کے تمام ادارے صرف اور صرف اللہ کی واحدانیت کے لیے کام کرتے ہیں۔ اسی کو مقتدرِ اعلیٰ مانتے ہیں۔ اسی کے اقتدارِ اعلیٰ کے عقیدے کو مضبوط کرنے میں سرگرداں رہنے کا نام اسلامی ریاست یا معاشرہ ہے۔ خدا کے علاوہ

Marfat.com

کسی اور کو مقتدرِ اعلیٰ ماننے والے انبیاء اور آسمانی کتابوں سے فیض یاب نہیں ہو سکتے۔ سو وہ دینوی واُخروی زندگی میں اللہ کی رحمتوں سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ اقوامِ عاد وثمود کی طرح تباہی و بربادی ان کا مقدر بن جاتی ہے یا بنی اسرائیل کی طرح محرومی وغلامی ان پر مسلط کر دی جاتی ہے۔

یاد رہے توحید صرف ایک عقیدہ ہی نہیں، اسلامی نظام ریاست وحکومت کا اہم ستون بھی ہے۔ اس لیے مدینہ کی پہلی اسلامی ریاست میں اسلامی آئین کی عمارت اسی اصول پر کھڑی کی گئی۔

2-والدین کے حقوق:

محسنوں کے ساتھ بھلائی کرنا تو دنیا کے اکثر وبیشتر اخلاقی ضابطوں میں موجود ہے، مگر اکثر وبیشتر قوانین کی زبانیں خاموش اور آنکھیں بند ہیں۔ والدین انسان کی نسلی ترویج وترقی کی بنیادی اکائی ہیں۔ وہ نہ صرف نسلِ انسانی کو آئندہ زمانے تک پہنچاتے ہیں، بلکہ اپنے وسائل اور حالات کے مطابق بہترین غذا اور تعلیم کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔ اولاد کے لیے ہر قسم کی مشکلات برداشت کرتے ہیں۔ خود بھوکے رہ کر بھی اولاد کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ اپنی تمام خواہشات اپنی اولاد پر قربان کر دیتے ہیں۔ اس کائناتِ ارضی پر اللہ اور رسولؐ کے بعد انسان کا والدین سے بڑا محسن کوئی نہیں۔ اس لیے اسلام نے اولاد کے لیے والدین کی خدمت واجب کر دی۔ اللہ اور رسولؐ کے بعد والدین کے حقوق پر زور دیا۔

آج اسلام پر سب سے زیادہ تنقید کرنے والی یورپی یونین انسانیت اور انسان کے بنیادی حقوق کا سب سے زیادہ پرچار کرنے والی اقوام متحدہ اس بنیادی انسانی حق پر گونگی، اندھی اور بہری ہے۔ اس کے پروردہ ممالک نے انسانی ترویج وترقی کی بنیادی اکائی ''والدین'' کو دارالامانوں (Old homes) میں قید کر دیا۔ قارئین غیر جانبداری سے فیصلہ کیجیے کیا، والدین کا یہ جرم ہے کہ اس نے اولاد کو پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ اولاد کے لیے اپنی خواہشیں بھی قربان کر دیں اور ان کی پڑھی لکھی، مہذب، شائستہ اور ترقی یافتہ اولاد نے اس عمر میں، جس میں انھیں اولاد کے سہارے کی ضرورت تھی، دارالامان (Old homes) کی اجنبی اور خیراتی زندگی کے حوالے کر دیا۔ کیا یہ ان کے احسانات کا بدلہ ہے کیا یہ مہذب پن ہے۔ کوئی گیا گزرا انسان بھی اپنے محسنوں کے ساتھ ایسا نہیں کرتا جو اقوام متحدہ اور یورپی یونین کر رہی ہے۔ ان کے مہذب پنے پر لاکھ لعنت بھیجئے اور ان کی تعلیم وتہذیب سے دور رہیئے جو تعلیم وترقی والدین کو بڑھاپے میں نہ سنبھال سکے، اس تعلیم سے

Marfat.com

ناخواندگی بہتر اور اس ترقی سے تنزل اچھا ہے۔

لیکن آفرین ہے یہ اعزاز صرف اسلام کو حاصل ہے جس نے والدین کے حقوق کو تمام انسانی حقوق سے زیادہ اہمیت دی۔ اولاد کے لیے سب سے بڑے محسن والدین کو قرار دیا گیا۔ والدین کی ناراضی کو خدا کی ناراضی کہا گیا۔ والدین کو میٹھی نظر سے دیکھنے کو حج کے برابر ثواب کا درجہ دیا گیا اور والدین کی نافرمانی کرنے والوں کے لیے آخرت کا حصہ ختم کر دیا گیا آخرت میں سزا کی وعید بھی سنائی گئی۔

قارئین!! یہ کاغذی بات نہیں ہے۔ آگے چل کر اس حق کی رو سے معاشرے کی بنیادی اکائی خاندان کی سربراہی والدین کو دے دی گئی۔ والدہ کو حقِ وراثت دیا گیا اور والد کو سربراہ کی حیثیت سے نافرمان اولاد کو عاق کرنے کا حق دیا گیا۔ اسلامی شریعت وفقہ میں خدا اور رسولؐ کے بعد اولاد کے لیے والدین کو دنیا کی معزز ومحترم ترین ہستیاں قرار دیا گیا۔

3-اجتماعی زندگی:

کسی قوم کی ترقی کی رفتار کو اس کی اجتماعی زندگی کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر افراد کی اجتماعی زندگی حق شناسی، ہمدردی، انصاف پسندی، غمگساری، ہمدردی، عفو و درگزر اور اجتماعی تعاون کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو تو وہ افراد معاشرہ یا اقوام ناقابل تسخیر ہو جاتے ہیں۔

اسلام کے بنیادی آئین کی زیر دفعہ تین مدینہ کی ریاست میں صدقات واجبہ و نافلہ کے احکامات نافذ العمل ہوئے۔ وراثت و وقف کے قوانین بنائے گئے۔ خدمت گاروں کی خدمات کا صلہ دینے کے لیے ''ہبہ'' جیسے قوانین متعارف ہوئے۔ محتاج، مساکین اور یتیم انسان اہل ثروت کی توجہ کے حقدار ٹھہرائے گئے۔ مہمانوں کے حقوق بھی مقرر کیے گئے۔ آئندہ سالوں میں حال یہ تھا کہ لوگ زکوٰۃ دینے والوں کو تلاش کرتے پھرتے اور زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ملتا۔ مہمانوں کو تلاش کیا جاتا۔ بستیوں اور محلوں میں اعلان کیے جاتے۔ کوئی مہمان ہے تو میرے گھر ٹھہرے۔ اپنی تعریف و نمائش کے لیے نہیں، بلکہ مہمان نوازی کا حق ادا کرنے کے لیے۔

بعد ازاں کمال احساس ہمدردی پیدا ہوا۔ ہر آدمی اپنے ساتھ رہنے بسنے والوں کے حقوق محسوس کرتا اور حق ادا کر کے احسان چڑھانے کے بجائے یا حق دینے پر احسان جتانے کے بجائے اس کا مشکور وممنون ہوتا کہ اس نے حق ادا کرنے کا موقع دیا۔

اس دور کی تاریخ دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ لوگوں نے اپنی زندگی تو وقف ہی اس مقصد کے

Marfat.com

لیے کر دی تھی کہ دوسروں کے لیے جیا جائے۔ وہ تو خدا سے جو کچھ بھی مانگتے تھے، دوسروں کی خدمت کے لیے مانگتے تھے۔ بعد ازاں اخلاقی حقوق کے تعین نے اسلامی ریاست کے اجتماعی نظام کو چار چاند لگا دیے۔ جو علاقے اسلامی قلمرو میں آئے، وہ امن عامہ، انصاف اور اجتماعی زندگی کے لحاظ سے پوری دُنیا میں نمونہ بن گئے۔ تاریخ آج تک اُس خوبصورت معاشرتی نظام کا نعم البدل پیش نہیں کر سکی۔

4۔ فضول خرچی کی اور کنجوسی کی ممانعت:

اگرچہ یہ شب معراج کی نصیحت تھی، لیکن بعد ازاں تمام افراد کو فضول خرچی سے بزور روکا گیا یعنی وہ اخراجات جو غیر ضروری تھے۔ اسلامی حکومت نے حرام قرار دے دیے۔ حضورؐ کی زندگی تو خیر سے کفایت شعاری کا بہترین نمونہ تھی۔ آپؐ کے بعد خلفاء راشدین نے اپنے دفتری اخراجات میں انتہائی حد تک کمی کر دی۔ ضرورت سے زیادہ وظائف بیت المال کے سپرد کر دیے۔ اپنے گھروں کے چراغ تک جلانا بند کر دیے تاکہ ریاستی خزانے پر بوجھ نہ پڑے۔

یوں دولتِ اسلامیہ کے خزانے کی گردش فضولیات، فخر و ریا، نمود و نمائش، عیاشی و فحاشی اور فسق و فجور کے بجائے اجتماعی و ریاستی ضروریات مساکین و یتیم و حاجتمندوں کی امداد کی طرف مڑ گئی۔

فضول خرچی کو نہ صرف اخلاقی و تعلیمی تربیت کے ذریعہ ختم کیا گیا، بلکہ سخت قانونی نفاذ کے ذریعہ بھی محاسبہ کیا گیا۔

خلفائے راشدین کے دور میں کئی گورنر، کئی قاضی اور کئی جنرل صرف اس لیے معطل کیے گئے کہ وہ ایک کے بجائے دو جوڑے کپڑوں کے رکھتے تھے۔ اسلام کے بہت بڑے جرنیل حضرت خالدؓ بن ولید کو صرف اس لیے معطل کر دیا گیا کہ وہ یمن کی ریشمی شالیں اوڑھتے تھے۔

فضول خرچی اسلامی شریعت کے مطابق کفرانِ نعمت ہے اور فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں اور تمام مسلمان شیطان کو خوب جانتے ہیں۔

آج کے بنکار خوب جانتے ہیں کہ دولت کا منجمد کر دینا معاشرتی اور قومی زندگی کے لیے کتنا نقصان دہ ہے۔ دولت اجتماعی زندگی کا بہترین ٹانک ہے۔ اقوام کی بہت بڑی طاقت ہے۔ اس طاقت کو اسراف یعنی فضول خرچی کے بھانبڑ میں جلا دینا دولت کو دریا میں بہا دینے کے مترادف ہے۔

Marfat.com

بالکل اسی طرح قوم کو کنجوسی کے ہمالیہ میں برف کر دینا اس کی شاہ رگ دبا دینے کے برابر ہے۔ کسی ایسے فرد کے ہاتھ میں دے دینا، جو سانپ بن کر بیٹھ جائے، معاشرتی وقومی زندگی کے لیے ایسے ہی ہے جیسے کسی چلتے پھرتے انسان کا خون نچوڑ کر جار میں رکھ دیا جائے۔ دولت کی متوازن گردش ہی قومی اور معاشرتی زندگی کی صحت کی ضامن ہے۔

اسلام نے جہاں فضول خرچوں کا اخلاقی، معاشرتی اور قانونی محاسبہ کیا، وہاں بخل اور کنجوسی کو بھی حرام قرار دیا۔ کنجوس آدمی کی جائز کمائی بھی حرام قرار دے دی گئی۔ تربیتی و تعلیمی نظام کے ذریعے کنجوسی پر واہ واہ کرنے کے بجائے پرزور مذمت کرنے والی رائے عامہ ہموار کی۔ تصورِ آخرت اور کئی اور تعلیماتی ذرائع سے مرنے کے بعد محاسبہ کا خوف پیدا کیا۔

بعدازاں تجارتی اخلاقی، کاروباری ضابطے نافذ کر کے زراندوزی اور ذخیرہ اندوزی کی حوصلہ شکنی کی۔ یہی وجہ تھی کہ مکہ سے خالی ہاتھ نکلنے والے کئی کئی دن فاقوں میں رہنے والے مہاجرین آگے چل کر دنیا کے بہترین معیشت گر، بہترین سرمایہ کار اور بہترین برآمد و درآمد کنندگان ثابت ہوئے۔

5۔ نسل کشی کی ممانعت اور معاشی نظام:

دراصل عربوں میں نسل کشی کا بڑا رواج تھا۔ خاص طور پر بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دینا یا زندہ درگور کر دینا معمولی بات تھی۔ بیٹی کی پیدائش کو باعثِ ننگ و عار تصور کرتے تھے اور معاشی بوجھ سمجھتے تھے۔ یہ خدا کے نظامِ تخلیق میں بہت بڑی تخریب کاری تھی۔ بیٹے ہوں یا بیٹیاں، سب کا رازق اللہ تعالیٰ ہے۔ نہ صرف انسان، بلکہ بے شمار مخلوقات کے رزق کا بندوبست تخلیقِ کائنات کے وقت ہی کر دیا گیا تھا۔ اس معاملے میں پریشان ہونا بے یقینی کے مترادف ہے اور بے یقینی ایسا روحانی مرض ہے جو انسان سے کچھ کرنے کی صلاحیتیں چھین لیتا ہے۔ یہ بے دینی سے بدتر ہے۔ بے دین کا کوئی عقیدہ یا ایمان نہیں ہوتا جبکہ صاحبِ ایمان اگر بے یقین ہو تو وہ روحانی اور جسمانی ترقی سے محروم رہ جاتا ہے۔

دوستو!! انسان کی موجودہ شکل وصورت کئی منازل کے بعد وجود میں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ارواح تخلیق کیں اور ہزاروں سال انسان کی روح عالم ارواح میں رونق افروز رہی۔ وہاں جس قسم کی خوراک یا رزق مطلوب تھا، اس کا پورا پورا انتظام اللہ نے کر دیا۔ عالم ارواح سے انسان ایک خاص نسلی اور تخلیقی عمل کے ذریعے ماں کے پیٹ میں جلوہ افروز رہا۔ ماں کے پیٹ

Marfat.com

میں جس قسم کا رزق چاہیے تھا، اللہ تعالیٰ مہیا کرتا رہا۔ ماں کے پیٹ میں انسان ایک وقت تک تنِ تنہا رہا۔ جب وہ وقت ختم ہوا تو اللہ کے حکم سے اس دنیوی کائنات میں جلوہ افروز ہوا۔ اللہ نے پیدائش سے بچپن تک جس قسم کا رزق چاہیے تھا، ماں کی چھاتی میں منتقل کر دیا۔

یاد رہے عالمِ ارواح کا رزق اور تھا، ماں کے پیٹ کا رزق اور تھا۔ ماں کے پیٹ والا رزق اگر پیدائش کے بعد انسان کو پیش کیا جاتا تو شاید وہ دیکھتے ہی قے یا متلی کر دیتا، لیکن سبحان اللہ خالق نے کیا خوبصورت رزق کا اہتمام کیا۔ دو سال کے لیے ماں کی چھاتیوں میں دودھ بھر دیا جو حضرتِ انسان خوب مزے مزے سے نوش فرماتا رہا۔ ذرا غور فرمایئے عالمِ ارواح سے شکمِ مادر تک کا سفر انسان نے کیسے طے کیا۔ کیا کھایا، کہاں سے کھایا، کس نے انتظام کیا۔ جو ذات غیر شعوری زندگی میں انسانی زندگی کے لیے اتنے احسن رزق کا اہتمام کر سکتی ہے۔ اس کے لیے اس دنیا میں کونسی مشکل بات ہے، جو اہتمام رزق میں مشکل محسوس کرے۔ کیا اس کے خزانوں میں کمی آ گئی ہے (نعوذ باللہ) اتنی بے یقینی اچھی نہیں۔ رزق کے خوف سے بیٹیوں کو زندہ درگور کر دینا یا منصوبہ بندی کے ذریعے مانع حمل کام کرنا نسلِ انسانی پر بہت ظلم ہے۔ خالقِ کائنات کے نظام میں بہت بڑی تخریب ہے۔

پتھروں میں پلنے والے کیڑوں کو رزق کون پہنچاتا ہے۔ آدم علیہ السلام کے بدن میں انسانی روح پھونکنے والے خالق پر اتنی بے اعتمادی و بے یقینی اچھی نہیں۔ آدمؑ کے وجود میں سے حضرت حوا کو پیدا کرنے والے رب پر یقین رکھنا ہی اصل کامیابی ہے۔ یقین رکھو اللہ سے اسباب ہیں، اسباب سے اللہ نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ظاہری ازدواجی سبب یعنی بن باپ کے مریم علیہا السلام کے پیٹ سے پیدا فرما دیا۔ آدمؑ و حواؑ کو پہلے جنت میں، بعد ازاں خاکدانِ ارضی پر رزق کا اہتمام کس نے کیا۔

بہر حال اسلام کی پہلی ریاست کے بنیادی آئین میں معاشی ناانصافی کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ دولت کی نمود و نمائش پر پابندی لگا دی گئی۔ بعد ازاں سود، شراب، جُوے اور رشوت کو حرام قرار دے کر قانونی تعزیریں لاگو کر دی گئیں۔ انسانوں کے درمیان برتری و بزرگی کا معیار دولت کی بجائے تقویٰ رکھ دیا گیا۔ معاشرتی محاسبہ کا ایسا نظام وضع کیا گیا کہ معاشی ناانصافی اور کاروباری غصب ختم ہو گیا۔

رزق کا سامان کرنا تو خدا کے ذمہ ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو خوب نبھانا جانتا ہے۔ شقی القلب لوگ اس عقیدے میں ابہام پیدا کرتے ہیں۔

Marfat.com

نسلوں کی افزائش کو اس خوف سے روک دینا کہ انسان زیادہ ہونے سے رزق کم ہو جائے گا، سیدھی سیدھی نظامِ فطرت میں دخل اندازی ہے۔ لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے جو خدا انسانوں کو اس زمین پر بسانے کا اتنا وسیع و عریض اور لاکھوں سالوں پر محیط انتظام کر سکتا ہے، اس کے لیے ایک خاندان یا ایک دو نسلوں کے لیے رزق کا بندوبست کرنا کون سی مشکل ہے۔ جبکہ بذریعہ قرآن اللہ تعالیٰ یقین بھی دلا رہا ہے۔

اسلام کے بنیادی آئین کی اس دفعہ نے دنیا کے تمام تصوراتی اور تخمینی نظاموں کی نفی کر دی جو اس کی آڑ میں زمانۂ قدیم میں کبھی نسل کشی اور کبھی ضبطِ ولادت کا ناقابل معافی جرم کرواتے رہے۔ جن کی وجہ سے ماضی قریب میں بیٹیاں زندہ درگور کر دینے کا جرم ہوتا رہا اور آج کل اسی جرم کی تیسری حالت ہمارے سامنے ہے یعنی حمل کا ساقط کر دینا۔ اسلام کے بنیادی دستور کی اس دفعہ پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ انسان کھانے والے کم کرنے کی تخریبی سوچ چھوڑ کر وسائل بڑھانے کی کوشش کرے اور افرادی قوت کم کرنے کی بجائے افراد کے لیے مربوط و مضبوط معاشی وسائل پیدا کرے۔ وسائل ترتیب و تنظیم میں ہوں گے تو زیادہ افراد کم وقت میں زیادہ پیسہ کما لیں گے۔ اگر وسائل بڑھانے کی بجائے افراد کی پیدائش روکنے پر ہی وقت ضائع کیا جاتا رہا تو کم وسائل بھی افرادی قوت کے بغیر ضائع ہو جائیں گے۔

اس لیے اسلام نے ایک تخریبی سوچ ختم کر کے ایک تنظیمی، اصلاحی اور تعمیری سوچ کو آگے بڑھایا۔

6- زنا سے ممانعت:

زنا ایک ایسا عمل ہے جو انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے نقصان کا باعث ہے۔ اس سے معاشرتی جرائم کی راہ کھلتی ہے اور انفرادی طور پر مضرِ صحت اثرات جنم لیتے ہیں۔

دنیا کے ہر مذہب اور ہر ضابطے میں نکاح کا کوئی نہ کوئی اصول یا روایت پائی جاتی ہے۔ خاندان معاشرتی زندگی کی بنیادی اکائی ہے۔ زنا خاندانی زندگی کے خلاف بہت بڑی تخریب ہے۔ خاندان سے معاشرے ملک اور اقوام نے ترتیب پائی۔ اس ترتیب کو توڑنا انسانوں کو حیوانوں کی طرح جنگلوں اور غاروں میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ اس لیے ہر دور میں، ہر قوم میں، ہر علاقے میں ازدواجی زندگی کی ابتدا کے لیے کوئی اصول یا کوئی اخلاقی و معاشرتی بندھن قائم رہا ہے۔

Marfat.com

زمانۂ قدیم میں جن اقوام نے ازدواجی زندگی کے بنیادی اصولوں کو چھوڑا، تباہی اور بربادی ان کا مقدر بنی۔ قومِ لوط اس کی واضح مثال ہے۔ موجودہ دور میں یورپی اقوام نے فرد کی آزادی کے نام پر اپنے معاشرے میں نکاح اور زنا کا فرق ختم کیا تو آج ان کی خاندانی زندگی انتہائی منتشر نظر آتی ہے۔ اُن میں ایڈز جیسی مہلک بیماریاں جنم لے چکی ہیں۔ معاشرے کی بنیادی اکائی ''خاندان'' منتشر ہو رہا ہے۔

بہرحال!!! اسلام کے بنیادی آئین میں زنا جیسے جرم پر خصوصی توجہ دی۔ اسے حدود کے تحت فوجداری جرم قرار دیا گیا۔ آخر کار یہ جرم اسلامی قانون کے ایک وسیع تعزیراتی باب کی بنیاد بنا۔ اسلام میں تہمتِ زنا کو بھی فوجداری جرم قرار دیا گیا۔ زنا کو روکنے کے لیے خواتین کے لیے پردے کے احکامات نافذ ہوئے۔ فحاشی کے تمام ذرائع کو بھی فوجداری جرائم میں شامل کیا گیا۔ شراب موسیقی اور رقص پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

ایسے ازدواجی قوانین بنائے گئے کہ نکاح کرنا آسان ہو گیا۔ اخلاقیات میں زنا کو خدا کی ناراضی کا ذریعہ بتایا گیا اور حکمرانوں کے لیے یہ وعید سنائی گئی کہ ظلم کی حکومت قائم رہ سکتی ہے، بے حیائی کی حکومت کا قائم رہنا ممکن نہیں۔

عورتوں کو معاشرتی تحفظ دینے کے لیے وراثت میں ان کا حصہ مقرر کیا گیا۔ تہمتِ زنا کو بھی فوجداری جرم قرار دیا گیا۔ زنا کی شہادتوں کے لیے ایک معیار مقرر کیا گیا۔ محکمہ کوتوال جسے ہم پولیس کہتے ہیں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس کی تفتیش میں شہادتوں کی موقع پر موجودگی کی تصدیق ضرور کریں۔ دور کی شہادتوں پر فردِ جرم عائد نہ کریں۔ یوں مدینہ میں یہ جرم بالکل ختم ہو گیا۔ لوگ اس جرم سے اتنے تائب ہوئے۔ کئی کئی سال کوئی مقدمہ درج نہ ہوتا۔ اگر ہوتا بھی تو عینی شاہدوں کی طرف سے نہیں، خود جرم کرنے والوں کی طرف سے درج ہوتا۔ لوگ خدا کے خوف کی وجہ سے جرم سرزد ہونے کی صورت میں خود ہی عدالت میں پیش ہو کر سزا طلب کرتے تا کہ آخرت میں مواخذہ نہ ہو۔

7-انسانی جان کا قتل:

ہر انسان قابلِ احترام ہے۔ کوئی فرد نہ اپنی جان لے سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کی۔ انسانی حرمت خدا کی قائم کردہ ہے۔ اسے خدا کے حکم سے اسی حد تک توڑا جا سکتا ہے جتنی وہ ذات باری تعالیٰ رعایت دے۔ حکم مل جانے پر بھی زیادہ خون ریزی کی ممانعت اور لاشوں کی بے حرمتی تک

جرم ہے۔اسی دفعہ کو بنیاد بنا کر مدینہ کی اسلامی ریاست نے خودکشی کو حرام اور جرم قرار دیا۔قتلِ عمد کی سزا قتل رکھی۔قتل خطا کے لیے کفارہ اور خون بہا رکھے۔قتل بالحق کی پانچ صورتیں مقرر کردیں:

I......یہ کہ کوئی قتلِ عمد کا مجرم ثابت ہو جائے۔

II......دینِ حق کے کسی مخالف گروہ کی مخالفت اس حد تک چلی جائے کہ جنگ ناگزیر ہو جائے۔

III......کسی شادی شدہ مرد عورت نے جرم زنا کا ارتکاب کیا ہو۔

IV......کسی گروہ نے اسلامی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کی ہو۔

V......یا کوئی شخص دینِ اسلام اختیار کرنے کے بعد اس سے پھر گیا ہو۔

ان سزاؤں کے اختیارات مکمل باشرع قاضیوں کو دیئے گئے۔کسی گروہ، ملک یا قوم کے خلاف جنگ کے اختیارات مجلس شوریٰ یا خلیفۃ المسلمین کو دیئے گئے۔

8-وفائے عہد:

معاہدے خواہ افراد آپس میں کریں یا حکومتوں کے مابین ہوں، اسلام کی رو سے ان کی پابندی ضروری ہے۔عہد و پیمان کی خلاف ورزی پر خدا کے ہاں بھی پوچھ گچھ ہوگی۔یہ صرف اخلاقی درس ہی نہ تھا۔اسلامی ریاست نے آئندہ سالوں میں اسی دفعہ کو داخلی و خارجی پالیسی کے بنیادی اصولوں میں شامل کیا اور افراد کے درمیان ہونے والے معاہدوں کو عدالتی دائرۂ اختیار میں دے دیا۔

9-یتیموں کے ساتھ حسن زن:

اس سے پہلے بھی عربوں میں یتیموں کی کفالت کرنے کا رواج تھا۔جیسے آپؐ اپنے چچا ابو طالب کی کفالت میں رہے اور ان کے بیٹے حضرت علیؓ آپؐ کی کفالت میں اور حضرت جعفرؓ آپؐ کے چچا حضرت عباس کی کفالت میں پلے۔کفیل بننے کا مطلب تھا کہ مال و جان کی حفاظت کی ذمہ داری یتیم کے بالغ ہونے تک نبھانا۔عمومی لحاظ سے ایسا نہیں تھا۔اکثر کفیل یتیموں کا مال ہڑپ کر جاتے۔اُن پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے۔یہ بہت بُری روش تھی۔اس روش کو اسلام کے ساتھ روایتی انداز میں چلانا ممکن نہیں تھا۔سو اسلام نے بنیادی آئین میں روایتی روش کو یکسر بدل دیا۔یتیموں مسکینوں کی کفالت افراد سے لے کر ریاست کو دے دی۔ریاست کو ان کے جان و مال کا محافظ اور امین بنا دیا۔

بنیادی آئین کی یہ دفعہ بھی آگے چل کر قانون کے ایک باب کا موجب بنی۔عشر، زکواۃ،

Marfat.com

صدقاتِ واجبہ و نافلہ بھی اسی زمرے میں آئے۔ بیت المال اور وقف کے قوانین متعارف ہوئے۔ ریاست نے اُن افراد کی ذمہ داری اُٹھالی جو اپنی حفاظت نہ کر سکتے تھے۔

10-ناپ تول میں انصاف:

اس دفعہ کے تحت محکمہ احتساب بنایا گیا جس کی ذمہ داری تھی کہ وہ بازاروں میں جا کر باٹ اور پیمانے چیک کرے اور کم ناپنے تولنے سے بزور طاقت بند کیا جائے۔ اسی کے تحت تمام شاہی افسران کو تجارت اور لین دین میں اونچ نیچ کرنے والوں پر نظر رکھنے یا محکمہ احتساب کے ساتھ تعاون کرنے کے اختیارات ملے۔

11- تکبر و نخوت کی ممانعت:

فخر و مباہات، نخوت و تکبر انسان کو گھٹیا پن کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کے ذرائع نمود و نمائش اور اختیارات ہیں۔ یہ بھی ایک معاشرتی جرم ہے۔ اس سے معاشرے میں ناہمواریاں اور دل آزادیاں جنم لیتی ہیں۔ دل آزاریاں محرومیاں پیدا کرتی ہیں اور محرومیاں جرائم پیدا کرتی ہیں۔ تکبر و نخوت اور بے جا نمود و نمائش ختم کیے بغیر ریاستی قوانین کا اجرا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسلام نے اس کو ناپسندیدہ عمل قرار دیا اور قرآن نے تاریخ کے یخ بستہ صفحات میں سے شداد، نمرود، ہامان اور قارون جیسے کئی متکبروں کی ایسی تصویر کشی کی کہ پڑھنے سننے والا اس عمل سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ بعض جگہ تو بڑا واضح انداز میں فرمایا کہ تم اکڑ کر اور سینہ تان کر چلنے سے نہ تو پہاڑوں کے برابر ہو سکتے ہو اور نہ ہی تمھارے بھاری قدم زمین پھاڑ سکتے ہیں۔

یہ درس صرف واعظانہ حد تک محدود نہ رہا بعد میں گورنروں عمال و حکام، جرنلوں اور قاضیوں کی تقرریاں اس دفعہ کو مدنظر رکھ کر کی جاتی رہیں اور ان میں غلط صفات کے پائے جانے پر معطلیاں بھی ہوتی رہیں۔

12-بے علم باتوں سے پرہیز:

اور یہ جو حکم ہوا کہ ایسی باتوں کی کھوج میں مت نکلو جو تمھارے علم و شعور کی حدوں سے باہر ہوں، اس کو بھی اسلامی آئین کا جزو بنا دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو عرب کی توہم پرستی تھی۔ بذریعہ آئین عربوں کو توہم پرستی سے روک دیا گیا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فرضی قیاس اور وہم کی

Marfat.com

بجائے حقیقی علوم کی طرف لوگوں کا رخ موڑ دیا گیا۔

دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ مسلمان بھی اللہ کو دیکھنے کی ضد کریں اور نقصان اُٹھائیں یا مافوق الفطرت باتوں کا علم حاصل کرنے یا ان کی تحقیق و تعلیم میں اپنی زندگی ضائع نہ کردیں۔

اس حکم کی پیروی اخلاقی ریاستی انتظام و انصرام، نظامِ تعلیم، نظامِ معیشت اور نظامِ عدالت میں مختلف طریقوں سے اختیار کی گئی۔ ان بے شمار خرابیوں سے اسلامی معاشرے کو محفوظ کر دیا گیا جو صرف فرضی وہم و گمان سے جنم لیتی تھیں۔ قانونی نفاذ میں یہ اصول اختیار کیا گیا کہ محض شبہ کی بنیاد پر کسی کو مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بنیادی دستور کی آٹھویں دفعہ کے تحت تہمت اور الزام تراشی کو جرم قرار دیا گیا۔ اخلاقی ضابطوں میں بدگمانی سے بچنے کی تلقین کی گئی۔ تفتیشی جرائم میں یہ وضاحت کی گئی کہ محض شک کی بنیاد پر کسی کو زیرِ حراست یا حوالات میں نہیں لایا جا سکتا۔ نظامِ تعلیم سے ان تمام علوم کو خارج کر دیا گیا جو محض ظن و تخمین اور اُوٹ پٹانگ پر مشتمل تھے۔ غیر مسلم اقوام کے ساتھ بھی انھیں تعزیرات کے تحت سلوک کیا گیا۔ علاوہ ازیں اشاعتی اور تبلیغی ذرائع سے ذہنی تربیت کی گئی کہ ہر شخص وہم و گمان کے معاملوں میں اپنا محاسبہ خود کرتا رہے حتیٰ کہ اسلامی ریاست نے اس حکمِ خداوندی کو نہ صرف آئین کا حصہ بنایا، بلکہ انتہائی سختی سے نافذ بھی کیا۔

علاوہ ازیں حسد، بغض، جھوٹ، غیبت اور کینہ پروری کے خلاف نفرت پیدا کی گئی ان چیزوں کو کبیرہ گناہوں میں شامل کیا گیا۔ آخرت میں ان کے محاسبہ کی وعید سنائی گئی۔ اخلاقیات میں ان چیزوں کو قابلِ نفرت درجہ دیا گیا۔ علمی، تعلیمی اور تدریسی نصابوں میں ایسے مستقل اور لازمی ابواب شامل کیے گئے جن سے پڑھنے سننے والا ان برائیوں سے ہمیشہ ہمیشہ تائب ہو جاتا اور اپنی آئیندہ زندگی ان گناہوں سے پاک رکھتا اور معاشرتی زندگی میں ان برائیوں کے مرتکب لوگوں سے نفرت کرنے لگتا۔

دوسرے لفظوں میں۔ اسلامی معاشرے کو ایسی بنیادوں پر استوار کیا گیا کہ اسلامی ریاست کا تہذیب و تمدن دیکھ کر فرشتے بھی عش عش کر اُٹھے۔ خود اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر نے صحابہ کرام کو جنت میں داخلہ کے گرین کارڈ جاری کر دیے۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ انسانی اسلامی نظامِ حیات کا کوئی تقابل پیش نہیں کر سکی۔ یاد رہے یہ تصدیق لفظی نہیں۔ کوئی بھی قاری تاریخ اُٹھا کے جائزہ لے سکتا ہے۔ ہمارے ان الفاظ کے حق میں بے شمار تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔

———(((الحمد للہ)))———

معراج النبیؐ کا عقلی و منطقی جائزہ

یہ واقعہ ماہِ رجب 38 ؁ کی ستائیسویں تاریخ کو پیش آیا۔ ان دنوں سن ہجری ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ سن عیسوی ہی مروج تھا۔ قمری لحاظ سے رجب سال کا ساتواں مہینہ تھا۔

تاریخِ انسانی کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ عقائد پہلے نازل ہوئے اور علوم بعد میں۔ عقائد کا نزول علوم سے پہلے ہوا۔ عقائد میں اللہ کے احکامات ہوتے ہیں اور علوم میں کلیے۔ مفروضے، قاعدے، مباحث، تشریحات اور میزانیے وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ انسان کو پیدا فرمانا چاہا تو فرشتوں کی محفل میں تذکرہ کیا۔ فرشتوں نے کہا یارب العزت یہ انسان دنیا میں فساد اور خون خرابہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا میں بہتر جانتا ہوں۔ فرشتے خاموش ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ”میں بہتر جانتا ہوں“ فرشتوں کے لیے حکم تھا کہ تم اس کو معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ چنانچہ انھوں نے سرِ تسلیم خم کیا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ خاموشی ان کا عقیدہ اور ایمان ہوا انھوں نے مزید جاننے کی خواہش ہی نہ پیدا ہونے دی۔

انسان تخلیق ہو گیا۔ اس کی دنیوی زندگی شروع ہوئی۔ اللہ نے فرشتوں اور جنات میں سے ابلیس کو آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ فرشتے سجدہ ریز ہو گئے۔ وہ صاحب عقیدہ تھے۔ شیطان کھڑا رہا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اللہ کے علاوہ سجدہ کیوں؟ مگر وہ یہ نہ جان سکا کہ اس جاننے سے پہلے اللہ کا واضح حکم آدمؑ کو سجدے کا حکم ٹوٹ رہا ہے۔ صاحب علم تھا۔ جاننے کے چکر میں پڑ گیا۔ صاحبِ یقین ہوتا تو بن جانے ہی سجدہ ریز ہو جاتا اور کامران ٹھہرتا۔ اس کے علم نے اسے خود سر کر دیا، اور اسی زُعم میں مارا گیا۔

آدمؑ کو جنت میں داخل کیا گیا۔ اس کے وجود سے حواؑ کو پیدا کر کے میاں بیوی کی حیثیت سے جنت میں عیش کے لیے چھوڑ دیا گیا، مگر ساتھ ہی اللہ کا حکم تھا کہ وہ جو ایک درخت کھڑا ہے، اس کے دانے کو ہاتھ نہیں لگانا، مگر حضرت انسان بھی متردّد تھا کہ اس دانے کو کھانے سے کیا ہوتا ہے۔ ایک دن ابلیس کے بہلاوے میں اور کچھ پر تجسس فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کے ان

Marfat.com

حضرات نے اس درخت کا پھل کھالیا۔ پھر کیا تھا جنت سے نکال دیئے گئے۔ کائنات ارضی پر بھیج دیئے گئے۔ بہر حال لمبا قصہ ہے۔ یہ بیان کرنے کا مقصد ہے، اگر وہ صاحبان ایک اللہ کے حکم کی بجا آوری میں کمی نہ کرتے تو نہ وہ اس دنیا میں آتے اور نہ ہم اس بحث میں مبتلا ہوتے۔ خیر اللہ کو یہی منظور تھا اور یقیناً وہ حکمتوں کو جاننے والا ہے۔

قارئین عقائد میزان سے باہر ہوتے ہیں، مگر ماوراًالعقل یا افسانوی نہیں ہوتے۔ یاد رکھیے عقائد کا تعلق ایمانیات سے ہے۔ سائنس سے نہیں۔ عموماً دلائل طلب کرنے والے ایمان نہیں لاتے۔ فرعون نے موسیٰ سے، نمرود نے ابراہیم علیہ السلام، ابوجہل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنے دلائل مانگے اور معجزات طلب کیے۔ وہ معجزات دیکھنے کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے۔ جو لوگ ایمان لائے، انھوں نے کوئی دلیل طلب نہیں کی۔ عقائد کے متعلق دلائل طلب کرنا عقیدے کی تحقیق نہیں تحقیر کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی لیے تو دلیل طلب کرنے سے ایمان نصیب نہیں ہوتا۔

معراج النبیؐ ایک معجزہ ہے اور معجزہ خود اپنے لیے بہت بڑی دلیل ہوتا ہے۔ اس کے لیے اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عقیدے کو من وعن ماننا ہی ایمان ہے۔ اس لیے تحقیق سے فائدہ کم، نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

کوئی بھی عقیدہ ماوراًالعقل نہیں ہوتا۔ بات صرف ادراک کی ہے، شعور کی ہے۔ اگر عقل و دل شعور کے اس بالغ مقام پر ہیں جہاں اللہ کے احکامات سن کر ماننے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، جاننے کی نہیں۔ اس مقام پر بات سمجھ بھی آجاتی ہے اور انسان تحقیق میں وقت ضائع کرنے کی بجائے عمل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ بس یہ تو انسان کے اندر کی کیفیات ہیں۔ اپنی اندرونی کیفیات کے مطابق ہی انسان اظہار و بیان و عمل کرتا ہے۔

آیئے ذرا عقل اور منطق کے پاس چلتے ہیں۔ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کا کیا خیال ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک عقیدہ ہے جیسے اللہ کو ماننا ایک عقیدہ ہے۔ فرشتوں کو اللہ کی مخلوق تسلیم کرنا ایک عقیدہ ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو کس نے دیکھا۔ اس کی پہچان تو اس کی قدرتوں سے ہے۔ اسی طرح فرشتے کس نے دیکھے۔ ان کی شناخت بھی اللہ اور اس کے انبیاء اکرام کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک عقیدہ ہے۔ اس پر یقین رکھنا جزوِ ایمان

Marfat.com

ہے۔عقائد کا تعلق ماننے سے ہے، جاننے سے نہیں۔

کیا یہی کافی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا اور قرآن نے اس کی تصدیق کی، اس سے بڑی شہادت کوئی نہیں۔کوئی مانے یا نہ مانے اس سے کیا فرق پڑتا ہے، وگرنہ انکار کرنے والے تو ابھی تک قرآن کا بھی انکار کیے جا رہے ہیں۔ان کا علاج ممکن نہیں۔ان کے دلوں پر انکار کی مہر لگی ہوئی ہے۔وہ اقرار نہیں کریں گے قرآن کے الفاظ اُن پر صادق ہیں۔

"وہ لوگ اندھے ہیں، گونگے ہیں بہرے ہیں، وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔"

اس کے باوجود ہم علم، منطق اور دلیل کی طرف چلتے ہیں، تاکہ انکار کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ عقائد ماوراُالعقل ہوتے ہیں۔

قارئین! جب یہ واقعہ اہلِ مکہ کے سامنے بیان کیا گیا اس کی مخالفت کرنے والے کون لوگ تھے۔کیا وہ سارے کے سارے اللہ کے نبیؐ سے محض حسد، بغض، شریکہ بازی اور اپنی چودھر کے تابع ہی مخالفت کرنے والے نہیں تھے؟ کیا اُن کے پاس کوئی بہتر نظام حیات موجود تھا اور آج بھی اعتراض کرنے والے کس مذہب یا کس طبقہِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔کیا کل والے اور آج والے نئے اور پرانے عقائد اور فکر کے لحاظ سے ایک ہی مکتبہِ فکر (School of thought) سے تعلق نہیں رکھتے؟؟

نئے اور پرانے معترضین میں فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اعتراض کرنے والے سیدھا سیدھا انکار کر دیتے تھے۔آج والے انتہائی سرد اور نفیس انداز میں اعتراض کرتے ہیں۔سوچ دونوں کی مخالفت برائے مخالفت کے تابع ہے۔

واقعہ معراج کی تفصیلات پیچھے بیان کی جا چکی ہیں۔اب اعتراض شدہ باتوں کا سطحی سا جائزہ لے کر منطق اور دلیل کی طرف چلتے ہیں۔

باختلاف روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں سوئے ہوئے تھے۔جبریل علیہ السلام آئے۔تین بار پاؤں دبا کر اُٹھایا اور حرم میں لے گئے۔شقِ صدر کیا یعنی سینہ کھولا۔آبِ زمزم سے دھویا۔حکمت اور دانائی بھری اور سینہ بند کر دیا۔اُس کے بعد براق کی طرف لے جایا گیا۔آپ اس پر سوار ہوئے اور بیت المقدس پہنچے۔وہاں انبیاء اکرامؑ کے ساتھ تعارف و امامت کے بعد ایک سیڑھی کے ذریعے آسمانوں پر گئے مختلف مظاہر فطرت دیکھے۔سدرۃ المنتہیٰ پر اللہ سے ہم کلام ہوئے اور واپس آ گئے۔

واپس آئے تو گھر کے دروازے کا کنڈا ابھی ہل رہا تھا اور بستر بھی گرم تھا۔صبح ہو رہی تھی۔

Marfat.com

اُمِ ہانی سے ملنے کے بعد حرم میں تشریف لے گئے۔ ابوجہل سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا کوئی نئی بات۔ آپؐ نے فرمایا: ”ہاں ہے۔“ پھر آپؐ نے واقعہ معراج بیان فرمایا۔ ابوجہل تلملا کر کہنے لگا۔ یہ قوم کے سامنے بیان کرو گے۔ فرمایا: ”ہاں ضرور کروں گا۔“ ابوجہل نے آوازیں دے دے کر لوگوں کو اکٹھا کیا اور کہا سنیئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں۔

آپؐ نے من وعن واقعہ معراج بیان فرمایا: ماننے والوں نے سنتے ہی آمنا وصدقنا کہا اور انکار کرنے والوں نے ہاہا کار مچا دی۔ یہ کیسے ممکن ہے رات کے ایک تہائی حصے میں مکہ سے بیت المقدس اور آسمانوں کی سیر اور واپسی۔ یہ ناممکن ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔

قارئین یہ ہو گیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ اس کی مرضی۔ بلانے والے نے بلانا چاہا تو بلا لیا۔ اس کے لیے کون مشکل ہے۔ وہ جو کرنا چاہے، کر لیتا ہے۔ اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ وہ اللہ تو اتنے وقت میں اس سے کروڑوں اربوں گنا زیادہ کرنے پر قادر ہے۔ بہر حال آیئے منطق اور دلیل کی بات کرتے ہیں۔

پہلے انکار کرنے والوں نے صاف انکار کر دیا۔ موجودہ انکار کرنے والے انکار کرتے ہیں، مگر اقرار کے ساتھ۔ مستشرقین کہتے ہیں: ”ممکن ہے یہ واقعہ خواب میں ہوا ہو۔ اگر خواب میں ہوا ہو تو علم فزکس کی بحث پیش نہیں آتی۔ سب سے پہلے تو ہم یہی بحث کرتے ہیں۔ چلیں ایک بات تو تصدیق ہوئی۔ معراج النبیؐ وقوع پذیر ہوئی۔ خواہ خواب ہی سہی۔ خواب کو حسب ذیل دلائل سے زیر بحث لے آتے ہیں۔ فیصلہ قارئین خود کر لیں۔

1۔ متفق علیہ روایت ہے۔ جبریل علیہ السلام نے تین دفعہ پاؤں دبا کر بیدار کیا۔

قارئین پاؤں کا تعلق روح سے ہے یا جسم سے۔ اگر پاؤں کا تعلق روح سے ہے تو یہ غلط ابہام جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں کہ معراج خواب میں وقوع پذیر ہوئی۔ اگر پاؤں جسم کا حصہ ہیں تو واقعاتی ابہام پیدا کرنے کی سوچی سمجھی سازش ہے اور یہ عظیم واقعہ نہ ماننے کے مترادف ہے۔

2۔ نیند کی حالت جسم کے لیے ہے یا روح کے لیے۔ اگر روح سو جاتی ہے تو اسے جگانا ضروری ہے۔ اگر روح سوتی ہی نہیں تو جاگتے کو جگانا چہ معنی دارد۔ یہ حقیقت ہے کہ نیند جسم کے لیے ہے، روح کے لیے نہیں۔ جسم سوتا ہے، روح جاگتی ہے۔ روح عالم ارواح سے تخلیق انسان تک یعنی ماں کے پیٹ تک اور ماں کے پیٹ سے لے کر پیدائش آدمی تک پیدائشِ آدم سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر حشر تک نہ کہیں سوئی اور نہ ہی سوئے گی۔ روح تو مختلف منازل سے گزرتی ہے، اپنی اصلی اور جاگتی ہوئی حالت میں۔ نیند کی حالت جسم کے لیے ہے سو جسم سوتا اور

Marfat.com

جسم ہی بیدار ہوتا ہے۔ طبعیات اور فزکس کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ جسم سوتا ہے اور جسم جاگتا ہے۔ جگایا اسے جاتا ہے جو نیند کی حالت میں جائے۔ جو نیند کی حالت میں گیا نہیں، اسے جگانے کا تک نہیں بنتا، لہٰذا نیند کی حالت میں جسم اطہرؐ، تھا سو پاؤں دبا کر اسے جگایا گیا۔ روح تو سوتی ہی نہیں، اسے ہی اگر معراج پر لے جانا مقصود تھا تو پاؤں دبانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس خاموشی سے روح کو ہی آواز دی جاتی اور معراج پر لے جاتے۔

3- شق صدر یعنی سینہ کھولا گیا اور سینہ کا تعلق بھی جسم سے ہے، روح سے نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح بذات خود کوئی نقش و نگار یا شکل و صورت نہیں رکھتی۔ روح کے کوئی ہاتھ پاؤں ناک کان منہ آنکھیں بازو پاؤں ٹانگیں نہیں۔ یہ سب چیزیں جسم کا حصہ ہیں۔ اس لیے جسم کو جگایا گیا۔ شق صدر بھی جسم کے ساتھ ہوا تاکہ جسم کو اس انوکھے سفر پر تیار کیا جائے۔ سو معراج جسم اطہر کے ساتھ وقوع پذیر ہوئی۔

4- جسم اطہر گھر سے نکلا تو دروازہ کھولا گیا۔ دروازہ کھولنے سے کنڈا ہلا جو واپسی تک ہلتا چلا گیا۔ روح کے لیے دروازہ کھولنے کا تکلف ضروری نہیں تھا جیسے آج ہم خواب میں گھر سے باہر نکل جاتے ہیں، ہمارے کمروں کے دروازے مقفل رہتے ہیں انھیں کھولنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایسے ہی معراج اگر خوابی ہوتی تو دروازہ کھولنے کی ضرورت نہ تھی۔

5- پانچویں اور اہم بات یہ کہ جب یہ واقعہ اہلِ مکہ کے سامنے بیان کیا گیا تو ان میں سے مخالفین نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اعتراض کیا کہ اتنا لمبا سفر رات کے ایک تہائی حصہ میں کیسے ممکن ہے۔ قارئین ذرا غور کیجیے۔ اگر روح یا خواب کا معاملہ ہوتا تو اعتراض والی بات ہی کوئی نہ تھی۔ اعتراض تو صرف جسمانی سفر پر تھا۔ خواب تو سبھی دیکھتے رہتے تھے۔ روحانی سفر کی باتیں بھی کم و بیش جب سے آپؐ مبعوث ہوئے سبھی سن رہے تھے۔ قرآن بذریعہ وحی نازل ہو رہا تھا جس کا ذریعہ وحی تھا اور وحی لانے والا فرشتہ روح القدس ہی کہلاتا تھا جس کا نام جبریلؑ تھا۔ ان کا آنا جانا روحانی انداز میں ہی تھا۔ اس بات پر شاید کسی کو اعتراض نہ ہوتا کہ روح اپنی اصلی حالت میں جسم اطہر کے بغیر یا خواب کی حالت میں سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے گئی اور واپس آ گئی۔

6- واقعہ میں بیان کیا گیا کہ جب آپؐ واپس آئے تو کنڈا ابھی ہل رہا تھا اور بستر بھی گرم تھا۔ چونکہ کنڈے کا ہلتے رہنا اور بستر کا گرم ہونا ایک معجزاتی عمل تھا۔ اس لیے یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ بستر گرم تھا اور کنڈا ہل رہا تھا۔

7- جناب قارئین!! سواری جسم کے لیے ہے یا روح کے لیے۔ یہ جو ''براق'' نام کی سواری

Marfat.com

بھیجی گئی، یہ جسم کے لیے تھی یا روح کے لیے۔ جسمانی اعتبار سے آج تک کسی نے خواب میں کوئی حقیقی سواری استعمال کی۔ خواب میں تو خوابی قسم کی فرضی سواری ہو سکتی ہے۔ جسم کو سوار کرنے والی سواری نہیں ہو سکتی یعنی خواب سی غیر حقیقی سواری تو ہو سکتی ہے، باقاعدہ جیتی جاگتی جسم رکھنے والی سواری نہیں۔

8- آپؐ سرکار سوار ہونے لگے تو براق نے شوخی کی۔ جبریل علیہ السلام نے کہا تجھے شرم نہیں آتی۔ یاد رکھ آج تک تجھ پر کوئی ایسی شخصیت سوار نہیں ہوئی جو مراتب میں اللہ کے ہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ معتبر ہو۔ اگر جسمِ اطہر موجود نہیں تھا پھر نہ تو سواری کے لیے براق جیسے مرکب کی ضرورت تھی، نہ ہی براق شوخی کرتا اور نہ ہی جبریلؑ کو درج بالا الفاظ سے خبر لینے کی ضرورت تھی۔

9- ایک اور اہم بات: جب جسم نیند کی حالت میں ہوتا ہے۔ دماغ اور جسم کے کچھ خلیے یا سیل تھکاوٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر سو جاتے ہیں۔ کچھ خلیے یا سیل جو بیداری کی حالت میں سوئے رہتے ہیں نیند کی حالت میں جاگتے رہتے ہیں۔ وہ مسلسل جسم کو تھپیڑے یعنی نیند کے سگنل پاس کرتے رہتے ہیں، جب نیند پوری ہو جاتی ہے تو وہ سیل یا خلیے نیند کے اشارے پاس کرنا بند کر دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ سوئے ہوئے خلیے بیدار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ چند ساعتوں میں بیداری کا عمل وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔ یہ انسانی جسم کے اندر مثبت متضاد عوامل ہیں جو جسمانی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ نیند اور بیداری میں بڑا فرق ہے۔ آپؐ کو نیند سے بیدار کیا گیا کہ جسم و روح دونوں کے ساتھ معراج کروائی جائے۔

یاد رہے روح کا جسم سے مربوط رہنا ہی زندگی ہے۔ جب روح جسم سے نکل جاتی ہے جسم دینوی کائنات سے فارغ ہو جاتا ہے۔ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ مردہ بن جاتا ہے۔ بے جان لاش قرار پاتا ہے۔ اس کی یہ دنیا منقطع ہو جاتی ہے۔ روح سے جسمانی زندگی ہے۔ روح خارج تو جسم مردہ۔ جو لوگ خواب میں روح جسم سے نکال دیتے ہیں، غلطی پر ہیں روح اللہ کا حکم ہے۔ حکم ربی ہے۔ اللہ کے حکم سے ایک خاص عملِ تولید کے بعد جسم میں منتقل ہوتی ہے اور روح اور جسم ملکر اس دارِ فانی میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کی اس جلوہ گری کے لیے بھی ایک وقت متعین ہوتا ہے۔ اس متعینہ وقت پر روح جسم کو چھوڑ دیتی ہے جسے ہم قضا، یا موت کا نام دیتے ہیں۔ یہ موت بھی اللہ کا حکم ہے جو روح کو جسم سے کھینچ لیتا ہے۔

اس بحث کا مقصد یہ بتانا مقصود تھا کہ روح جسم کو کسی حالت میں، کسی وقت موت سے پہلے نہیں چھوڑتی۔ اس لیے یہ کہنا کہ نیند کی حالت میں روح جسم کو چھوڑ کر خوابوں میں چلی جاتی ہے،

سراسر غلط ہے۔روح جسم سے موت تک لحہ بہ لحہ منسلک رہتی ہے۔

خواب کی حالت میں جسم یا دماغ کے ایسے خلیے یا سیل بیدار ہوتے ہیں جو بیداری کی حالت میں سوئے رہتے ہیں۔وہ خلیے یا سیل دماغ کو زندہ رکھنے کے لیے کچھ اعصاب کو متحرک کر دیتے ہیں۔وہ مخصوص اعصاب متحرک ہوکر یا تو واقعات دیکھنے لگ جاتے ہیں یا ایسے خیالات کو ترتیب دینا شروع کر دیتے ہیں جو دیکھنے میں نئے اور پرانے واقعات کی آمیزش پر مبنی ہوتے ہیں۔روح جسم سے لحہ بھر کے لیے موت تک جدا نہیں ہوتی۔اس لیے روح کا جسم سے جدا ہوکر معراج جیسے مقامات تک پہنچنا ممکن نہیں اور معراج جیسے مافوق الفطرت واقعہ کا جسم کے بغیر وقوع پذیر ہونا ممکن نہیں۔

10- قارئین!! معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک معجزہ ہے۔معجزات صرف نبیوں سے متعلق ہیں۔نبوت ورسالت کا انکار معجزے سے بھی انکار کرتا ہے۔معراج کو خواب قرار دینا یا صرف روح سے منسلک کرنا معجزہ سے انکار کرنے کا سرد اور عالمانہ انداز ہے۔اس لیے معراج النبی کو من وعن آنکھیں بند کر کے بغیر کسی وضاحت کے تسلیم کر لینا ہی ایمان ہے۔

11- دنیا میں ہمیشہ مختلف مذاہب کی پیروی کرنے والے موجود رہے ہیں اور ہر مذہب میں ایسے عقائد موجود رہے ہیں جنھیں علم فزکس یا علم طبیعات کے اصولوں پر پرکھنا ممکن نہیں۔جیسا کہ آگ کا کام جلانا ہے،مگر ابراہیم علیہ السلام کو نہیں جلا سکی۔چھری کا کام کاٹنا ہے،اسماعیل علیہ السلام کو نہیں کاٹ سکی۔وہی چھری جو اسماعیلؑ کی گردن پر بے کار ثابت ہوئی دنبے کی گردن پر فوراً چل گئی۔

پانی کا کام ڈبونا ہے جو موسیٰؑ اور ان کے بارہ قبائل کے لیے راستے بنا کر پار اُتار دیتا ہے۔اسی وقت،اسی جگہ فرعون اپنے لاؤلشکر سے گزرنا چاہتا ہے تو اسے غرق کر دیتا ہے۔اسی طرح بنی اسرائیل کے لیے جنت سے پکے پکائے کھانے آجانا موسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا سلیمان علیہ السلام کا ہواؤں سمیت تمام مخلوقات پر حکومت کرنا تمام مخلوقات کی ضیافت کرنا اور تمام مخلوقات کے لیے پکایا جانے والا کھانا ایک مچھلی کا ایک نوالہ کر لینا صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا بچے سمیت آناً فاناً پہاڑوں سے پیدا ہو جانا اس کا قومِ صالحؑ کے تمام کنویں خشک کر دینا اور اسے مارنے کی صورت میں قوم پر عذاب الٰہی نازل ہو جانا کس لیبارٹری میں پرکھا جا سکتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش کونسی سائنس،کونسی طب،کونسی فزکس مانے گی۔کس کس کو سائنسی حوالوں سے ثابت کر کے منواؤ گے۔فزکس اور طبیعات تاریخِ انسانی میں جلوہ

افروز ہونے والے کون کون سے معجزات سائنسی کسوٹی پر حل کرے گی۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک معجزہ ہے جس طرح پہلے ادیان میں معجزات رونما ہوئے تو انھیں عقیدے اور ایمان کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے معجزے کو بھی عقیدہ اور ایمان سمجھ کر ہی تسلیم کرنے میں بہتری ہے۔

بہر حال اس علمی اور منطقی بحث کے بعد بات کھل کر سامنے آ گئی کہ آپ کا سفرِ معراج خوابی یا روحانی نہیں، بلکہ بجسدہٖ یعنی جسم کے ساتھ تھا۔ اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں، وہ جو کرنا چاہے کر لیتا ہے اور ہاں ماننے یا نا ماننے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی مان لے تو اس میں ماننے والے کا اپنا ہی فائدہ ہے۔ نہ ماننے والا خسارے میں رہے گا۔

اللہ کو اللہ ماننا ایک عقیدہ ہے، علم نہیں۔ اسی طرح انبیاء اکرام اللہ کی طرف سے ہیں۔ رسول کو رسول اللہ ماننا ایک عقیدہ ہے، علم نہیں۔ فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں انھیں تسلیم کرنا عقیدہ ہے، علم نہیں۔ اگر کوئی کہے میں اللہ کو اللہ ماننے سے پہلے اللہ کا علم حاصل کرنا یا اللہ کو جاننا ضروری سمجھتا ہوں تو یہ بیوقوفی ہے، نادانی ہے۔ حکم ماننے کا ہے، جاننے کا نہیں۔ حکم تسلیم کا ہے تصدیق کا نہیں۔ جب پہلے حکم سے انکار کر دیا تو پھر ماننے نہ ماننے، جاننے نہ جاننے ایک ہی بات ہے۔ بس جی اپنے یقین و ایمان کی فکر کرو۔ اعتراض کرنے والے اللہ پر بھی اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ رسولوں کے زمانے سے لے کر اب تک اعتراض کئے جا رہے ہیں۔ ان کا کوئی علاج نہیں انھیں اپنی کرنے دو۔ تم اپنے ایمان پر ڈٹے رہو۔ اللہ کو بہتری منظور ہوئی تو خود بخود راستے نکال دے گا۔

اس سے پہلے عقل اور منطق کے حوالے سے معراج پر کافی بحث ہو گئی اور عقلی اور منطقی دلائل و براہین سامنے آ گئے اب ذرا سائنس اور علم کے پردے اٹھا کے دیکھیں، وہ خود کیا ہے جو عجیب و غریب قسم کے اعتراضات باندھے جا رہے ہیں۔

—(((الحمد للہ)))—

Marfat.com

معراج النبیؐ کا سائنسی جائزہ

سائنس بذات خود نامکمل تھی، نامکمل ہے اور نامکمل رہے گی۔ یہ ہمیشہ سے معلوم کی تلاش میں ہے۔ اس کا جو معلوم ہے، وہ محدود ہے۔ نامعلوم کی وسعت، گہرائی، طول وعرض ہی نامعلوم ہے۔ گویا نامعلوم نامعلوم وقت تک دراز ہے۔ اس نامعلوم کی حدود ہیں۔ بہت کچھ معلوم ہو جانے کے بعد بھی نامعلوم نامعلوم ہے۔ بہت کچھ اور معلوم ہونے کے بعد بھی نامعلوم نامعلوم ہی رہے گا۔ اس لیے معلوم یا حاصل کی بنیاد پر نامعلوم کا تعین ممکن نہیں۔ نہ جانے جو معلوم ہو گا وہ کتنا اور کس وقت تک کے لیے ہو گا۔ اس لیے اگر معلوم ہو گیا تو بھی اسے معلوم کہنا ممکن نہیں۔ کیا معلوم جو معلوم ہے، وہ کتنا ہے۔ اس کی مقدار کتنی ہے اور کس وقت تک ہے بس یہی کہنا بہتر ہو گا۔

ٹھہرتا نہیں ہے کاروانِ وجود

موجودہ دور علم سائنس کا دور ہے۔ ہر بات سائنسی کسوٹی پر رکھی جاتی ہے، حالانکہ ہر بات سائنس نہیں ہوتی۔ سائنس کے اپنے مطلق کلیے، نظریے اور اضافتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ کوئی بھی سائنسی نظریہ حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ جب سائنس کے اپنے پیش کردہ نظریات حرفِ آخر نہیں تو عقائد کو سائنسی تجربہ گاہ میں لانا سراسر نادانی اور جہالت ہے۔ عقائد وقت کے ساتھ بدلتے نہیں یا بدلے نہیں جاسکتے۔ مثلاً عقیدہ توحید آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک ایک چلا آ رہا ہے اور قیامت تک یونہی اور اسی حالت میں چلتا رہے گا۔ عقیدۂ آخرت جو اصحابِ کہف کے وقت تھا، وہی آج ہے اور یہی قیامت تک رہے گا۔ یہ سائنس کو شرف حاصل ہے جو پرانے اصول بتدریج ختم کر کے نئے اصول اپناتی جاتی ہے۔ چونکہ سائنس ایسا نہ کرے تو سائنس سائنس نہ رہے۔ یہی عمل اس کی زندگی کا ضامن ہے۔

یاد رکھیے سائنس کوئی مذہب نہیں رکھتی اور عقائد کسی نہ کسی مذہب کا حصہ ہوتے ہیں۔ سائنس اپنے کلیے اور اضافتیں بدلنے سے سائنس بنتی ہے۔ جبکہ عقیدہ میں معمولی تبدیلی بھی اسے ایمانیات سے خارج کر دیتی ہے۔ اس اختلاف کے باوجود سائنس اور عقیدے میں مماثلتیں بھی

موجود ہیں۔

مثلاً عقیدہ قوانینِ فطرت کا عکاس اور مظہر ہوتا ہے جبکہ سائنس چھپے ہوئے قوانینِ فطرت کی تلاش میں رہتی ہے۔ عقائد کے ذریعے معلوم قوانین فطرت کی جستجو میں رہتی ہے۔ عقائد میں موجود اسرار و رموز کو جاننے میں لگی رہتی ہے۔ بہرحال دونوں کے اپنے اپنے معیار ہیں ان کے مطابق ہی عمل پذیر رہتے ہیں۔

آیئے ذرا سائنسی کاروانِ وجود پر بھی نظر ثانی کر کے دیکھیں۔ ارسطو کہتا ہے حقیقت کی تلاش کے لیے ہمیں فطری اصولوں کی پیروی کرنی چاہیے۔ مثلاً یہ ایک فطری اصول ہے کہ ہر چیز ایک مقام رکھتی ہے۔ نیچے گرنے والی چیز کا اصل مقام ہی زمین ہے۔ دھواں ہمیشہ اوپر اُٹھتا ہے۔ اس کا مقام ہی فضا ہے۔ بقول شاعر ؎

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود

آئن سٹائن کے بقول خلا میں کوئی ایسا معیار نہیں جو مطلق ہو۔ کسی نسبت تناسب سے اس کی پیمائش ممکن نہیں۔ وقت کا بھی کوئی پیمانہ نہیں۔ اس کا تعین بھی صرف ''ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا'' سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ابد کب سے ہے۔ ازل کب تک رہے گا۔ تعین ناممکن ہے۔ بقول اقبال:

ازل اس کے پیچھے ابد اس کے سامنے

ذرا اور جامعیت کے ساتھ اقبال ہی فرماتے ہیں:

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

آئن سٹائن مزید کہتا ہے۔ نظام الارض اور نظام السمٰوت مکمل ہم آہنگی اور ربط کے ساتھ حرکت پذیر ہیں۔ فضائے بسیط میں نہ حدود ہیں، نہ سمت۔ اس لیے تکوینی نظام کی اصلی رفتار معلوم کرنے کے لیے روشنی کی رفتار کو معیار قرار دینا بے معنی ہے۔ فضائے بسیط کا مطلق معیاری پیمانہ معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ بقول غالب:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

نوٹ (یہ اقوال بلاوجہ بیان نہیں کیے جا رہے۔ عرض کرنے کا مقصد سائنس کے ہر رخ سے یارائے کی تصویر کشی کرنا اور معراج جیسے عقائد کی عظمت اور سائنس سے تجزیاتی مطالعہ پیش کرنا

ہے۔

گلیلیو کے مطابق کائنات کے سارے نظام میکانکی (Magnatic) عمل کے تابع ایک ہی سمت میں متحرک ہیں۔

دو ہزار برس تک تو سائنس خیالی نظریات کے تار و پو بنتی رہی۔ ارسطو سے دو ہزار سال بعد جب اٹلی پہنچی تو انھوں نے جدید سائنس کی بنیاد نظریات کی بجائے ٹھوس تجربات پر اٹھائی۔ سولہویں صدی عیسوی میں گلیلیو اور اسحاق نیوٹن نے جو تجربے کیے اور جو نتائج اخذ کیے، ان سے میکانکی تصور نے جنم لیا۔ یہاں سے سائنس ایک نیا موڑ مڑی۔ پرانے تصورات ختم ہوتے چلے گئے۔ نیوٹن نے مشاہدات سے روشنی کی رفتار کشف کی۔

انیسویں صدی عیسوی میں نیوٹن کے نظریات کی بنیاد بھی ڈگمگانے لگی۔ اس کے بعد آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت مرتب کیا۔ جس سے زمان مکان اور وقت کی بحث نکلی۔ 1900ء سے 1927ء کے لگ بھگ دو اور نظریے دنیا کے سامنے آئے جن سے ایک بار پھر سائنس کی بنیادیں ہل گئیں۔ ایک کا تعلق کوانٹم (Quantum) یعنی مادہ اور مقدار کی بنیادی اکائیوں کے متعلق تھا اور دوسرا اضافیت (Relativity) یعنی کائنات کی ساخت اور اس کے نظام سے تھا۔ اسی تصور کو آئن سٹائن نے آگے بڑھا کر زمان و مکان اور وقت کے دائرے میں پھیلا دیا۔

بہر حال یہ ہے سائنس کے وقت کے ساتھ بدلتے رُخوں کا خاکہ جبکہ عقیدے اپنی پہلی حالت میں قیامت تک قائم رہنے والی چیز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا علم کسی کو دینا چاہا، تصورات کے ذریعے کشف کر دیا۔ نظریہ اضافیت کے مطابق کسی واقعہ کے زمان و مکان کا صرف اسی وقت تعین کیا جا سکتا ہے جب اس کے ''مکان'' کا بھی حوالہ لیا جائے۔ اسی سے یہ اصول مرتب ہوا کہ اگر کوئی قدرت کے مظاہر کو اس طرح پیش کرنا چاہے کہ اس کے نتائج کا ساری کائنات پر اطلاق کیا جا سکے تو پہلے اسے وقت اور فاصلہ کو متغیر (Verriable) مقدار مان کر آگے بڑھنا ہوگا کیونکہ وقت کی طرح فاصلہ کا تصور بھی اضافی ہوتا ہے۔ وقت کا لحاظ رکھے بغیر فاصلہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے خیال کے مطابق زمینی اور سماوی نظام کے درمیان اگر کسی چیز کا وقت یا فاصلہ معلوم کرنا مقصود ہو تو متعلقہ جگہ پر متعین گھڑی کے پیمانوں اور فرق کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے مثلاً ہم لاہور اور سعودی عرب کے وقت کو دیکھیں تو تین ساڑھے تین گھنٹے کا فرق نظر آئے گا سعودیہ سے امریکہ کے وقت کا موازنہ کرنا چاہیں تو شاید آٹھ دس گھنٹے کا فرق نظر آئے۔ اس لیے جس مقام سے وقت یا فاصلہ معلوم کیا جانا مقصود ہے اور جس جگہ تک فاصلے کا تعین کرنا چاہتے ہو، اس جگہ کا

Marfat.com

وقت یعنی دونوں مقامات کے درمیان گھڑی کی سوئیوں کے فرق کو معلوم کیا جانا ضروری ہے۔ زمینی پیمانہ ایک ہونے کے باوجود گھڑی کی سوئیوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک مختلف ہے تو نظامِ ارضی اور نظامِ سماوی کے تو پیمانے ہی بدل جاتے ہیں۔ اگر کوئی سائنس دان زمین و آسمان کے درمیان کسی وقت اور فاصلے کا تعین کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ متعلقہ سیارے پر چلنے والی گھڑی کا پیمانہ معلوم کرے اور پھر اپنے مقصود تک غور وفکر کرے۔ زمین سے زمین تک گھڑی کی سوئیوں میں گھنٹوں اور دنوں تک کا فرق ہے آگے بڑھیں تو سماوی نظامِ قدرت میں پیمانے ہی بدل جاتے ہیں مثلاً:

حیات عیسیٰ علیہ السلام سے پتا چلتا ہے کہ انھیں زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا گیا۔ انھوں نے دنیا میں دوبارہ جلوہ افروز ہونا ہے۔ ابھی وہ چوتھے آسمان پر بقیدِ حیات ہیں۔ جس آسمان پر وہ جلوہ افروز ہیں۔ وہاں وقت کا پیمانہ اور ہے۔ اس آسمان کا ایک دن ہمارے زمینی ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اگر ہم عیسیٰ علیہ السلام کے زمین سے اٹھائے جانے سے اب تک وقت کا تعین کرنا چاہیں تو دو طریقوں سے کرنا پڑے گا۔ زمینی حساب سے اور آسمانی حساب سے۔ زمینی حساب سے تو انھیں 2006ء سال ہو چکے ہیں جبکہ آسمانی وقت کے حساب سے ابھی آسمانوں پر دو دن گزرے ہیں اور تیسرا ابھی طلوع ہو رہا ہے۔

قارئین!! یقیناً جہاں ایک دن ایک ہزار سال کا ہے، یقیناً وہاں کی فزکس اور طبعیات مختلف ہوگی۔ وہاں مخلوقات کی عمریں لمبی ہیں۔ وہاں کی خوراک، آب و ہوا اور ماحول کے اثرات بھی جسموں پر مختلف ہوں گے۔ علاوہ ازیں فزکس کے حوالے سے رفتار کے جسموں پر اثرات بھی مختلف ہوں گے۔ زمین پر تو ایک صدی میں کروڑوں انسان معدوم ہو جاتے ہیں جبکہ وہاں گھڑی کی سوئیاں ہمارے ہزار سال میں ایک دن کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ یہی پیچیدگی معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھنے میں درپیش ہے، لیکن پھر قدرت کی عظیم و کبیر عظمتوں کو مانے بغیر نہیں بنتی۔

اللہ کی کائنات بڑی وسیع و عریض ہے۔ بہت کچھ معلوم ہو جانے کے بعد بھی شاید قیامت تک نامعلوم نامعلوم ہی رہے۔ کائناتِ بسیط انتہائی پر اسرار ہے۔ بے شمار اسرار کھل جانے کے بعد بھی شاید راز راز ہی رہے۔ جستجو سائنس کی حیات ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے!! آیئے سائنس کی تبدیلی کا ایک جائزہ اور ہو جائے۔

———(((اللہ اکبر)))———

ایک زمانہ تھا جب لوگ دن اور رات کو آٹھ پہروں میں تقسیم کر کے وقت کا تعین کرتے

Marfat.com

تھے۔ چار پہر دن اور چار پہر رات، بعدازاں دن کی گھڑیاں ایجاد ہوئیں۔ دن اور رات کا تعین گھڑیوں سے کیا جانے لگا۔ 18 گھڑیاں دن کی اور 18 گھڑیاں رات کی اور آج دن اور رات 24 گھنٹوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ گھنٹے منٹوں میں اور منٹ سیکنڈوں میں بدل چکے ہیں۔

ناپ تول کا نظام ادریس علیہ السلام سے شروع ہوا۔ سنا ہے کہ چیزیں باقاعدہ تولی جاتی تھیں۔ ان کے پیمانے معلوم نہیں ہو سکے۔ اس کے بعد سیر اور من کے باٹ ایجاد ہوئے جو بیسویں صدی تک رائج رہے۔ اب بھی دنیا کے اکثر ممالک میں رائج ہیں۔

اس کے بعد ماپ تول کا اعشاری نظام آیا جس میں سرساہی، رتی، ماشہ کی جگہ گرام اور ملی گرام نے لے لی، فاصلے ماپنے کے لیے انچ گز کرم فرلانگ میل اور منزل استعمال ہوتی تھی جس کی جگہ میٹر، ملی میٹر، فٹ اور کلومیٹر نے لے لی۔ الغرض سائنس اپنے پیمانے بدلتی رہتی ہے۔ عقائد اور ایمانیات پر سائنسی پیمانوں کا لاگو ہو جانا ضروری نہیں یا ایمانیات وعقائد کا ان پیمانوں پر پورا اترنا ضروری نہیں۔

جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر اٹھا لیے گئے ظاہر ہے ان کا آسمانی سفر کسی غیر معمولی رفتار سے ہوا۔ اب اگر ہم فزکس کے پیمانے اٹھا کے بیٹھ جائیں کہ وہ جی آسمانوں پر کیسے گئے کس رفتار سے گئے۔ مزاحمتِ ہوا (Resistance of air) نے ان پر اثر کیا یا نہیں۔ اگر اثر کیا تو کتنا کیا۔ کس حد تک کیا۔ اگر نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا۔ وہ جس جگہ پر بقیدِ حیات ہیں۔ اس جگہ کا ایک دن ایک ہزار سال کا ہے۔ کیوں ہے؟

کیسے ہے؟ یہ سب فضول اور احمقانہ باتیں ہیں۔ اللہ تو اس سے بھی زیادہ عظمتوں اور قدرتوں والا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی اصحاب کہف کی زندگی کا طبیعاتی تجزیہ کرنے لگ جائے تو بیوقوفانہ حرکت تصور کی جائے گی۔ ایسی ہی بیوقوفیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دکھا۔ وہ ایسے ہی لوگ تھے جو عقیدہ آخرت کو جھٹلا رہے تھے۔ جو کہتے تھے موت کے بعد انسان مر جاتا ہے۔ اس کی ہڈیاں اور گوشت گل سڑ جاتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے، انسان دوبارہ پھر جی اٹھے گا۔

انھیں لاشعور لوگوں کو دکھانے کے لیے عقیدہ آخرت کو زندہ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے صدیوں نیند کی حالت میں بغیر کھائے پیئے زندہ رکھ کر دکھا دیا کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جو کرنا چاہتا ہے، کر لیتا ہے۔ اس کی مرضی پر کسی کا عمل دخل نہیں۔ اس نے جو کرنا ہے اسے جھٹلانا ممکن نہیں۔ اس نے جو حکم دیا ہے، اسے من وعن ماننا اور اس کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی حق

Marfat.com

بندگی ہے۔

خدا کی تخلیق کردہ کائنات بڑی وسیع وعریض ہے۔ ہم زمینی اشیاء کے لیے روشنی کی رفتار کو آخری حد قرار دے سکتے ہیں۔ سماوی نظاموں کے بارے کچھ کہنے کے قابل نہیں۔ ہماری فکر اور بصارت ظاہر بین ہے۔ ہمیں خود اپنے باطن کا علم نہیں۔ سماوی نظام کے متعلق ہم جو کچھ بھی جانتے اور کہتے ہیں یا انبیاء کے ذریعہ بتایا گیا ہے یا پھر محض تخمین وقیاس پر مبنی ہے۔ اور قیاس تو قیاس ہے۔ سائنسی مفروضے یا کلیے کی طرح کسی بھی وقت غلط ثابت ہوسکتا ہے۔ سائنس کی بنیاد قیاس پر ہے منطق علم پر نہیں علم وہ ہے جو مطلق معلوم ہو۔ جس علم نے نامعلوم میں بدل جانا ہے اسے علم نہیں فن کہا جاسکتا ہے۔

ہمیں تو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آخرت میں ایک دن دنیا کے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ جس دنیا کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا، وہ دنیا اس دنیا سے کتنے ہزار گنا بڑی ہوگی۔ ہم محض سائنس کے قیاس سے اس کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ ہاں بند آنکھوں سے یقین کرلیں تو ساری کی ساری وسعتیں تحت الشعور میں سما جاتی ہیں۔

آخر میں تھوڑی سی ریاضیاتی میزان معلومات میں اضافہ کے لیے پیش کیے دیتے ہیں۔ آپ کی پیش کی جانے والی روایت کے مطابق براق نام کی ایک سواری پیش کی گئی جس کی رفتار کا ایک قدم حدِ نگاہ تک تھا حد نگاہ سے مراد نظر کی رفتار ہے۔ یہ اصول نیوٹن ہی کا مفروضہ ہے۔ روشنی کی رفتار نظر کی رفتار کے برابر ہے۔ نظر یا روشنی کی رفتار 286282 میل فی سیکنڈ ہے۔ سفرِ معراج رات کے ایک چوتھائی حصہ میں اختتام پذیر ہوا۔ چوتھائی حصہ تقریباً چار گھنٹے بنتا ہے۔ چار گھنٹوں کے 14400 سیکنڈ بنتے ہیں۔ فی ثانیہ نظر کی رفتار 286282 ہوئی۔ کل وقت x فی ثانیہ رفتار = کل سفر۔

286282x14400 = دو ارب اٹھائیس کروڑ چوبیس لاکھ ساٹھ ہزار آٹھ سو میل۔

لہٰذا چار گھنٹوں میں کل سفر دو ارب اٹھائیس کروڑ چوبیس لاکھ ساٹھ ہزار سفر بنا، مگر اس میں صرف سفر ہی سفر نہیں۔ بلکہ زیادہ وقت تعارف وملاقات اور چیزوں کے دیکھنے دکھانے میں بھی صرف ہوا۔ اگر ایک گھنٹہ سفر پر خرچ کیا جائے تو گھنٹے میں ستاون کروڑ ایک لاکھ بارہ ہزار ایک سو پندرہ میل سفر بنتا ہے

چنانچہ ایک گھنٹہ وقت تعین کر کے درج بالا سفر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ حتمی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اللہ ہی جاننے والا ہے۔ اس ذات کے ظاہری وباطنی معاملات میں کسی کو عمل دخل نہیں۔ آخر

میں فزکس کی اُلجھن بھی حل کیے دیتے ہیں۔ فزکس کہتی ہے کہ اتنی رفتار سے اگر کوئی چیز سفر کرے، ہوا کی مزاحمت کی وجہ سے رگڑ کا شکار ہو کر آگ کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ بظاہر سوال میں وزن ہے، مگر یہ سفر تین نفوس پر مبنی تھا۔ تینوں نفوس ہی جنس کے لحاظ سے مختلف تھے اور مختلف سیاروں کی مخلوقات میں سے تھے۔

پہلی چیز ہے مرکب جس کی جنس نوری، ناری یا خاکی کا پتا نہیں چل سکا، لیکن تھی وہ زمین کے علاوہ کسی اور سیارے کی مخلوق۔ دوسرے تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو انسانوں میں سے تھے اور تیسرے تھے، جبریل علیہ السلام جو نوری مخلوق میں سے تھے۔ اگر تینوں زمینی مخلوق ہوتے تو فزکس کی پریشانی بجا تھی۔ فزکس کے مفروضے اہلِ ارض پر اپلائی ہوتے ہیں۔ نوری خود نور سے ہیں یعنی روشنی سے روشنی اور آگ ہم جنس ہیں، اس لیے آگ روشنی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ جبریلؑ کی جسامت مختلف روایات کے مفاہیم کے مطابق خلاؤں پر محیط ہے۔ یہ عام سی بات ہے۔ اگر دو جسم سفر پذیر ہوں۔ ایک جسم سینکڑوں گنا بڑا اور دوسرا جسم سینکڑوں گنا چھوٹا ہو تو ہوا کی رگڑ بڑے جسم پر اثر انداز ہو گی۔ چھوٹے پر نہیں۔ بڑا جسم تو ویسے ہی چھوٹے جسم کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہوتا ہے۔ جبریل علیہ السلام کے جسم نے ویسے ہی آپ صلی اللہ علیہ کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ جبریلؑ چونکہ خود تو نور تھے۔ انھیں فزکس کی رو سے کوئی مسئلہ درپیش ہی نہیں تھا۔ آپ کو اگر فزکس کی رو سے کوئی مسئلہ درپیش تھا، وہ جبریلؑ کے جسمانی حصار میں ہونے کی وجہ سے ختم ہو چکا تھا۔ یہ محض فزکس کی خواہ مخواہ کی اُلجھن ہے، ورنہ کوئی معاملہ ہی نہیں۔

ایک گاڑی میں ایک مسافر سفر کناں ہے۔ سفری لحاظ سے دونوں سفر کر رہے ہیں۔ گاڑی بھی مسافر بھی۔ حرکتی لحاظ سے یا جسمانی لحاظ سے ایک متحرک ہے اور دوسرا ساکن یعنی گاڑی حرکت میں ہے اور مسافر غیر متحرک بیٹھا بٹھایا سفر کیے جا رہا ہے۔ گاڑی ہر قسم کی مزاحمت کا سامنا کر رہی ہے۔ سوار کو کسی مزاحمت کا سامنا درپیش نہیں۔ اس حوالے سے بھی دیکھا جائے تو راستے کی ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لیے براق جو تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بس سفر کرنا تھا، سو کر لیا۔ براق چونکہ کسی اور سیارے اور جنس سے تعلق رکھتا تھا، اس پر ہماری سائنس اور فزکس کے اصول اپلائی ہی نہیں ہوتے۔

محترم قارئین یہ مباحث تو اعتراضات کی گرہ کھولنے کے لیے ہیں، ورنہ ان کی کیا ضرورت ہے۔ یہی کافی ہے بلانے والے نے بلانا چاہا تو بلا لیا۔ بلانے والا قضا و قدر کا مالک اور عظیم و خبیر۔ اس کی عظمتوں کا تو شعور پانا بھی کم ظرفوں سے بعید ہے۔

Marfat.com

کسی نے فرعون سے کہا تیرے اقتدار کو موسیٰ ختم کرے گا۔ اس نے کہا میں اسے پیدا ہی نہیں ہونے دوں گا۔ اس نے اپنے ملک کے نومولود بچے مروانے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ ستر ہزار نومولود بچے قتل کروا دیئے۔ اس خوف سے کہ نہ موسیٰ پیدا ہو اور نہ میرا اقتدار چھینے۔

اس ربِّ عظیم و کبیر نے نہ صرف موسیٰ کو پیدا فرمایا، بلکہ فرعون ہی کے گھر اس کی اپنی بیوی کی گود میں پرورش کا اہتمام کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر میں پل بڑھ کر فرعونیت کے خاتمہ کا سبب بنے۔ روکنے والے ہزار ہا جتن کر کے بھی تدبیرِ خداوندی کے نفاذ کو نہ روک سکے۔ خدا کے معاملات میں کسی کو دخل نہیں۔ وہ سب کچھ کرنا جانتا ہے۔ اس نے نہ معلوم اس کائنات کے حقائق میں سے کتنے چھپا رکھے ہیں۔ کتنے سربستہ راز سائنس، عقل، علم اور منطق کی حدود سے، نظر کی بصارت سے فکر کی رسائی سے دُور مدفون پڑے ہیں۔ نہ جانے کون کون سے رموز ہر چیز کے فنا کا نظارہ کر کے خود بھی فنا ہو جائیں گے۔ باقی رہ جائے گا نام اللہ کا:

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
(اقبال)

فطرت کے راز ہائے بستہ اور حقائق کی حقیقت بیان کرنا بھی فطرت کے خلاف سر اٹھانے کے مترادف ہے۔ اس لیے استغفر اللہ کے ساتھ بحث ان عظیم الفاظ میں ختم کرتے ہیں:

هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَبِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

مفہوم: اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا
(اقبال)

———(((الحمد للہ)))———

سفرِ طائف اور جنوّں کا قبولِ اسلام

مشرکینِ مکہ کو سفرِ معراج والی بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے دل و دماغ میں اسلام دشمنی کا ایسا زہر بھر چکا تھا جس کا تریاق کسی کے پاس نہ تھا۔ وہ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی جان لینے پر تل گئے۔ انھی دنوں قبیلہ بنی حنیفہ کے چند لوگ مکہ میں وارد تھے۔ مشرکین نے بنی حنیفہ میں سے ایک کرایے کا قاتل تلاش کر لیا یعنی ایک آدمی کو ہادیِ برحق سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے (نعوذ باللہ) قتل کے لیے اجیر کر لیا۔

آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس سازش کی خبر پہنچا دی اور حکم دیا کہ مکہ سے نکل جائیں۔ آپؐ راتوں رات طائف کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس وقت طائف بلادِ عرب کا خوبصورت سرسبز اور خوش فضا مقام تھا۔ یہ مکہ کے جنوب میں واقع تھا اس دور میں سواری اونٹ خچر یا گھوڑے کی تھی۔ اونٹ کے ذریعہ طائف کا سفر دو دن کا تھا اور خچر یا گھوڑے پر ایک دن میں کٹ جاتا تھا۔ یہ شہر سطح سمندر سے اٹھارہ سو میٹر (1800) کی بلندی پر واقع ہے۔ وہاں میٹھا پانی وافر مقدار میں موجود ہے۔ بارشیں بھی معمول سے زیادہ ہوتی تھیں۔ مکہ اور نواحِ مکہ کے دولت مندوں نے اکثر وہاں باغات، سیرگاہیں اور حویلیاں تعمیر کر رکھی تھی۔ طائف کے لوگ بڑے امیر اور مالدار تھے۔ عام عرب کی نسبت ان کا معیارِ زندگی بڑا بلند تھا۔ ان کے پیشے زمینداری تجارت اور سودخوری تھے۔ ان دنوں اہل طائف اونٹنی کے دودھ اور کھجور کی بجائے گندم کی روٹی استعمال کرتے تھے۔ معاشی لحاظ سے مضبوط ہونے کی وجہ سے باقی عربوں کی نسبت عام پریشانیوں سے فارغ تھے۔ اس لیے وہ لوگ اپنا کچھ وقت عیاشی و فحاشی اور فن و ہنر مندی پر خرچ کر دیتے تھے۔ ان دنوں نواحِ عرب جہالتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ نواحِ عرب میں ایک ہی حکیم[39] تھا جو طائف کا رہنے والا تھا جس کا نام حارث بن کلدہ تھا۔ اس نے یہ فن ایرانیوں سے سیکھا تھا۔

اس کے علاوہ عرب کا اکلوتا مُنجم، فلکیات کو علمی طور پر جاننے والا عمرو بن اُمیہ، بھی طائف کا

ہی رہنے والا تھا۔

قارئین! یاد رہے شہر طائف کا پرانا نام "واج" تھا۔ لفظ طائف کے لغوی معنی دیوار یا حصار کے ہیں۔ واقعہ یوں ہوا کہ طائف کے ایک باشندے نے شاہِ ایران کے لیے کوئی انتہائی خدمت انجام دی۔ شاہِ ایران نے خوش ہو کر کہا۔ مانگو جو مانگنا ہے۔ اس نے کہا اے بادشاہ سلامت: تم اگر مجھے عرض کرنے کی اجازت دیتے ہو تو میں اپنے شہر واج کے گرد دیوار تعمیر کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔

اس درخواست پر شاہِ ایران نے آزمودہ کار معمار بھیج کر شہر کے گرد دیوار تعمیر کروا دی۔ اس کے بعد اس شہر کا نام واج کی بجائے "طائف" یعنی "محصور یا دیوار" والا ہو گیا۔ عرب کے بدنام زمانہ بتوں میں سے تیسرے نمبر کا بت "لات" بھی اسی شہر میں ایک ٹیلے پر رکھا ہوا تھا۔ اس ٹیلے کو مقدس تصور کیا جاتا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف پہنچ کر عبد یالیل کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ شخص حضرت عبدالمطلب کا چچا زاد بھائی تھا۔ آپؐ کے دادے کا بھائی سمجھ کر اس کے گھر گئے تھے، مگر اس نامعقول نے ملنے سے انکار کر دیا۔ نہ صرف ملنے سے انکار کر دیا، بلکہ اپنے نوکروں اور شہر کے اُوباش لڑکوں کو پتھر مارنے کا حکم دیا۔ عبد یالیل کے ملازموں اور شہر کے اُوباشوں نے آپؐ کو پتھروں سے لہولہان کر دیا، یہاں تک کہ خون آپؐ کے جوتوں میں جم گیا۔ مجبوراً آپؐ طائف کے ایک باغ میں چھپنے پر مجبور ہو گئے۔ عبد یالیل کے نوکر آپؐ کو کھو کر واپس چلے گئے۔

یہ باغ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کا تھا۔ وہ خود آپ سرکارؐ کے انتہائی دشمنوں میں سے تھا۔ وہ مکہ کا رہنے والا تھا۔ آپ کو پناہ نہیں دینا چاہتا تھا اور نہ ہی اس نے پناہ دی۔ اس کے غلام یا اس باغ کے مالی کو آپؐ کی حالت پر رحم آ گیا وہ انگور کا گچھا توڑ کر لایا اور پیش کیا۔

آپؐ نے دعوتِ باغ قبول فرمائی اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا۔

وہ غلام مسیحیت کا پیروکار تھا۔ بسم اللہ کے الفاظ سن کر حیران رہ گیا۔ پوچھنے لگا آپؐ مسیحی ہیں۔ آپؐ نے کہا: "نہیں" وہ غلام کہنے لگا یہ کلام تو ہم مسیحیت کے پیروکاروں کا شعار ہے۔ اگر آپؐ مسیحی نہیں تو پھر یہ بسم اللہ کے کلمات آپؐ کی زبان پر کیسے آ گئے۔

آپؐ نے فرمایا میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہوں۔ وہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ میں ان لوگوں کو اللہ کی واحدانیت کی طرف بلاتا ہوں۔ اسی لیے یہ لوگ مجھے پتھر مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔

Marfat.com

اس عیسائی غلام کا نام "عدس" بتایا جاتا ہے۔ اس نے کہا میں عیسیٰ علیہ السلام کا ماننے والا ہوں۔ خدائے یکتا کی پوجا پر یقین رکھتا ہوں۔ اگرچہ انگور پیش کرنے کے لیے مجھے عتبہ بن ربیعہ نے کہا ہے، مگر وہ کسی صورت آپؐ کو پناہ نہیں دیں گے۔ اس لیے آج رات کی تاریکی میں آپؐ کا یہاں سے نکل جانا ضروری ہے کیونکہ لوگ آپؐ کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔ یہاں سے بحفاظت نکلنے میں میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔

پھر رات کو آپؐ "عدس" کی مدد سے بحفاظت حدودِ طائف سے نکل کر مکہ کی حدود میں داخل ہوئے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھوکے پیاسے، اوپر سے جسم زخموں سے چور، حدودِ مکہ میں داخل ہوئے۔ تو آپ کا بال بال چھدا ہوا تھا۔ جسمِ اطہر کا رواں رواں درد سے کراہ رہا تھا، مگر صدقے جائیں آپؐ کے حوصلوں اور جذبوں کے۔ کیا مجال جو ایک لفظ بھی شکوے یا شکایت کا منہ سے نکلا ہو۔ جبریلِ امین آتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہو تو اس شہر طائف کو زمین سے اٹھا کر اُلٹ دوں۔ رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب سنیے۔ آپؐ نے انتہائی ترحمانہ انداز میں کہا: نہیں نہیں جبریل ایسا نہ کرنا۔ شاید ان کی آئندہ نسلیں ہی ہدایت یاب ہو جائیں اور پھر آپؐ نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے اور انتہائی ہمدردانہ اور رقّت انگیز انداز سے طائف والوں کے لیے اپنے ربّ کے حضور مناجات کیں۔

آپؐ نے طائف سے نکل کر نواحِ مکہ میں مقام "بطنِ نخلہ" میں قیام کیا رات کا وقت تھا۔ ہر طرف خاموشی اور تاریکی کا دبیز پردہ تھا۔ یہاں آپؐ نے سورہ مریم کی تلاوت شروع کر دی۔ انسانیت کا دردسوز بن کر اور حالیہ واقعات کی تکالیف نے انتہائی گداز کی صورت اختیار کر لی۔ اوپر سے زبانِ مبارکہؐ سے الحان کے ساتھ اُترنے والے الفاظ نے خاموش فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ تاریکی کے پردوں میں لپٹی فضائے بیکراں کا ذرہ ذرہ مرتعش ہو گیا ہو گا۔ کیا پُر کیف سماں ہو گا جس کی کیفیات الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

فضائے بیکراں میں جنوں کی ایک جماعت آوارہ عناں تھی۔ ان کے کانوں تک قرآنی الفاظ کی دردوسوز میں گندھی آواز پہنچی تو وہ ثانیہ بھر بھی دور نہ رہ سکے۔ فوراً خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اس واقعہ کی تصدیق کی۔ "سورۃ احقاف" میں یوں اپنے رسول کی حوصلہ افزائی کی:

"اور وہ وقت آن پہنچا۔ ہم نے جنوں کی ایک جماعت تمہارے پاس بھیجی اور وہ جب

Marfat.com

قرآنی آیات سن کر حاضر ہو گئے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے خاموشی سے کان لگا کر سنو۔"

یاد رہے بطنِ نخلہ وہی مقام ہے جہاں آج کل "مسجد جن" واقع ہے۔ یہ جگہ آج کل زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔

یہاں ایک وضاحت کرتے چلیں۔ متشرقین کا اپنی آراء اور نظریات کو تاریخ اور سیرت میں سمونے کا ایک اپنا طریقہ ہے۔ وہ انتہائی عالمانہ انداز سے غلط قسم کے دلائل کو انتہائی سادگی سے واقعہ میں درج کر دیتے ہیں اور اکثر قارئین ان کی پرخار تحریر کو سادہ، عام فہم اور معقول سمجھ کر سر دھننے لگتے ہیں۔ مثلاً وہ جنات کے قبول اسلام والے واقعہ کو یوں سبوتاژ کرتے ہیں۔ ایک فرانسیسی متشرق نے لکھا ہے یہاں جنات سے مراد کوئی اور مخلوق نہیں، بلکہ جنگل کے لوگ ہیں۔ عرب کے صحراؤں میں رہنے والے اکثر افراد کو تہذیب (Civilisation) کا پتا نہیں ہوتا۔ ان خانہ انوں میں تہذیب وتمدن کی آشنائی نہیں ہوتی۔ اس لیے انھیں پہلی نظر دیکھنے سے کوئی عجیب وغریب مخلوق ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اس طرح کی دلیلوں سے وہ تاریخی حقائق اور تخلیقی سچائیوں کو چھپاتے پھرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ تجاہلِ عارفانہ ہے۔ اسلام میں رخنے ڈالنے کا عالمانہ سرد انداز ہے جو سراسر تاریخ کے ساتھ زیادتی ہے۔

جنات کے مخلوق ہونے کا عندیہ خود اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ دیا ہے جو قرآن پاک میں کئی جگہوں پر درج ہے۔ جنات انسانوں کی پیدائش سے بھی پہلے کی مخلوق ہیں۔ عقائد اور اعمال کے لحاظ سے انسان کے برابر کی مخلوق ہیں۔ اس واقعہ میں ان کو جنات کی بجائے جنگلی انسان کہنا اسلام، تاریخ اور سیرت رسولؐ سے سراسر زیادتی ہے۔ اس سوچ کے پیچھے متشرقین کی بچپن سے تربیت کی جانے والی انتہائی کٹر اسلام دشمن فکر کارفرما ہے، مگر ہمارے کم خواندہ قارئین جو اسلامی تاریخ وتمدن سے ناآشنا ہیں، ایسے ہی جملے پڑھ کر ایک طرف ان مصنفین کو غیر جانبداری کے تمغے سجاتے پھرتے ہیں۔ دوسری طرف اپنے ہم مذہبوں کی تحریروں میں کیڑے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔

یاد رکھیے اپنے خیالات ونظریات تحریروں میں ٹھونس دینے سے تاریخ نہیں بدلتی۔ تاریخ لوح بھی ہے، قلم بھی، یہ ماضی کے چہرے پر تختی کی طرح کنداں ہے۔ اسے تراش یا رگڑ کر مٹایا نہیں جا سکتا۔ انسان کی بہتری اور فلاح اسی میں ہے کہ تاریخ کو اس کے اپنے مخصوص انداز میں ہی زندہ رہنے دے۔ تاریخ کو اس کی حالت پر ہی چھوڑ دے تاکہ آئندہ نسلیں کماحقہٗ فائدہ اٹھاتی

Marfat.com

رہیں۔ اگر کسی نے ذاتی نظریات تاریخ میں ٹھونک دیئے تو پھر تاریخ تاریخ نہ رہے گی، بلکہ انسانی گروہ بندیوں کی طرح تعصبات کا گورکھ دھندا بن جائے گی اور آئندہ آنے والی نسلِ انسانی تعصب اور رجعت کا شکار ہو کر خود انسانیت کے خاتمے کا سبب بن جائے گی۔ ہاں معلومات میں اضافہ کے لیے نوٹ کیجئے تاریخ ایسا صحیفہ ہے جس کا اپنا کوئی مذہب نہیں۔ یکسر لادین ہے، مگر دنیا کے تمام مسترد ادیان اسی کی وجہ سے زندہ ہیں۔ اسی نے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اتنی غیر جانبدار ہے کہ اپنے آپ کو ہر قسم کے نظریاتی مفروضات سے محفوظ رکھتی ہے۔ اتنی بے وفا ہے کہ ہر صاحبِ اقتدار و اختیار اسے اپنا سمجھتا ہے، لیکن یہ کسی کی نہیں۔ اتنی ہرجائی ہے کہ ہر کس و ناکس سے آنکھیں لڑائے رکھتی ہے اور کسی کو احساس ہی نہیں ہونے دیتی کہ وہ کسی اور کی بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کا یہی انداز سب سے دلرُبا ہے۔ اسی میں انسان کی بقا اور دوام ہے۔ اس کو اپنا بنانے سے بہتر ہے کہ اسے آزاد ہی رہنا دیا جائے تاکہ آئندہ نسلِ انسانی اس کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکے۔

———(((اللہ اکبر)))———

عرب میں قبیلہ سے کٹ کر رہنا ناممکن تھا۔ آپؐ کے مدنظر اپنی ذات نہ تھی۔ اگر صرف اپنی ذات مدنظر ہوتی تو کچھ لے اور کچھ دے کر مشرکین کے ساتھ عہد باندھ کر آرام سے بیٹھ جاتے۔ ایسی حالت میں جبکہ مخالفین کی طرف سے بڑی بڑی پیش کشیں ہو چکی تھیں جن کا ذکر پچھلے ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ آپ کی نظر ان صحابہ اکرام پر تھی جو روز بروز غیر محفوظ ہوتے جا رہے تھے یا پھر آپ کی نظر انسانیت پر تھی جو اللہ کی نافرمانیوں کی وجہ سے دنیا و آخرت میں غیر محفوظ ہوتی جا رہی تھی۔ آپؐ کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا۔ آپؐ کی تمام تکلیفیں تمام درد، تمام پریشانیاں مقاصد کی عظمتوں میں دب گئیں۔

یہی وجہ تھی کہ آپ بھوک پیاس اور شدید زخمی ہونے کے باوجود تھکے نہیں۔ دنیاوی تکالیف کے آگے جھکے نہیں اور دنیاوی آسائشوں کے ہاتھوں بکے نہیں، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ عزم اور حوصلے کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے۔

طائف میں آپؐ کا ورود اللہ کے حکم سے تھا، اس لیے واپسی مکہ میں اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک اللہ کوئی نہ کوئی سبب نہ پیدا کر دیتا۔ اس لیے آپ نواح مکہ میں بیٹھ کر کسی نہ کسی سے حق جوار یعنی پناہ لینے کی کوشش کرتے رہے۔

Marfat.com

آپؐ نے سب سے پہلے اخنس بن شریک [40] کے پاس قاصد بھیجا۔ اخنس قبیلہ بنی زہرہ کا سردار تھا۔ اس وقت سردار قبیلہ چیف یا فیوڈل لارڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے جواب بھیجا کہ خواہش تو یہی ہے کہ آپؐ کو پناہ دی جائے، لیکن قبیلہ قریش کے ساتھ عہد و پیمان میں ہوں۔ ایک معاہدے میں منسلک ہونے کی وجہ سے پناہ دینے میں معذور ہوں۔

اس جواب کے بعد والیِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل بن عمر سے رابطہ کیا۔ وہ تھا تو قریش میں سے ہی، مگر اس کے قبیلے کی شاخ کا قبیلہ قریش سے بہت اوپر جا کے ملاپ تھا۔ سہیل بن عمرو [41] نے بھی معذوری ظاہر کر دی۔

ساقیِ کوثر صلی اللہ علیہ وسلم بطن نخلہ میں قیام پذیر رہے۔ یہاں تک کہ رجب کا مہینہ یعنی ایام حج شروع ہو گئے۔ آپؐ ایک ایک قبیلے کے سردار سے ملتے۔ قرآنی آیات سناتے۔ دنیاوی حشمت اور دنیا کے طول و عرض پر حکومت کی پیش گوئی سناتے اور اُخروی کامیابیوں کی ضمانت پیش کرتے۔ ان میں سے کچھ تو سن کر خاموشی سے اٹھ جاتے۔ کچھ مذاق اڑاتے اور کچھ (نعوذ باللہ) مجنون کہنا شروع کر دیتے۔ کسی نے آپؐ کی باتوں پر توجہ نہ دی۔ آفرین ہے آپؐ کی محنت لگن اور جذبوں پہ صد آفرین۔ پندرہ قبائلی سرداروں سے انکار سننے کے باوجود سولہویں کو دعوتِ اسلام پیش کی جا رہی ہے۔ سولہواں قسمت کا دھنی نکلا وہ نہ تو ہنسا اور نہ ہی اسے جھوٹ نظر آیا۔ یہ شخص اُس یثرب سے آیا ہوا تھا جس یثرب کو مدینۃ النبیؐ کے نام سے چار چاند لگنے والے تھے۔

قرآنی آیات سنتے ہی اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے باقی پانچ افراد کو آوازیں دے کر بلا لیا۔ ان پانچ افراد نے بھی جب قرآنی آیات سنیں تو ان کی حالت بھی دگرگوں ہوئی۔ وہ تمام حضرات مسلمان ہو گئے اور وعدہ کیا کہ ہم اپنے قبیلے کے باقی افراد کو بھی آپ کی بیعت میں لائیں گے۔

چند روز بعد ہادیٔ برحقؐ نے "نوفل" قبیلے کے سردار سے رابطہ کیا۔ اس نے آپؐ کو حق جوار دے دیا۔ یوں آپؐ بنی نوفل کی حمایت میں آنے کے بعد اپنے گھر میں رہنے لگے۔

آپؐ نے گھر واپسی کے چند دنوں بعد حضرت سودہؓ کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ یہ وہی سودہؓ ہیں جنھوں نے اپنے خاوند کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی اس کا خاوند مرتد ہو گیا تو محترمہ کو خطرہ لاحق ہوا، کہیں مجھے بھی عیسائی بننے پر مجبور نہ کر دے۔ انھوں نے طلاق لی اور واپس مکہ آ گئیں۔ تفصیلات ہجرت حبشہ کے باب میں بتائی جا چکی ہیں۔

Marfat.com

حضرت سودہؓ کے نکاح کے کچھ عرصہ بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا نے درخواست کی کہ آپؐ ان کی بیٹی عائشہ صدیقہ کو اپنی زوجیت میں قبول فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا عائشہ ابھی کم عمر ہے شادی کے قابل نہیں ہوئی۔

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا فی الحال آپؐ رشتہ قبول فرمالیں۔ حلقہ ازدواج میں بالغ ہونے پر داخل ہو جائے گی۔ آپ نے قبول فرمالیا، لہٰذا یہ نسبت 620ء میں قائم ہوئی۔ حضرت عائشہؓ وہ پہلی شخصیت ہیں جو مسلمان کے گھر مسلمان کی حیثیت سے داخل ہوئیں یعنی ان کے کان میں توحید کا پیغام سنایا گیا۔ رخصتی ہجرت کے بعد ہوئی۔

---(((الحمد للہ)))---

Marfat.com

اسلام کا پہلا حربی حلف

(بیعتِ عقبہ اول اور دوم)

مکہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی انتہائی کرب میں گزر رہی تھی۔ آپؐ ہر قسم کے جور و ستم برداشت کر رہے تھے۔ آپؐ کی حیاتِ مبارکہ کو ہر قسم کے خطرات لاحق تھے، مگر آپؐ نے ہر خطرے کی پروا کیے بغیر تبلیغی کام جاری رکھا۔

اس سال 621ء کو حج پر قافلوں کی آمد شروع ہوئی تو مدینہ سے بھی بارہ افراد پر مشتمل ایک جماعت حج پر پہنچی۔ یہ مدینہ کے دو قبائل کی نمائندہ جماعت تھی۔ دو افراد ایک قبیلہ سے اور دس افراد دوسرے قبیلہ سے تھے۔ انھوں نے مقام "عقبہ" پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ مدینہ کے حالات سے آگاہ کیا۔ وہاں اسلام کے پھیلاؤ کے امکانات پر تبادلہ خیال کیا۔

عقبہ مکہ اور منیٰ کے درمیان ایک گھاٹی کا نام ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسمٰعیل کو قربانی کے لیے ذبح کرنا چاہا۔ مشیتِ ایزدی سے اسمٰعیل کی بجائے ایک دنبہ ذبح ہو گیا۔ حضرت ابراہیمؑ اس مقام پر اسمٰعیل کو ذبح کرنے کی نیت سے تشریف فرما تھے۔ شیطان نے مختلف طریقوں سے روکنے کی کوشش کی۔ حضرت ابراہیمؑ اس کے بہکاوے میں نہ آئے، بلکہ انھوں نے مٹی کی مٹھی پھینکتے ہوئے لعنت بھیجی تو اللہ کی قدرت سے وہ پتھر ہو گیا۔ عربی میں اس مجسمے کو جمرا کہا جاتا ہے۔ یہ منیٰ میں اب بھی موجود ہے۔ آج حج پر جانے والے ان جمرات پر پتھر مارتے ہیں۔ یہ سنتِ ابراہیمی حج کے ارکان میں سے ہے۔

مدینہ سے آنے والے بارہ افراد عقبہ میں آپؐ سے ملے انھوں نے بتایا کہ مدینہ کے یہودی بھی پیشین گوئیاں کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں آخری نبی آنے والے ہیں وہ پیغمبر کی نسبت یہود سے کر رہے ہیں ہم ان کی باتیں سن کر شرمندہ ہوتے تھے کہ ہم میں سے کوئی نبیؑ نہیں۔ ہم سوچتے تھے کہ کاش ہم بھی اہلِ کتاب ہو جاتے۔ آج ہم بہت خوش ہیں۔ ہمیں بھی کتاب والا مل گیا۔ ہم بھی اہلِ کتاب ہو گئے۔

Marfat.com

اس کے علاوہ انھوں نے بتایا کہ آیاتِ قرآنی اہلِ مدینہ پر تیزی سے اثرات چھوڑ رہی ہیں۔ پچھلے سال سے اب تک کافی افراد اسلام کے قریب آگئے۔

بعدازاں سیاسی حالات زیرِ بحث آئے۔ انھوں نے بتایا کہ مختلف قبائل میں بادشاہ مقرر کرنے پر عارضی معاہدہ ہو چکا تھا۔ ایک زرگر نے تاج شاہی کے لیے عبداللہ بن اُبی کے سر کا ماپ بھی لے لیا تھا، لیکن کچھ قبائل کا خیال ہے کہ ہمیں سربراہی کے لیے بادشاہ کی ضرورت نہیں۔ کسی پیغمبرؐ کی ضرورت ہے۔ پیغمبرؐ چونکہ اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے، اس لیے وہ معاملات کو زیادہ بہتر انداز سے چلا سکتا ہے، اس لیے ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ کا تعلق چونکہ قریش سے ہے۔ آپؐ کے ننھیال ہم میں سے ہیں۔ آپؐ کے والد بزرگوار عبداللہ کی قبر مبارک بھی مدینہ میں ہے۔ اس لیے مدینہ والے آپؐ کو اپنے ہاں بلانے پر متفق ہیں۔ اہلِ مدینہ کے ذہنوں میں یہ بات ثبت ہے کہ ایک پیغمبرؐ باہمی اختلافات دور کرنے کے لیے بادشاہ یا رئیس سے بہتر ہے۔

آپؐ نے یہ باتیں سن کر کہا کہ تم میرے ساتھ بیعتِ ثانی کرنے پر تیار ہو۔ بیعت ثانی عرب میں ایسے معاہدے کو کہتے تھے جس میں قبیلہ یا قبائل ایسے شخص کے ساتھ معاہدہ کرتے تھے جس کا کوئی قبیلہ نہ ہو یا جو قبیلہ بدر کر دیا گیا ہو۔ معاہدہ کرنے والا قبیلہ اس شخص کو مکمل رکنیت دے دے۔

بعدازاں مدینہ کے ان دو قبائل کے نمائندوں نے حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی جگہ مقامِ عقبہ پر وفاداری کا عہد باندھا۔ اس بیعت کو بیعت النساء بھی کہتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ بیعت کرنے والا حلف اٹھائے گا کہ پناہ دینے والے کی حفاظت اپنے بال بچوں سے بھی زیادہ کرے گا۔

پھر جب انھوں نے حلف اٹھا لیا تو پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر تم لوگ اپنے حلف پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ تمھیں جنت نصیب فرمائے گا۔ اگر میرے ساتھ بے وفائی کی تو یہ اللہ کی مرضی پر چھوڑتا ہوں، وہ تمھیں سزا دے یا بخش دے۔

حج کی ادائیگی کے بعد جب وہ لوگ مدینہ لوٹنے لگے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک خاص نمائندہ تعلیم و تبلیغ کے لیے ان کے ساتھ کر دیا۔ وہ نمائندہ حضرت ابن عمیرؓ تھے۔ اس کی ذمہ داری اسلام میں داخل ہونے والوں کو قرآنی تعلیمات سے سرفراز کرنا تھا۔ یہ نوجوان صحابیؓ انتہائی خوش الحان تھے۔

Marfat.com

یاد رہے سب سے پہلے حرم شریف میں سورہ رحمٰن کی تلاوت اسی قاری نے انجام دی تھی جس پر مشرکین نے جناب ابنِ عمیرؓ کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کے بعد آپؐ نے انھیں یوں با آواز بلند تلاوت کرنے سے منع فرما دیا تھا۔

مدینہ میں تحریک اسلامی کے اثرات توقع سے زیادہ سرایت کر رہے تھے۔ 621 سنِ عیسوی کے اختتام تک ماسوائے یہودی قبائل کے باقی تمام قبائل میں اسلام پھیل چکا تھا۔ نوجوان قاری کی قرآن خوانی نے اپنا رنگ جما لیا تھا۔ ایک سال کے عرصہ میں یہودیوں کے علاوہ بیشتر مدینہ مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا۔ یہودی اگرچہ اسلام نہیں لائے تھے، مگر حضور نبی اکرمؐ کو مدینہ لانے پر متفق ہو چکے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے کم از کم ان کے باہمی لڑائی جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

ہجرت بہت انتہائی قدم تھا جس پر آپؐ اپنے آپؐ اور اپنے ساتھیوں کو آمادہ کر رہے تھے۔ آپؐ کو شدت سے احساس تھا کہ مدینے کی طرف قدم اٹھانے سے آپؐ مکہ سے یکسر کٹ جائیں گے۔ مکہ آپ کو انتہائی عزیز تھا۔ آپؐ یہ بھی احساس تھا کہ مدینہ پہنچ کر اسلام کے زیرِ اثر ایک نئے معاشرے کی تشکیل ہو گی۔ اس معاشرے میں گورے، کالے۔ امیر، غریب اور قبائلی تعصب کا امتیاز ختم ہو جائے گا اور معاشرہ ایک اُمّت کی حیثیت سے ابھرے گا۔ یقیناً یہ اُمّت ایک جسدِ واحد کی طرح دنیا کو اپنے حصار میں لے لے گی۔ اس کی راہنمائی میں پوری دنیا محفوظ و مامون ہو جائے گی۔

اس سال 622 سن عیسوی کو ایک بار پھر اہلِ مدینہ حج و زیارت کے لیے مکہ آئے۔ اس دفعہ حج کے علاوہ ان کا اور بھی مشن تھا ان کی جماعت کی تعداد پچھتر تھی جن میں تہتر مرد اور دو خواتین تھیں۔ مکہ پہنچ کر یہ تمام افراد خفیہ طور پر معروف گھاٹی عقبہ میں جمع ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی آیات تلاوت کرنے کے بعد بیعت کرنے کو کہا۔ ان حضرات نے گرمجوشی سے بیعت کی یعنی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر حالت میں حفاظت کا حلف اٹھایا۔ حلف لینے کے بعد سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آپ لوگوں نے میرے ساتھ معاہدہ کیا ہے کہ خطرے کی صورت میں اپنے آل اولاد کی طرح میرا دفاع کرو گے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام کی ترقی و عروج کے لیے ہم جنگ کرنے پر مجبور ہو جائیں تو ایسی صورت میں کیا۔ آپ لوگ اللہ کی راہ میں تلوار اٹھا لو گے اور کیا تم میرے ساتھ جنگی معاہدہ یعنی ''بیعتِ حرب'' کرنے پر تیار ہو۔ انھوں نے عرض کیا یا حضرتؐ ہم تیار ہیں، لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ جب آپؐ فتح یاب ہو جائیں گے تو ہمیں چھوڑ کر کہیں

Marfat.com

مکہ نہ چلے آئیں۔ اس پر آپؐ نے بھی ان کے ساتھ معاہدہ کیا کہ تم مجھ سے ہو اور میں تم میں سے۔ اے اہلِ یثرب تمھارا خون میرا خون اور میرا خون تمھارا خون ہے۔ تمھارے ساتھ جنگ کرنے والا مجھے اپنے مقابل پائے گا۔ اللہ کی راہ میں پیکار کی صورت میں تم مجھے اپنے ہمرکاب پاؤ گے۔

یوُں اُن افراد نے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپؐ نے ان کے لیے بارہ سربراہ مقرر کیے جن میں نو افراد مختلف گھرانوں میں سے ایک قبیلے کے تھے اور باقی تین کسی اور قبیلے کے۔ اس کے بعد آپؐ نے اسلامی مساوات اور بھائی چارے کا درس دے کر ان لوگوں کو رخصت کر دیا۔

قارئین یہ اسلام کا پہلا جنگی معاہدہ تھا جو اہل مدینہ اور رسول اللہؐ کے درمیان ہوا تھا۔ یوں تو بیعتِ ثانی بھی جنگی معاہدہ ہے۔ لیکن وہ دفاعی قسم کا تھا۔ بیعتِ حرب سے مراد جارحانہ جنگ کا عہد ہے اس لیے ہم بیعت الحرب کو ہی اسلام کا پہلا جنگی معاہدہ کہیں گے۔ اس معاہدے کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے۔ اس کی وجہ سے ہی تاریخِ انسانی نے ایک نیا رُخ اختیار کیا۔ یہ معاہدہ ماہِ رجب سن 622ء میں وقوع پذیر ہوا۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نے ہمہ تن ہجرت کی تیاریاں کیں اور منصوبہ بندی شروع کر دی جسے ہم اگلے باب میں بحث کرتے ہیں۔

———(((الحمد للہ)))———

حواشی:

1- سورۃ انعام آیۃ 75
2- سورۃ بقرا آیۃ 260
3- سورہ اعراف آیۃ 143 سورہ کہف آیۃ 60 تا 82
4- سورہ تکویر آیۃ 23
5- سورہ نجم آیۃ 6 تا 9
6- سورہ نجم آیۃ 13 تا 18
7- بخاری۔ مسلم۔ طبقات ابن سعد۔
8- ابن ہشام۔ طبقات ابن سعد۔

9- ابن جریداور ابن اسحاق سے روایت ہے۔

10- مسلم شریف، ترمذی شریف۔

11- ابن ہشام، سیرت النبی۔

12- سیرت سرور عالم، ابن ہشام۔

13- سیرت سرور عالمؐ۔

14- ابن ہشام، سیرت النبیؐ۔

15- ابن ہشام جلد اول۔

16- ابن ہشام جلد اول۔

17- ابن ہشام، بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ۔

18- درج بالا تمام واقعات تھوڑے بہت لفظی اختلاف کے ساتھ سیرت، حدیث اور تاریخ کی تمام کتب میں درج ہیں۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے۔ بخاری، نسائی، ترمذی، ابوداؤد مسلم شریف، سیرت ابن ہشام، سیرت النبیؐ، سیرت سرور عالم، تاریخ ابن خلدون۔

19- ابن ہشام جلد اول۔

20- ابن ہشام جلد اول۔

21- ابن ہشام جلد اول، سرور عالمؐ۔

22- ابن ہشام جلد اول۔

23- بخاری کتاب الصلوٰۃ۔

24- سیرت سرور عالمؐ جلد اول۔

25- سورۃ بنی اسرائیل اور سورہ نوح کی تفاسیر میں تفصیلات موجود ہیں۔

26- بخاری، مسلم، ابن ہشام۔

27- تفسیر ابن کثیر جلد اول، تفسیر مظہری جلد اول، تفہیم القرآن جلد اول۔ آیۃ 284-285

28- مسلم۔ ترمذی، بخاری، ابن ہشام، سرور عالمؐ۔ سیرت النبیؐ۔

29- ابن ہشام۔

30- ابن ہشام جلد اول۔

31- ابن ہشام جلد اول، سیرت سرور عالم۔

Marfat.com

-32 ابن ہشام، بخاری، ترمذی۔

-33 ابن ہشام، بخاری۔

-34 سیرت سرور عالم، ابن ہشام۔

-35 بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی۔

-36 ابن ہشام۔

-37 بخاری۔ ابوداؤد۔ ابن ہشام۔

-38 ابن ہشام، سیرت النبیؐ، سیرت سرور عالمؐ، بخاری شریف، تاریخ طبری، تاریخ ابن خلدون، سیرت محمدؐ۔

-39 تاریخ ابن خلدون۔

-40 ابن خلدون، سیرت النبیؐ۔

-41 ابن خلدون، سرت النبیؐ تاریخ طبری۔

Marfat.com

باب:13

ہجرت

جداگانہ معاشرتی وعالمی تشخص

جداگانہ تشخص کے بغیر کوئی قوم بطور قوم یا ملت دنیا میں متعارف نہیں ہوسکتی۔ ایک منفرد تشخص ہی کسی قوم کو دنیا میں نمایاں کرنے کا ضامن ہوتا ہے۔ اس تشخص میں اس قوم کے نظریات، اس کے رسوم ورواج، طرز زندگی، معاشرتی ضابطے وغیرہ سب کچھ شامل ہوتے ہیں۔

اسلام چونکہ نظام حیات تھا۔ اس لیے اس کی تہذیب ومعاشرت کلی طور پر جداگانہ ہونے کا تقاضا کر رہی تھی۔ تربیتی لحاظ سے 13 سالہ مکی زندگی میں ماننے والوں کو پختہ کر دیا گیا تھا۔ اس تحریک کے جداگانہ نعرے۔ منفرد نظریے سکھائے جاچکے تھے۔

تاریخ میں عرب ہمیشہ قبائلی تقسیم میں منقسم رہے۔ کبھی سیاسی مذہبی یا تمدنی لحاظ سے پورا عرب کسی ایک نظریے کے زیر اثر، کسی مشترک سیاسی نظام پر یکجا نہیں ہوا۔ عرب ہمیشہ قبائلی ناہمواریوں میں پلتے بڑھتے رہے۔ معاشرتی اونچ نیچ ہمیشہ ان کا طرۂ امتیاز رہا۔

621 عیسوی اور[1] 622 عیسوی نہ صرف اسلامی تاریخ میں اہمیت رکھتے ہیں، بلکہ عالمی تاریخ میں بھی ایسے ہی اہم خیال کیے جاتے ہیں۔ جن سالوں میں دنیا یکسر مخالف سمت میں رخ (U-Turn) بدلتی نظر آتی ہے۔ بیعت الحرب کو تاریخ کا معمولی واقعہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ تاریخ کا غیر معمولی واقعہ ہے یہ معاہدہ آئندہ چند سالوں میں دنیا کی رفتار ہی بدل دیتا ہے۔ پوری دنیا کے تمام نظامہائے زندگی اس کے معمولی جھونکے سے خس وخاشاک طرح ہوا ہوتے نظر آتے ہیں۔

اس واقعہ کے چند ہفتوں بعد تاریخ نے دو نئی اصطلاحات سنیں۔ ایک اصطلاح ''مہاجر'' اور دوسری تھی ''انصار''۔ مہاجر یعنی ہجرت کرنے والے۔ انصار یعنی ''نصرت'' کرنے والے۔ ان دو اصطلاحات نے عربوں کی پرانی پہچان ہی ختم کر دی۔ قبائلی اونچ نیچ، رنگ ونسل، مقیم اور اجنبی کے

Marfat.com

امتیازات ختم کر کے معاشرتی پہچان کے دو نشان مقرر کر دیئے یعنی مہاجر یا انصار۔ اب کوئی مسلمان ان دو قبیلوں سے باہر نہ تھا۔ خواہ گورا تھا یا کالا، عربی تھا یا عجمی، غریب تھا یا امیر، وہ یا تو مہاجرین میں سے تھا یا پھر انصار یعنی مدینہ والوں میں سے۔

یہ دونوں طبقے نظریاتی لحاظ سے یکجان دو قالب تھے۔ اسلامی تاریخ ان دو طبقوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دیتی۔ اسلام کے پھیلاؤ میں کوئی ایک طبقہ دوسرے سے برتر نہیں گردانا جا سکتا۔

اس معاہدے کے تھوڑا عرصہ میں جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ تشریف فرما ہوئے تو انصار نے وہ عدیم المثال قربانی پیش کی کہ مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے مہاجرینِ مکہ کے سامنے اپنا سب کچھ پیش کر دیا۔ مال جان گھر بار سب کچھ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہاجر کو ایک انصار کا تنظیمی و مذہبی بھائی بنا دیا۔ انصار نے اتنی کشادہ دلی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا کہ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

انصار نے مہاجر بھائیوں کو اپنے گھر کا آدھا حصہ، مال مویشی میں سے آدھا، کھیت کھلیان کا آدھا حصہ حتیٰ کہ جس کی دو بیویاں تھیں، اس نے ایک بیوی بھی شادی کے لیے پیش کر دی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی مہاجر نے کسی انصار کی بیوی والی پیش کش قبول نہیں کی۔

گھر بار اور کاروبار میں بھی اکثر شریک نہیں ہوئے۔ بس کچھ عرصہ سر چھپاوے کے طور پر ان کے ہمراہ رہے۔ ان کے کاروبار میں معاونت کرتے رہے۔ اپنی محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کرنے کو ترجیح دیتے رہے اور تھوڑے عرصہ بعد اپنے مکانات تعمیر کر کے انصار بھائیوں سے شکریے کے ساتھ اجازت لے کر اپنی کٹیوں میں آ بسے۔ لیکن یہ دنیا میں انوکھی اخوت تھی۔ جداگانہ قسم کا بھائی چارہ تھا۔ اس سے پہلے دنیا نے اس قسم کا عملی مظاہرہ کہیں نہیں دیکھا تھا۔

———((اللہ اکبر))———

مشرکین کا خیال تھا کہ وہ اوچھے ہتھکنڈوں سے تحریک اسلامی کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن انھیں یہ احساس نہ تھا کہ تحریک اسلامی کو ختم کرنے کے لیے ان کے پاس جھوٹ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے مقابل اللہ کے ہاں محترم ترین ہستی تھی۔ دنیا کی بزرگ ترین شخصیت تھی۔ اگر انھیں اپنی طاقت کا زعم تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو اپنے رب پر پورا بھروسا تھا۔ مخالفینِ اسلام کی جنگ باطل کے لیے تھی، جبکہ فدایان اسلام کی جنگ حق کے لیے تھی۔ وہ اپنی انا، اپنی جھوٹی پھوں پھاں کے لیے لڑ رہے تھے تو کارکنانِ تحریک اسلامی اللہ اور اس

Marfat.com

کے رسولؐ کی ذات کے لیے لڑ رہے تھے۔ ان کو جھوٹ پر بھروسا تھا تو مسلمانوں کو سچ پر اعتماد تھا۔ حق و باطل سچ اور جھوٹ کی کشمکش میں ہمیشہ سچ ہی غالب آتا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہوا۔

''بیعت الحرب'' رجب 622ء کو انتہائی خفیہ انداز میں وقوع پذیر ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے مسلمانوں کو فوراً واپسی کا حکم دے دیا۔ مدینہ سے آنے والے مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ اسی وقت تعمیل حکم رسالتمابؐ میں مکہ سے نکل کھڑے ہوئے۔

مخالفین نے ابھی تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تعرض نہیں کیا یا غفلت برتی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انھیں رسول اللہؐ یا ان کی جماعت پر ترس آ گیا تھا۔ اس غفلت کی وجہ یہ تھی کہ انھیں ایک قبیلہ نے اپنی پناہ میں لیا ہوا تھا، ورنہ وہ تو بغیر کسی توقف کے آپؐ کو (نعوذ باللہ) قتل کر دینا چاہتے تھے۔

مسلمانانِ مدینہ پو پھٹنے سے پہلے ہی سوئے مدینہ چلے گئے انھوں نے قریش کے تعاقب سے بچنے کے لیے ساحلی راستہ اختیار کیا۔ ابھی انھیں تین دن نہیں گزرے تھے کہ قریش نے مدینہ سے آنے والوں کے مقاصد کی بو سونگھ لی اور تحقیقات شروع کر دیں۔ انھوں نے مدینہ سے آنے والے زائرین سے پوچھ گچھ شروع کر دی، لیکن مدینہ سے آنے والے عام بت پرست زائرین کو ان پچھتر افراد کی سرگرمیوں کا کوئی علم نہیں تھا جنھوں نے بیعتِ حرب کی تھی۔ قریش کو اور تو کچھ نہ ملا، مگر وہ اتنا ضرور جان گئے کہ ان افراد کے راتوں رات مکہ چھوڑنے کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔

ان دنوں مکہ اور مدینہ کا سفر قافلے کی صورت میں گیارہ دن کا تھا۔ تیز رفتار سفید اونٹ یہی فاصلہ تین دن میں پھلانگ لیتا تھا۔ مشرکین نے سفید اونٹ پکڑے اور مسلمانوں کا تعاقب شروع کر دیا۔ چونکہ مسلمان راستے بدل کر سفر کر رہے تھے۔ اس لیے سفید اونٹ بھی ان کی گرد کو نہ پہنچ سکے، ہاں البتہ وہ ایک عام تاجر کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

بیچارے تاجر کی شامتِ اعمال۔ ناحق سفر کھوٹا کرنے پر مجبور ہوا۔ تحقیقات کی گئیں تو اس نے واضح جواب دیا۔ میں قافلے میں شامل ضرور تھا، مگر مجھے کسی سے ملنے یا کسی قسم کے معاہدہ کا کوئی علم نہیں۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی تمام سرگرمیاں انتہائی خفیہ انداز میں انجام دیں۔ مدینہ سے آنے والے لوگوں کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ مشرکین اُس تاجر کو ٹکٹکی پر چڑھانا چاہتے تھے۔ مگر مجبور تھے کہ وہ تاجر بھی عرب کے معروف اور مضبوط قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ مکہ میں بھی صاحبِ اثر تھا۔ اس کے کئی ایسے واقف حال تھے۔ ان کے

ساتھ اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ بہر کیف مشرکین نے طوہاً و کرہاً اسے اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ دو جاسوس مدینے میں لے جائے تا کہ وہ اہل مدینہ سے معلوم کر سکیں کہ ان کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس قسم کا معاہدہ ہوا ہے۔

دوسری طرف حضور علیہ السلام نے مکہ کے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مختلف جماعتوں یا چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی شکل میں خفیہ انداز میں مدینہ کی طرف ہجرت کریں اور انصار کے ہاں پناہ گزین ہوں۔

ان دنوں مکہ کوئی اتنا بڑا شہر نہیں تھا کہ درجنوں افراد غائب ہوں اور شہر میں پتا نہ چل سکے۔ چنانچہ مشرکین کو پتا چل گیا کہ مسلمان ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔ سو انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو زبردستی روکا جائے۔ یوں مسلمانوں میں سے تین افراد ان کے ہتھے چڑھ گئے۔ عباس بن ربیعہ۔ امیہ بن عاص اور ہاشم بن عاص۔ ان تینوں نے ایک ساتھ نکلنے کا فیصلہ کیا، لیکن ہاشم بن عاص روانگی کے وقت اچانک غائب ہو گئے۔ بقیہ دو نے کافی انتظار کے بعد روانگی اختیار کی۔ بات یہ ہے کہ حضرت ہاشم کی مسلمانی ابھی تک خفیہ تھی قریش کو علم ہوا تو انھوں نے گرفتار کر لیا اور انھیں باندھ کر تپتی ہوئی ریت پر پھینک دیا۔

ان دنوں عرب میں جیل ویل نہیں تھی۔ عرب کی پہلی جیل آپ کی رحلت کے کئی سال بعد کوفہ میں تعمیر ہوئی۔ اس لیے سزا دینے کے لیے دہکتا ہوا ریگزار ہی استعمال کیا جاتا یا قید کے لیے کسی گھاٹی کو استعمال کیا جاتا۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

ہجرت ایک عظیم قربانی

لوگ کام کاج سے فارغ ہو کر گھروں کی طرف آرام کے لیے جا رہے تھے، مگر آپ ﷺ اپنے جدامجد اسماعیلؑ کی طرح اللہ کے عظیم حکم کی بجا آوری کے لیے تیار کھڑے تھے۔ حرم کی دیوار سے لپٹ کر فرما رہے تھے۔ اے مکہ میں تجھے چھوڑنا نہیں چاہتا، مگر تیرے بیٹے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔ یہ بڑا کرب آمیز منظر تھا۔ آپؐ رو رہے تھے۔ اس لیے نہیں کہ گھر بار اور عزیز و اقارب چھوٹ رہے تھے، بلکہ اس لیے کہ حرم شریف کی قرابتیں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ گھر جسے آپؐ کے دادا ابراہیمؑ اور آپؐ کے باپ اسماعیلؑ نے تعمیر کیا تھا۔ اسے بسانے اور آباد کرنے کے لیے آپؐ مبعوث ہوئے تھے۔ اسے یونہی بغیر آباد کیے چھوڑ کر جانا انتہائی کٹھن تھا۔ آپؐ اللہ کے اس گھر کی خاطر جان تو پیش کر سکتے تھے، اسے یوں چھوڑنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مگر اللہ کا حکم ہی ایسا تھا جس سے سرتابی ناممکن تھی۔ آپؐ سے اللہ اور اس کا گھر حرم سے جدائی کی قربانی مانگ رہا تھا۔ یہ قربانی بالآخر آپؐ کو دینا تھی، بڑے دل گردے کے ساتھ، بڑے حوصلوں کے ساتھ، بڑے جذبوں کے ساتھ۔

قارئین!! آپؐ کی ذات تو خیر آپؐ ہیں۔ آپ کی اللہ سے وارفتگی کی کوئی میزان نہیں کوئی الفاظ نہیں جن میں بیان کی جائے، بلکہ بیان سے انتہائی بالا و عظیم ہے۔

حرم شریف کا آج بھی یہ اعجاز ہے۔ اسے دیکھ کر خوشی کی انتہا نہیں معلوم رہتی۔ جو کیف و سرور پہلی نظر دیکھنے سے ہوتا ہے، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کیفیات کو بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ حرم سے وابستگی اور انس کی شدت جتنی جلدی دل میں جاگزیں ہوتی ہے، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دل میں تیزی سے سرایت کر جانے والے اس انس کی الفاظ میں تصویر کشی کرنا ممکن نہیں۔ یہ تو بس وہی جانتا ہے جو اس کیفیت سے گزرا ہو۔ اس کی جدائی بھی بڑی کٹھن ہے۔ اگر الفاظ میں بیان کی جا سکتی تو یوں کہا جا سکتا ہے۔ موت کے وقت دنیا سے جدائی بھی شاید اتنی کٹھن نہ ہو جتنی حرم کعبہ سے جدائی۔

Marfat.com

بہرحال! رات سر پر آئی تو آپؐ نے لوگوں کی امانتیں حضرت علیؓ کے سپرد فرمائیں۔ انھیں تاکید کی کہ یہ امانتیں لوگوں کے سپرد کر کے تم بھی چلے آنا۔ خود حضرت ابوبکر صدیق کی معیت میں عازم سفرِ مدینہ ہوئے۔

اُدھر مشرکین نے آج رات آپؐ کے قتل[3] (نعوذ باللہ) کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ طے شدہ منصوبہ کے مطابق وہ حضورؐ کے گھر پہنچے۔ حضرت علیؓ آپؐ کے بستر پر چادر اوڑھ کر سوئے ہوئے تھے انھوں نے جگایا اور پوچھا محمد ﷺ کدھر ہیں۔ حضرت علیؓ کے ذمہ لوگوں کی امانتیں تھیں۔ وہ سچے انسان تھے۔ جھوٹ بولنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ چنانچہ بغیر کسی توقف کے انھوں نے بتا دیا کہ آپ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

مشرکین کا آج کا منصوبہ فیل ہو چکا تھا۔ مدینہ پہنچ کر انھیں آپؐ کے پکڑے جانے کی امید بھی نہ تھی، اس لیے ان کے لیے آج ہی تھا، بس آج۔ آج کے بعد مشرکین کے لیے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ خدا کی قدرتوں کا آج ہی مقابلہ کرنا چاہتے تھے، مگر ناکام۔ ناکامی پھن پھیلائے ان کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ جل بھن گئے تھے، جل بھن۔ وہ جلے بھنے آپؐ کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ نواحِ مکہ کو گھیرے میں لے کر تلاش شروع کر دی۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اشتہار دے دیے۔ سر کی قیمت رکھ دی کہ جو محمد ﷺ کو پکڑ لائے یا ان کے خفیہ ٹھکانے کی اطلاع کرے "سو سرخ اونٹ" لے سکتا ہے۔ آپؐ کو مکہ والوں نے اشتہاری قرار دے دیا۔ آپؐ کے سر کی قیمت (نعوذ باللہ) سو سرخ اونٹ مقرر کر دی گئی۔

آپؐ اور ابوبکر صدیقؓ گھر سے نکلے تو کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ گھر سے کچھ بھی نہ لیا۔ شاید کچھ لوگ کہیں کہ آپؐ کے پاس ہوتا تو لیتے۔ نہیں یہ بات نہیں۔ لوگوں کی امانتیں تو آپؐ کے پاس تھیں۔ اگر کوئی اور ہوتا تو ان لوگوں کی امانتیں اپنے اوپر حلال کر لیتا جو آپؐ کے قتل کا منصوبہ لیے بیٹھے تھے۔ وہ امانتیں ہی لے دوڑتا۔ بات یہ ہے کہ آپؐ کو اللہ اور اس کے دین کے سوا کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ اللہ اور اس کا دین آپؐ کے ساتھ تھے تو آپؐ نے ساتھ اور کیا لینا تھا۔

آپؐ ایک لمبا چکر کاٹ کر غارِ ثور تک پہنچے۔ ابوبکرؓ کے ہمراہ اس کے اندر اتر گئے۔ اللہ کی قدرتِ کاملہ دیکھیے ایک وقت تھا جب اللہ تعالیٰ اصحابِ کہف کو اسی طرح کی غار میں صدیوں تک پناہ دیے رکھی اور ان کا بال بیکا نہ ہونے دیا۔ ایک وقت یہ ہے کہ اس کا محبوب امیؐ اپنے صحابیؓ کے ساتھ ایک غار میں اترے ہیں تو اللہ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ایک مکڑی کو کہا کہ اس غار کے منہ پر جالا بن دے۔ اس نے جالا بن دیا۔ ایک کبوتری کے دل میں ڈالا کہ اس جالے پر انڈے دے

Marfat.com

دے وہ انڈے دے آئی۔

اب تعاقب کرنے والی پارٹیوں میں سے ایک پارٹی غارِ ثور پر پہنچتی ہے تو انھیں یقین آ جاتا ہے۔ یہاں کوئی داخل نہیں ہوا۔ اگر کوئی یہاں داخل ہوتا تو کم از کم یہ جالا ضرور ٹوٹ جاتا۔ وہ پارٹی واپس ہوئی اور دوسری پھرتی پھراتی آ گئی انھوں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا۔

ادھر غار میں داخل ہونے سے پہلے جنابِ رسالتمآبؐ کے پاؤں کے تلوے پھٹ چکے تھے۔ غار کے اندر دو افراد کے لیٹنے کی جگہ نہ تھی۔ زخموں کی شدت اور تھکاوٹ کو دیکھتے ہوئے آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی حضرت ابوبکرؓ نے پتھروں پر سر رکھنے کی بجائے اپنے ران پر سر رکھ لیا اور ساتھ ہی اپنی سر والی چادر پھاڑ پھاڑ کر غار کے اندر کے سوراخ بند کر دیے تاکہ کوئی موذی جانور نہ نکلنے پائے۔

حضرت ابوبکرؓ نے سونے سے پہلے غار میں مزید نظر دوڑائی تو ایک سوراخ نظر آیا۔ اب چادر ختم ہو چکی تھی۔ اس سوراخ پر ایڑی رکھ کر سو گئے۔ اس سوراخ میں ایک سانپ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو آگے ابوبکرؓ کی ایڑی پڑی تھی۔ اس سانپ نے باہر نکلنے کے لیے ڈنگ مارا۔ حضرت ابوبکرؓ درد کی شدت سے تڑپ اٹھے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ چہرے پر تریلیاں بھر گئیں۔ پسینے کے چند قطرے حضورؐ کے چہرے پر جا گرے۔ یوں آپؐ کی آنکھ کھل گئی۔ آپؐ نے دیکھا کہ ابوبکرؓ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ رہا ہے۔ فوراً سمجھ گئے۔ ضرور کوئی تکلیف ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سانپ نے ڈس لیا ہے۔ فوراً ٹانگ کو کاٹے کی جگہ سے اوپر باندھ دیا اور لعابِ مبارک لگایا۔ ابوبکر تھوڑا پرسکون ہو گئے۔

ہم نے یہ روایت اپنے اسلاف سے سنی ہے کہ اس سانپ سے پوچھا گیا تو نے ابوبکر کو کیوں ڈنگ مارا۔ اسے بولنے کی قوت ملی۔ اس نے جواب دیا: میں کئی صدیوں سے حضورؐ کی زیارت کے لیے اس غار میں چھپا بیٹھا ہوں۔ آج جو زیارت کا موقع آیا تو تمام سوراخ بند کر دیے گئے۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ روایت ہم اپنے بزرگوں سے بچپن سے سنتے آ رہے ہیں۔ آگے اللہ بہتر جانتا ہے۔

مسلسل تین دن آپؐ غارِ ثور میں چھپے رہے۔ تین دن کی مارا ماری کے بعد قریش جب تھک ہار کر واپس لوٹ گئے تو طے شدہ منصوبے کے مطابق حضرت صدیقؓ کا غلام عامر بن فہیرہ دو سفید اونٹنیاں لیکر مذکورہ مقام پر آ گیا اور آپؐ قدرے مشکل، لیکن قدرے محفوظ ساحلی راستے سے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

مدینہ سے مکہ کا سفر عام سواری پر سات دن میں طے ہوتا تھا جبکہ سفید اونٹنی یہ سفر تین دن میں پیٹ لیتی تھی۔

آپؐ بھی ایک اعلیٰ نسل کی سفید اونٹنی پر سوار تھے جس کا نام ''قصویٰ'' تھا۔

اس غار میں تین معجزے ظاہر ہوئے۔ایک غار ثور کے منہ پر مکڑی کا جالا بننا دوسرا کبوتر کا جالے پر انڈے دینا ان دو معجزات کی وجہ سے مشرکین یقین کرنے پر مجبور ہو گئے کہ کم از کم اس غار کے اندر کوئی نہیں داخل ہوا۔اگر کوئی داخل ہوتا تو نہ انڈے بچتے اور نہ مکڑی کا بنا ہوا جالا۔

تیسرا معجزہ سانپ کا کاٹا لعاب مبارک سے اس زہر کا اثر ختم ہو جانا اور سانپ کا بولنا کہ میں صدیوں سے آپؐ کی زیارت کا منتظر ہوں۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات کو کتنی دیر پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ آپؐ مبعوث ہونے والے ہیں۔

اہلِ مکہ عقل مند ہوتے تو مسلسل ناکامیاں دیکھ کر تائب ہو جاتے یا کم از کم مخالفت ہی ترک کر دیتے۔اب تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے دور جا چکے تھے۔اگر کامیاب ہو کر لوٹتے تو یہ ان کی اپنی خاندانی کامیابی قرار پاتی۔اگر ناکام ہوتے تو ان کی خواہش کے مطابق (نعوذ باللہ) مکہ والوں کی جان چھوٹ جاتی،مگر وہ تو ابن شیطان تھے۔اللہ کے دربار سے دھتکارے جا چکے تھے۔ اتنی ناکامیوں سے شرمندگی کے بجائے انتہائی بے غیرتی اور ڈھٹائی سے اسلام کی مخالفت کرتے رہے۔الغرض مدینہ میں بھی مسلمانوں کے لیے مشکلات ایجاد کرتے رہے۔

———(((الحمد للہ)))———

آؤ مدینے چلیں

اہل قریش کے ہرکارے ہر طرف اعلان کر چکے تھے کہ محمد ﷺ کو پکڑنے یا پتا دینے والے کو سو سرخ اونٹ انعام دیے جائیں گے۔ یہ خبر سن کر انعام کے لالچ نے مکہ کے ہر شخص کے دل میں خواہش پیدا کر دی تھی کہ (نعوذ باللہ) وہ محمد ﷺ کو پکڑ کر راتوں رات امیر ہو جائے۔

آپؐ نے اسی حکمت کے تحت بحیرہ احمر کے ساتھ قدرے طویل اور مشکل ساحلی راستہ اختیار کیا تھا۔ غار ثور میں تین دن چھپے رہنے کی وجہ سے مخالفین تھک ہار کر اپنی تگ و دو تقریباً ختم کر چکے تھے، مگر صحرائے عرب کے بدوی قبائل راستوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

آپ قبیلہ بنو مدلج[4] کے علاقوں سے گزر رہے تھے۔ بنی مدلج کے ایک شخص نے آپ کو دیکھ لیا۔ وہ فوراً اپنے سردار سراقہ بن مالک کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے خیمے میں براجمان تھا۔ اس شخص نے کہا: "اے سراقہ میں نے فلاں جگہ دو اونٹ سواروں کو دیکھا ہے جو جماز اونٹنیوں پر سوار ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے ایک محمد ﷺ ہیں۔"

سراقہ بن مالک زیرک آدمی تھا۔ بتائی ہوئی نشانیوں سے سمجھ گیا کہ یقیناً یہ مسافر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، لیکن سارا انعام اکیلے وصول کرنے کے چکر میں خبر لانے والے سے کہنے لگا: "نہیں تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ دونوں افراد تو رات کو میرے مہمان تھے آج صبح یہاں سے نکلے ہیں۔

خبر لانے والے کی خواہشات پر پانی پھیر کر خود سراقہ بن مالک اپنے چند خواص کے ساتھ تیز رفتار گھوڑوں پر تعاقب کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سراقہ اور اس کے ساتھی بہت جلد آپؐ تک پہنچ گئے۔ سراقہ جب قریب ہونے کی کوشش میں تلوار سونت کر آگے بڑھا تو اس کا گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا اور زمین پر گر گیا۔ سراقہ نے اسے اٹھایا۔ دوبارہ سوار ہو کر لگام کھینچی تو گھوڑا پھر زمین میں دھنس گیا اور گر پڑا۔ اس نے تیسری بار گھوڑے کو اٹھایا۔ تھپکی دی اور سوار ہو کر لگام تانی تو تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔

Marfat.com

سراقہ سمجھدار آدمی تھا دورِ جاہلیت کے عربوں کی طرح فال نکالنے پر یقین رکھتا تھا اس نے فال نکالنے کا فیصلہ کیا۔ فال نکالی تو فال بھی اس کی خواہش کے خلاف نکلی۔ چوتھی بار پھر گھوڑے پر چڑھا۔ ایڑ لگائی چوتھی بار بھی وہی ہوا جو پہلے تین بار ہوا تھا۔ یوں وہ شخص آپؐ اور آپؐ کے ہمراہی حضرت ابوبکرؓ تک پہنچنے میں ناکام ہوا۔

قارئین!! یہ سفر ہجرت کا چوتھا معجزہ[5] تھا جو اللہ کے فضل و رحمت سے وقوع پذیر ہوا۔

سراقہ کی حالت یہ کچھ دیکھ کر متحیر ہوگئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اللہ کا نبیؐ سچا ہے جو میری تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ چنانچہ وہ زور زور سے چلایا۔ یا محمد ﷺ رکیے۔ میں آپؐ سے گفتگو کا خواہشمند ہوں۔ آپؐ رک گئے تو سراقہ نے گھوڑا اپنے ساتھیوں کے حوالے کیا اور پیدل آپؐ کی طرف دوڑا۔ پاس پہنچ کر کہنے لگا: یا محمد ﷺ میں قریش کا اتحادی ہوں اور چاہتا تھا کہ آپؐ کو پکڑ کر قریش کے حوالے کردوں اور بدلے میں سو سرخ اونٹ وصول کروں، لیکن اب مجھے یقین ہوگیا کہ آپؐ برحق ہیں۔ کیونکہ میرا گھوڑا چار بار زمین میں دھنسا اور گرا، لہٰذا میرا علم کہتا ہے کہ آپؐ ضرور قریش مکہ پر غالب آئیں گے۔ میں اس دن کے لیے آپؐ سے امان طلب کرتا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا: ''اس دن کے لیے امان طلب کرنے کا مطلب کیا ہے۔'' سراقہ کہنے لگا یا حضور ﷺ جس دن آپؐ کو قریش پر غلبہ حاصل ہو جائے۔ اس دن قریش کی حمایت کرنے کی پاداش میں مجھے اور میرے قبیلے کو انتقام کا نشانہ نہ بنائیں۔

رحمت اللعالمینؐ نے فرمایا: جاؤ اس دن تم اور تمھارا قبیلہ امان میں ہوں گے۔ تمھیں کوئی گزند نہ پہنچائے گا۔

اس دن سے سراقہ نے آپؐ کی تلاش میں آنے والے افراد کو اپنی حدود میں داخل ہونے سے منع کردیا۔ اگر کوئی کسی قیاس و اندازے سے یہاں آ بھی جاتا تو اسے یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا کہ محمد ﷺ یہاں سے نہیں گزرے۔

بعدازاں سراقہ بن مالک مسلمان ہوگئے، بلکہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رضوعنہ کے مصداق ہوگئے اور اسلام کے نامور جرنیل بنے۔ ایسے جرنیل جن کی جنگی تدبیریں آج دنیا کی عسکری درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

اس کے بعد یہ مختصر قافلہ سوئے منزل روانہ ہوا۔ دو دن کے بعد آپؐ کا سامنا ایک اور مکی کارواں سے ہوا جس میں آپؐ کے رشتے کے بھائی زبیر بن عوام بھی سفر کناں تھے۔ آپؐ نے زبیر بن عوام سے کچھ کپڑے اور سامانِ خورد و نوش لیا اور سفر جاری رکھا۔

دو دن بعد قبیلہ بنی اسلم میں تشریف فرما ہوئے جس کا سردار اوس بن حاجر تھا۔ اوس بن حاجر نے اپنے قبیلے کا ایک آدمی بطور راہنما آپؐ کے ساتھ کیا۔ اس گائیڈ کا نام مسعود تھا۔ اگلا سفر اس کی راہنمائی میں شروع ہوا۔

دور جاہلیت کے عربوں میں قبائلی تقسیم آج کی کالونیل ریاستوں سے زیادہ آزاد اور مضبوط تھی۔ ان کی قبائلی حدود میں بے جا مداخلت روکنے کے لیے کوئی اقوام متحدہ نہ تھی، بلکہ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔ اس وقت ناخواندہ اور بدوی عرب قبائل ہمارے آج کے ''نوآزاد ممالک'' سے زیادہ خودمختار تھے۔ کسی قسم کی سلامتی کونسل ان پر مسلط نہ تھی۔ اپنی قبائلی حدود میں ان قبائل کے شہری ہم سے زیادہ آزادی اور سکون محسوس کرتے تھے۔ ہم سے زیادہ پُرامن تھے۔ ان کے باہمی مشاورتی فیصلے ہماری آج کی اسمبلیوں سے زیادہ مانے جاتے تھے۔ ان فیصلوں پر تمام قبیلہ بلاتفریق خواص وعوام بخوشی عمل کرتا تھا۔

سفری راہنما صرف راستوں کی راہنمائی کرنے والا نہ تھا، بلکہ پورے عرب کے اندر سفری راہنما ایک پاسپورٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ صحرا میں بکھرے خاندان گائیڈ کو اپنے سردار یا قبیلے کا ایلچی سمجھتے تھے۔ اس راہنما کے لئے پہچان کے مخصوص سگنل یا اشارے مقرر تھے ان پر عمل کر کے گائیڈ کسی قافلے کو اپنی حدود سے پار لے جاتا تھا۔

بہرحال مسعود نے عرض کیا: ''یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے قبیلے کی حدود تک ہی آپؐ کا ساتھ دے سکتا ہوں۔ اس سے آگے نہیں اس قبیلے کی حدود بستی قبا سے جا ملتی تھیں۔ چنانچہ مسعود کو اس کی قبائلی حدود پر پہنچ کر رخصت دے دی گئی وہ واپس اپنے قبیلے میں چلا گیا۔''

بستی قبا کے نزدیک پہنچ کر آپ[6] سرکار ﷺ رک گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوئے۔ اے ابوبکر اس اونٹنی کو جس پر میں سوار ہوں، میرے ہاتھوں فروخت کر دو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حیرت سے بولے: ''یا رسول اللہ ﷺ اس قصویٰ کو خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ویسے ہی آپؐ کی نذر کر دیتا ہوں۔

یاد رہے قصویٰ اونٹ کی ایک خاص نسل کا اسم صفت تھا۔ اس نسل کے اونٹ سفید یا سرخ رنگ پر مبنی تھے۔ یہ باربرداری کے لیے استعمال نہیں کیے جاتے تھے۔ عرب میں یہ اونٹوں کی ایک اعلیٰ نسل گردانی جاتی تھی۔ لوگ اسے شوق سے پالتے تھے۔ سواری یا دوڑ کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس نسل کا ڈُڑکی میں قدم لمبا ہوتا تھا۔ دوسری نسلوں کے مقابلہ میں یہ دوگنا سفر کاٹتے تھے۔ جو سفر اونٹوں کی عام نسل دو دن میں طے کرتی۔ قصویٰ نسل وہی فاصلہ ایک دن میں پاٹ لیتی تھی۔

Marfat.com

کچھ لوگ ان اونٹوں کے کان کاٹ دیتے تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ گوش بریدہ اونٹنی زیادہ دوڑ سکتی ہے۔ کان کٹنے کی وجہ سے بھی لوگ اسے قصویٰ کہتے تھے۔ چونکہ اس اونٹنی کے کان بھی کٹے ہوئے تھے۔ اس لیے اسے بھی قصویٰ کہا جاتا تھا۔

بعدازاں یہی قصویٰ نام اسم خاص میں بدل گیا اور تاریخ میں یہ اونٹنی قصویٰ کے نام سے ہی پہنچانی گئی۔ صرف تاریخ میں ہی نہیں، بلکہ حیاتِ مبارکہ میں ہی لوگ اسے قصویٰ کے نام سے یاد کرتے تھے۔

بہرحال آپؐ نے اس اونٹنی کو نذر لینے سے انکار کر دیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اسے آپؐ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ تاریخ میں انسانوں کے ساتھ ساتھ اس قصویٰ کا کردار بھی ثبت ہو گیا۔ آج آپ سرکارؐ کے سفروں کا ذکر اس قصویٰ کے بغیر نامکمل سا رہ جاتا ہے۔ کوئی بھی شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر کی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے قصویٰ سے بھی متعارف ہونا پڑتا ہے۔

———(((اللہ اکبر)))———

قبیلہ بنی اسلم کا گائیڈ مسعود اپنے قبیلے کی حدود تک چھوڑ کر واپس ہوا۔ اس کے قبیلے کی حدود قبا تک تھیں۔ وادیٔ قبا حدودِ مدینہ میں شامل تھی۔ یہ بستی مدینہ کے جنوب میں واقع تھی۔ ان دنوں مدینے کا کل رقبہ نواحی علاقے ملا کر تیس مربع کلومیٹر کے برابر تھا۔ یہاں دو مختلف نظریے اور مذہب رکھنے والے دو گروہ آباد تھے۔ ایک یہودی اور دوسرے بت پرست۔ بت پرست یہاں کے مقامی باشندے تھے یعنی اصل عرب تھے اور یہودی ہزاروں سال پہلے کہیں تبان اسعد کے زمانے میں یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔

تاریخِ مدینہ میں اس شہر کے مختلف نام رہے، لیکن آمد رسولؐ کے وقت اس کو دو مختلف اور متضاد ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ اکثر لوگ اسے یثرب کے نام سے پہنچانتے تھے جس کے معنی تکلیف پہنچانے یا بیمار کر دینے کے ہیں۔ یہ نام صحرائی یا بدوی باشندوں کا دیا ہوا تھا۔ مدینہ شہر دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے جو اسے شمال اور جنوب سے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کے مشرق مغرب میں آتش فشاں لاوا منجمد ہے۔ مدینہ کی آب و ہوا معتدل اور باقی جزیرۃ العرب کی نسبت بارشوں کی اوسط زیادہ تھی۔ شہر کے ایک کنارے پانی کا ایک بڑا تالاب بھی تھا جو بارش سے سارا سال بھرا رہتا تھا۔ آپؐ زمانہ طفلی سے اپنے ننھیال کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ اس تالاب میں نہاتے اور تیراکی سیکھتے رہتے تھے۔ آپؐ نے تیراکی کا فن یہیں سے سیکھا۔

مدینہ میں کل چھ قبائل آباد تھے جن میں تین یہودیوں کے اور تین اعراب کے تھے۔ یہ لوگ بھی باقی عربوں کی طرح قبائلی تقسیم اور نظم وضبط کے پابند تھے۔ اس کی آبادی بہتر (72) قلعوں میں بقید حیات تھی۔ ان قلعوں میں سے (59) انسٹھ قلعے یہودیوں کے اور باقی عربوں کے تھے۔ باقی عربوں کی طرح بات بات پر جنگ وجدل ان کا بھی معمول تھا۔ یہاں کے لوگوں کے پیشے زراعت، باغبانی، مویشی پالنا، تجارت، زرگری اور گوہر فروشی تھے۔

یہاں بھی باقی عرب کی طرح نہ پولیس تھی اور نہ جیل۔ دشمنی دوستی بس قبائلی زندگی کے تابع تھی۔ جرم کی شکل میں قبیلہ ہی فیصلہ کرتا اور قبیلہ ہی سزا دیتا۔ اگر دو قبیلوں کے مابین جنگ چھڑ جاتی تو کئی دہائیوں تک جاری رہتی۔ کوئی صلح کروانے والا نہ تھا۔ یہاں کے دو مشہور قبائل اوس اور خزرج کے درمیان ایک جنگ چالیس سال پر محیط ہے۔ اسے تاریخ میں جنگِ واحس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ باہمی قبائلی معرا کہ آرائیاں یہاں کا معمول تھا۔ اوس وخزرج کے باہمی انتشار سے اور تو کسی کو کوئی فائدہ نہ ہوا ہاں، البتہ ایک شخص تھا جس نے مقبولیت پائی وہ عبداللہ بن ابی تھا۔ اس نے منافقانہ حد تک غیر جانبدار بن کر دونوں قبائل کو لڑائے رکھا اور اپنی مقبولیت بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ مختلف قبائل اسے بادشاہ بنانے پر متفق ہو گئے۔ سناروں نے اس کے سر کا ماپ بھی لے لیا تھا تا کہ تاجِ شاہی بنایا جا سکے، لیکن اسی دوران میں آمدِ رسول کی خبر مدینہ پہنچی تو ان لوگوں نے سوچا کہ بادشاہ کی نسبت نبی زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ نبی اللہ سے رابطے میں ہوتا ہے۔

ان دنوں مدنیہ میں ''اشق'' نامی شخص تھا جو انسانی قتل کے سلسلہ میں خون بہا مقرر کرتا تھا۔ یہی منصب مکہ میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا۔ مدینہ میں خون بہا کی شرح 100 سرخ اونٹ آنکھ پھوڑنے کی شرح 50 اونٹ اور دانت توڑنے کی سزا دانت توڑنا تھی۔

اور ہاں مدینہ کا دوسرا نام طیبہ تھا جس کے معنی پاک صاف جگہ کے ہیں۔ یثرب اور طیبہ باعتبار معنی ایک دوسرے کی ضد تھے۔ آپؐ نے اس کا نام مدینہ رکھا جس کے معنی شہر کے ہیں۔ اس لفظ سے کسی قسم کی توقیر نہیں ہوتی۔ سادہ لفظ ''مدینہ'' یعنی ''شہر'' سے کسی نظریہ وفکر کی نفی نہیں ہوتی۔ اس لیے اسی نام کو تاریخ میں مقبولیت ملی جواب بھی قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گی۔

———(((اللہ اکبر)))———

16 جولائی[7] 622 عیسوی کا گرم دن تھا جب آپؐ بستی قبا میں داخل ہوئے۔ سورج اپنی آب وتاب سے آگ برسا رہا تھا۔ آپؐ کے استقبال کو آنے والے گرمی کی شدت سے گھبرا کر کمروں میں جا گھسے سورج کے شباب کا وقت تھا۔ شعاعوں کی شدت سے زمین دہک رہی تھی۔

Marfat.com

جب آپ قبا کی بستی میں داخل ہوئے۔گلی کوچوں میں ہو کا عالم تھا۔کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار رہا تھا۔

ایک یہودی جس کا نام غالباً شلوم تھا، اتفاق سے ادھر آ نکلا۔اس کو بھی باقی قبا والوں کی طرح آمدِ رسول کا علم تھا، لہٰذا وہ دیکھتے ہی پہچان گیا، مگر وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ ان دو میں سے اللہ کا نبی کون ہے۔دیکھنے کے بعد وہ دوڑ دوڑ کر چلایا: "اے یہودیو! دیکھو تمھارا نجات دھندہ آن پہنچا۔"

مدینہ کے یہودی بھی آمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منتظر تھے۔قبا والوں نے شلوم کی چیخ پکار سنی تو مرد و زن بچوں سمیت نکل آئے تاکہ آپؐ کو ایک نظر دیکھ سکیں۔یہ دیکھ سکیں کہ اللہ کا نبی کیسا ہے؟ بچیوں نے دف بجا کر استقبالی ترانے گائے۔

آج اگر بدقسمتی سے قریشِ مکہ موجود ہوتے تو شاید چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے کہ انھوں نے جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دھکا دیا، مدینہ والے غیر ہو کر بھی ہاتھوں پر اٹھا رہے ہیں، مگر یہ کیسے ہوتا۔قریش مکہ کی قسمت پھوٹ چکی تھی۔ان کو ان کی عقلی اور خاندانی برتری کے زُعم نے اچاٹ کر دیا تھا۔ان کی بصارتیں لٹ چکی تھیں۔ان کی سماعتیں کھو چکی تھیں۔

آپؐ نے کھجور کے دو[8] درختوں کے سامنے اونٹنیوں کو بٹھایا اور سائے میں کھڑے ہو گئے۔ ابھی تک لوگ پہنچان نہیں سکے تھے کہ ان دو اشخاص میں سے رسول اللہ ﷺ کون ہیں۔اسی اثناء میں حضرت صدیق اکبرؓ نے رُخ بھانپ لیا۔انھوں نے اپنا عمامہ اتارا اور رسول اللہ ﷺ پر سایہ کر کے کھڑے ہو گئے تاکہ لوگ پہنچان لیں کہ اللہ کا رسول کون ہے۔

اس دوران لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو بخوبی پہنچان لیا اور عربوں کی رسم کے مطابق "ہاہلہ" مچانا شروع کر دیا۔ہاہلہ دراصل عربوں کا مخصوص رسمیہ انداز ہے جو وہ مخصوص آواز نکال کر ادا کرتے ہیں۔یہ رسم آج بھی عربوں میں قائم ہے۔عرب علاقوں میں سکونت اختیار کرنے والے بیرونی لوگ اسے خوب جانتے ہیں۔

یہ محلہ بنی عمرو بن عوف تھا۔رسول اللہ نے پوچھا۔یہ جگہ کس کی ملکیت ہے۔ایک نوجوان نے جواب دیا۔یہ باغ اور یہ جگہ میری ملکیت ہے۔آپؐ نے فرمایا کیا ہمیں ان درختوں کے نیچے کچھ دیر ٹھہرنے کی اجازت ہے۔اس نوجوان نے جواب دیا۔آپؐ جب تک چاہیں یہاں قیام کر سکتے ہیں۔

اسی اثنا میں ایک مسلمان خاتون اُمِّ کلثوم آ گئیں۔اس نے درخواست کی کہ آپؐ اس کے گھر میں قیام فرمائیں۔آپؐ نے فرمایا کہ ہم آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتے۔اس خاتون نے بصد ہو کر کہا: "یا رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں ایک حجرہ خالی ہے۔وہ میرے استعمال میں بھی نہیں،

Marfat.com

لٰہذا آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ بلاتکلف اس میں رہائش پذیر ہو سکتے ہیں میں خود آپؐ کے اونٹوں کی دیکھ بھال اور دانہ پانی کا خیال رکھوں گی، لٰہذا اُمِ کلثوم کے اصرار پر رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں وہاں خالی حجرے میں قیام پذیر ہو گئے۔

اہل مدینہ کو بھی آمد رسولؐ کی خبر پہنچ چکی تھی۔ سب سے پہلے حضرت عمر بن خطابؓ قبا میں پہنچے۔ بعدازاں باقی مسلمان بھی حاضر خدمتِ اقدسؐ ہوئے۔ لحہ بہ لحہ لوگوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ اس چھوٹے سے حجرے میں لوگوں سے ملنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہاں ایک مسلمان سعد بن خیثمن تھا جس کا گھر کافی کشادہ تھا۔ اس نے اپنے گھر کو رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیا۔ لوگوں سے میل ملاقات کے لیے اللہ کے نبیؐ نے سعدؓ کا گھر مقرر کیا اور آرام کے لیے اُمِ کلثوم کا حجرہ مقرر ہوا۔

قبا پہنچنے کے تیسرے دن مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ ہوا۔ انصار میں سے ایک شخص نے زمین بطور ہدیہ پیش کرنے کی پیشکش کی، لیکن آپؐ نے جگہ خریدنے کی خواہش ظاہر کی اس کی بازاری قیمت نکال کر اس صحابیؓ کو ادا کر دی گئی۔ مؤرخین نے قیمت نہیں درج کی۔ اس لیے ہم قیمت کا اندازہ نہیں لکھ سکتے۔ اتنا ضرور ہے کہ مسجد قبا کی جگہ کی قیمت ضرور ادا کی گئی۔

زمین خریدنے کے بعد تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا جس میں تمام مہاجرین وانصار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تمام مسلمانوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ بڑے ذوق شوق سے تعمیری کام کیا۔ کوئی پتھر لا رہا تھا تو کوئی گارا بنا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ جیسے شرفاء مکہ اپنے ہاتھوں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں عمرؓ کو اگر اس کام کا لاکھوں دینار معاوضہ بھی دیا جاتا تو شاید وہ ایسا کام کرنے پر تیار نہ ہوتے۔ یہ فیضانِ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھا کہ اکابرینِ مہاجرین و انصار اللہ کے نبیؐ کے ساتھ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تعمیری کام کر رہے تھے۔

اسلام کی یہ پہلی مسجد تقریباً بیس دنوں میں تیار ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔

مسجد قبا تعمیر ہو رہی تھی تو یہودیوں کے چند مذہبی لوگوں نے یہ جاننے کے لیے آپؐ سے ملاقات کی کہ آپؐ موسیٰؑ کے دین میں کب شامل ہو رہے ہیں۔ ان کے اس وہم کی وجہ بھی تھی۔ مسجد قبا کی محراب کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا بعدازاں اللہ کے حکم سے مسجد کا رخ خانہ کعبہ کی طرف کر دیا گیا۔ اسی لیے اس مسجد کو مسجد ”قبلتین“ یعنی دو قبلوں والی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔

یہودیوں نے مختلف سوالوں کے ذریعے جاننا چاہا کہ آپؐ دینِ موسیٰؑ قبول کریں گے یا

Marfat.com

نہیں۔ آپؐ نے جواب میں انھیں بتانے کی کوشش کی کہ وہ دینِ موسیٰ قبول نہیں کریں گے جواب سن کر یہودی عالموں نے واضح اور ٹھوس انداز میں کہا: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر تم نبی بننا چاہتے ہو تو سب سے پہلے دین موسوی اختیار کرو کیونکہ دنیا میں صرف قومِ یہود ہی ہے جس میں نبی آتے ہیں اور کوئی قوم نہیں جو نبوت کے منصب کے قابل ہو۔ ویسے بھی یہودیوں کا مقام اعلیٰ ہے۔ یہ دنیا میں پہلے نمبر پر اور باقی اقوام دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر پر ہیں۔

یہ باتیں سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وفد سے فرمایا: ''اے علمائے یہود میں پیغمبر اپنی مرضی سے نہیں بنا۔ اللہ نے مجھے مبعوث کیا ہے۔ اللہ کی نظر میں کوئی قوم دوسری قوم پر فوقیت نہیں رکھتی۔ اللہ کے ہاں تمام انسانوں کا معاملہ ایک جیسا ہے۔ سب برابر ہیں۔ وہ کسی وسیلے کا محتاج نہیں۔ وہ جب چاہے جسے چاہے، اپنے رابطے میں لے سکتا ہے۔ یہ امتیاز صرف یہودیوں کو ہی حاصل نہیں۔

مسجد قبا میں پہلی نماز جمعہ کے دن ادا کی گئی۔ حضور ﷺ نے جمعہ کو مسلمانوں کی اجتماعی عبادت کا دن قرار دیا۔ یہ فیصلہ بھی یہودیوں پر شاق تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہفتے کا دن ہی اجتماعی عبادت کے لیے مقرر کیا جائے گا۔

یہی وجوہات تھیں کہ ماسوائے شلوم کے قبا میں کسی یہودی نے اسلام قبول نہیں کیا۔ یہ شلوم وہی شخص ہے جس نے قبا میں داخلے پر آپ کو سب سے پہلے دیکھا اور شور مچا کر اہلِ قبا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر دی۔

یہودیوں کی اس بے چینی پر ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بروز جمعہ یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اللہ کے ہاں کوئی قوم کسی قوم سے افضل نہیں۔ سب انسان برابر ہیں، ماسوا متقی اور پرہیز گار لوگوں کے۔

اب یہودیوں پر واضح ہو چکا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہودیت پر آنے والے نہیں۔ اس لیے انھوں نے روایتی انداز میں جھوٹا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ انھوں نے ایک افواہ پھیلا دی کہ اللہ کی طرف سے اذن ملا ہے کہ جو عورت اسلام لائے گی وہ بانجھ ہو جائے گی۔ اس افواہ نے مسلمانوں پر قدرے اثر بھی کیا۔ وجہ یہ تھی کہ مسلمان عورتیں اور مرد سفر کی تھکن اور آب و ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے بیمار پڑ گئے تھے۔

یہ افواہ سن کر آپؐ نے مسلمانوں کو مسجد قبا میں جمع کر کے فرمایا۔ یہ جو افواہ پھیلی ہوئی ہے، یہ قطعاً اللہ کی طرف سے نہیں ہے، لہٰذا مردوں کا فرض ہے کہ وہ عورتوں کو حوصلہ دیں۔ جو آدمی اپنے

Marfat.com

میٹھے بول سے کسی کو سکون دے گا، اللہ کے ہاں اس کا اجر محفوظ ہے۔

اس افواہ کے بعد ہی قبلہ تبدیل کرنے کا حکم بھی موصول ہوا۔ قبلہ کی تبدیلی حضور ﷺ کی خواہش تھی کیونکہ آپؐ کو خانہ کعبہ سے بڑی محبت تھی۔ اسے تعمیر بھی آپؐ کے جدِّ امجد ابراہیمؑ اور اسماعیل علیہ السلام نے کیا تھا۔

———(((اللہ اکبر)))———

قبا میں 20 دن قیام کے بعد آپ سرکارِ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پورا شہر استقبال کے لیے امڈ آیا تھا۔ پیر و جوان[9] مرد و زن سب پر جوش انداز سے زیارت نبیؐ کے منتظر تھے۔ بچیاں استقبالی ترانے گا رہی تھیں۔ ''وداع کی گھاٹیوں سے بدرِ منیر یعنی منور چاند نکل آیا۔'' بچیوں کے ترانوں کا اسی قسم کا مفہوم تھا۔ الغرض مدینہ میں ایک جشن کا سا سماں تھا۔ لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ مدینہ کی گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگوں کی رونق تھی۔

آپؐ مدینہ میں داخل ہوئے تو ہر ایک کی خواہش تھی آپؐ اس کے مہمان بنیں۔ آپؐ بخوبی جانتے تھے کہ اگر آپؐ نے اپنی طرف سے کسی کے ہاں قیام کا فیصلہ کیا تو دوسرے لوگوں کی دل آزاری ہوگی۔ اس لیے آپؐ نے قصویٰ کی مہار چھوڑ دی کہ وہ جہاں بیٹھے گی۔ وہاں ہی قیام کیا جائے گا۔ یوں آپؐ نے اپنی طرف سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا یعنی آپؐ کا قیام جس گھر میں اللہ کو مطلوب ہوا، وہ قصویٰ کو وہیں روک دے گا۔

یوں قصویٰ شہر کے کئی محلے چھوڑ چھاڑ محلہ بنی نجار میں داخل ہوئی۔ بنی نجار آپؐ کے اور آپؐ کے والدِ بزرگوار کے ننھیال تھے۔ مزے کی بات ہے، بنی نجار آپؐ کے دادا عبدالمطلب کے بھی ننھیال تھے۔ اسی محلے میں دادا عبدالمطلب کی والدہ کا گھر تھا جو ہاشم کی بیگم تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ قصویٰ وہاں رکے گی کیونکہ آپؐ کے بچپن کا کچھ حصہ یہاں گزرا تھا۔ آپؐ اپنی والدہ بی بی آمنہ کے ساتھ یہاں آتے رہے، مگر اونٹنی وہاں نہیں رکی۔ لوگوں میں تجسس بڑھ رہا تھا کہ دیکھئے کون سا گھر آپ کی مہمان نوازی کے لائق ٹھہرتا ہے۔ قصویٰ بنی نجار کی گلیوں میں چکر کاٹتی رہی۔ کافی گھوم پھر کر ایک میدان میں داخل ہوگئی۔ یہ میدان ان دنوں کھجوریں خشک کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر قصویٰ نے گھٹنے ٹیک دیے اور بیٹھ گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی کے لیے اٹھانا چاہا، شاید عارضی توقف نہ ہو، لیکن قصویٰ جہاں بیٹھی تھی وہیں زمین سے چمٹ گئی۔

تمام مسلمانوں کو انتہائی خوشی ہوئی کہ قصویٰ بیٹھ گئی ہے اور جہاں وہ بیٹھی ہے یہ کھلا میدان ہے۔ ظاہر ہے اب یہاں مسجد بھی تعمیر ہوگی۔ اگر کسی تنگ گلی یا محلے میں رک جاتی تو مسجد کی وسعت

Marfat.com

کے حوالے سے مسلمانوں کو ہمیشہ زحمت اٹھانا پڑتی۔ لوگ خوش تھے کہ اب یہاں مسجد کے ساتھ آپ کی رہائش کے لیے جگہ کی بھی کمی نہیں۔

آپؐ نے دریافت کیا یہ زمین کس کی ملکیت ہے۔ اسد بن زرارہؓ نے جواب دیا یہ زمین دو یتیم بچوں کی ملکیت ہے۔ میرے قبضہ میں ہے۔ میں ان یتیم بچوں کا ولی یا کفیل ہوں، لیکن میں یہ زمین مسجد اور گھر کے لیے آپؐ کی نذر کرتا ہوں۔

آپ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر جواب دیا۔ اگر یہ زمین دو یتیم بچوں کی ملکیت نہ بھی ہوتی تو بھی میں کسی کی نذر قبول نہ کرتا، چہ جائیکہ اس زمین کے مالک یتیم بچے ہیں۔ اے اسد میں یتیم پلا ہوں۔ یتیمی کے دکھ درد اور کیفیات کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہاں ایک شرط پر زمین قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم زمین کی قیمت مروجہ قیمت وصول کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو!!! اسد بن زرارہؓ نے اس کی قیمت سات دینار بتائی۔ آپؐ نے لوگوں سے قیمت کے متعلق پوچھا۔ سب نے اسد کی قیمت کی تصدیق کر دی۔ بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ میں اس کی قیمت دس دینار دیتا ہوں تاکہ ان یتیموں کے لیے اس سے بہتر زمین خریدی جاسکے۔

قارئین!!! ان دنوں دینار سونے کے دس سکوں کے ہم وزن تھا۔ سونے کے دس سکے بہت بڑی رقم خیال کی جاتی تھی۔ عرب میں بیرونی کرنسی چلتی تھی۔ عربوں کی اپنی کرنسی نہیں تھی۔ ان دنوں عرب میں ایرانی دینار "خسروی" دینار کے نام سے چلتے تھے اور رومی سکے "ہرقلی" نام سے چلتے تھے۔ خسرو پرویز ایران کا بادشاہ تھا اور ہرقل روم کا۔ ان دنوں کرنسی پر بادشاہِ وقت کی ٹکسال ہوتی تھی۔ روم سے مراد "بازنطین" تھا۔ جہاں آج کل جمہوریہ ترکی ہے۔ اسے رومۃ الصغریٰ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا دارالحکومت استنبول ہی تھا، مگر اس کا نام "بازنطین" تھا۔

مدینہ آمد کے دوسرے دن مسجد کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ تمام مسلمان بلا امتیاز مسجد کی تعمیر میں لگ گئے۔ سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم والی دو جہاں خود بھی عام لوگوں کی طرح تعمیر کا کام کرتے رہے۔ سب سے پہلے بنیادیں کھودی گئیں جو تین ذراع گہری تھیں۔ بنیادوں میں پتھر استعمال کیے گئے۔ دیواروں کی چنائی کچی اینٹ سے کی گئی۔ مسجد کی چھت پر درخت خرما کے شہتیر ڈالے گئے اور جرید یعنی کھجور کے پتوں سے ڈھانپ دیا گیا۔

اسلام کی یہ دوسری اور وجود کے لحاظ سے پہلی بڑی مسجد تھی۔ اس کا اندازِ تعمیر آج تک دنیا کی مساجد کے لیے نمونہ اور علامت ہے۔ اس کی تعمیر میں سات مہینے لگے۔ یہ اپنے دور کی سب سے

Marfat.com

مضبوط اور پائیدار عمارت تھی۔ چونکہ مدینہ میں بارشوں کی اوسط باقی عرب علاقوں سے زیادہ تھی، اس لیے اسے اس حد تک مضبوط بنایا گیا کہ برساتی پانی نقصان نہ پہنچا سکے۔

ہجرت کر کے آنے والوں میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو بالکل تہی دست اور بے خانماں تھے۔ ان کے بیٹھنے کے لیے ایک چبوترہ، جسے "صفہ" کہا گیا، بنایا گیا اور ایک سائبان ان کے سونے کے لیے تعمیر ہوا۔ یہ "صفہ" گارے اور پتھر کی اینٹ سے تعمیر ہوا۔ اس صفہ پر بیٹھنے والوں کو اصحاب صفہ کہا گیا۔ بعدازاں یہی غریب و ناتواں صحابہ اکرامؓ مشاہیر اسلام میں داخل ہوئے انھوں نے علمی وتدریسی اور مادی میدانوں میں سنہری کارنامے انجام دیے۔

رہنے کے لیے ابوایوب انصاریؓ کے اصرار پر ان کا گھر منتخب ہوا۔ بعدازاں مسجد کے ساتھ رہائشی حجرے تعمیر ہوئے تو آپؐ اپنے حجرے میں رہائش لے آئے جو مسجد سے متصل تھا۔

مکہ سے آنے والے مفلوک الحال تھے۔ مفلسی اور تنگ دستی ان کے دامن گیر تھی۔ اکثر اپنے قریبی عزیز واقارب اور گھربار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چھپتے چھپاتے خالی ہاتھ مدینہ پہنچے تھے۔ غم اور سفری تکالیف نے پکڑا ہوا تھا۔ اوپر سے یہودیوں کی افواہیں پیچھا کر رہی تھیں۔

اللہ کے فضل سے انھیں دنوں عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاں ایک تندرست وتوانا اور خوبصورت بیٹا پیدا ہوا جس کی پیدائش مسلمانوں کے سکون کا باعث ہوئی کیونکہ یہودیوں نے افواہ پھیلا رکھی تھی کہ مسلمان عورتیں بانجھ ہوگئی ہیں۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاں بیٹے کی پیدائش نے مسلمانوں کے تمام وسوسے اور خدشات دور کر دیے۔

والیِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے مفلسی اور کسمپرسی کا یوں تدارک کیا کہ ایک مہاجر کا ایک انصاری سے اس وقت تک "عہدِ اخوت" باندھ دیا جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود کسی کے ساتھ عہد اخوت اس لیے نہیں باندھا کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ چنانچہ آپؐ نے اپنا عہدِ اخوت حضرت علیؓ کے ساتھ باندھ لیا۔ یہاں سے اسلام کے عروج کا دور شروع ہوتا ہے جس کا منظر بڑا طویل وعریض ہے۔ مدینہ میں تعمیر ہونے والی یہ مسجد اسلام کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مرکز یعنی ہیڈکوارٹر بنی۔ بعد میں اسے نبیؐ کی نسبت سے "مسجد نبوی کا نام دے دیا گیا۔"

اب چونکہ ایک مرکز میسر آ چکا تھا۔ تحریک اسلامی کا ایک ہیڈکوارٹر بن چکا تھا۔ اس لیے اسلامی ریاست کی ابتدا ضروری تھی۔ اس ریاست کے لیے ایک دستور اور ضابطے کی ضرورت تھی۔

Marfat.com

یہاں آنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ اللہ کے اس نظام کی ابتدا کر دی جائے جس کے لیے آپؐ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ سو مدینہ میں رہنے والوں کو اکٹھا کیا گیا تا کہ مختلف خیال اور مختلف طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان کوئی معاہدہ، کوئی اصولی ضابطہ تحریر کیا جائے تا کہ اپنے اپنے نظریے، اپنے اپنے مذہب پر رہتے ہوئے تمام لوگ معاشرتی اصولوں کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کر سکیں، کسی کو کسی قسم کی نظریاتی اور معاشرتی قدغن محسوس نہ ہو۔ ہر طبقہ فکر ایک حد کے اندر رہ کر زندگی بسر کر سکے کسی کو کسی سے کسی قسم کی الجھن تکلیف اور پریشانی نہ ہو۔

بالآخر اس سلسلے میں ایک معاہدہ ضبطِ تحریر میں آیا جسے میثاق مدینہ کہا جاتا ہے۔

یاد رہے یہ معاہدہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت و حیثیت کا موازنہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ دنیا کا پہلا تحریری آئین ہے پہلا دستورِ ریاست ہے جو تحریر کیا گیا۔

مضمون کی طوالت سے بچنے کے لیے اسے علیحدہ عنوان سے اگلے صفحات میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

———(((الحمد للہ)))———

Marfat.com

دنیا کا پہلا تحریری آئین
(میثاقِ مدینہ)

مکہ میں اسلامی تحریک خفیہ یا محکوم انداز میں چل رہی تھی۔ اس تحریک کو روکنے کے لیے مشرکین مکہ متحد تھے۔ وہ لوگ قلت عقل وفکر کی وجہ سے تحریک اسلامی کے الہامی اور قرآنی اثر ونفوذ کے گہرے اثرات کو سرد انداز میں روکنے کی کوشش کرتے رہے اس جنگ میں بانی انقلاب ﷺ کی شخصیت و کردار ان پر حاوی رہا۔ تحریکی سچائی اور کارکنوں کی تحریک سے وابستگی نے قریش مکہ کی ایک نہ چلنے دی۔ مشرکین جتنی شدت سے روکتے رہے، اسلام اتنی تیزی سے پھیلتا رہا۔

مکہ میں تحریک اسلامی کے سامنے ایک ہی دشمن یعنی قریش مکہ تھے۔ اب جبکہ مدینہ میں تحریکِ اسلامی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی تو اس کے سامنے کم از کم چھ (6) دشمن تھے جن کا اسے مقابلہ کرنا تھا۔ ان میں سے ایک تو یہودی قبائل تھے جو اہل کتاب بھی تھے۔ دوسرے مدینہ کے مشرک قبائل جنھوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ تیسرے قریش مکہ کے حلیف جو مدینہ میں موجود تھے۔ چوتھے "منافقین" جن کی سازشیں ہمیشہ گہری رہیں۔ کسی آئندہ فرصت میں ہم ان کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے اور چھٹے عرب کے وہ سرحدی قبائل جو ایران وروم کے باجگوار تھے۔

اب چونکہ مجموعی طور پر اسلام کی دشمن اقوام میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ مدینہ کی غالب اور طاقتور اکثریت (اوس وخزرج) اسلام میں داخل ہو کر اسلام کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی، مگر مجموعی دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اس لیے معاشرتی، معاشی اور سیاسی لحاظ سے مضبوط قابل عمل اور جاندار منصوبہ بندی کی ضرورت تھی تاکہ آئندہ ایک حکومت اور ریاست کی شکل میں ابھرنے والی اسلامی ریاست کے تحریکی اور مذہبی اثرات کو قانونی اور آئینی شکل میں نافذ کیا جا سکے۔

اس لیے گرامی قدر رسولِ خدا ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد جو سب سے پہلا سیاسی کام

Marfat.com

کیا، وہ مدینہ کی تمام اقوام تمام مذاہب کے نظریات سے ٹکرائے بغیر ایک متفقہ دستاویز تیار کرنا تھی جو تمام مکتبہ ہائے فکر کے لیے قابل قبول اور نافذ العمل ہو۔ اس دستاویز کو تاریخ میں "میثاق مدینہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جسے مسلمان سیرت نگار ڈاکٹر حمید اللہ[10] نے دنیا کا پہلا تحریری آئین قرار دیا ہے اور یقیناً ہے بھی۔ دنیا میں تخلیقِ آدم سے لے کر ہجرت تک تاریخ میں اس کے علاوہ کوئی دستاویز نظر نہیں آتی جو آئینی حیثیت سے باہمی مشاورت سے قابل قبول اور قابل تعمیل حد تک معرضِ تحریر میں آئی یا لائی گئی ہو۔

اس دستاویز کو پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی اور تخلیقی صلاحیتوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ بے شک اس میں قرآن سے الہام وکشف بھی لیا گیا اور پرانے قبائلی رسوم ونظام کو بھی مدنظر رکھا گیا، لیکن یہ دستاویز کلی طور پر آپ کی اختراع یا ایجاد ہے۔

یہ آئین کل باون (52) شقوں پر مشتمل ہے جس میں سے (25) پچیس مسلمانوں کے لیے اور ستائیس (27) دوسرے مذاہب کے لیے تھیں۔ اسے تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے برابری کے اصول مدنظر رکھتے ہوئے تدوین کیا گیا تا کہ ہر شخص آزادیِ مذہب وفکر کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ کسی کو کسی کے کام میں کیڑے نکالنے کی ضرورت نہ رہے۔ کوئی کسی کے لیے مزاحمت نہ کر سکے۔

یہ آئین ہجرت کے سات ماہ بعد 623 عیسوی کو تحریر ہوا۔ اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اقوامِ متحدہ کے غیر منصفانہ اور غیر جانبدارانہ اور نا قابل عمل چارٹر سے موازنہ کرنے سے ہوتا ہے کہ میثاق مدینہ آئینی دستاویز ہی نہ تھی، بلکہ عربوں کے لیے اسلامی قلمرو میں آنے والے تمام علاقوں کے نزدیک آج کے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر سے ہزار گناہ زیادہ افادیت واہمیت رکھتی تھی۔

بہرکیف باقی مباحث بعد میں۔ سب سے پہلے دنیا کی اس پہلی تحریری دستاویز پر ارتکاز نظر کرتے ہیں۔ اس معاہدے کا متن ہم تفہیمی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اصل متن عربی زبان میں ہے۔ ہمیں اپنے قارئین کی مشکل کا بخوبی اندازہ ہے، اس لیے سلیس اور آسان الفاظ میں حسب ذیل حالت میں متن کا مفہوم پیش خدمت ہے:

———(((اللہ اکبر)))———

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ شروع اللہ کے نام[11] سے جو بے حد مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ یہ نوشتہ یا دستاویز محمد ﷺ کی طرف سے جو نبیؐ ہیں قریش اور اہل یثرب میں سے ہیں۔ ایمانداروں

Marfat.com

اوراطاعت گزاروں نیز ان لوگوں کے درمیان جوان کے تابع ہوں ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اوران کے ساتھ جہاد میں شامل ہو جائیں۔

یہ تھا معاہدے کا سرورق یا موضوع جسے ہم آج کل موضوع (Sabject) کہتے ہیں اور لکھتے وقت خط کشید کرتے یعنی انڈر لائن کرتے ہیں۔

1- ''دوسرے لوگوں کے بالمقابل وہ ''اُمت'' ہونگے یہی لفظ جس نے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو قومی اور سیاسی لحاظ سے دنیا کے تمام مذاہب سے منفرد اور جدا کر دیا ہے۔ تحریری طور پر یہ لفظ میثاق مدینہ کی پہلی شق بنا۔

2- ''قریش کے مہاجر اسلام سے قبل کے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے اور اپنے اسیروں کا فدیہ بھی اسی شیڈول کے مطابق ادا کریں گے تا کہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف پر ہو۔''

3- ''اور بنی عوف کے لوگ اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے اسیروں کا خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف پر ہو۔''

4- اور بنی حارث اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے اسیروں کو خود فدیہ ادا کر کے چھڑائے گا تا کہ ایمانداروں کا برتاو باہم نیکی پر ہو۔''

5- ''اور بنی ساعدہ کے لوگ اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے اسیر خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف پر ہو۔''

6- ''بنی جشم اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کرے گا اور ہر گروہ اپنے اسیروں کا خود فدیہ دیکر چھڑائے گا تا کہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف پر ہو۔''

7- ''اور بنی نجار اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے اور اپنے اسیروں کا خود فدیہ ادا کر کے چھڑائیں گے تا کہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف پر ہو۔''

8- ''اور بنی عمرو بن عوف کا اپنے دستور کے مطابق خون بہا ہوگا اور ہر گروہ اپنے قیدی فدیہ دے کر خود چھڑائے گا تا کہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف پر ہو۔''

9- اور بنی النبیت اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ ادا کر کے چھڑائے گا تا کہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف پر ہو۔

10- ''اور بنی اوس اپنے دستور کے مطابق خون بہا دیں گے اوا پنے قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائیں گے تا کہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف پر ہو۔''

11- ''اور ایماندار لوگ کسی مفلس اور زیر بار شخص کو مدد دیے بغیر نہ چھوڑیں گے تا کہ اس کا فدیہ یا خون بہا بخوبی ادا ہو سکے۔''

یاد رہے یہاں تک ایک چیز کھل کر سامنے آئی ہے کہ پرانے اصول وضوابط میں سے جو قابل تقلید تھے، انھیں اسی پرانی حالت میں بغیر کسی ردّ وبدل کے نئے اصول وضوابط میں اپنا لیا گیا ہے یہ اسلامی ریاست کا پہلا آئین تھا۔ اس پہلے آئین نے ہی آگے چل کر اسلامی قوانین کی بنیاد بنا تھا۔ یہاں پرانے قبائلی ضوابط انتہائی سوچ سمجھ کر ہی اپنائے گئے تھے۔ بعدازاں یہی اصول قصاص اور دیت کے زمرے میں آیا۔ یہ دراصل پرانا قبائلی رواج تھا۔

ان دنوں خون بہا کی قیمت سو اونٹ تھی جو قاتل نے مقتول کے ورثا کو معافی نہ ملنے کی حالت میں ادا کرنا ہوتی تھی۔ اس اصول پر عرب کے غیر متمدن قبائل آج کے یورپ سے زیادہ عمل کرتے تھے۔ یہ ضابطہ صرف لفظوں کی حد تک نہیں تھا، بلکہ عملاً ہمارے پاکستانی آئین سے زیادہ نافذ العمل تھا۔

12- اور کوئی مومن کسی دوسرے مومن کی اجازت کے بغیر اس کے مولیٰ یعنی معاہداتی بھائی سے معاہدہ نہ کرے گا۔''

13- اور متقی اور ایماندار ہر اس شخص کی مخالفت پر کمربستہ رہیں گے جو ان میں سے سرکشی کرے یا ظلم یا زیادتی کا مرتکب ہو۔ یا ایماندار لوگوں میں فساد پھیلائے۔ ان سب کے ہاتھ ایسے شخص کی مخالفت پر ایک ساتھ اٹھیں گے، خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔''

14- ''اور کوئی ایماندار کسی ایماندار کو کسی کافر کی خاطر قتل نہ کرے گا اور نہ کسی ایماندار کے خلاف کافر کی امداد کرے گا۔''

15- ''اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے، مسلمانوں میں سے ادنیٰ فرد بھی کسی کو پناہ دے کر پابندیاں عائد کر سکے گا اور ایماندار دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں باہم بھائی بھائی ہیں۔

16- اور یہودیوں میں سے جو شخص اتباع کرے گا اسے امداد و مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ان لوگوں پر ظلم ہوگا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔''

17- اور ایمانداروں کی صلح ایک ہی ہوگی اللہ کی راہ میں ہو تو کوئی ایماندار کسی دوسرے ایماندار کو چھوڑ کر دشمن سے صلح نہیں کرے گا جب تک یہ صلح سب کے لیے برابر نہ ہو۔

18- ''اور وہ تمام گروہ جو ہمارے ساتھ ہو کر جنگ کریں گے ایک دوسرے کے پیچھے ہوں گے''۔ پیچھے ہونے سے مراد تدبیراتی لحاظ سے ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

Marfat.com

19- ''اور اس میں کوئی شک نہیں کہ متقی ایماندار سب سے بہتر اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔'' یہاں قرآنی آیات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

21- اور کوئی مشرک قریش کے مال اور جان کو پناہ نہ دے گا اور نہ ایماندار کے لیے اس سلسلے میں رکاوٹ بنے گا۔'' یعنی مسلمان اگر قریش مکہ کی پناہ پر پناہ دینے والے کو پناہ معطل کرنے کے لیے کہیں گے تو وہ روڑہ نہیں اٹکائے گا۔

22- اور کوئی شخص جو کسی مسلمان کو قتل کرے گا تو قاتل سے اس کا قصاص لیا جائے گا بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی خون بہا پر راضی ہو جائے اور تمام ایماندار اس کی تعمیل کے لیے اٹھیں گے اور اس کے سوا ان کے لیے کوئی صورت جائز نہ ہوگی۔''

23- ''اور کسی ایماندار کے لیے جو اس نوشتے یا دستاویز کے مندرجات کا اقرار کر چکا ہے جائز نہیں کہ کسی فتنہ اٹھانے والے کی مدد کرے یا اسے پناہ دے جو اسے پناہ دے گا دن قیامت کے اللہ کی لعنت اور غضب کا حقدار ہوگا اور اس سے کوئی فدیہ یا بدلہ قبول نہ کیا جائے گا۔''

24- ''اور جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف پیدا ہوگا اللہ اور محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔'' چونکہ اللہ کا رسولؐ اس دنیا میں خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اس لیے انصاف اور معاملات کی تصحیح کے لیے اسی کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے اگر رسولؐ اس دنیا سے روپوش ہو چکے تو پھر اللہ کی نازل کردہ کتاب اور رسول کی تعلیمات اور سنت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

25- اور یہودی جب تک ایمانداروں کے ساتھ مل کر جنگ کرتے رہیں گے مصارف یعنی جنگی اخراجات بھی برداشت کرتے جائیں گے۔''

26- ''اور بنی عوف کے یہودی ایمانداروں کے ساتھ ایک امّت (سیاسی وحدت) تسلیم کیے جاتے ہیں یہودی اپنے دین پر رہیں اور مسلمان اپنے دین پر خواہ موالی ہوں یا اصل۔ البتہ جو لوگ ظلم اور جرم کے مرتکب ہونگے وہ اپنی ذات یا گھرانے کے سوا دوسروں کو ہلاکت و فساد میں نہ ڈالیں گے''۔

27- ''اور بنی نجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو''۔

28- ''اور بنی حارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔''

29- ''بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں

Marfat.com

کو۔"

30- "اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔"

31- بنی اوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔"

32- اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ البتہ جو ظلم یا جرم کا ارتکاب کرے گا تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوا کوئی مبتلائے ہلاکت وفساد نہ ہوگا"۔

33- جفنہ بھی ثعلبہ کی شاخ ہیں انھیں بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو اصل کو۔"

34- "اور بنی شطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ وفا شعاری ہو یا کہ عہد شکنی۔"

35- اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔"

36- "اور یہودی قبائل کی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو اصل کو۔"

37- "اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر جنگ کے لیے نہ نکلے گا۔"

38- "اور زخم کا بدلہ لینے میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے گی جو شخص خون ریزی کرے گا تو ذمہ داری اس پر اور اس کے گھرانے پر ہوگی بجز اس شخص کے جس پر ظلم ہوا اور خدا اس کے ساتھ ہے۔"

39- "اور یہودی اپنے خرچ کے ذمہ دار ہونگے اور مسلمان اپنے خرچ کے۔"

40- "جو کوئی اس دستور العمل کو قبول کرنے والوں کے خلاف جنگ کرے تو یہودی اور مسلمان ایک دوسرے کی مدد کریں۔"

41- "کوئی شخص اپنے حلیف کی بد عملی کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے گا اور مظلوم کی بہر حال مدد کی جائے گی۔"

42- "یہودی اس وقت تک مصارف برداشت کرتے رہیں گے جبکہ تک وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شریک رہیں گے۔"

43- یثرب کا میدان اس نوشتے کو ماننے والوں کے نزدیک مقدس ومحترم ہوگا۔"

مراد یہ ہے کہ مدینہ بھی مکہ کی طرح "حرم" ہوگا یہاں بھی خون ریزی، قتل وغارت، دنگا فساد حرام ہوگا وہ تمام اصول اور قانون مدینہ کی حرمت کے لیے مدینہ کی حدود میں بھی لاگو ہونگے جو مکہ کے "حرم" ماننے پر لاگو ہوتے ہیں۔

44- ''پناہ گزین کے وہی حقوق ہونگے جو اصل یعنی پناہ دینے والے کے ہیں۔ نہ اسے کوئی نقصان پہنچایا جائے گا اور نہ وہ کسی جرم کا مرتکب ہوگا۔''

45- ''کسی عورت کو اس کے کنبے کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی۔''

46- ''اس دستاویز کو قبول کرنے والوں کے درمیان کوئی نیا معاملہ یا جھگڑا پیدا ہو جائے جس پر فساد رونما ہونے کا ڈر ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اس نوشتے میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کو اس پر زیادہ سے زیادہ وفاداری پسند ہے۔''

47- ''نا قریش کو پناہ دی جائے گی اور نا ہی اس شخص کو جو اُن کا معاون ہو۔''

48- ''اگر کوئی یثرب یعنی مدینہ منورہ پر حملہ آور ہو تو معاہدہ میں شامل فریقوں یعنی یہودیوں اور مسلمانوں پر ایک دوسرے کی مدد اور نصرت لازم ہوگی۔''

49- ''اگر انھیں صلح کرنے اور اس میں شرکت کی دعوت دی جائے گی تو یہ اسے قبول کریں گے اور شریک ہونگے اسی طرح جب وہ کسی کو صلح کے لیے بلائیں گے تو اسے قبول کریں گے اور مسلمانوں پر بھی قبول کر لینا لازم ہوگا بجز اس صورت کے کہ کوئی دینی جنگ کرے۔''

50- ''ہر شخص کے حصے میں اسی کی مدافعت آئے گی جو اس کے بالمقابل ہوگا۔''

51- ''اور اوس کے یہودیوں کو اصل ہوں یا موالی وہی حقوق حاصل ہونگے جو اس نوشتے کے ماننے والوں کو ہیں۔''

52- اور یہ نوشتہ کسی ظالم یا مجرم کے آڑے نہ آئے گا جو شخص جنگ کے لیے نکلے وہ بھی اور جو شخص گھر میں بیٹھا رہے وہ بھی امن کا مستحق ہوگا صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہونگے جو ظلم یا جرم کے مرتکب ہونگے خدا اس شخص کا حامی ہے جو عہد و اقرار میں وفا شعار اور پرہیزگار اور اللہ کے رسول محمد ﷺ بھی اس کے حامی ہیں۔''

مذکورہ بالا دستاویز لفظ بلفظ سیرت ابن ہشام سے ماخوذ ہے۔ ہم نے اس کی اصل ہیئت اس لیے تبدیل نہیں کی کہ یہ ایک آئینی دستاویز ہے اور کسی بھی آئینی دستاویز کا اگلی نسل تک اصل ماخذات کے ساتھ منتقل کرنا ہی تاریخی انصاف ہے۔ کسی بھی آئینی دستاویز کی تشریح اور تفسیر آئیندہ لوگوں تک پہنچانا پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی تو پہنچا سکتا ہے، لیکن اس آئینی دستاویز کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔

اور اسے اصل حالت میں لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پڑھنے والے آپؐ کی تخلیقی اور سیاسی صلاحیتوں کا اندازہ خود بخود کر لیں۔ نہ صرف یہ، بلکہ آپؐ کی انسانیت پرور، غیر جانبدار اور روشن

Marfat.com

خیال حیثیت بھی قارئین کے سامنے کھل کر آ جائے۔ آپؐ کی شخصیت کے اس رخ میں کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ اس اُمت پر خصوصی رحم فرمائے اور خواص و عوام کو ایک متحرک اور متحدہ شعور و فکر سے نوازے۔ آمین!

(((الحمد للہ)))

حواشی:

1- ابن خلدون، تاریخ اسلام، سیرت النبیؐ۔
2- سیرت النبیؐ، رحمت اللعالمینؐ، سیرت سرور عالمؐ، سیرت ابن ہشام۔
3- سیرت ابن ہشام، تاریخ ابن خلدون، سیرت النبیؐ۔
4- تاریخ اسلام، سیرت ابن ہشام، سیرت النبیؐ۔
5- ابن ہشام، سیرت النبیؐ۔
6- ابن ہشام، ابن خلدون، طبری، سیرت النبیؐ وغیرہم۔
7- ابن ہشام، تاریخ طبری۔
8- سیرت النبیؐ، ابن ہشام، سیرت سرور عالمؐ۔
9- یہ تمام واقعات تاریخ و حدیث اور سیرت کی کتب میں متفق علیہ ہیں۔
10- عہد نبویؐ میں انداز حکمرانی۔ از ڈاکٹر حمید اللہ۔
11- سیرت ابن ہشام، عہد نبوی میں انداز حکمرانی از ڈاکٹر حمید اللہ۔

Marfat.com

کتابیات وماخذات

قرآن وتفاسیر

اصولِ تفسیر	امام ابنِ تیمیہ
تاریخ ارض القرآن	سید سلیمان ندوی
کیا بائبل خدا کا کلام ہے	شیخ احمد دیدات ترجمہ: لیفٹیننٹ کمانڈر محمد طفیل
تفہیم القرآن	مولانا مودودی
تفسیرِ عثمانی	مولانا شبیر احمد عثمانی
تفسیرِ مظہری	مولانا محمد ثناء اللہ پانی پتی
تفسیر ترجمان القرآن	ابوالکلام احمد آزاد
تفسیر ابنِ کثیر	علامہ عماد الدین ابنِ کثیر
تفسیر فاضلی	پیر کرم اللہ اظہری
انوار القرآن	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ملک
موضح قرآن	شاہ عبدالقادر/ مولانا ابوالکلام آزاد
ترجمان القرآن	
سیرت انبیاء اکرام	مولانا عبدالرحمٰن
قصص القرآن	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
فضائلِ اعمال	مولانا زکریا
تبلیغی نساب	مولانا زکریا
بہشتی زیور	مولانا اشرف علی تھانویؒ
الجہاد	سید واجد علی شاہ

Marfat.com

سیر الصحابہؓ	ادارہ اسلامیات لاہور
قرآن سائنس اور مسلمان	مولانا شہاب الدین ندوی
نکات القرآن	مولانا عبدالرحمٰن اشرفی
بائبل قرآں اور سائنس	ثناء الحق صدیقی
اسلام اور جدید سائنس	مولانا شہاب الدین ندوی
تذکیر القرآن	مولانا وحید الدین خاں
حقانیت اسلام	مولانا اشرف علی تھانوی
حقیقتِ انسانیت	صوفی دین محمد اشرفی

احادیث وفقہ

مُعجم البلدان	یاقوت حموی
موطا امام مالک	امام مالک بن انسؒ
شرح صحیح بخاری	محمد بن اسماعیل بخاریؒ
شرح صحیح مسلم	ابوزکریا یحییٰ
سنن ابوداؤد	ابوداؤد سلیماں
جامع ترمذی	
سنن ابنِ ماجہ	ابوعبداللہ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی
سنن النسائی	ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب
فتح الباری	احمد بن علی بن حجر عسقلانی
البدایہ والنہایہ	اسماعیل بن کثیر ثقفی
زاد المعاد	حافظ ابنِ قیم
مُسند احمد	امام احمد بن حنبل
المستدرک	ابوعبداللہ محمد حاکم نیشاپوری
معارف حدیث	مولانا عثمانی

تاریخ وسیرت

تاریخ ابن خلدون	علامہ ابن خلدونؒ

Marfat.com

تاریخ طبری	علامہ طبریؒ
تاریخ ابنِ کثیر	علامہ عمادالدین ابن کثیرؒ
تاریخ الخلفاء	
سیرت ابن ہشام	ابومحمد عبدالملک بن ہشام ترجمہ: مولانا غلام رسول مہر
سیرت النبیؐ	سید سلیمان ندوی۔علامہ شبلی نعمانی
آبِ حیاتؐ	مولانا قاسم نانوتوی
رحمت اللعالمینؐ	قاضی سلیمان سلمان منصور پوری
سیرت سرورِ عالمؐ	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
پیغمبرِ اعظم و آخر	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
سیرت محمدؐ	فقیر متوکلی
رسول اللہ کا سفارتی نظام	ڈاکٹر حافظ محمد یونس
محمد بحیثیت عسکری قائد	افضل الرحمٰن
الفاروق	شبلی نعمانی
مہاجر و انصار	
فتوحاتِ صدیقی	
زندگاں صحابہ کی	ڈاکٹر عبدالرحمٰن راحت پاشا ترجمہ: ابوجاوید اقبال قاسمی
پیغمبرِ اسلام	ڈاکٹر محمد حمید اللہ ترجمہ: پروفیسر خالد پرویز
حیات و عہدِ نبوی	جنرل گلب پاشا ترجمہ: حبیب حیدرآبادی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی	ڈاکٹر محمد حمید اللہ ترجمہ: پروفیسر خالد پرویز
پیغمبرِ انقلاب	مولانا وحیدالدین خان

Marfat.com

محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ڈاکٹر محمد حمید اللہ ترجمہ: پروفیسر خالد پرویز
قصص القرآن	خواجہ محمد اسلام
مشاہیر اسلام	
تاریخ اسلام	اکبر خاں نجیب آبادی
الجہاد فی الاسلام	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
سیر الصحابہ	ادارہ اسلامیات لاہور
تاریخِ فرشتہ	محمد قاسم فرشتہ ترجمہ: عبدالحئی خواجہ
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام	مولانا غلام رسول مہر
معراج النبیؐ	ڈاکٹر اسرار احمد
الرحیق المختوم	مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری
تاریخ اسلام	سید معین الدین ندوی
حیاتِ محمدؐ	محمد حسین ہیکل
عہدِ نبوی میں نظام حکمرانی	ڈاکٹر محمد حمید اللہ
رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی	ڈاکٹر محمد حمید اللہ
مطالعۂ تاریخ	مولانا کوثر نیازی
عدالتِ نبوی کے فیصلے	عبداللہ قرطبہ
نفحۃ العرب	مولانا اعزاز علی امروہی
تحفۃ العرب اردو شرح	مولانا محمد حنیف گنگوہی
رسول اللہؐ کی خارجہ پالیسی	اسد سلیم شیخ
عظمتِ صحابہؓ	محمد ادریس بھوجیانی
سیرت عبداللہؓ بن عمر بن العاص	ابنِ عبدالشکور
ابوذر غفاریؓ	ابن عبدالشکور
حضرت ابوبکر صدیقؓ	عبدالصبور طارق
حضرت عثمانؓ	ابن عبدالشکور

Marfat.com

حضرت علیؓ	علی اصغر چودھری
عہدِ نبوی کے نادر واقعات	علی اصغر چودھری
الجہاد فی الاسلام	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
خلافتِ راشدہ	مولانا ادریس کاندھلوی
مذہب اور جدید چیلنج	مولانا وحید الدین خان

رسائل وجرائد

نقوش ڈائجسٹ	سیرت محمدؐ (نمبر)
سیارہ ڈائجسٹ	قرآن نمبر
سیارہ ڈائجسٹ	جہاد نمبر
سیارہ ڈائجسٹ	سیرت نمبر
سیارہ ڈائجسٹ	انبیاءِ اکرام نمبر
سیارہ ڈائجسٹ	صحابہ اکرام نمبر
سیارہ ڈائجسٹ	خلفائے راشدین نمبر

Morese Bokay	Bible - Qurran and Science
Dr. Abdul Rauf	Stories from prophets life
Maj Gen A.I.Akram	The Sword of Allah
Ziayddin Kirmani	The last Message with lasting Message.
Corlyal	Muhammaddan life
Michal H Heart	The 100s
Sun TZU: Translation by Samuel b giffith	The Art of war
	World at War

☆☆☆☆☆

Marfat.com

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منفرد، آسان اور جدید اسلوبِ بیاں
مکہ کی سرد جنگ
رسول اللہ ﷺ کے خلاف کفارِ مکہ کی مذموم سازشوں کی تاریخ
میجر میاں محمد رفیع مراد
BOOK HOM

Marfat.com